بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

مطالبُ الفرقان

قرآن مجید کی تفسیر ——— خود ——— قرآن مجید سے

جلد پنجم

سورۃ الانعام ۶ (مکمل)، اور سورۃ الاعراف ۷ (آیت ۱۵۸) تک

مع انڈکس

پرویز

شائع کردہ

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، ۲۵/بی، گلبرگ ۲، لاہور

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب	-------------	مطالب الفرقان (جلد پنجم)
مصنف	-------------	علامہ پرویز
پبلشر	-------------	طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
		25- بی' گلبرگ 2- لاہور 54660
		فون: 879246
طابع	-------------	دوست ایسوسی ایٹس
		الکریم مارکیٹ' اردو بازار' لاہور
پریس	-------------	ایچ- وائی پرنٹرز' لاہور
ایڈیشن	-------------	اول نومبر 1982ء
		دوم اکتوبر 1994ء

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی شائع کردہ کتب کی جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

باسمہ تعالیٰ

آئینۂ مطالب

(مطالب الفرقان — جلد پنجم)

مضمون	صفحہ
آئینۂ مطالب ۔	٣
پیش گفتار ۔	٢٨
پہلا باب (سورۃ الانعام) آیت ٦/١ تا ٦/١٦٦	
٦/١ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ..... یَعْدِلُوْنَ	٣
نور و ظلمت خدا کی تخلیق ہیں	٤
"خدا ایسا کرتا ہے" کا مفہوم	//
٦/٢ ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ ..... تَمْتَرُوْنَ	//
افراد اور اقوام کی موت اور حیات	٥
٦/٣ وَھُوَ اللّٰہُ ...... مَا تَکْسِبُوْنَ	//
ارض و سماء میں الٰہ	//
٦/٤-٦ وَمَا تَاْتِیْھِمْ ..... قَرْنًا اٰخَرِیْنَ	٦
اقوامِ سابقہ کے مآل کی مثال	//
٦/٧-٩ وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَیْکَ .... مَّا یَلْبِسُوْنَ	٧
قریش کی معجزات طلبی اور اس سے انکار	//
رسول کا فریضہ وحی کے مطابق نظام قائم کرنا تھا	٨
اور یہ فریضہ انسان ہی سرانجام دے سکتا تھا، فرشتہ نہیں	//
٦/١٠-١١ وَلَقَدِ اسْتُھْزِیٔ .... الْمُکَذِّبِیْنَ	٩
استہزاء اور اس کا انجام	//
٦/١٢ قُلْ لِّمَنْ ...... یُؤْمِنُوْنَ	١٠
"کَتَبَ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ" کا مفہوم	//
خدا کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا ۔	
سنت اللہ اور کلمت اللہ	١١
خدا نے خود اپنے آپ پر پابندی عائد کر رکھی ہے	//
خدا اور انسان کے صاحبِ اختیار ہونے میں فرق	١٢

مضمون	صفحہ
٦/١٣-١٤ وَلَہٗ مَا سَکَنَ ..... مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ	١٣
نظامِ اسلامی کی خصوصیت	//
یہ تمام افراد کی ضروریات پوری کریگا۔ ان سے اپنے لئے کچھ نہیں لے گا	//
٦/١٥-١٨ قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ ..... الْحَکِیْمُ الْخَبِیْرُ	١٣
اگر رسولؐ بھی (بفرضِ محال) خدا کی معصیت کرے، تو سزا سے بچ نہیں سکتا	١٤
شفاعت کے خلاف ایک اور دلیل	//
قہر اور قہّار کا مفہوم	//
خدا کے قہر اور انسانوں کے قہر میں فرق	١٥
٦/١٩ قُلْ اَیُّ شَیْءٍ ..... مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ	//
قرآن قیامت تک ضابطۂ ہدایت ہے	//
ختمِ نبوّت کی محکم دلیل۔	١٦
یہود اور نصاریٰ کی طرف سے مخالفت کے اسباب	//
٦/٢٠-٢١ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ ..... الظّٰلِمُوْنَ	١٧
ان کا شرک کس قسم کا تھا؟	//
٦/٢٢-٢٤ وَیَوْمَ نَحْشُرُھُمْ ..... کَانُوْا یَفْتَرُوْنَ	١٨
یومِ مکافاتِ عمل انکا شرک سے انکار۔	//

مضمون	صفحہ
٦/٢٥-٢٨ وَمِنْھُمْ مَّنْ ..... لَکٰذِبُوْنَ	١٨
مجالسِ نبویؐ میں منافقانہ شرکت	١٩
یہ التجائیں کہ ہمیں ایک بار دنیا میں لوٹا دیا جائے تو ہم بڑے نیک بن جائیں۔ ایسا ہو نہیں سکے گا۔	٢٠
٦/٢٩-٣٤ وَقَالُوْٓا ..... نَّبَاِی الْمُرْسَلِیْنَ	//
حیاتِ اُخروی سے انکار	//
قرآن اور اُخروی زندگی پر ایمان لازم و ملزوم ہیں	//
ظہورِ نتائج کے بعد تاسف و ندامت (توبہ) کچھ کام نہیں دیں گے	٢١
"دنیاوی زندگی لہو و لعب سے زیادہ کچھ نہیں" کا مفہوم	٢١
اے رسولؐ! یہ تمہیں جھوٹا نہیں کہتے قوانینِ خداوندی کی تکذیب کرتے ہیں اس لئے تمہیں اس سے ملولِ خاطر نہیں ہونا چاہیئے۔ ایسا کچھ ہر رسول کے ساتھ ہوتا چلا آیا ہے، اور آخر الامر وہ رسولؐ کامیاب ہوئے	٢٢
یہ خدا کا اٹل قانون ہے۔	٢٣
کلمات اللہ اور سنت اللہ کے غیر متبدل ہونے کے حوالے	//

مضمون	صفحہ
٦/٣٥ وَ اِنْ كَانَ كَبُرَ ... مِنَ الْجٰهِلِيْنَ	٢٢
اے رسولؐ! تم خواہ مخواہ ان کے غم میں گھلے جا رہے ہو۔ یہ معجزات دکھلانے پر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ اور یہ ہماری مشیت نہیں کہ ہم انسانوں کے اختیار و ارادہ کو سلب کر کے انہیں ایمان لانے پر مجبور کر دیں۔	٢٣
٦/٣٦ اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ ...... اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ	٢٤
ایمان تو وہ لائیں گے جو عقل و فکر سے کام لیں گے۔	″
٦/٣٧ وَقَالُوْا لَوْلَا ..... لَا يَعْلَمُوْنَ	″
پھر معجزات کا مطالبہ۔	٢٥
٦/٣٨ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ ..... يُحْشَرُوْنَ	″
تخلیقی اعتبار سے، دیگر جاندار بھی انسانوں جیسی ایک نوع ہیں — نظریۂ ارتقاء کا بنیادی اصول	″
٦/٣٩ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا ...... مُّسْتَقِيْمٍ	٢٦
عقل و فکر سے کام نہ لینے والے، گمراہ رہتے ہیں۔ منافقین کا ایمان — خدا کے ساتھ سودے بازی!	٢٦
١ / ٤٠ تا ٤٣ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ ...... كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔	٢٧
خدا کی ہمسر قوتیں۔	″
قوموں کی تباہی کے اسباب — مفلسی اور محتاجی بھی۔ اور افراطِ رزق بھی	٢٨
٦/٤٤ فَلَمَّا نَسُوْا ...... هُمْ مُّبْلِسُوْنَ	٢٨
ناجائز ذرائع سے حاصل کردہ دولت کی فراوانی، تباہی کا موجب ہوتی ہے۔	٢٨
جائز ذرائع سے فراوانیٔ رزق باعثِ شادابی۔	٢٩
٦/٤٥ فَقُطِعَ ...... رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ	٢٩
اس طرح ظالمین کی جڑ کٹ جاتی ہے۔	″
اور مظلوم شکر کا کلمہ پڑھتے ہیں۔	″
نظامِ سرمایہ داری کے دلائل کی تردید	٣٠
قارون کی ذہنیت۔	″
٦/٤٦ قُلْ اَرَءَيْتُمْ ... يَصْدِفُوْنَ۔	″
حصولِ رزق کی صلاحیتیں خدا کی عطا کردہ ہیں۔	″
اگر وہ انہیں سلب کر لے، تو کوئی بھی انہیں واپس نہیں دلا سکتا۔	″

مضمون	صفحہ
٦/٤٧ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ ...... الظّٰلِمُوْنَ	٣١
ایسی قومیں تباہ ہوتی ہیں۔	//
٦/٤٨-٤٩ وَمَا نُرْسِلُ ..... يَفْسُقُوْنَ	//
قوموں کی زندگی اور موت سے متعلق خدا کی طرف سے واضح راہنمائی	٣٢
٦/٥٠ قُلْ لَّآ اَقُوْلُ ..... تَتَفَكَّرُوْنَ	//
رسولؐ کا اعلان کہ میرے پاس خزانے نہیں، نہ میں غیب کا علم جانتا ہوں، نہ میں فرشتہ ہوں۔ میں صرف وحی کا اتباع کرتا ہوں اور اس کی طرف تمہیں دعوت دیتا ہوں۔	٣٢
٦/٥١ وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ ..... يَتَّقُوْنَ	٣٣
تنذیر سے وہی لوگ فائدہ اٹھاسکتے ہیں جو غلط اقدامات کے نتائج سے خائف ہوں۔	٣٣
رسولوں کی دعوت پر سب سے پہلے غریب لوگ لبیک کہتے۔ اُمراء کا طبقہ مطالبہ کرتا کہ انہیں جماعت سے نکال دو	٣٣
رسول اس مطالبہ کو ٹھکرا دیتا	٣٣
٦/٥٢ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ ..... الظّٰلِمِيْنَ	٣٤
رسول اللہؐ سے ارشاد کہ ان غریبوں اور کمزوروں کو دھتکار نہ دینا۔ انکا اخلاص بہت بڑی متاع ہے	٣٤

مضمون	صفحہ
جماعت صحابہؓ کی اہمیت	٣٤
٦/٥٣ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا ..... بِالشّٰكِرِيْنَ	٣٥
بڑے لوگوں کی فرعونیت	//
٦/٥٤ وَاِذَا جَآءَكَ ..... غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔	//
بارگاہ نبویؐ میں صحابہؓ کا مقام	//
كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ	٣٦
جہالت سے غلط اقدام اور اس سے توبہ	//
٦/٥٥ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ .... الْمُجْرِمِيْنَ۔	//
قانون غیر مبہم ہونا چاہیئے۔	//
مجرم الگ نظر آجائیں تاکہ کوئی دھوکا نہ کھاسکے۔	٣٧
٦/٥٦ قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ .... مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ	٣٧
قانون کا مدعی دوسروں کے جذبات کے پیچھے نہیں چلتا۔	٣٧
٦/٥٧ قُلْ اِنِّيْ ..... خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ	//
عمل اور اس کے نتیجے کے درمیان وقفہ اسے قانون مہلت کہتے ہیں۔	// //

مضمون	صفحہ
۶/۵۸-۵۹ قُلْ لَّوْ اَنَّ ..... کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ	۳۸
کون سے امورِ غیب سے متعلق ہیں، اور کون سے ایسے جن کا علم انسان کو بھی ہو سکتا ہے	۳۹
۶/۶۰ وَهُوَ الَّذِیْ ...... کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔	۴۰
نیند اور موت میں فرق۔	۴۱
نفس کے معنی شعور۔	″
موت کی صورت میں انسانی شعور کی فعالیت معطل ہو جاتی ہے۔ وہ معدوم نہیں ہوتا۔	″
حیاتِ اُخروی میں اُس کی قوّتِ فعالیت پھر کارفرما ہو جاتی ہے	۴۲
۶/۶۱-۶۲ وَهُوَ الْقَاهِرُ ...... اَسْرَعُ الْحَاسِبِیْنَ	۴۲
اعمال نامہ کی تفصیل۔	۴۳
موت سے صرف جسمِ انسانی مرتا ہے، نفسِ انسانی نہیں مرتا۔	۴۴
۶/۶۳-۶۴ قُلْ مَنْ یُّنَجِّیْکُمْ ...... اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ۔	۴۴
مصیبت کے وقت خدا یاد آتا ہے خوشحالی میں اُسے فراموش کر دیا جاتا ہے	″
۶/۶۵ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ ...... یَفْقَهُوْنَ	۴۵
عذاب (تباہی) کی وجوہات۔	″
کبھی اربابِ اقتدار بگڑ جاتے ہیں، تو ساری قوم بگڑ جاتی ہے	۴۶
کبھی نیچے کا طبقہ تنگ آ کر قانون شکنی پر اُتر آتا ہے، کبھی قوم پارٹیوں میں بٹ جاتی ہے اور خانہ جنگی شروع ہو جاتی ہے	۴۶
۶/۶۶ وَكَذَّبَ بِهٖ ...... بِوَكِیْلٍ۔	۴۶
رسول کا فریضہ صحیح راستہ دکھانا ہے — اُس پر زبردستی چلانا نہیں	۴۷
۶/۶۷ لِكُلِّ نَبَاٍ ...... سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ	″
ہر عمل کا نتیجہ اُس کے وقت پر جا کر نمودار ہوتا ہے۔	″
۶/۶۸-۷۰ وَاِذَا رَاَیْتَ ...... كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ۔	۴۸
قرآنِ کریم کو سنجیدگی سے نہ لینے والوں کی محفل سے اُٹھ آؤ	۴۸
اُن تک قرآن پہنچاتے رہو تاکہ کوئی شخص اس لئے ہلاک نہ ہو جائے کہ سچائی اُس تک پہنچی نہیں تھی۔	۴۹
۶/۷۱-۷۲ قُلْ اَنَدْعُوْا ...... اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ	۵۰

مضمون	صفحہ
خدا کی دعوت کے سوا ہر دعوت گمراہی ہے ہدایت صرف خدا کی دی ہوئی ہدایت ہے۔	۵۰
کتاب اللہ کی اطاعت ہی اسلام ہے۔ یہی اقامت الصلوٰۃ کا مفہوم ہے۔	۵۱
۶ / ۷۳-۷۴ وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ..... هُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ	۵۲
کائنات میں جو کچھ وقوع پذیر ہوتا ہے، خدا کی محکم اسکیموں کے مطابق ہوتا ہے۔	۵۲
نفخ صور کا اجمالی مفہوم۔	//
۶ / ۷۵-۷۶ وَاِذْ قَالَ........ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ	۵۳
حضرت ابراہیمؑ کی داستان جلیلہ۔ پہلے اپنے والد کو تنبیہ	۵۳
نبی کی بشریت۔	//
حقائق کائنات کا مشاہدہ	//
۶ / ۷۷-۷۹ فَلَمَّا جَنَّ......... مِمَّا تُشْرِكُوْنَ۔	۵۴
ستارہ پرستی کے خلاف جہاد اور دلائل محکم۔	۵۴
سائنٹفک طریق استدلال ہی مؤثر ہو سکتا ہے	۵۵
لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ کی حقیقت کی تشریح	۵۵
کائنات کی ہر شے تغیر پذیر ہے، اور تغیر پذیر کو مقام الوہیت حاصل نہیں ہو سکتا۔	۵۶
فنا اور بقا کے معانی۔	//
فنا اور ہلاکت میں فرق۔	//
نفس انسانی نشو و نما پا کر تغیرات سے ماوراء ہو جاتا ہے۔	۵۷
ہمارے مفسرین کی غلط نگہی۔	//
حقیقت نبوت۔	۵۸
حضرت ابراہیمؑ کا انداز بڑا محققانہ اور دلنشین تھا	//
۶ / ۸۰ اِنِّيْ وَجَّهْتُ..... مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ	۵۹
توحید خالص کا مفہوم۔	//
۶ / ۸۱-۸۲ وَحَاجَّهٗ قَوْمُهٗ....... تَعْلَمُوْنَ۔	//
شرک کا لازمی نتیجہ خوف ہے۔	//
توحید سے ہر قسم کا خوف مٹ جاتا ہے اس لئے کہ اقتدار اور حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔	۶۰

مضمون	صفحہ
6/83 اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ..... مُّهْتَدُوْنَ	۶۱
شرک ظلمِ عظیم ہے۔	؍؍
مومن کہلاتے ہوئے بھی مشرک کے مشرک!	۶۲
6/84 وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ ..... حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ	۶۲
مبنی برحقیقت دلائل وعبر سے مدارج بلند ہوجاتے ہیں	۶۲
6/85-89 وَوَهَبْنَا لَهٗ ..... يَعْمَلُوْنَ	۶۲
ذریّتِ ابراہیمؑ اور انبیاء ماسبق۔	؍؍
ان میں سے ہر ایک نبی نہیں تھا۔	؍؍
6/90 اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ ..... بِكٰفِرِيْنَ	۶۴
اُنہیں کتاب وحکم ونبوّت عطا ہوئی تھی۔	؍؍
اُمتوں کو یہ کچھ کیسے حاصل ہوتا ہے؟	؍؍
تمام انبیاء اُمتِ واحدہ کے افراد تھے۔	۶۵
6/91 اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ ..... لِلْعٰلَمِيْنَ	۶۵
دین شروع سے آخر تک ایک ہی رہا ہے	۶۶
اس کے نافذ کرنے کے طریقے بدلتے رہے ہیں۔ یہ شریعت ہوتی ہے جس میں تغیّر ہوتا رہتا ہے	؍؍
مَیں تم سے رسالت کا کوئی اجر نہیں مانگتا	؍؍
ایک اعلانِ عظیم۔	۶۷
اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى کا مفہوم اور بحث	۶۸
اِس کا غلط ترجمہ اور غیر قرآنی مفہوم	؍؍
اِس مفہوم کی تردید قرآنِ کریم کی رُو سے	؍؍
نسل پرستی کے خلاف	؍؍
مَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى کا مفہوم۔	۶۹
غلط مفہوم کی بُنیاد وضعی روایات	۷۱
ان کی تاریخ اور تفصیل	؍؍
ایرانیوں، عباسیوں، سیّدوں کی فضیلت کی روایات	۷۳
درود میں آل کا اضافہ	؍؍
6/92 وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ ..... يَلْعَبُوْنَ	۷۶
خدا کا صحیح تصوّر وہی ہے جس کا تعارف خود اُس نے بذریعہ وحی کرایا ہے	۷۷
6/93 وَهٰذَا كِتٰبٌ ..... يُحَافِظُوْنَ	۷۸
کتاب اللہ مبارک ہے۔	؍؍
برکت کے معنی	؍؍
اِستحکام اور نشو و نما کا امتزاج	؍؍
غیر متبدل اصول اور زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دینے والی جزئیات	؍؍

مضمون	صفحہ
خدا اور آخرت پر ایمان	۷۸
تبلیغ کا دائرہ بتدریج وسیع ہوتا گیا۔	۷۹
[۶/۹۴] وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ ...... تَسْتَكْبِرُوْنَ۔	//
سنگین ترین جرم۔	//
۱۔ مذہبی پیشوائیت ـــ تھیاکریسی کے حامل۔	۸۰
۲۔ ختم نبوّت کے بعد وحی کے مدعی۔ خواہ اس کا نام کشف و الہام رکھ لیا جائے۔	//
۳۔ قرآن کی مثل (مثلہٗ معہٗ۔ روایات) کا عقیدہ۔	۸۰
اِبْغو کے متعلق ضمنی اشارہ۔	//
[۶/۹۵] وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى ...... تَزْعُمُوْنَ	۸۱
فُرَادٰى کا معنیٰ خیز اور حقیقت کشا مفہوم	۸۲
[۶/۹۶-۹۸] اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ ...... لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ	۸۴
موت و حیاتِ نو کے متعلق مثالیں۔	۸۵
سورج اور چاند دونوں حساب و شمار کے لئے ہیں	//
ستاروں سے راہ نمائی	//

مضمون	صفحہ
علومِ سائنس کی اہمیت۔	۸۶
[۶/۹۹] وَهُوَ الَّذِىْٓ اَنْشَاَكُمْ ...... يَّفْقَهُوْنَ۔	//
تخلیقِ انسانی نفسِ واحدہ سے۔	//
مُستقر اور مستودع کا مفہوم	۸۶-۸۷
[۶/۱۰۰] وَهُوَ الَّذِىْٓ اَنْزَلَ ...... يُّؤْمِنُوْنَ	۸۸
اجناس اور پھلوں کی شکل میں سامانِ نشوونما۔	۸۸
کائناتی حقائق میں مومنین کے لئے آیات۔	//
[۶/۱۰۱] وَجَعَلُوْا ...... يَصِفُوْنَ	۸۹
توہم پرستیاں۔	//
[۶/۱۰۲] بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ ...... عَلِيْمٌ	//
خدا کی اولاد کے عقیدہ کا ابطال۔	//
اُس کی بیوی ہی نہیں تو اُس کے ہاں بیٹا کیسے ہو سکتا ہے	۸۹
ایک عظیم دلیل اس حقیقت کی کہ کائنات میں خدا بھی خلافِ فطرت کوئی کام نہیں کرتا۔	۹۰
[۶/۱۰۳-۱۰۴] ذٰلِكُمُ اللّٰهُ ...... الْخَبِيْرُ	۹۰

مضمون	صفحہ
خدا کا ادراک کوئی آنکھ نہیں کر سکتی۔	۹۰
یہ عقیدہ کہ اولیاء اللہ، خدا کے شریکِ محفل ہوتے ہیں، قرآن کے خلاف ہے۔	۹۱
۶/۱۰۵ قَدْ جَآءَكُمْ...... بِحَفِيظٍ۔	۹۱
قرآن بصائر کا مجموعہ ہے، اور علم و بصیرت کی رُو سے سمجھ میں آ سکتا ہے	۹۲
قانونِ مکافاتِ عمل، ہر عمل کا نتیجہ اپنے لیے۔	۹۲
۶/۱۰۶ وَكَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ...... يَعْلَمُونَ	۹۲
تصریفِ آیات سے قرآن فہمی۔	//
درس کے معنی۔	۹۳
قرآنی مفاہیم کی وضاحت خود خدا نے کر دی ہے۔	۹۴
۶/۱۰۷ اِتَّبِعْ مَآ أُوحِيَ...... عَنِ الْمُشْرِكِينَ	۹۴
رسول اللہؐ کو اتباعِ قرآنی کا حکم۔	۹۵
۶/۱۰۸ وَلَوْ شَآءَ اللَّهُ...... بِوَكِيلٍ	//
خدا انسانوں کو مجبوراً صحیح راہ پر چلانا نہیں چاہتا۔	//
۶/۱۰۹ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ...... يَعْمَلُونَ۔	۹۶
لوگوں کے معبودانِ باطل کو بُرا بھلا مت کہو۔ دلائل و براہین سے اُن کی غلط نگہی کی وضاحت کرو۔	۹۷
۶/۱۱۰-۱۱۲ وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ...... يَجْهَلُونَ۔	۹۷
معجزات طلبی اور اُس سے انکار۔	//
ایک دفعہ نہ کہدیا، تو پھر کسی صورت میں ہاں نہیں کہتے (ضد پر اڑے رہنا)	۹۸
۶/۱۱۳-۱۱۴ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا...... مُّقْتَرِفُونَ۔	۹۹
انبیاء کی دعوت کے دشمن۔	۹۹
شیاطین الانس والجن۔	//
یہ ملمع سازی کی باتیں کرتے رہتے ہیں، یعنی افسانوں پر مبنی وعظ۔	۱۰۰
مقصد — جہلا کو اپنے پیچھے لگانا۔	//
۶/۱۱۵ أَفَغَيْرَ اللَّهِ...... مِنَ الْمُمْتَرِينَ۔	۱۰۱
رسول اللہ کا اعلان کہ حکومت صرف کتاب اللہ کی جائز ہے	۱۰۱
یہ کتاب مفصل یعنی نکھار کر بات کرنے والی ہے۔	۱۰۲

مضمون	صفحہ
(٦/۱۱٦) وَتَمَّتْ كَلِمَتُ ...... السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ	۱۰۱
خدا کی کتاب مکمل اور غیر متبدل ہے۔	//
(٦/۱۱۷-۱۱۸) وَاِنْ تُطِعْ ..... بِالْمُهْتَدِيْنَ	۱۰۲
اکثریت کی تائید حق کا معیار نہیں ہو سکتی۔	//
مغربی جمہوریت کی جڑ کاٹ کر رکھ دی	//
نظام جمہوریت کی تاریخ۔	//
نظام جمہوریت خود اہل مغرب کی نگاہوں میں	۱۰۴
دنیا کس طرح قرآن کی طرف آرہی ہے	۱۱۴
(٦/۱۱۹) فَكُلُوْا مِمَّا ..... مُؤْمِنِيْنَ	۱۱۵
ذبح کے وقت اللہ کا نام لینا ضروری ہے	//
جس پر اللہ کا نام نہ لیا جائے وہ حلال نہیں۔	//
(٦/۱۲۰) وَمَا لَكُمْ ...... بِالْمُعْتَدِيْنَ	۱۱٦
حلال چیزوں میں سے وہ کھاؤ جو تمہیں پسند (طیب) ہوں	۱۱۷
(٦/۱۲۱) وَذَرُوْا ظَاهِرَ .... يَقْتَرِفُوْنَ۔	۱۱۷
ممنوع کے ظاہر اور باطن دونوں سے اجتناب لازم ہے	//

مضمون	صفحہ
اہل تصوف کی غلط نگہی — شریعت کے ظاہر احکام کی پابندی ضروری ہے	۱۱۸
ظَاهِرَ الْاِثْمِ اور بَاطِنَهٗ کے معنی	۱۱۹
(٦/۱۲۲) یہ آیت پہلے آچکی ہے۔	//
(٦/۱۲۳) اَوَمَنْ كَانَ ...... يَعْمَلُوْنَ۔	//
موت اور حیات کا قرآنی تصور۔	//
یہ پیغام انہی کے لئے منفعت بخش ہوگا جو زندہ ہوں۔	//
(٦/۱۲۴-۱۲۵) وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا .... يَمْكُرُوْنَ	۱۲۰
نظام ربوبیت کی مخالفت اکابر مجرمین کی طرف سے	۱۲۰
اُن کا مطالبہ کہ اُن کی طرف وحی براہ راست ہونی چاہیئے	۱۲۱
(٦/۱۲٦-۱۲۸) فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ .... كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ	۱۲۲
اسلام کے لئے شرح صدر۔ کفر اور منافقت کے لئے تعصب اور تنگ نظری۔	۱۲۳
اس سے رجس پیدا ہوجاتا ہے۔ شکوک و اضطراب	//

مضمون	صفحہ
٦ / ۱۲۲-۱۲۹ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ ..... غٰفِلُوْنَ	۱۲۳
جنّ و انس کا اجتماع ۔	۱۲۵
اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ کا مفہوم ۔	//
تباہی کی دو شرائط: ہدایت کا پہنچ جانا اور سمجھنے کی صلاحیت	//
٦ / ۱۳۳ وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ ..... يَعْمَلُوْنَ	//
درجات مطابقِ اعمال ۔	۱۲۶
٦ / ۱۳۴-۱۳۵ وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ..... بِمُعْجِزِيْنَ ۔	۱۲۶
قانون استبدال و استخلافِ قومی ۔	//
٦ / ۱۳۶ قُلْ يٰقَوْمِ ..... الظّٰلِمُوْنَ ۔	//
دعاوی کے سچے اور جھوٹے ہونے کا ثبوت ان کے محسوس نتائج ہوتے ہیں ۔	۱۲۷
ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی ۔	۱۲۷
٦ / ۱۳۷-۱۴۱ وَجَعَلُوْا لِلّٰہِ ..... كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ	۱۲۸
توہم پرستیاں ۔ پیروں اور پروہتوں کی کارستانیاں سب "خدا کے نام پر"	۱۲۹
خود ہماری حالت ۔ مُردوں سے متعلق رسومات: نذر و نیاز ۔ عُرس !	۱۲۹
توہم پرست قومیں ان قوموں کا مقابلہ نہیں	

مضمون	صفحہ
کر سکتیں جو عقل و بصیرت سے کام لیں ۔	۱۳۰
٦ / ۱۴۲-۱۴۵ وَهُوَ الَّذِيْٓ .... الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ	۱۳۱
حقوق اللہ اور حقوق العباد کی تفریق غیر قرآنی ہے ۔ حقوق انسانوں پر ایک دوسرے کے ہیں ۔	۱۳۲
حَقَّهٗ کا مفہوم — اسلام کا معاشی نظام	۱۳۲
حرام و حلال کی انسانوں کی مرتب کردہ فہرستیں ۔	۱۳۳
٦ / ۱۴۶ قُلْ لَّآ اَجِدُ ..... غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ	۱۳۴
خدا کی حرام کردہ (چار) اشیاء کی فہرست	//
٦ / ۱۴۷-۱۴۸ وَعَلَى الَّذِيْنَ ..... قَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ	۱۳۵
یہودیوں پر، اُن کے جرائم کی سزا کے طور پر کچھ چیزیں حرام قرار دی گئی تھیں	۱۳۵
ہماری فقہ نے اُمّت پر اتنی چیزوں کو حرام کیوں قرار دے دیا؟	//
٦ / ۱۴۹-۱۵۰ سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ..... اَجْمَعِيْنَ ۔	۱۳۶
"اگر خدا کو منظور نہ ہوتا تو ہم شرک نہ کرتے"	۱۳۶
عقیدۂ تقدیر کی تردید ۔	//

مضمون	صفحہ
۶/۱۵۱ قُلْ هَلُمَّ ...... يَعْدِلُوْنَ -	۱۳۷
سند صرف خدا کی کتاب ہے، فقہا نہیں -	۱۳۸
۶/۱۵۲ قُلْ تَعَالَوْا ..... تَعْقِلُوْنَ -	〃
چند اہم احکام یکجا -	〃
۱- شرک مت کرو- ۲- والدین کے ساتھ حسنِ سلوک	〃
۳- قتلِ اولاد کے خلاف - ۴- بے حیائی کے خلاف - ۵- قتلِ نفس	۱۳۹
جنسی خواہش کی بے باکی کی روک تھام دل کے ارادے سے ہو سکتی ہے	۱۴۰
ہر انسانی جان یکساں واجب الاحترام ہے	〃
لیکن ہماری فقہ کا فیصلہ - عورت کی دیت مرد سے نصف	۱۴۱
۶/۱۵۳ وَلَا تَقْرَبُوْا ..... تَذَكَّرُوْنَ	〃
دیگر احکام	
۱- یتیموں کے مال کی حفاظت ۲- ناپ تول پورا - ۳- عدل کی تاکید - ۴- ایفائے عہد	۱۴۲
خدا وسعت سے زیادہ مکلّف نہیں ٹھہراتا -	〃
۶/۱۵۴ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ .... لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ	۱۴۳
قرآن ہی صراط مستقیم ہے -	۱۴۳
اسی کا اتباع، اتباعِ سنّت رسول اللہ ہے	〃
۶/۱۵۵-۱۵۶ ثُمَّ اٰتَيْنَا ..... لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ	〃
کتابِ موسیٰؑ کے بعد یہ آخری کتاب (قرآن مجید)	۱۴۴
۶/۱۵۷-۱۵۸ اَنْ تَقُوْلُوْا .... كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ	〃
اہلِ عرب کی طرف کتاب تاکہ اتمام حجت ہو جائے	〃
ہم قرآنِ مجید کی عملی تکذیب کرتے ہیں -	۱۴۵
۶/۱۵۹ هَلْ يَنْظُرُوْنَ ...... اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ	۱۴۵
تباہی سامنے آنے پر ایمان، اور ایمان بلا عملِ خیر بے مقصد اور بے معنی ہوتا ہے	۱۴۶
۶/۱۶۰ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا .... يَفْعَلُوْنَ	۱۴۷
دین میں فرقے پیدا کرنے والوں سے رسول اللہ کا کوئی واسطہ نہیں	〃
۶/۱۶۱ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ .... لَا يُظْلَمُوْنَ	۱۴۸
حُسنِ عمل کی جزا دس دس گنا ہے -	〃
جُرم کی سزا اُتنی ہی زیادہ نہیں -	〃

مضمون	صفحہ
فقہ کا شرمناک فیصلہ سزا بالمثل کے متعلق	۱۴۹
[۶/۱۶۲] قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي ..... الْمُشْرِكِينَ	"
مِلّت ابراہیمیؑ کا اتباع۔	"
حَنِيفًا کا مفہوم۔	"
[۶/۱۶۳-۱۶۴] قُلْ إِنَّ صَلَاتِي ...... أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ۔	۱۵۰
سب کچھ خدا کے لئے ہونا اور کرنا۔	"
اسلام اسے کہتے ہیں۔	"
حضورؐ سب سے پہلے مُسلم تھے۔	"
نُسُك کے معنی۔	"
[۶/۱۶۵] قُلْ أَغَيْرَ اللَّهِ ...... تَخْتَلِفُونَ۔	۱۵۱
رب صرف خدا ہے۔	"
قانونِ مکافاتِ عمل۔	"
رب اور حاکم کا باہمی تعلق	"
[۶/۱۶۶] وَهُوَ الَّذِي ...... رَّحِيمٌ	"
خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ۔	۱۵۲
اختیارات سے ذمہ داریوں کی پرکھ مطلوب ہوتی ہے۔	۱۵۲

دوسرا باب
سورۃ الاعراف
آیت ۱ تا ۵۸

مضمون	صفحہ
[۷/۱-۲] آلمص ...... لِلْمُؤْمِنِينَ۔	۱۵۴
لفظ "نزول" کی اہمیت۔	"
یہ وحی کی خصوصیت کا مظہر ہے۔	"
قرآن کس طرح شرحِ صدر (دل کی کشادگی) پیدا کر دیتا ہے۔	۱۵۵
قرآنی انقلاب کی راہ میں مشکلات۔	"
معجزات طلبی۔	۱۵۶
[۷/۳] اتَّبِعُوا ...... تَذَكَّرُونَ	۱۵۷
اتباع اور اطاعت میں فرق۔	۱۵۸
اتباع کا مفہوم۔	"
قرآن کا اتباع ہوگا۔	"
اطاعت کے لئے سمجھنا شرط ہے	"
یعنی کسی زندہ اتھارٹی کے احکام کی اطاعت	"
اتباع کے لیے نفسیاتی تبدیلی کی ضرورت۔	۱۵۹
عہدِ ملوکیت میں نہ اطاعت رہی نہ اتباع	"
دین مذہب میں تبدیل ہوگیا۔	۱۶۰
حضورؐ بھی قرآن کا اتباع کرتے تھے۔	"
اسلاف کے مسلک کا اتباع!	۱۶۱
[۷/۴-۵] وَكَمْ مِنْ قَرْيَةٍ ...... ظَالِمِينَ۔	۱۶۲

مضمون	صفحہ
اقوامِ سابقہ پر تباہیاں ۔	۱۶۲
تباہی کا عبرت آموز نقشہ ۔	۱۶۳
7/6 فَلَنَسْـَٔلَنَّ .... اَلْمُرْسَلِيْنَ	۱۶۴
تباہی سے پہلے دو شرائط کا پورا کرنا ۔	//
اُن تک پیغام پہنچ چکا ہو ۔ اور	//
اُن میں اِس کے سمجھنے کی صلاحیت ہو	//
ختمِ نبوّت کے بعد یہ ذمہ داری جماعتِ مومنین پر عائد ہوتی ہے	//
7/7-9 فَلَنَقُصَّنَّ .... بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ	۱۶۴
اعمال کے ذرہ ذرہ کا وزن ہوگا ۔	۱۶۵
پلڑوں کا بھاری اور ہلکا ہونا ۔	//
سلسلۂ ارتقاء میں یہی اصول کارفرما ہے	//
سوال، معصوم ہونے کا نہیں، تعمیری پلڑے کے بھاری ہونے کا ہے	۱۶۶
مومنین سے کبھی لغزشیں ہو جاتی ہیں ۔	//
امتحانوں میں (PASS-MARKS) کا اصول ۔	۱۶۷
لازمی مضمون میں فیل ہو جانیوالے کے باقی پرچے دیکھے ہی نہیں جاتے	//
توحید اور ایمان بالآخرت لازمی مضامین ہیں ۔	۱۶۸
کفار اپنے اچھے کاموں کا بدلہ اِسی دنیا میں لے لیتے ہیں	۱۶۸
باغی کے تمام اچھے کام ضائع ہو جاتے ہیں ۔	//
ہمارے اعمال کبھی رائیگاں جاتے ہیں ۔	۱۶۹
خُسران سے مراد انسانی ذات کا نقصان ہے	//
7/10 وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ .... تَشْكُرُوْنَ ۔	//
نوعِ انسان کا تمکن فی الارض	۱۷۰
زمین تمام انسانوں کے لئے ذریعۂ معاش ہے ۔	//
7/11-24 آیات کا مفہوم ۔ (تشریح ان آیات کی جلد دوم میں گزر چکی ہے)	۱۷۰ تا ۱۷۴
متاع کا مفہوم ۔	۱۷۵
اس کے اندر قرآن کا پورا معاشی نظام آجاتا ہے ۔	۱۷۵
7/25 قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ .... تُخْرَجُوْنَ	//
اِسی میں مرنے اور جینے کا مفہوم ۔	۱۷۶
7/26-27 يٰبَنِىْٓ اٰدَمَ .... لَا يُؤْمِنُوْنَ	۱۷۶
زیب و زینت کی چیزیں حرام نہیں ۔	۱۷۶

مضمون	صفحہ
لیکن اُن کا استعمال حدودِ خداوندی کے اندر رہتے ہوئے کرنا ہوگا	۱۷۷
الٰہیسی جذبات تحت الشعور میں پنہاں رہتے ہیں	//
۷/۲۸ وَاِذَا فَعَلُوْا ..... تَعْلَمُوْنَ ۔	۱۷۸
غلط کام دو چار نسلوں تک متوارث چلے آئیں، تو ان کی کھٹک باقی نہیں رہتی۔ وہ اسلاف کا مسلک بن جاتے ہیں۔	۱۷۸
"تقدیر" اور تقلید دونوں خلافِ قرآن ہیں	۱۷۸
۷/۲۹ قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ ..... تَعُوْدُوْنَ ۔	//
اِن سے بچنے کا طریق —— احکامِ خداوندی کی اِطاعت۔	۱۷۹
مسجد کے معنی اِطاعت کرنا۔	//
پلٹ کر وہیں چلو جہاں سے غلط راستہ اختیار کیا تھا	//
پھر وہی نتائج پیدا ہوجائیں گے۔	//
۷/۳۰ فَرِیْقًا هَدٰی .... مُّهْتَدُوْنَ	//
دُنیا میں دو ہی گروہ ہیں۔ یہی "دو قومی نظریہ" ہے	۱۸۰
کھلے ہوئے ملحد اور فریب خوردہ مذہب پرست ——	۱۸۰
مذہب پرستوں کی اِصلاح ناممکن نہیں تو سخت مشکل ضرور ہوتی ہے	۱۸۰
۷/۳۱ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ ...... الْمُسْرِفِیْنَ	۱۸۱
زیب و زینت خدا کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔	۱۸۱
اطاعتِ خداوندی زندگی میں حسن پیدا کر دیتی ہے۔	۱۸۲
۷/۳۲ قُلْ مَنْ حَرَّمَ .... لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ	۱۸۳
زیب و زینت کی چیزوں کو کون حرام قرار دے سکتا ہے؟	۱۸۳
آرٹ اور اسلام۔	//
اس زندگی میں بھی حجابات اور اُخروی زندگی میں بھی حرام و حلال کی فقہی فہرستیں خدا کے چیلنج کا جواب	۱۸۴ تا ۱۸۷
۷/۳۳ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ .... لَا تَعْلَمُوْنَ۔	۱۸۸
خدا کی حرام کردہ اشیاء کی فہرست۔	//
فواحش کا مفہوم۔	//
۷/۳۴ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ .... یَسْتَقْدِمُوْنَ۔	۱۸۹

مضمون	صفحہ
قوم کی اجل کا مفہوم۔	۱۹۰
بہائیوں کی غلط نگہی۔	//
قرآن کسی خاص مدت کے لئے نہیں دیا گیا	//
یہ ابدی ضابطۂ خداوندی ہے۔	//
اس کی موجودگی میں کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں۔	//
۷/۳۵-۳۶ یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ ...... خٰلِدُوْنَ	۱۹۱
بنی آدم کے ہاں محفوظ وحی کا رہنا ضروری ہے۔	۱۹۱
۷/۳۷ فَمَنْ اَظْلَمُ .... کَانُوْا کٰفِرِیْنَ۔	//
مفتری علی اللہ اور مکذبین دونوں مجرم۔	۱۹۲
جہنم میں باز پرس	//
۷/۳۸-۳۹ قَالَ ادْخُلُوْا .... کُنْتُمْ تَکْسِبُوْنَ	۱۹۳
جہنم میں قوموں کا مکالمہ	//
سب کو دگنا عذاب	//
۷/۴۰-۴۱ اِنَّ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا .... الظّٰلِمِیْنَ۔	۱۹۴
استکبار — اعلانیہ سرکشی اختیار کرنا۔	۱۹۵

مضمون	صفحہ
تکذیب۔ زبان سے اقرار اور عمل سے تردید۔	۱۹۵
زمین اور آسمان کی برکات کے دروازوں کا کھل جانا۔ یعنی دنیاوی خوشحالیاں اور ہدایتِ خداوندی کا حصول۔	//
۷/۴۲-۴۳ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا .... تَعْمَلُوْنَ	۱۹۶
لَا نُکَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ۔	//
اہلِ جنت کے دلوں سے غل کا دور ہو جانا	۱۹۷
اُن میں کوئی بات ایسی نہ ہوگی جسے ایک دوسرے سے چھپا کر رکھا جائے	//
جنت، اعمالِ انسانی کے عوض۔	//
انتزاعِ غل — ایک عمیق نفسیاتی عمل جس سے تحت الشعور میں پڑی ہوئی گرہیں کھل جاتی ہیں۔	۱۹۷ تا ۱۹۸
۷/۴۴-۴۵ وَنَادٰٓی ..... کٰفِرُوْنَ۔	۱۹۹
اہلِ جنت اور اہلِ جہنم میں مکالمہ۔	۱۹۹
دونوں کے درمیان پردہ۔	۲۰۰
نقاب پوش انسانی درندے	۲۰۱
مذہبی پیشوا، صراطِ مستقیم میں پیچ و خم ڈالنے والے!!	//

مضمون	صفحہ
اَلْعَوَجُ اور اَلْعِوَجُ میں فرق	۲۰۱
ع ۴۶ وَمَا بَيْنَهُمَا حِجَابٌ ...... يَطْمَعُوْنَ۔	//
اہلِ اعراف کا مفہوم۔	۲۰۲
اُمتِ محمدیہ کے رفیع المنزلت افراد۔	//
ع ۴۷ وَإِذَا صُرِفَتْ ...... يَجْحَدُوْنَ۔	۲۰۳
اہلِ اعراف اور دیگر افراد کے مکالمات	۲۰۳-۲۰۴
اپنے دین سے مذاق کرنے والے۔	۲۰۴
دنیاوی زندگی کی کشش کے فریب خوردہ	//
ع ۵۲-۵۳ وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ ...... يَفْتَرُوْنَ	//
اُن تک ہدایت پہنچ چکی تھی۔	۲۰۵
موت کے بعد دنیا میں واپس نہیں آیا جا سکے گا	//
سفارش (شفاعت) کسی کی نہیں چلیگی	//
ع ۵۴ اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ ...... رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ۔	//
خارجی کائنات میں قانون کی کارفرمائی۔	۲۰۶
سائنس کے انکشافات کس طرح قرآنی آیات کی تائید کرتے ہیں۔	۲۰۷

مضمون	صفحہ
پیرس کے ڈاکٹر (MAURICE BUCCAILLE) کی بصیرت افروز تحقیق	۲۰۸
مصنف کا حقیقت کُشا تعارف	۲۰۸
ذوقِ تحقیق کیا کچھ کراتا ہے!	//
قدیم عربی زبان کی تحصیل۔ یہ تحقیق کہ قرآن غیر محرف صحیفہ ہے۔	//
تبویب القرآن۔	۲۰۹
قرآن مجید کے مُروّجہ ترجموں کی کیفیت۔	//
قرآن، لاریب، خدا کی کتاب ہے۔	۲۱۰
ع ۵۵ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ ...... الْمُعْتَدِيْنَ۔	۲۱۲
تضرّع کا مفہوم۔	//
ع ۵۶ وَلَا تُفْسِدُوْا ...... مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ۔	۲۱۳
معاشرہ میں فساد انگیزی، ناہمواریاں پیدا کرنے کی مخالفت۔	//
ع ۵۷ وَهُوَ الَّذِيْ ...... تَذَكَّرُوْنَ۔	//
وحی کی رہنمائی اور انسانی محنت، دونوں کے یکجا ہونے سے ثمرباری ہوتی ہے۔	۲۱۴
ع ۵۸ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ ...... يَشْكُرُوْنَ	۲۱۴

مضمون	صفحہ
قوم کی اجل کا مفہوم ۔	۱۹۰
بہائیوں کی غلط نگہی ۔	”
قرآن کسی خاص مدّت کے لئے نہیں دیا گیا	”
یہ ابدی ضابطۂ خداوندی ہے ۔	”
اِس کی موجودگی میں کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں ۔	”
۷/۳۵-۳۶ یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ ...... خٰلِدُوۡنَ	۱۹۱
بنی آدم کے ہاں محفوظ وحی کا رہنا ضروری ہے ۔	۱۹۱
۷/۳۷ فَمَنۡ اَظۡلَمُ .... کَانُوۡا کٰفِرِیۡنَ ۔	”
مفتری علی اللہ اور مکذبین دونوں مجرم ۔	۱۹۲
جہنم میں باز پُرس	”
۷/۳۸-۳۹ قَالَ ادۡخُلُوۡا .... کُنۡتُمۡ تَکۡسِبُوۡنَ	۱۹۳
جہنم میں قوموں کا مکالمہ	”
سب کو دُگنا عذاب	”
۷/۴۰-۴۱ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا .... الظّٰلِمِیۡنَ ۔	۱۹۴
استکبار — اعلانیہ سرکشی اختیار کرنا ۔	۱۹۵
تکذیب ۔ زبان سے اقرار اور عمل سے تردید ۔	۱۹۵
زمین اور آسمان کی برکات کے دروازوں کا کھُل جانا ۔ یعنی دنیاوی خوشحالیاں اور ہدایتِ خداوندی کا حصول ۔	”
۷/۴۲-۴۳ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا .... تَعۡمَلُوۡنَ	۱۹۶
لَا نُکَلِّفُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَاۤ ۔	”
اہلِ جنّت کے دلوں سے غِل کا دور ہو جانا	۱۹۷
اُن میں کوئی بات ایسی نہ ہوگی جسے ایک دوسرے سے چھپا کر رکھا جائے	”
جنّت، اعمالِ انسانی کے عوض ۔	”
انتزاعِ غِلّ — ایک عمیق نفسیاتی عمل جس سے تحت الشعور میں پڑی ہوئی گرہیں کھُل جاتی ہیں ۔	۱۹۷ تا ۱۹۸
۷/۴۴-۴۵ وَنَادٰۤی ..... کٰفِرُوۡنَ ۔	۱۹۹
اہلِ جنت اور اہلِ جہنم میں مکالمہ ۔	۱۹۹
دونوں کے درمیان پردہ ۔	۲۰۰
نقاب پوش انسانی درندے !!	۲۰۱
مذہبی پیشوا، صراطِ مستقیم میں پیچ و خم ڈالنے والے !!	”

مضمون	صفحہ
تمکنؐ اور عقل وبصیرت دونوں حاصل تھے	۲۵۸
آیات ۷/۷۰-۷۱ کا بقایا حصّہ	۲۵۹
[۷/۷۲] ..... وَقَطَعْنَا ..... مُؤْمِنِيْنَ	۲۶۱
تباہی اور بربادی ۔	//
سعد و نحس کا مفہوم ۔	۲۶۳
قومِ ثمود ــــ حضرت صالحؑ	
[۷/۷۴] وَاذْكُرُوْآ ..... مُفْسِدِيْنَ ۔	
قومِ ثمود کا تعارف ۔	۲۶۵
[۷/۷۳] وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۔	۲۶۶
بعثتِ حضرت صالحؑ ۔	//
ارباب اقتدار کے سرگروہ فساد کی جڑ ہوتے ہیں ۔	۲۶۷
اُن کی اصلاح ہو جائے تو قوم کی اصلاح ہو جاتی ہے	//
پیغامِ اوّلین ــ صرف اللہ کی محکومیت	۲۶۸
[۷/۷۵-۷۶] قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ ..... كٰفِرُوْنَ ۔	
ارباب قوت کی طرف سے مخالفت	۲۶۹
وہی اعتراض کہ ایک انسان کسطرح رسول ہو سکتا ہے ۔	۲۷۱
اسلاف پرستی ۔	۲۷۲
خفیہ سازشیں ۔	۲۷۳
[۷/۷۷] وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ..... الْمُرْسَلِيْنَ	۲۷۵
ناقۂ حضرت صالحؑ ۔	//
خداوندی نظامِ معیشت کا بنیادی نکتہ ۔	//
[۷/۷۳] هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ ..... اَلِيْمٌ	//
اللہ کی اونٹنی ــــ اللہ کی زمین ۔	//
تم پابندیاں لگانے والے کون ہوتے ہو؟	//
معاہدہ کرنے کے بعد خلاف ورزی ۔	۲۷۷
[۷/۷۸] فَاَخَذَتْهُمُ ..... جٰثِمِيْنَ ۔	۲۷۹
لرزہ انگیز عذاب ۔	//
اصحاب الرّس ۔	۲۸۰
[۷/۷۹] فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ ..... النّٰصِحِيْنَ	۲۸۳
حضرت صالحؑ جماعتِ مومنین کو لیکر کسی محفوظ مقام کی طرف نکل گئے تھے	//
کوئی رسولؑ اجرِ رسالت نہیں مانگتا تھا ۔	۲۸۶
ناقۃ اللہ (اللہ کی اونٹنی) کیوں کہا گیا	۲۸۷
اسی طرح کشتیٔ نوحؑ اور کعبہ وغیرہ کو آیات اللہ کہا گیا ہے	۲۸۸
آیات اللہ کی حفاظت نہ کرنے سے تباہی آتی ہے ۔	//
قومِ حضرت لوطؑ	
قومِ لوطؑ کا تعارف ۔	۲۹۰

مضمون	صفحہ
ع ۸۰-۸۱ وَلُوطًا اِذْ قَالَ .... مُّسْرِفُوْنَ	۲۹۱
اُن کا جُرم — اغلام جیسی شرمناک فحاشی	//
علم بصیرت کے باوجود جہالت۔	۲۹۲
رہزنی بھی۔	//
ع ۸۲ وَمَا كَانَ ...... يَتَطَهَّرُوْنَ	۲۹۳
تنذیر اور مخالفت۔	۲۹۴
ظہورِ نتائج کا وقت۔	۲۹۵
خدا کے فرستادہ۔	۲۹۶
ع ۸۴ وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ ..... الْمُجْرِمِيْنَ	۲۹۸
عذاب کی نوعیت۔	//
حضرت لوطؑ کی بیوی اُن کے اہل میں سے نہیں تھی۔	۲۹۹
حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویاں دوسری طرف فرعون کی بیوی	۳۰۰
تورات کی رُو سے حضرت لوطؑ کا (معاذ اللہ) کردار (بیٹیوں کے ساتھ ہمبستری)	۳۰۴
قوم کی عورتیں نبیؑ کی بیٹیاں۔	۳۰۵
حضرت ابراہیمؑ کے مہمان کون تھے؟	۳۰۶
قومِ مدین — حضرت شعیبؑ	
قومِ مدین کا تعارف۔	۳۰۹
ع ۸۵-۸۶ وَاِلٰى مَدْيَنَ ...... الْمُفْسِدِيْنَ۔	۳۱۰-۳۱۲
ع ۸۸-۸۹ قَالَ الْمَلَاُ ...... خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ	۳۱۴-۳۱۵
مُستکبِرین کی طرف سے مخالفت	۳۱۵
ع ۹۰ وَقَالَ الْمَلَاُ ..... لَخٰسِرُوْنَ۔	//
مذہب اور سیاست۔	۳۱۷
صلوٰۃ کا مفہوم۔	//
اسلاف پرستی۔	۳۲۰
سردارانِ قوم کی طرف سے دھمکیاں۔	۳۲۱
جواب: تم اپنی جگہ کام کرو۔ مجھے میرے پروگرام کے مطابق کام کرنے دو۔ نتیجہ خود بتا دے گا کہ کون حق پر ہے	۳۲۲
اعتراض: تم ہمارے ہی جیسے انسان ہو، پھر رسول کس طرح!	۳۲۳
ع ۹۱-۹۲ فَاَخَذَتْهُمُ ..... هُمُ الْخٰسِرِيْنَ	۳۲۴
ظہورِ نتائج کا وقت۔	۳۲۴
ع ۹۳ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ ..... كٰفِرِيْنَ۔	۳۲۵
حضرت شعیبؑ وہاں سے ہجرت کر گئے تھے۔	۳۲۵
ع ۹۴ وَمَآ اَرْسَلْنَا ..... لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ	//

مضمون	صفحہ
یہ کشمکش مسلسل چلی آرہی ہے۔	۳۲۵
۷/۹۵ ثُمَّ بَدَّلْنَا ...... لَا يَشْعُرُوْنَ	//
وہ پھر ویسی روش اختیار کر لیتے ہیں۔	۳۲۶
یہ کچھ محض اتفاقیہ نہیں ہوتا۔	۳۲۷
تقدیر اور سیکولرازم کے غلط نظریات	//
۷/۹۶ وَلَوْ اَنَّ ...... يَكْسِبُوْنَ۔	۳۲۸
اگر وہ قوم قوانینِ خداوندی پہ ایمان لے آئے، تو اس پر زمین اور آسمان کی برکات کے دروازے کھل جاتے ہیں	۳۲۸
دین اور دنیا کا ارتباط۔	//
عشق اور زیرکی کا آمیزہ۔	//
۷/۹۷-۹۹ اَفَاَمِنَ ..... الْخٰسِرُوْنَ۔	۳۲۹
لیکن قومیں ایسا نہیں کرتیں اور تباہ ہو جاتی ہیں۔	//
تباہی اُس وقت آتی ہے جب قوم عقل و فکر سے کام لینا چھوڑ دے	//
۷/۱۰۰ اَوَلَمْ يَهْدِ ...... يَسْمَعُوْنَ۔	۳۳۰
اُن کے جانشینوں کے لئے بھی یہی قانون ہے	//
۷/۱۰۱ تِلْكَ الْقُرٰى ...... قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ۔	//
اقوامِ سابقہ کی داستانیں اِسی مقصد کے لئے دُہرائی جاتی ہیں۔	//

مضمون	صفحہ
دل مانتا ہے لیکن جھوٹی عزت کا خیال اِسے تسلیم نہیں کرنے دیتا	۳۳۱
۷/۱۰۲ وَمَا وَجَدْنَا ...... لَفٰسِقِيْنَ۔	//

چوتھا باب

(آیات ۱۰۴ تا ۱۲۶)

مضمون	صفحہ
حضرت موسیٰؑ کی مدین کی زندگی۔	۳۳۳
تجلی گاہ طُور۔	۳۳۴
وادئ مقدس طویٰ کا مجازی مفہوم	۳۳۵
وحی اور عقل کے تجرباتی طریق میں فرق۔	//
وحی سے منزلیں سمٹ جاتی ہیں۔	//
ایک عظیم انقلاب برپا کرنے کا فریضہ۔	۳۳۶
عصا اور ید بیضا۔	۳۳۸
اس مہم کے سر کرنے کے لئے حضرت موسیٰؑ کی استدعا	۳۴۰
زبان کی گرہ کشائی۔	۳۴۱
تسبیح و ذکر کا انقلابی مفہوم۔	//
ان منازل کا ذکر جن سے گزر کر حضرت موسیٰؑ مقامِ نبوت تک پہنچے	۳۴۲
اِس طرح خدا نے اُنہیں "اپنے ایک کام" کے لئے تیار کیا۔	۳۴۲

مضمون	صفحہ
حضورؐ کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔	۳۴۴
فرعون کی طرف جاؤ تو رویہ نرم رکھنا۔	۳۴۵
مزید ہدایات۔	۳۴۶
خدا کے ساتھ ہونے کا مفہوم۔	۳۴۷
ایرانی گورنر (ہرمزان) اور حضرت عمرؓ کا مکالمہ	″
گزشتہ واقعات کا اعادہ۔	۳۴۸
دربارِ فرعون میں۔	۳۵۵
۷ / ۱۰۴-۱۰۵ وَقَالَ مُوسٰی ...... بَنِیٓ اِسْرَآءِیْلَ	۳۵۶
ایک ہی مطالبہ — بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دے۔	″
فرعون کا استفسار — تمہارا رب کون ہے؟	۳۵۷
اس کا جواب — نہایت مختصر اور جامع۔	″
سوال:- ہمارے اسلاف کس حالت میں ہیں؟	۳۵۸
پیغمبرانہ جواب۔	″
ہمارا اور اسلاف کا تعلق۔	۳۵۹
جواب کی مزید وضاحت۔	۳۶۱
فرعون کا دعوائے ربوبیت۔	۳۶۲
اُس کا ابطال۔	″
استبداد کی دھمکی۔	۳۶۳

مضمون	صفحہ
فرعون بنی اسرائیل کے ساتھ کیا کرتا تھا؟	۳۶۴
ذبح ابناء۔ استحیاءِ نساء۔ پارٹیوں میں تقسیم	″
خدا بنی اسرائیل کو نوازنا چاہتا تھا۔	۳۶۶
یعنی انہیں مملکت اور اقتدار عطا کرنا چاہتا تھا۔	″
خدا کی نوازش اور احسان کا مفہوم۔	″
۷ / ۱۰۶-۱۰۸ قَالَ اِنْ كُنْتَ ...... لِلنّٰظِرِيْنَ۔	۳۶۷
فرعون کا مطالبہ۔	″
عصا۔ اژدہا اور یدِ بیضا کا مفہوم۔	″
۷ / ۱۰۹-۱۱۲ قَالَ الْمَلَاُ ...... سٰحِرٍ عَلِیْمٍ	۳۶۸
فرعون کا پروگرام۔ مذہبی پیشواؤں کے ساتھ مناظرہ۔	۳۶۸
وہی اسلاف پرستی۔	۳۷۰
قوم فرعون کو خدشہ تھا کہ موسیٰؑ انہیں مملکت سے نکال باہر کریگا	۳۷۱
اعتراض:- تم تو ہماری ہی طرح کے انسان ہو، اور تمہاری قوم ہماری محکوم ہے!	۳۷۲
محکوموں کی کوئی بات قابلِ اعتنا نہیں ہوتی۔	″

مضمون	صفحہ
حضرت موسیٰؑ پر احسانات کی یاد دہانی	۳۷۴
جواب: ان احسانات کا بدلہ یہ چاہئے ہو کہ بنی اسرائیل کو اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رکھو۔	۳۷۵
دھمکی۔	۳۷۵
عصا اور ید بیضا کی مزید تشریح۔	۳۷۶
ساحرین کا مفہوم۔	۳۷۷
فرعون تمسخر پر اتر آیا۔	۳۸۱
اپنی قوم میں اپنے اقتدار کا پراپیگنڈا۔	״
یہ ملک اور اس کے ذرائع پیداوار سب میری ملکیت ہیں۔	۳۸۳
ع ۱۱۳-۱۱۴ وَجَآءَ السَّحَرَةُ ..... الْمُقَرَّبِيْنَ	۳۸۵
مذہبی پیشواؤں کا مطالبہ کہ اگر ہم جیت گئے تو ہمیں کیا انعام ملے گا؟	۳۸۵
انعام بھی ملے گا اور بادشاہ کا تقرب بھی حاصل ہوگا۔	״
تورات میں ہامان کا ذکر اور حقیقت۔	״
ع ۱۱۶-۱۱۷ قَالَ اَلْقُوْا ..... مَا يَاْفِكُوْنَ	۳۸۹
مقابلہ۔	״
ع ۱۱۸-۱۲۰ فَوَقَعَ الْحَقُّ ..... سٰجِدِيْنَ۔	۳۹۰
حق کی فتح۔	۳۹۰
ع ۱۲۱-۱۲۲ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ..... وَهٰرُوْنَ	۳۹۱
ساحرین کا ایمان لانا۔	״
ع ۱۲۳-۱۲۴ قَالَ فِرْعَوْنُ ..... اَجْمَعِيْنَ	״
فرعون کی شعلہ باری۔	״
انتہائی سزا کی دھمکی۔	۳۹۲
ساحرین کے کریکٹر کی پختگی۔	۳۹۳
آیات ع ۱۲۵-۱۲۶ کا حوالہ۔	۳۹۴

پانچواں باب

آیات ۱۲۷ تا ۱۵۸

مضمون	صفحہ
ع ۱۲۷ وَقَالَ الْمَلَاُ ..... قَاهِرُوْنَ	۳۹۷
بنی اسرائیل کے خلاف تدابیر	״
اور تشدد۔	۳۹۸
ع ۱۲۸-۱۲۹ قَالَ مُوْسٰى ..... كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ۔	״
حضرت موسیٰؑ کی اپنی قوم کو تلقین۔	״
وراثت ارض کا قانون۔	״
ع ۱۳۷ وَاَوْرَثْنَا ..... بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ	۳۹۹
بنی اسرائیل کو مملکت کا وارث بنا دیا گیا۔	״

مضمون	صفحہ
ع ۱۳۰ وَلَقَدْ اَخَذْنَآ ..... يَذَّكَّرُوْنَ	۳۹۹
قومِ فرعون پر ہلکی ہلکی عقوبات۔	″
ع ۱۳۱-۱۳۳ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ ..... قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ۔	۴۰۰
اُن کی طرف سے ردِّ عمل۔	″
ع ۱۳۴-۱۳۶ وَلَمَّا وَقَعَ ..... غٰفِلِيْنَ	۴۰۱
فرعون کی غرقابی۔	″
ع ۱۳۸-۱۴۰ وَجٰوَزْنَا ..... عَلَى الْعٰلَمِيْنَ	۴۰۲
بنی اسرائیل کا عبورِ دریا۔	″
اور غلامی کی نفسیات کے مظاہرے	
ع ۱۴۸-۱۵۱ وَاتَّخَذَ قَوْمُ ..... اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ	۴۰۳
گوسالہ پرستی۔	۴۰۳
تفرقہ، شرک سے بھی بدتر۔	۴۰۴
ع ۱۴۹ وَلَمَّا سُقِطَ ..... خٰسِرِيْنَ	″
قوم کی ندامت۔	″
ع ۱۵۲-۱۵۳ اِنَّ الَّذِيْنَ ..... رَّحِيْمٌ	۴۰۵
گوسالہ پرستی کا نتیجہ۔	۴۰۵
ع ۱۵۵ وَاخْتَارَ مُوْسٰى ..... خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ	″
قوم کی طرف سے خدا کو بے نقاب دیکھنے کا مطالبہ اور جواب	۴۰۶

مضمون	صفحہ
ع ۱۵۶ وَاكْتُبْ لَنَا ..... يُؤْمِنُوْنَ۔	۴۰۶
حضرت موسیٰؑ کی خدا سے درخواست۔	″
دنیا اور آخرت کی حسنات۔	″
رحمتِ خداوندی کی وسعتِ بے پایاں۔	″
ع ۱۵۷ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ ..... الْمُفْلِحُوْنَ۔	۴۰۸
یہ حسنات اور رحمت، اِتباعِ محمد الرسول اللہؐ سے حاصل ہونگی	۴۰۸
بعثتِ نبی اکرمؐ کا مقصود و منتہیٰ نوعِ انسانی کی آزادی۔	۴۰۸
کتبِ سابقہ میں حضورؐ کی آمد کی پیشگوئیاں	۴۱۰
ع ۱۵۸ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ..... تَهْتَدُوْنَ	۴۱۳
تمام نوعِ انسان کی طرف رسول۔	″
ہدایت مشروط ہے اتباعِ نبی اکرمؐ کے ساتھ خدا کا آخری رسولؐ۔	″
ع ۱۴۲-۱۴۳ وَوٰعَدْنَا ..... اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ	۴۱۴
حضرت موسیٰؑ کی دیدارِ خداوندی کی آرزو۔	۴۱۴
اِس کا جواب — یہ ناممکن ہے۔	″
انسانی ذات بھی محسوس اور مرئی نہیں چہ جائیکہ خدا کی ذات	۴۱۵

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
خدا اور انسان کا باہمی تعلق ۔	۴۱۶	الواح حضرت موسیٰؑ	۴۱۸
نبیؐ کی بشری حیثیت ۔	۴۱۷	۷/۱۴۶-۱۴۷ سَاَصْرِفُ ...... كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ	۴۱۸
۷/۱۴۴ قَالَ یٰمُوْسٰی ...... الشّٰكِرِیْنَ ۔	"	اس آیت کا عام اور صحیح مفہوم ۔	۴۱۹
اصطفاء اور اجتباء ۔	"	استکبار (اقتدار) بغیر الحق حرام ہے	۴۲۰
۷/۱۴۵ وَكَتَبْنَا لَهٗ فِی الْاَلْوَاحِ ..... دَارَ الْفٰسِقِیْنَ	۴۱۸	اندلس ۔	۴۲۱

منزل و مقصودِ قرآں دیگر است   رسم و آئینِ مسلماں دیگر است

بندۂ مومن ز قرآں برنخورد   در ایاغِ او، نہ مے دیدم نہ دُرد

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست   خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

تا نہالِ سلطنت قوت گرفت   دینِ او نقش از ملوکیت گرفت

از ملوکیت نگہ گردد دگر

عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر

(اقبالؒ ۔ جاوید نامہ ص۸۵)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش گفتار

مطالب الفرقان کی پہلی جلد اکتوبر ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ دوسری جلد اکتوبر ۱۹۷۶ء میں تیسری نومبر ۱۹۷۹ء میں، اور چوتھی نومبر ۱۹۸۱ء میں۔ اب اس کی پانچویں جلد پیش خدمت ہے۔ اس میں سورۃ الانعام (مکمل) اور سورۃ الاعراف کی (۱۔ تا۔ ۱۵۸) آیات آگئی ہیں۔ ان کے مضامین اور موضوعات کا اندازہ فہرست سے لگ سکے گا۔ تصریف آیات کی رو سے جو تفسیر مرتب ہو گی اس میں کیفیت یہ ہو گی کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے، اکثر و بیشتر وہ مضامین سامنے آئیں گے جن کی تشریح سابقہ جلدوں میں کی جا چکی ہے۔ ان موضوعات کی مکرر تشریح کی ضرورت نہیں ہوتی ان کا حوالہ دے دینا کافی ہوتا ہے۔ زیر نظر جلد میں اس قسم کے موضوعات بکثرت سامنے آئیں گے، بالخصوص داستان بنی اسرائیل اور کوائف حضرت موسیٰؑ کے ضمن میں۔ ان مقامات پر تشریحات کا اعادہ نہیں کیا گیا۔ حوالوں پر اکتفا کیا گیا ہے۔

فکر قرآنی کے سلسلہ میں پرویز صاحب کا مسلک حَنِیۡفًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ (۶/۷۹) کا ہے یعنی ہر طرف سے کٹ کر قرآن خالص کی فکر و تعلیم پیش کرنا۔ انہوں نے یہ آواز قریب پچاس سال پہلے بلند کی تھی اور قریب چالیس سال سے وہ اسے مسلسل پیش کرتے چلے آرہے ہیں۔ شروع شروع میں اس کی مخالفت ہوئی لیکن جوں جوں قرآنی حقائق زیادہ نمایاں ہوتے جارہے ہیں، اس مخالفت کے بادل بھی چھٹتے جارہے ہیں اور نگۂ امید دیکھ رہی ہے کہ آخر الامر یہی انداز فکر غالب آئے گا۔ جس وقت امت نے یہ مسلک اپنا لیا، دین کے دروازے اس پر وا ہو جائیں گے۔ پرویز صاحب کی فکری کاوش اس باب میں بڑی حد تک ممد و معاون ثابت ہو گی۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز کرے اور انہیں توفیق عطا فرمائے کہ وہ اپنے مشن کی تکمیل کر سکیں۔

اس جلد کی کاپیوں کی تصحیح بڑی دیدہ ریزی سے کی گئی ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی غلطی نظر پڑے تو براہ کرم اس سے ہمیں مطلع فرما دیا جائے۔ اس فکر کی نشر و اشاعت میں ہم احباب کے ہر قسم کے تعاون کے محتاج ہیں۔

آیات کا حوالہ اس جلد میں بھی حسب سابق ہے۔ یعنی متن کتاب میں (اوپر سورۃ کا نمبر / نیچے آیت کا نمبر)۔ انڈکس میں الٹے حوالے دیا گیا ہے۔ (۶/۱۷) چھٹی سورۃ کی سترھویں آیت۔ والسلام۔

گلبرگ۔ نومبر ۱۹۸۲ء

ناظم ادارہ طلوع اسلام

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

مطالبُ الفرقان

جلد پنجم

◉

آغاز سورۃ الانعام (سورۃ ۶)

پہلا باب

تیشۂ براہیمیؑ

۱ ـــــــ سنت اللہ اور کلمات اللہ

۲ ـــــــ انسان کے صاحب اختیار اور خدا کے صاحب اختیار ہونے میں فرق

۳ ـــــــ نظام اسلامی کی بنیادی خصوصیت ـــــــ ربوبیت

۴ ـــــــ ختم نبوّت کی محکم دلیل

۵ ـــــــ معجزات طلبی اور اس کا انکار

۶ ـــــــ نظام سرمایہ داری کا استیصال

۷ ـــــــ نیند اور موت میں فرق ـــــــ نفس غیر شعوریہ

۸ ـــــــ اعمال نامہ جو گردن میں معلّق رہتا ہے

۹ ـــــــ حضرت ابراہیمؑ کی داستانِ جلیلہ

۱۰ ـــــــ مؤدۃ فی القربیٰ کا صحیح مفہوم

۱۱ ـــــــ خدا کے ہاں "ذادی جانے" کا مفہوم

۱۲ ـــــــ خدا کا ادراک آنکھوں سے نہیں ہو سکتا

اہلِ تصوّف کا پیدا کردہ الجھاؤ۔

۱۳ ـــــــ اقوام کی موت وحیات کا قرآنی مفہوم

۱۴ ـــــــ حرام وحلال کی بابت خدا کا فیصلہ

ذبیحہ پر خدا کا نام لینا۔

۱۵ ـــــــ "اگر خدا چاہتا تو ہم ایسا نہ کرتے" ـــــــ اس عقیدہ کی تردید

پہلا باب

سُوْرَۃُ الْاَنْعَام ـــ (۶)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۶/۱ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ
وَالنُّوْرَ۬ ؕ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ ۝

کائنات کا گوشہ گوشہ اپنے پیدا کرنے والے کی حمد و ستائش کا زندہ پیکر ہے (۶/۱) اس میں ظلمت اور نور ۔تاریکی اور اجالے کی نمود بھی اُسی کے قانون کے مطابق ہوتی ہے (یہ نہیں کہ، جیسا کہ مجوسیوں کا عقیدہ ہے "تاریکی کا خدا' اہرمن ہے اور روشنی کا خدا' یزداں ہے)۔ یہ ان لوگوں کی غلط نگہی ہے جو توحید کا انکار کر کے خدا کے ساتھ اوروں کو بھی برابر کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

قرآنِ مجید (سورہ فاتحہ) کا پہلا لفظ حمد ہے جس کا مفہوم مطالب الفرقان جلد اوّل (ص۳) میں بتایا گیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ کسی نہایت حسین، متناسب، نادر شاہکار کو دیکھ کر انسان کے دل میں جو جذباتِ تحسین بے ساختہ بیدار ہوں ان کے والہانہ اظہار کو عربوں کے ہاں حمد' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے شرطِ اوّل یہ ہے کہ جس شاہکار کی ستائش کی جا رہی ہو وہ ایک خارجی حقیقت اور محسوس شئے ہونی چاہیئے۔ وہاں (سورہ فاتحہ میں) خدا کی ربوبیتِ عالمینی کو وجۂ حمد قرار دیا گیا تھا۔ یہاں تخلیقِ ارض و سمٰوات کو سامنے لایا گیا ہے۔ ارض و سماء (کائنات) خدا کا کس قدر عظیم تخلیقی شاہکار ہے اس کے متعلق انڈکس میں ارض و سمٰوات۔ تخلیق۔ علماء۔ کائنات وغیرہ کے عنوانات نیز جلد چہارم میں آیات (۳/۹۰-۱۸۹) کے تحت دیکھئے۔

ظلمت اور نور (تاریکی اور روشنی) کے متعلق مطالب جلد اوّل ص۲۶۱ اور جلد سوم ص۴۵۲ میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے، جہاں بتایا گیا ہے کہ ایک "تاریکی اور روشنی" خارجی کائنات کی ہے۔ اور دوسری انسانی دُنیا کی۔ انسانی

دُنیا میں باطل تصوّرات اور نظریاتِ حیات کو تاریکی سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ اُن سے زندگی کی صحیح راہیں روشن نہیں ہوتیں اور وحی کے عطا کردہ نظریات کو نور کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہاں کہا گیا ہے کہ "جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ" (خدا نے تاریکی اور روشنی کو بنایا)۔ جہاں تک خارجی کائنات میں تاریکی اور روشنی کا تعلق ہے، اس کی بابت کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ خدا کے متعین کردہ طبیعی قوانین (تکویر شمس و قمر اور گردش لیل و نہار) کے مطابق رونما ہوتی ہیں۔ لہٰذا جَعَلَ (اُس نے بنایا) سے مراد ہے اُس کے قوانین کی رو سے ظہور پذیر ہونے والے تغیرات۔ جہاں تک انسانی دنیا کا تعلق ہے خدا کی نازل کردہ (وحی) نور ہے۔ جو شخص اس نور سے استفادہ نہیں کرتا وہ تاریکی میں رہتا ہے، اسی طرح جیسے سورج اپنی روشنی کو عام کرتا ہے۔ لیکن جو شخص اپنی آنکھیں بند کر لے اُس پر تاریکی چھا جاتی ہے۔ انسانی دنیا میں بھی نور اور ظلمت خدا کے قانون کی رو سے رونما ہوتے ہیں۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ خارجی کائنات ہو یا انسانی دُنیا، جو کچھ خدا کے قانون کی رو سے واقع ہو اُسے خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ خواہ وہ (انسانی دنیا میں) کسی کے ہاتھوں سرانجام پائے۔ تفصیل اس نکتہ کی مطالب جلد اوّل (ص۱۸۴) میں ملے گی۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ انسانی دنیا سے متعلق امور میں جب (قرآن مجید میں) یہ کہا جائے کہ خدا نے ایسا کیا تو اس سے مراد یہ ہوگی کہ خدا کے قانون کی رو سے ایسا ہوا، خواہ اس کا کرنے والا کوئی ہو۔

نور و ظلمت

نور و ظلمت کے مذکورہ بالا مفہوم سے مجوسیوں (پارسیوں) کے اس عقیدہ کی بھی تردید ہو گئی کہ اہرمن (تاریکی یعنی شیطان) اور یزداں (روشنی یعنی خدا) دو مستقل بالذّات قوتیں آپس میں نبرد آزما ہیں۔ نیز خیر و شر کا مسئلہ بھی حل ہو گیا جس نے دانشوران عالم کو خواہ مخواہ پریشان کر رکھا ہے (دیکھئے انڈکس میں "خیر و شر")

تخلیق ارض و سمٰوات (خارجی کائنات) کی طرح انسانی تخلیق بھی خدا کا شاہکار ہے۔ اگلی آیت میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ

۶/۲ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ قَضٰٓى اَجَلًا ؕ وَ اَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ۝

تاریکی اور روشنی تو پھر بھی کرّوں کی گردش کا نتیجہ ہے۔ خدا تو وہ ہے جس نے تمہاری تخلیق کی ابتدا بے جان مادہ سے کی اور پھر (تمہاری طبیعی زندگی کے لئے) ایک میعاد ٹھہرا دی۔ افراد کی موت و حیات کے علاوہ، اقوام کی موت و حیات کے لئے بھی ایک میعاد ہوتی ہے۔ یہ میعاد قانونِ خداوندی کے مطابق متعیّن

ہوتی ہے[1]۔ لیکن اس کے باوجود تم اِس باب میں خواہ مخواہ جھگڑے پیدا کر رہے ہو۔

قانونِ موت وحیات | تخلیق انسان کے متعلق مطالب الفرقان۔ جلد دوم کے ابتدائی باب میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ موت وحیات سے متعلق بحث کے لئے انڈکس دیکھئے اور اس سوال کے جواب کے لئے کہ "کیا موت کا وقت مقرر ہے یا عمر گھٹ بڑھ سکتی ہے؟" **جلد چہارم۔ صفحات ۲۵۳-۲۵۲ ملاحظہ کیجئے**

(طبیعی دنیا میں (خواہ وہ خارجی کائنات ہو، خواہ خود انسان کی طبیعی زندگی) قوانینِ خداوندی کے تذکرہ کے بعد اس حقیقت کو اُجاگر کیا کہ انسان کی "انسانی زندگی" میں بھی اُسی کے قوانین کارفرما ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ جو قوم ان قوانین کے تابع زندگی بسر کرے گی اُس کی زندگی کی راہیں روشن ہوں گی۔ جو ان سے آنکھیں بند کرے گی، اُس پر تاریکی چھا جائیگی۔

۶/۳ وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ ۖ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ۝

لہٰذا تم یہ نہ سمجھو کہ خدا کا قانون، خارجی کائنات تک ہی محدود ہے۔ انسانوں کی زندگی اُس کے دائرۂ اثر و نفوذ سے باہر ہے (۲۹/۶۳-۶۱)۔ کائنات میں بھی اُسی کا قانون نافذ العمل ہے اور تمہاری تمدنی اور معاشی زندگی میں بھی اُسی کا قانون۔ (۲۱/۲۲-۲۱ ، ۴۳/۸۴)۔ وہ تمہاری اُن باتوں سے بھی واقف ہے جو اُبھر کر سامنے آتی ہیں اور اُن سے بھی جو چھپی رہتی ہیں۔ (وہ تمہاری مضمر اور مشہود، دونوں صلاحیتوں کو جانتا ہے) اور جو کچھ تم کرتے ہو اُس سے باخبر ہے۔

ارض وسماء میں الٰہ | اللہ تعالیٰ کے الٰہ الارض اور الٰہ السماء ہونے کے متعلق مطالب الفرقان جلد اوّل (صفحہ ۳) میں تفصیلی بحث کی جا چکی ہے۔ آیت زیرِ نظر کے آخری الفاظ سے مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ انسان کوئی سا نظامِ حیات اختیار کرلے، اُس کے نتائج (اُس کی اپنی مرضی کے مطابق نہیں بلکہ) قوانینِ خداوندی کے مطابق

---

[1] افراد کی مدتِ حیات خدا کے طبیعی قوانین کے مطابق ہوتی ہے (۳/۱۴۴ ، ۵۶/۶۰)۔ اور انہی کے مطابق عمر گھٹ بڑھ سکتی ہے (۳۵/۱۱)۔ اسی طرح قوموں کی موت وحیات کے لئے بھی قانون مقرر ہے۔ (مدت پہلے سے مقرر نہیں۔ قانون مقرر ہے) جس کے مطابق وہ قوم اپنی زندگی کی مدت خود مقرر کرتی ہے (۱۰/۴۹ ، ۱۳/۳۸ ، ۷/۳۴)۔ جب اس قانون کے مطابق کسی قوم کی زندگی کے دن ختم ہو جاتے ہیں تو اُسے اس سے مفر نہیں ہو سکتا۔ (۷/۳۴)

برآمد ہوں گے۔ جب حقیقت یہ ہے تو پھر قوانینِ خداوندی سے اعراض برتنا انسان کی غلط نگہی اور گمراہی ہے۔

۶/۴ وَمَا تَأْتِيهِم مِّنْ آيَةٍ مِّنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ۝

لیکن اس کے باوجود، لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ (خدا کے کائناتی قوانین یعنی قوانینِ فطرت کے تو اس درجہ قائل ہیں کہ ان پر علوم سائنس کی اتنی عظیم عمارت قائم کر رکھی ہے لیکن) جب اسی خدا کی طرف سے، (ان کی تمدنی اور معاشی زندگی سے متعلق) کوئی قانون سامنے آتا ہے تو اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔

اس کے بعد قرآن مجید اپنے انداز کے مطابق سب سے پہلے اپنی اولیں مخاطب قوم کو، ان کی غلط روی کے انجام سے متنبہ کرتا ہے اور اپنے دعویٰ کی شہادت میں اقوامِ گزشتہ کے انجام کو سامنے لاتا ہے۔ ارشاد ہے:۔

۶/۵-۶ فَقَدْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ ۖ فَسَوْفَ يَأْتِيهِمْ أَنبَاءُ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۝ أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَبْلِهِم مِّن قَرْنٍ مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّن لَّكُمْ وَأَرْسَلْنَا السَّمَاءَ عَلَيْهِم مِّدْرَارًا وَجَعَلْنَا الْأَنْهَارَ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمْ فَأَهْلَكْنَاهُم بِذُنُوبِهِمْ وَأَنشَأْنَا مِن بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ ۝

یہی کیفیت ان مخاطبین کی ہے۔ جب خدا کا وہ ضابطۂ قوانین جو ٹھوس حقائق اپنے اندر رکھتا ہے، ان کی طرف آیا تو انہوں نے اسے جھٹلا دیا اور جس انقلاب کا اس میں ذکر کیا گیا ہے اس کی ہنسی اڑانے لگے۔ لیکن کیا اس سے وہ انقلاب رک جائے گا؟ وہ تو آ کر رہے گا!

یہ اپنی قوت اور دولت کے نشے میں بدمست ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کا نظامِ زندگی جس سے انہیں اس قدر خوش حالی اور فراوانی حاصل ہے انہیں کبھی تباہی کی طرف نہیں لے جا سکتا۔ لیکن کیا انہوں نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ ان سے پہلے کتنی قومیں تباہ ہو چکی ہیں جنہیں اس قدر ثروت اور سطوت حاصل تھی۔ جو انہیں بھی حاصل نہیں۔ ان پر رزق کی فراوانیوں کی بارش ہوتی تھی، اور معاشی خوش حالیوں کی نہریں بہتی تھیں۔ لیکن وہ اپنے غلط نظامِ زندگی کی وجہ سے (جس میں عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود کے بجائے، محدود مفاد پرستی کو پیشِ نظر رکھا گیا تھا) تباہ اور برباد ہو گئیں۔ اور ان کی جگہ دوسری قوموں نے لے لی۔

قوموں کے عروج و زوال ان کے استبدال و استخلاف اور موت و حیات سے متعلق قوانین کے لئے انڈکس

دیکھئے۔ یہاں اتنا اضافہ کافی ہوگا کہ قرآنِ کریم نے دولت (معیشت) کی فراوانی کو بھی قوموں کی تباہی کا موجب بتایا ہے جب اسے تخریبی امور کے لئے صرف کیا جائے (۲۸/۵۸)۔ قرآن مجید کی اوّلین مخاطب قوم (قریش) کو بھی اسی قسم کی معاش کی فراوانی حاصل تھی (۱۰۶/۴) جس کے نشے میں مست ہوکر وہ عقل و بصیرت پر مبنی کسی بات کے سننے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتے تھے چنانچہ جب انہیں اس طرف متوجہ کیا جاتا تو مطالبہ کرتے کہ رسول اللہؐ انہیں کوئی معجزہ دکھائیں۔ کہا کہ یہ بھی ان کی کٹ حجتی ہے یہ صحیح روشِ زندگی سے اس لئے انکار نہیں کرتے کہ بات اُن کی سمجھ میں نہیں آتی اور اس لئے معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں۔ بات اُن کی سمجھ میں تو آتی ہے لیکن چونکہ اس سے اُن کے مفادات پر زد پڑتی ہے اس لئے اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ مخالفت تو اس لئے کرتے ہیں لیکن باتیں اور بناتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اگر کوئی لکھی لکھائی کتاب آسمان سے نازل ہو تو ہم پھر اس پر ایمان لائیں گے۔ (۱۷/۹۳) فرمایا

۶/۷ وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِي قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ لَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝

ہم نے، اپنے نظام کے حق اور ان کے نظام کے باطل ہونے کے ثبوت میں خارجی کائنات، انسانی تخلیق اور تاریخی شواہد سے ایسے واضح دلائل پیش کر دیئے ہیں کہ ان کے بعد کسی صاحبِ عقل و بصیرت کو اس سے مجالِ انکار نہیں ہو سکتی۔ لیکن ان کا مطالبہ یہ ہے کہ ہم دلائل و براہین کو نہیں جانتے۔ ہمیں کوئی معجزہ دکھاؤ، تب ہم مانیں گے۔ لیکن یہ بھی ان کی محض کٹ حجتی ہے۔ اگر ہم ایسا کرتے کہ تم پر کوئی لکھی لکھائی کتاب آسمان سے نازل کر دیتے جسے یہ لوگ اپنے ہاتھوں سے چھو کر دیکھ لیتے کہ وہ سچ مچ کی کتاب ہے تو جنہوں نے نہیں ماننا وہ اس پر بھی کہہ دیتے کہ یہ کھلا ہوا فریب ہے۔

معجزات طلبی اور اس سے انکار

معجزات طلبی اور اس سے انکار کے متعلق، مطالب الفرقان جلد اوّل (ص ۳۰۹) اور جلد سوم (ص ۲۳) پر بحث ہو چکی ہے۔

پھر فرمایا:-

۶/۸-۹ وَقَالُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۖ وَلَوْ أَنزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْأَمْرُ ثُمَّ لَا يُنظَرُونَ ۝ وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِم مَّا يَلْبِسُونَ ۝

یہ کہتے ہیں کہ اس رسولؐ پر کوئی ایسا فرشتہ کیوں نہیں نازل ہوتا (جسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں)۔ ان سے

کہو کہ فرشتے اُس وقت آیا کرتے ہیں جب قوموں کی تباہی کا وقت آجاتا ہے۔ اُس وقت ان کے معاملہ کا دو ٹوک فیصلہ ہوجایا کرتا ہے اور کسی کو اس کی مہلت نہیں دی جاتی کہ وہ اپنی روش میں تبدیلی کر کے اُس تباہی سے بچ جائے۔

باقی رہا ان کی طرف پیغام رسانی کا معاملہ 'سو' اِس مقصد کے لئے اگر ہم (بالفرض محال) کوئی ایسا فرشتہ بھی بھیجتے جو اُنہیں نظر آسکتا تو وہ بھی اُن کے سامنے انسانی شکل ہی میں آتا۔ اُس صورت میں یہ پھر اُنہی شبہات میں مبتلا رہتے جن میں اب ہیں۔

سورہ بنی اسرائیل میں اس حقیقت کو ایک اور انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا:-

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۝ (۱۷ ؍ ۹۵-۹۴)

(ہم جانتے ہیں کہ جب تو اُن سے کہے گا کہ میں تمہارے جیسا ایک انسان ہوں اور میرا فریضہ یہ ہے کہ میں خدا کا پیغام تم تک پہنچا دوں، تو یہ تم پر ایمان نہیں لائیں گے۔ اس لئے کہ ذہن انسانی کے طفلانہ پن نے اسے ہمیشہ مغالطہ میں رکھا ہے کہ خدا کے رسولؐ کو، انسانوں سے الگ کوئی اعجوبہ سی مخلوق ہونا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ) جب کبھی لوگوں کے پاس ہماری راہنمائی آئی تو ان کے' اس راہ نمائی کے قبول کرنے کے راستے میں ہمیشہ یہ بات حائل رہی کہ ہدایت لانے والا دوسرے انسانوں جیسا انسان کیوں ہے۔ (فرشتہ کیوں نہیں!)

ان سے کہو کہ (انسانوں کو رسول بنا کر اس لئے بھیجا جاتا ہے کہ دُنیا میں انسان بستے ہیں) اگر ایسا ہوتا کہ زمین میں فرشتے چلتے پھرتے اور سکونت پذیر ہوتے تو ہم اُن کے لئے آسمان سے فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتے (۱۷ ؍ ۹۴)

اِس میں ایک عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ رسول کا فریضہ یہی نہیں ہوتا کہ وہ منزل من اللہ، وحی کو لوگوں تک پہنچا دے۔ اُس کا فریضہ یہ بھی تھا کہ وہ اس وحی کے مطابق نظام معاشرہ قائم کر کے دکھا دے۔ رسُول کا یہی کارنامہ

رسول کا فریضہ

دوسروں کے لئے اسوہ (نمونہ) کا کام دیتا تھا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ رسول کی زندگی دوسروں کے لئے نمونہ اسی صورت میں بن سکتی تھی جب رسول بھی انہی جیسا انسان ہوتا۔ یعنی وہ سمجھ لیتے کہ جب ایک انسان اس قسم کا نظام قائم کر سکتا ہے تو دوسرے انسان کیوں نہیں ایسا کر سکتے۔ اگر زمین پر بسنے والے انسانوں کی طرف کوئی فرشتہ (فوق البشر ہستی) رسول بن کر آتا اور یہ کچھ کر کے دکھاتا تو اُس کا یہ کارنامہ انسانوں کے لئے نمونہ کا کام دے ہی نہ سکتا۔

وہ کہہ دیتے (اور ایسا کہنے میں حق بجانب ہوتے) کہ وہ تو فرشتہ تھا جس نے ایسا کر دکھایا ہم تو فرشتے نہیں۔ ہم سے ایسا کچھ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ تھی وہ حکمت جس کے مطابق انسانوں کی طرف ایک انسان ہی رسول بنا کر بھیجا جاتا تھا۔

لیکن ہم نے اس حکمتِ خداوندی کو ختم کرکے رکھ دیا جب یہ عقیدہ قائم کر لیا کہ رسول اللہؐ نے جو کچھ کیا وہ خدا کی طرف سے معجزہ تھا۔ اور اس کے بعد اس خود فریبی میں مبتلا ہو کر بیٹھ گئے کہ رسول اللہؐ نے تو ایسا کچھ معجزات کی رو سے کر دکھایا تھا۔ ہم ایسا کس طرح کر سکتے ہیں، ہمیں تو خدا کی طرف سے معجزات نہیں ملتے؟

انسان اپنی بے عملی کے جواز کے لئے کس کس قسم کے بہانے تراش لیتا ہے؟ قرآن نے اس قسم کی بہانہ تراشیوں اور کٹ حجتیوں کو استہزاء سے تعبیر کیا ہے۔ فرمایا:

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ○ ۶/۱۰

حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اس اہم معاملہ کو سنجیدگی سے (SERIOUSLY) لیتے ہی نہیں۔ یونہی ہنسی مذاق سمجھ رہے ہیں۔ یہ کچھ (اے رسولؐ!) تمہارے ساتھ ہی نہیں ہو رہا۔ تم سے پہلے بھی جس قدر رسول آئے اُن کا اسی طرح مذاق اُڑایا گیا۔ جب اُنہوں نے اقتدار پرستوں اور مفاد طلبوں سے کہا کہ تمہارا غلط نظامِ زندگی تمہیں تباہی کی طرف لئے جا رہا ہے تو اُنہوں نے اُن کی ہنسی اُڑائی۔ لیکن ان ہنسی اُڑانے والوں کو اُس تباہی نے آگھیرا جس کی وہ ہنسی اُڑایا کرتے تھے۔

اس کے جواب میں اتنا کہہ دینا کافی سمجھا کہ

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ ثُمَّ انظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ○ ۶/۱۱

ان سے کہو کہ جاؤ! زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ ان قوموں کا کیا حشر ہوا جنہوں نے قانونِ خداوندی کو جھٹلایا تھا؟

اس کے بعد کہا کہ تم ان تاریخی شواہد سے ہٹ کر خود نظامِ کائنات پر غور کرو اور دیکھو کہ وہاں کس کا قانون اور اقتدار کارفرما ہے۔ اس کے جواب میں یہ لوگ بلا تامل کہہ دیں گے کہ یہ اقتدار کسی انسان کا نہیں۔ خدا کا ہے (اس نقطہ کی وضاحت اپنے مقام پر کی جائے گی۔ سرِ دست آپ یہ حوالے دیکھ لیجئے (۲۳/۸۴-۸۵)، (۲۹/۶۱-۶۳)، (۳۱/۲۵)، (۴۳/۹)، (۴۳/۸۷)

لیکن آیۂ زیرِ نظر میں جس حقیقت پر زیادہ زور دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ خدا کے اس اقتدار کا مقصد اور سلسلۂ کائنات کے اس نظم و نسق کے ساتھ کارفرما رہنے کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے؟ یہ بڑا اہم نکتہ ہے۔ اس کے لئے آپ پہلے آیت اور

اُس کا مفہوم ملاحظہ فرمایئے ۔ فرمایا:۔

۶/۱۲ قُلْ لِّمَنْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰی يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

ان سے کہو کہ ان تاریخی شواہد کے ساتھ، نظامِ کائنات پر بھی غور کرو اور دیکھو کہ اس میں اقتدار اور قانون کس کا کارفرما ہے، اور یہ کس کے پروگرام کی تکمیل کے لئے یوں سرگرمِ عمل ہے؟ ان سے کہو کہ (جیسا کہ تمہیں خود اس کا اعتراف ہے، (۲۹/۶۱)[1] یہ تمام سلسلہ، خدا کے پروگرام کے مطابق چل رہا ہے۔ اور چل اس لئے رہا ہے کہ ہر شے کو اُس کی نشوونما کا سامان ملتا رہے۔ اس لئے کہ جس لئے اُسے پیدا کیا ہے اُس نے سامانِ نشوونما کا بہم پہنچانا بھی اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ خارجی کائنات میں تو یہ نظام بلا روک ٹوک جاری رہتا ہے، لیکن انسان اپنی دنیا میں اس کی مزاحمت کرتا ہے۔ لیکن اس کی مزاحمت کیسے روا رکھی جا سکتی ہے؟ لہٰذا سوچو کہ اگر تم اس نظامِ ربوبیت کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاؤ تو تمہیں کھڑا رہنے دیا جائے گا؟ ایسا نہیں ہوگا۔ تمہیں ایک عظیم انقلاب سے دوچار ہونا پڑے گا —— اور ضرور ہونا پڑے گا۔

ان حقائق کی موجودگی میں، ایسی عظیم صداقت سے انکار وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اپنے آپ کو تباہ کر چکے ہوں۔

کہا کہ یہ کارخانۂ کائنات اس حسن و خوبی سے اس لئے چل رہا ہے کہ ہر شے کو اس کی نشوونما کا سامان ملتا رہے (رحمت کے یہی معنی ہیں۔ دیکھئے انڈکس) ایک بیج منوں مٹی کے نیچے دبا دیا جاتا ہے لیکن خدا کا قانون وہاں بھی اس لئے کارفرما ہوتا ہے کہ اس بیج میں نشوونما پانے کی مضمر صلاحیتیں برومند ہو کر کونپل کی شکل میں اُبھر آتی ہیں۔ پھر وہ پودا آہستہ آہستہ اپنی انتہائی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ استقرارِ حمل کے بعد عورت کا جسمانی نظام اس قدر نظم و ضبط کے ساتھ (خود بخود) مصروفِ عمل رہتا ہے کہ جنین کو رحم کے اندر سامانِ نشوونما ملتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کی پیدائش کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہ ہیں اس کی رحمت کے کرشمے! لیکن اس کیلئے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ انتہائی غور و فکر کے متقاضی ہیں۔ فرمایا:۔

كَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ

كَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ

[1] دیگر حوالے اوپر لکھے جا چکے ہیں۔

سامانِ نشوونما کا مہیا کرنا خدا نے اپنے اوپر لازم قرار دے رکھا ہے۔

آپ انڈکس میں "عالم امر" اور "خلق" کے عنوان دیکھئے۔ اس میں یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ عالم امر میں خدا کا تخلیقی پروگرام جس طرح طے پاتا ہے وہ (ہمارے علم و تصور کی رو سے) کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہیں ہوتا۔ لیکن عالم خلق کے لئے خدا نے کچھ قوانین مرتب کر رکھے ہیں جن میں خود خدا بھی کوئی تبدیلی نہیں کرتا۔ اُن میں اکثریت قوان کی ہے. جنہیں "قوانینِ فطرت" کہا جاتا ہے۔ لیکن انسانوں کی انسانی زندگی — (طبیعی زندگی نہیں۔ ان کی انسانی زندگی) کیلئے قوانین، وحی کے ذریعے دیئے گئے ہیں۔ ان قوانین یا احکام کے لئے لفظ کَتَبَ (یا کُتِبَ) آیا ہے۔ یعنی ایسا کرنا تم پر لازم قرار دیا گیا ہے۔ (مثلاً) كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ (2/178)۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (2/183) وغیرہ۔ اور یہی لفظ خدا نے خود اپنے لئے بھی استعمال کیا ہے جہاں فرمایا كَتَبَ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (6/12، 6/54) "خدا نے الرَّحْمَةَ کو اپنے اوپر لازم قرار دے رکھا ہے۔"

خارجی کائنات اور انسانوں پر خدا کا اقتدار تھا۔ اس لئے ان کے متعلق کہا کہ "خدا نے ان پر ایسا کرنا لازم قرار دے رکھا ہے۔" لیکن خدا کے اوپر تو کسی کا اقتدار نہیں تھا جو اُس پر کسی قسم کی پابندی عائد کرتا۔ اُس نے کہا کہ ہم نے اپنے اوپر خود آپ پابندی عائد کر رکھی ہے۔" اس کے لئے کہیں "کَتَبَ" کا لفظ آیا۔ کہیں کہا کہ حَقًّا عَلَيْنَا (10/103، 30/47)۔ کہیں اُسے اپنا "وعدہ" کہہ کر پکارا، اور اس وعدہ کے متعلق کہا کہ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا (4/122)۔ "خدا کے وعدے

خدا کے وعدے

پکے اور سچے ہیں۔" ان کی خلاف ورزی کبھی نہیں ہوتی۔ (نیز 10/4 و دیگر متعدد مقامات) ایک جگہ تو یہاں تک بھی کہہ دیا کہ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُولًا (25/16) "یہ خدا کا ایسا وعدہ ہے کہ اگر کبھی تمہیں (بالفرضِ محال) ایسا خیال گزرے کہ وہ پورا نہیں ہو رہا تو یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟"

الفاظ کچھ بھی کیوں نہ استعمال ہوئے ہوں۔ مفہوم سب کا یہ ہے کہ یہ ایسے قوانین ہیں جن کی خود خدا نے بھی اپنے اوپر پابندی عائد کر رکھی ہے۔ اس کو دیگر مقامات میں "سنت اللہ" سے تعبیر کیا گیا ہے جو غیر متبدل ہے (مطالب الفرقان جلد دوم۔ ص 153 نیز عنوان تقدیر و مکافاتِ عمل وغیرہ)۔ "حکمت اللہ" کو (LAW IN THEORY) اور "سنت اللہ" کو (LAW IN PRACTICE) سمجھئے۔ دونوں غیر متبدل ہیں۔

ان مقامات پر بعض سطح بین ذہنیتیں اعتراض کیا کرتی ہیں کہ خدا پر کسی قسم کی پابندی ہونے سے تو وہ قادرِ مطلق نہیں رہتا۔ لیکن یہ اُن کی سوچ کی کمی ہے۔ آپ کو آپ کا آقا (جس کے ہاں آپ ملازم ہیں) کہتا ہے کہ تمہاری

ڈیوٹی یہ ہے کہ صبح پانچ بجے اُٹھو۔ فلاں جگہ (جو یہاں سے تین میل کے فاصلے پر ہے) جاؤ وہاں یہ کام کرو اور پھر واپس آکر ناشتہ کرو۔ ظاہر ہے کہ ایسا آپ کو مجبوراً کرنا پڑتا ہے۔ یہ ملازمت کی پابندی ہے۔ لیکن اگر آپ (اپنی صحت کی خاطر) خود فیصلہ کرتے ہیں کہ آپ صبح پانچ بجے اُٹھ کر سیر کے لئے جایا کریں گے اور تین میل کی سیر کے بعد آکر ناشتہ کریں گے تو یہ آپ پر جبر نہیں۔ اس سے آپ کا اختیار سلب نہیں ہوجاتا۔ آپ نے اپنے اختیار سے اپنے آپ پر پابندی عائد کی ہے۔ یہی مثال خدا کی اپنے آپ پر پابندیاں عائد کر لینے کی ہے۔ اس سے اُس کے قادرِ مطلق ہونے پر کوئی حرف نہیں آتا۔ نہ کوئی اثر پڑتا ہے۔

اور یہی صورت خود انسان کی ہے۔ خدا نے اُس کے لئے ایک قانون مقرر کیا اور اس کے بعد کہا کہ تمہاری مرضی ہے کہ تم اس پر عمل کرو یا نہ کرو۔ اب اگر کوئی شخص اس پر عمل کرتا ہے تو اس پابندی سے اُس کا اختیار سلب نہیں ہوجاتا۔ اُس نے خود اپنے اختیار سے یہ پابندی قبول کی ہے۔ یہ پابندی تو بلکہ اُس کے صاحبِ اختیار ہونے کا ثبوت ہے۔ یہ اپنے اختیار سے جس قدر قانونِ خداوندی کا پابند ہوتا جائے گا اُسی قدر صاحبِ اختیار متصوّر ہوگا ——

می شود از جبر پیدا اختیار۔

خدا اور انسان کے صاحبِ اختیار ہونے میں فرق

لیکن خدا اور بندے میں ایک بنیادی فرق بھی ہے۔ انسان کے لئے جب خدا نے "كُتِبَ عَلَيْكُمْ" کہا تو اُسے اس کا اختیار دے دیا کہ چاہے اس پابندی کے مطابق عمل کرے اور چاہے اس سے انکار کر دے۔ لیکن خدا نے اپنے متعلق یہ نہیں کہا۔ اس نے کہا کہ ہم نے اپنے لئے جو پابندی تجویز کی ہے ہم اُس کی خلاف ورزی کبھی نہیں کریں گے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو انسان صاحبِ اختیار رہتا ہے اور خدا "مجبور"۔

خدا کا اس قسم کا تصور آپ کو اور کہیں نہیں ملے گا۔ اور اسی قسم کا وہ چاہتا ہے کہ انسانی دنیا میں نظام قائم ہو جس میں ہر فرد اپنے اختیار و ارادہ سے قانون کی پابندیاں قبول کرے اور ان کی خلاف ورزی کبھی نہ کرے۔ اس قسم کا نظام اُس حسن و خوبی سے چلے گا جس حسن و خوبی سے نظامِ کائنات کارفرما ہے۔ وہاں نہ کوئی شے قانون کی پابندی سے سرتابی اختیار کرتی ہے (کہ انہیں اس کا اختیار ہی حاصل نہیں) اور نہ ہی اس نظام کا چلانے والا (خدا) اپنے اوپر عائد کردہ پابندیوں کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ کس قدر قابلِ اعتماد ہے وہ نظام! اور اگر انسانی دنیا میں بھی اس قسم کا نظام قائم ہو جائے تو کس قدر امن و سکون کی مظہر اور برومندیوں اور شادابیوں کی پیکر ہوگی وہ زندگی! قوانینِ خداوندی کی

ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ

۶/۱۴-۱۳ وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِى الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۗ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○
قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ
وَلَا يُطْعَمُ ۗ قُلْ اِنِّىْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ
مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○

رات کی تاریکیاں ہوں یا دن کا اجالا، خدا کے لئے یکساں ہے۔ اس لئے نہ تم اُس سے بھاگ کر کہیں جاسکتے ہو، نہ اُس کی نگاہوں سے پوشیدہ رہ سکتے ہو۔ وہ سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔

ان سے کہو کہ کیا تم چاہتے ہو کہ میں ایسے خدا کو چھوڑ کر جس نے اس عظیم سلسلۂ کائنات کو پیدا کیا اور پھر ہر شے کی نشوونما کا ذمہ لیا، کوئی اور رفیق و کارساز تجویز کر لوں؟ اُس خدا کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ہر ایک کو سامانِ زیست عطا کرتا ہے لیکن خود سامانِ زیست کا محتاج نہیں۔ اس لئے اُس کی طرف سے جو کچھ ملتا ہے بلا مزد و معاوضہ ملتا ہے۔ وہ کسی کی محنت اور مشقت کے ماحصل میں سے اپنے لئے کچھ نہیں لینا چاہتا۔

یہی ہے وہ خدا جس کے متعلق مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سب سے پہلے اُس کے قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کروں اور اس کی حاکمیت میں کسی اور کو شریک نہ کروں (۶/۱۴)۔

اسلامی نظام کی خصوصیت

اس نظام کی بنیادی خصوصیت یہ ہوئی کہ هُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ۔ وہ سب کو حسبِ ضرورت دے گا۔ کسی سے اپنے لئے کچھ نہیں لے گا۔ اس میں کسی قسم کی سلب و نہب نہیں ہوگی۔ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا (۲۰/۱۱۲) "اس میں نہ کسی پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی ہوگی نہ سلب و نہب"۔ اس میں سربراہِ مملکت سب سے پہلے اعلان کرے گا کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ○ "میں سب سے پہلے ان قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں" (۶/۱۶۴)۔ تفصیل کے لئے دیکھئے سابقہ میں آیت (۳/۲۸) کی تشریح اور انڈکس میں "حکومت" کا عنوان۔

یہاں کہا گیا ہے کہ رسول بھی ان قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرتا تھا۔ دوسرے مقام پر کہا گیا ہے کہ وہ مومنین کی طرح اپنی وحی پر ایمان بھی لاتا تھا (مطالب جلد سوم صفحہ ۴۸۹)۔ وہ ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا تھا اور ساتھ ہی کہتا تھا کہ

۶/۱۸-۱۵ قُلْ اِنِّىْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّىْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ○ مَنْ يُّصْرَفْ
عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ۗ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ○ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ

اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ؕ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ○

رسول بھی قوانین سے مستثنیٰ نہیں

ان سے کہو کہ میں کس طرح خدا کے قوانین سے سرکشی اختیار کر سکتا ہوں جب کہ مجھے معلوم ہے کہ ظہورِ نتائج کے وقت اُن کی خلاف ورزی کی پاداش ایسی سخت ہوگی جس سے مجھے ڈرنا چاہیئے۔ یعنی اُس کے قانونِ مکافات میں کسی کی رعایت نہیں ہو سکتی اُس کی ہمہ گیری کا عالم یہ ہے کہ اگر میں بھی اس کی خلاف ورزی کر دوں تو مجھے بھی اس کی سزا مل جائے گی۔ ۱۰/۱۵ ، ۳۹/۱۳ ۔

جو شخص، اُس دن، اس عقوبت سے محفوظ رہا تو سمجھ لو کہ اُس پر خدا کا بڑا ہی فضل ہوا۔ یہ اُس کی بڑی کامیابی و کامرانی ہوگی، جو اُسے اُس کے اعمالِ حسنہ کے نتیجہ میں ملے گی۔

یاد رکھو! انسان کو جو نقصان، قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی سے پہنچتا ہے اُس کے ازالہ کی، اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ انسان اُسی کے قوانین کا اتباع کرے۔ یہی صورت نفع پہنچنے کی ہے۔ اس لئے کہ نفع اور نقصان کے پیمانے اُس کے قوانین کی رو سے متعیّن ہوتے ہیں جن پر اُسے پورا پورا کنٹرول ہے۔

اس کے قوانین کی زد سے کوئی شخص باہر نہیں جا سکتا۔ وہ سب پر غالب ہیں لیکن اس کا یہ غلبہ، استبداد اور دھاندلی کا نہیں۔ وہ ہر بات سے باخبر ہے اور اس کا ہر کام حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔

شفاعت کے خلاف

شفاعت کے متعلق سابقہ جلدوں میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے (دیکھئے انڈکس)۔ یہاں ایک اور زاویہ سے اس پر روشنی پڑتی ہے۔ سوچئے کہ جو (بزرگ و برتر) ہستی اپنے متعلق کہے کہ اگر (بفرضِ محال) میں بھی معصیت کا مرتکب ہوں تو اس کی سزا سے نہیں بچ سکتا، کیا وہ یہ کرے گا کہ دوسرے معصیت کاروں کی سفارش کر کے انہیں اُن کے جرائم کی سزا سے بچا لے؟

آیت (۶/۱۸) میں خدا کے لئے "قاہر" کا لفظ آیا ہے۔ دیگر مقامات پر اُسے "قہار" بھی کہا گیا ہے۔ ہمارے

قاہر اور قہار کا مفہوم

ہاں قہر اور قہار وغیرہ الفاظ اچھے معنوں میں استعمال نہیں کئے جاتے۔ ان سے مراد جابر اور مستبد حکمران ہوتے ہیں۔ لیکن خدا کی طرف یہ مفہوم منسوب کرنا صحیح نہیں ہوگا۔ عربی لغت میں قہر کا لفظ گرفت، غلبہ اور اقتدار کے لئے آتا ہے۔ اس لئے خدا کے غلبہ (قہر) سے مراد اس کے قانونِ مکافاتِ عمل کی گرفت ہے جس سے نہ کوئی چھوٹ سکتا ہے نہ باہر رہ سکتا ہے۔ یہ مفہوم

اس سورہ میں ذرا آگے چل کر ان الفاظ میں واضح کر دیا کہ ھُوَ الْقَاھِرُ فَوْقَ عِبَادِہٖ وَیُرْسِلُ عَلَیْکُمْ حَفَظَۃً ط (۶/۶۱) "وہ اپنے بندوں پر غالب ہے اور اس کے لئے اُس نے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ انسان کا ہر عمل محفوظ رہے تاکہ اُسے اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے"۔ خدا کے قانونِ مکافات کا یہی غلبہ ہے جس کی رُو سے ظالموں کی جڑ کٹ جاتی ہے اور مظلوم اس پر شکر کا کلمہ پڑھتے ہیں (۶/۴۵)۔ خدا نے ابھی ابھی کہا تھا کہ "اُس نے اپنے اوپر رحمت کو لازم قرار دے رکھا ہے"۔ اگر قہر کے عام معنی لئے جائیں تو پھر رحمت کے ساتھ قہر کیسے آ سکے گا؟ لیکن ادنیٰ تدبّر سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ ظالم کی کلائی مروڑنے کے لئے آہنی گرفت کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کی کلائی کا توڑ دینا، مظلوموں کے حق میں رحمت ہوتا ہے۔ اس بنا پر اقبالؒ نے بندۂ مومن کے متعلق کہا ہے کہ

قہر بھی اس کا ہے اللہ کے بندوں پر شفیق　　　(ضربِ کلیم ص ۱۲۹)

انسانوں کا قہر

لیکن جب یہی قہر (غلبہ و تسلط) ایک انسان کا دوسرے انسانوں پر ہو تو یہ وہ فرعونیت ہے۔ جس کی بربریت کے لئے ضربِ کلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ فرعون کے جرائم کے سرِ فہرست یہی جرم تھا جس کی رو سے وہ کہتا تھا کہ اِنَّا فَوْقَھُمْ قٰھِرُوْنَ (۷/۱۲۷) "ان (بنی اسرائیل) پر ہمارا غلبہ اور تسلط ہے"

چونکہ جابر و قاہر انسان کسی دوسرے انسان پر اسی صورت میں تسلط جماتا ہے جب اسے معلوم ہو کہ وہ تنہا ہے اس کا یارو مددگار کوئی نہیں۔ اس لئے حضور نبی اکرمؐ کی وساطت سے جماعتِ مومنین سے کہا گیا کہ فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْھَرْ (۹۳/۹) "جو معاشرہ میں تنہا رہ جائے اُسے کچلنے کی کوشش نہ کرنا"۔ اسی نہج سے عرب اُس گوشت کو جسے بھوننے کے لئے آگ پر رکھا جائے "لَحْمٌ مَقْھُوْرٌ" کہتے تھے۔ اس سے انسانوں پر انسانوں کے قہر کی کیفیت سمجھ میں آسکتی ہے۔ کسی کمزور و ناتوان کو اپنے قہر کی آگ پر رکھ کر اُسے اپنے کھانے کے قابل بنا لینا (اللہ ہر ایک کو اس سے اپنے حفظ و امان میں رکھے)

۶/۱۹ قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَھَادَۃً ط قُلِ اللّٰہُ قف شَھِیْدٌۢ بَیْنِیْ وَبَیْنَکُمْ قف وَاُوْحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَکُمْ بِہٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ط اَئِنَّکُمْ لَتَشْھَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰہِ اٰلِھَۃً اُخْرٰی ط قُلْ لَّآ اَشْھَدُ ج قُلْ اِنَّمَا ھُوَ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ ○

پوچھو کہ ان حقائق کی صداقت کے لئے (جنہیں میں بیان کرتا ہوں) کس کی شہادت سب سے بڑی ہو سکتی ہے؟

میرے اور تمہارے درمیان خود خدا کی شہادت موجود ہے۔ اُسی کا فیصلہ سب سے بہتر ہو سکتا ہے۔ اس کی یہ شہادت

اور فیصلہ اس قرآن میں موجود ہے جو بذریعہ وحی دیا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعے تمہیں اور انہیں بھی جن تک یہ بعد میں پہنچے، زندگی کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کروں۔ (۶۲/۲-۳)

کیا تم یہ کہتے ہو کہ اللہ کے سوا کوئی اور بھی ہے جس کے قوانین کی اطاعت کی جائے؟ ان سے کہو کہ اگر تمہارا یہی دعویٰ ہے تو میں اس کی صداقت کی شہادت نہیں دے سکتا۔ میرا دعویٰ تو یہی ہے کہ خدا کے علاوہ کوئی اور ایسی ہستی نہیں جس کے قانون کی اطاعت کی جائے۔ جنہیں تم اقتدار میں خدا کا شریک ٹھہراتے ہو، میرا اُن سے کوئی تعلق نہیں۔ میں اُن سے بیزار ہوں۔

اللہ تعالیٰ اور ملائکہ وغیرہ کی شہادت کے متعلق (۳/۱۸) میں گفتگو ہو چکی ہے۔ وہاں دیکھ لیجئے۔ اس آیت میں ایک نکتہ قابلِ غور ہے۔ حضورؐ کی لسانِ مبارک سے کہا یہ گیا ہے کہ "میری طرف قرآن وحی کیا گیا ہے لِاُنۡذِرَکُمۡ بِہٖ وَمَنۡۢ بَلَغَ۔ تاکہ میں اس کے ذریعے تمہیں بھی متنبہ کروں اور انہیں بھی جن تک یہ بعد ازاں پہنچے۔" قرآن کریم تمام اقوام عالم کیلئے قیامت تک کیلئے ضابطۂ راہنمائی ہے۔ حضورؐ نے اپنے مخاطبین کو تو اس سے بذاتِ خود آگاہ کر دیا۔ حضورؐ کی وفات کے بعد یہ سلسلۂ تبلیغ رسالت ختم نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے حضورؐ

ختمِ نبوّت کی ایک اور دلیل

کی اُمت کی وساطت سے جاری رہنا تھا۔ قرآن کی یہ تبلیغ (لِاُنۡذِرَکُمۡ بِہٖ میں قابلِ غور ہے) قیامت تک جاری رہے گی۔ اسے حضورؐ ہی کی جانب سے سمجھا جائے گا۔ سورۃ الجمعہ میں اس کی وضاحت کی گئی ہے (۶۲/۳)۔ نبوّت حضورؐ کی ذات پر ختم ہو گئی اور رسالت (یعنی قرآن کریم کی تعلیم کا دوسروں تک پہنچانے کا ذریعہ) امت کی وساطت سے ادا ہوتا رہے گا۔ اس لئے حضورؐ کے بعد کسی نبی یا رسول کے آنے کی ضرورت نہیں رہی، بالخصوص اس لئے کہ قرآن کریم، مکمل بھی ہے۔ غیر متبدل بھی اور محفوظ بھی۔ ایسی کتاب کی موجودگی میں کوئی رسول آئے گا کاہے کے لئے؟

جیسا کہ معلوم ہے رسول اللہ ﷺ کی دعوت کی مخالفت ایک تو قریش کی طرف سے ہوتی تھی جو کسی آسمانی مذہب کے پیرو ہونے کے مدعی نہیں تھے۔ دوسرا گروہ اہلِ کتاب کا تھا جن میں یہودی اور عیسائی شامل تھے۔ یہودی اس مخالفت میں زیادہ متشدد تھے۔ یہ دونوں (یہودی اور عیسائی) ایک آنے والے کے منتظر تھے جس کی علامات اور خصوصیات

یہود اور نصاریٰ کی طرف سے مخالفت

ان کی کتابوں میں مذکور تھیں، اور اگر تعصب کی عینک اتار کر دیکھا جاتا تو حضورؐ اُن خصوصیات کے مصداق نظر آجاتے۔ لیکن یہ لوگ سب کچھ جانتے بوجھتے اس دعوت کی مخالفت کرتے۔ یہودی اس لئے مخالفت کرتے کہ یہ مدعیٔ نبوّت شاخ اسرائیل (حضرت اسحٰقؑ کی اولاد) سے متعلق ہونے کی بجائے ذریت اسمٰعیل سے کیوں ہے؟ اور عیسائی کہتے کہ وہ آنے والا آسمان سے زندہ اُترنے والا مسیحؑ ہوگا۔ قرآن کریم نے کہا کہ صداقت کے اس انکار سے لوگ کسی اور کا نہیں خود اپنی

ذات کا نقصان کر رہے ہیں۔

۶/۲۰ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۘ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

جن لوگوں کو اس سے پہلے کتاب دی گئی تھی، وہ اس حقیقت کو اچھی طرح پہچانتے ہیں کہ یہ قرآن خدا ہی کی طرف سے ہے ——— یوں پہچانتے ہیں جیسے ماں باپ اپنی اولاد کو پہچانتے ہوں۔ اس لئے ان کا انکار حقیقت سے بے خبر ہونے کی وجہ سے نہیں۔ یہ اس لئے ہے کہ یہ اپنے آپ کو تباہ و برباد کر چکے ہیں۔ (اور خطرات سے حفاظت تو وہی چاہتا ہے جسے زندہ رہنے کی آرزو ہو۔ ۳۶/۲)

اپنی ذات کے نقصان کی وضاحت کے لئے سابقہ جلد میں آیت (۵/۱۰۵) دیکھئے۔ وہ کہتے تھے کہ حضورؐ کا دعویٰ نبوت (معاذ اللہ) افترا ہے۔ فرمایا:

۶/۲۱ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

ذرا سوچو کہ اُس سے زیادہ ظالم اور کون ہو سکتا ہے جو اپنی طرف سے بات بنائے اور اُسے خدا کی طرف منسوب کر دے۔ اسی طرح اُس سے بڑھ کر ظلم کرنے والا کون ہے جو خدا کے سچے قوانین کو جھٹلائے۔ یہ دونوں ظالم ہیں ——— وہ جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کرتا ہے اور یہ سچ کو جھوٹ قرار دیتا ہے ——— ان میں سے کوئی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

قرآنِ کریم نے (متعدد مقامات پر) ان مخالفین کو مشرک کہہ کر پکارا ہے۔ قریش تو بتوں کی پرستش کرتے تھے اس لئے

یہ مشرک کس طرح تھے؟

وہ عام مفہوم کے اعتبار سے ہی مشرک تھے۔ عیسائی حضرت عیسیٰؑ (اور حضرت مریمؑ) کو الوہیت میں شریک تصور کرتے تھے۔ اُن کا شرک بھی کھلا ہوا تھا۔ یہودی معترض تھے کہ انہیں مشرک کیوں قرار دیا جا رہا ہے؟ کہا کہ تم احکامِ خداوندی کے بجائے اپنے مذہبی پیشواؤں کے احکام کی اطاعت کرتے ہو۔ یہی تمہارا شرک ہے (دیکھئے مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۹۵)

یاد رکھئے جب بھی انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو خدائی احکام کا درجہ دے دیا جائے تو وہ شرک ہو جائے گا، خواہ وہ مذہبی مقتداؤں کے احکام ہوں اور خواہ حکمرانوں کے احکام۔ ہم خود صدیوں سے اسی عملی شرک میں مبتلا ہیں۔ ہمارے ہاں اطاعت کتاب اللہ کی نہیں، انسانوں کے وضع کردہ احکام کی ہوتی ہے۔ اسی قسم کے شرک کے متعلق کہا:-

۶ ۲۴-۲۲ وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا أَيْنَ شُرَكَاؤُكُمُ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ۝ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا وَاللَّهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ ۝ انْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۝

جس دن یہ سب مغلوب و محکوم ہو کر تمہارے سامنے آئیں گے (یا حیاتِ اخروی میں ان کے اعمال کے نتائج ان کے سامنے آئیں گے) تو اس وقت اُن لوگوں سے جو خدا کے ساتھ اوروں کو بھی شریک ٹھہراتے ہیں، پوچھا جائے گا کہ بتاؤ! وہ کہاں ہیں جن کے متعلق تمہارا دعویٰ تھا کہ وہ خدائی اختیارات میں شریک ہیں (۱۶/۴۷)

شرک سے انکار

اُس وقت اُن کے پاس کوئی بات کہنے کے لئے نہیں ہوگی، بجز اس کے کہ وہ خدا کی قسمیں کھا کھا کر یقین دلائیں گے کہ ہم خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا کرتے تھے۔

اُس وقت کہا جائے گا کہ دیکھو! یہ لوگ کس طرح خود اپنے خلاف جھوٹ بولتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ جس قدر افترا پردازیاں کیا کرتے تھے، وہ سب بے کار ثابت ہو چکی ہوں گی۔

یہ لوگ حضورؐ کی مجالس میں آ کر بیٹھتے لیکن بالکل منافقانہ انداز سے۔ اس لئے کہ

۶ ۲۵ وَمِنْهُمْ مَنْ يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ ۚ وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۚ وَإِنْ يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَا يُؤْمِنُوا بِهَا ۚ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوكَ يُجَادِلُونَكَ يَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۝

اور ان میں سے وہ بھی ہیں جو محض دکھاوے کی خاطر تیری طرف کان لگائے بیٹھے رہتے ہیں ورنہ ضد اور تعصب کی بنا پر اُن کے دلوں پر ایسے پردے پڑے ہوئے ہیں کہ اُن میں بات سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔ اور تکبر و نخوت کی وجہ سے اُن کے کانوں میں ایسے ڈاٹ لگ چکے ہیں کہ کوئی آواز اُن کے دماغ تک پہنچ ہی نہیں سکتی۔ ان کی یہ حالت ہو چکی ہے کہ اگر اُن کے سامنے (دو، چار، دس نہیں) وہ تمام دلائل بھی آ جائیں جن سے صداقت پہچانی جا سکتی ہے، تو یہ پھر بھی اُس پر ایمان نہ لائیں۔ یہی وجہ ہے، کہ یہ بات بات پر تجھ سے الجھتے اور جھگڑتے رہتے ہیں۔ قرآن سے انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں، اس کے سوا رکھا ہی کیا ہے کہ پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں جنہیں یہ دُہراتا رہتا ہے۔

اس قسم کی آیات کی تشریح اس سے پہلے بھی کی جا چکی ہے (دیکھئے مطالب الفرقان۔ جلد اوّل صفحہ ۱۶۷) پھر اتنا ہی نہیں کہ یہ خود ہی قرآنی تعلیم سے اپنے آپ کو محروم رکھتے تھے۔ یہ دوسروں کو بھی اس کی طرف آنے سے روکتے

تھے۔ یہ حسد اور مخالفت کی انتہا ہے۔ مذہب میں ہوتا ہی یہ ہے۔

۶/۲۶ وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْـَٔوْنَ عَنْهُ ۚ وَإِنْ يُهْلِكُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ○

اس طرح یہ لوگ، خود بھی قرآن کی راہ نمائی سے بے نصیب رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس سے روکتے رہتے ہیں لیکن اتنا نہیں سمجھتے کہ اس سے ہم کسی اور کا نقصان نہیں کرتے، خود اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔

اس کے لئے یہ لوگ ٹیکنیک کیا اختیار کرتے تھے اُس کی بابت مطالب الفرقان جلد اوّل ص۱۷۳ دیکھئے

فرمایا کہ ان کی مخالفت کی شدت کا تو یہ عالم ہے لیکن بزدلی کی یہ کیفیت کہ عذاب کے سامنے آتے ہی یہ گھٹنوں کے بل جھک جائیں گے اور منتیں سماجتیں کرنے لگ جائیں گے۔ منافق ہوتا ہی بزدل ہے۔ فرمایا۔

۶/۲۷-۲۸ وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ وُقِفُوا عَلَى النَّارِ فَقَالُوا يَا لَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِآيَاتِ رَبِّنَا وَنَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ○ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَا كَانُوا يُخْفُونَ مِنْ قَبْلُ ۖ وَلَوْ رُدُّوا لَعَادُوا لِمَا نُهُوا عَنْهُ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ○

اس وقت تو یہ یوں بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہے ہیں۔ (لیکن اے مخاطب!) اگر تُو اس منظر کو دیکھ سکتا جب یہ تباہی اور بربادی کے جہنم کے سامنے کھڑے ہوں گے اور اس سے بچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آئے گی، تو یہ کس حسرت و یاس سے کہیں گے کہ اگر ہمیں ایک موقعہ اور دے دیا جائے، تو ہم قوانینِ خداوندی کی کبھی تکذیب نہ کریں اور اُن پر ضرور ایمان لے آئیں۔

یہ کچھ وہ اس لئے نہیں کہیں گے کہ وہ واقعی اپنی حالت بدلنا چاہتے تھے۔ بلکہ اس لئے کہ جو کچھ وہ دوسروں سے چھپا کر کیا کرتے تھے (اور یوں مجرم ہونے کے باوجود، لوگوں کی نگاہوں میں بڑے معتبر بنے رہتے تھے) وہ بے نقاب ہو کر سامنے آجائے گا اور انہیں اپنے جرائم کے چھپانے کے لئے کوئی پردہ نہیں مل سکے گا۔ ورنہ اُن کی کیفیت یہ ہے کہ اگر انہیں اور موقعہ بھی دے دیا جائے تو پھر وہی کچھ کرنے لگ جائیں جن سے انہیں روکا گیا تھا۔ (ایسا ہر روز ہوتا ہے۔ جب آدمی مصیبت میں پھنس جاتا ہے اور اس سے چھٹکارے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو گڑ گڑا، گڑ گڑا کر معافیاں مانگتا ہے اور وعدے کرتا ہے کہ اگر ایک دفعہ اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل ہو جائے تو آئندہ کبھی ایسا

نہیں کروں گا۔ لیکن، اس کے بعد پھر وہی کچھ کرنے لگ جاتا ہے۔)

لہٰذا، یہ لوگ ایسا کہنے میں بھی سچے نہیں ہوں گے کہ اگر اُنہیں ایک موقع اور مل جائے تو وہ کبھی ایسا نہیں کریں گے۔

دُنیا میں واپسی نہیں ہو گی

اس نکتہ کے متعلق کہ مرنے کے بعد اس دنیا میں دوبارہ نہیں آیا جا سکے گا، مطالب الفرقان جلد سوم، صفحہ ۳۵ - ۱۳۲ دیکھئے۔ نیز جلد اوّل ص ۴۴۔

یہ تو وہ تھے جو مرنے کے بعد کی زندگی کے بہر نوع قائل تھے۔ لیکن دوسرا گروہ اُن کا تھا جو سرے سے اس کا قائل ہی نہ تھا۔

۶/۲۹-۳۱

وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۝ وَلَوْ تَرٰٓى
اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۭ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ۭ قَالُوْا بَلٰى وَ
رَبِّنَا ۭ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝ قَدْ
خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ اللّٰهِ ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَتْهُمُ السَّاعَةُ
بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰي مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا ۙ وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ
اَوْزَارَهُمْ عَلٰي ظُهُوْرِهِمْ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَزِرُوْنَ ۝

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ زندگی بس اِسی دنیا کی زندگی ہے۔ اس کے بعد کچھ نہیں۔ اس لئے اگر ہم یہاں ایسا انتظام کر لیں کہ کسی کی گرفت میں نہ آ سکیں۔ یا گرفت میں آنے کے بعد، جھوٹ سچ بول کر سزا پانے سے بچ جائیں، تو پھر اپنے آپ کو جائز اور ناجائز کی پابندیوں میں کیوں جکڑے رکھیں۔ (یاد رکھئے۔

حیاتِ آخرت کے منکر

قرآن پر وہی ایمان لائے گا جو حیاتِ اُخروی پر ایمان رکھتا ہو: ۶/۹۳؛ ۴۵/۲۲-۲۴؛ ۴۷/۱۲)۔ یہی وجہ ہے کہ ارتکابِ جرم سے انسان اسی صورت میں بچ سکتا ہے، جب اسے خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل، اور زندگی کے تسلسل (حیاتِ اُخروی) پر محکم یقین ہو (۴۵/۲۴)۔

اگر تم اس وقت کا تصوّر کر سکو، جب یہ ظہورِ نتائج کے وقت اپنے نشوونما دینے والے کے سامنے کھڑے ہوں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ بتاؤ! زندگی کے تسلسل اور حیاتِ اُخروی کا عقیدہ، حقیقتِ ثابتہ تھا یا نہیں؟ تو اُنہیں یہ کہنے کے سوا چارہ نہیں ہوگا کہ ہاں! ہمارا نشوونما دینے والا اس پر شاہد ہے کہ

یہ فی الواقعہ ایک ٹھوس حقیقت تھی اُس وقت اُن سے کہا جائے گا، کہ اب اِس اعترافِ حقیقت سے کیا فائدہ؟ اَب تم اپنے اعمال کی سزا بھگتو جس سے تم یُوں انکار کیا کرتے تھے۔ غلط روش کے نتائج، اس زندگی میں بھی سامنے آسکتے ہیں اوراس کے بعد کی زندگی میں بھی۔ غلط نظام کی قومی اور اجتماعی تباہیاں، یہیں سامنے آجاتی ہیں۔

جو لوگ خدا کے قانونِ مکافات سے انکار کرتے ہیں، وہ خود اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔ جب وہ تباہ کُن انقلاب یک لخت اُن کے سامنے آئے گا، تو وُہ بصد حسرت ویاس کہیں گے کہ ہم سے بڑی تقصیر ہوئی۔ لیکن اُس وقت ایسا کہنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ وہ اپنے غلط اعمال کے بوجھ کے نیچے دبے ہونگے ——— اور کس قدر بُرا ہے وہ بوجھ جس سے اِنسان کی انسانیت یوں کچلی جائے!

وہ دنیاوی زندگی ہی کو اصلِ حیات سمجھتے تھے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ

٦/٣٢ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ ؕ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

یہ سب اس لئے کہ انہوں نے سمجھ رکھا تھا کہ انسان کی طبیعی زندگی ہی بس حقیقی زندگی ہے۔ اوراس کے تقاضوں کا پورا کرنا ہی مقصودِ حیات ہے۔ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ طبیعی زندگی کے تقاضوں کی اہمیت کے باوجود، جب کبھی ایسا ہو کہ ان تقاضوں میں اور انسان کی ذات کے تقاضوں میں تصادم واقع ہو جائے، تو اس وقت طبیعی زندگی کے تقاضا کو کھیل تماشے سے زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیئے۔ اور انسانی زندگی کے تقاضا کو اس پر قربان نہیں کر دینا چاہیئے۔ جو لوگ تباہی سے بچنا چاہتے ہیں، اُن کے نزدیک ایسے وقت میں، انسانی زندگی کا تقاضا، طبیعی تقاضا کے مقابلہ میں کہیں زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ اقدارِ خداوندی کی پابندی کرتے ہیں، خواہ اس سے انہیں مادی نقصان ہی کیوں نہ ہو۔

دنیاوی زندگی لہو ولعب

کیا ان کی سمجھ میں اتنی سی بات بھی نہیں آئی کہ زندگی محض حیوانی سطح کی زندگی نہیں، اس سے بلند، انسانی سطح کی زندگی بھی ہے اور انسانی زندگی، بہر نوع، حیوانی زندگی سے بلند ہوتی ہے۔

دنیاوی زندگی کے لہو ولعب ہونے کا مطلب، اور دنیاوی اور اُخروی زندگی میں تقابل کے لئے اِنڈکس دیکھئے۔

اِس کے بعد پھر حضورؐ کو تسلّی دی گئی کہ ان لوگوں کے طرزِ عمل سے آپ افسردہ خاطر نہ ہوں۔۔ اس کے لئے

جس نکتہ کی وضاحت کی گئی ہے وہ بڑا اہم ہے اور اس کی وضاحت بڑی دلنشین ہے۔ فرمایا کہ یہ لوگ جو تمہاری مخالفت کرتے ہیں، تو یہ تمہیں جھوٹا نہیں کہتے جو تمہیں اس پر ملال ہو۔ یہ قوانینِ خداوندی کو جھٹلاتے ہیں۔ اور چونکہ یہ قوانین تمہارے نہیں، خدا کے ہیں (تم تو صرف انہیں اُن تک پہنچانے والے ہو)، اس لئے یہ اُن قوانین کو جھٹلاتے ہیں تو اس میں تمہارے لئے بُرا ماننے کی کون سی بات ہے؟ یہ موضوع اس سے پہلے بھی متعدد مقامات میں آچکا ہے (انڈکس دیکھئے)، نیز آیت (۵/۴۱) کی تشریح جو سابقہ صفحات میں سامنے آچکی ہے۔ فرمایا:

یہ تمہیں جھوٹا نہیں کہتے

۶/۳۳ قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ○

(اے رسولؐ!) ہم اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ یہ لوگ، اس نظام کے متعلق جو باتیں کرتے ہیں، وہ تمہارے لئے سخت ملال اور افسردگی کا باعث ہوتی ہیں۔ لیکن یہ تجھے تو جھوٹا نہیں سمجھتے (جو یہ بات اس طرح تم پر گراں گزرے) یہ تو قانونِ خداوندی کو جھٹلاتے ہیں (حالانکہ ان کا دل اسے صحیح تسلیم کرتا ہے (۲۷/۱۴))۔ اس لئے ان کی باتوں سے دل برداشتہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ (اگر تم کسی سے کہو کہ سنکھیا مہلک ہوتا ہے اور وہ کہے کہ نہیں یہ جھوٹ ہے۔ سنکھیا ممدِّ حیات ہے۔ تو اس سے اُس کی جہالت پر افسوس تو ہو سکتا ہے، ضیق اور ملال نہیں ہونا چاہیئے)

اور پھر یہ بھی کوئی نئی بات نہیں۔ ایسا کچھ ہر رسول کے ساتھ ہوتا چلا آیا ہے:

۶/۳۴ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِى الْمُرْسَلِيْنَ ○

پھر، یہ بات کوئی نئی بھی نہیں۔ تم سے پہلے بھی جو رسول آئے، اُن کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا رہا۔ اُن کی پیش کردہ تعلیم کی بھی اسی طرح تکذیب ہوتی رہی۔ لیکن انہوں نے ان باتوں کی کوئی پرواہ نہ کی اور نہایت استقلال اور استقامت سے اپنے پروگرام پر عمل پیرا رہے۔ اور جس قدر تکالیف مخالفین کی طرف سے پہنچتی رہیں، انہیں ہمت اور حوصلہ کے ساتھ برداشت کیا۔ یہاں تک کہ بالآخر (ہمارے قانون کے مطابق) ہماری طرف سے نصرت آپہنچی ——— پہنچتی کیوں نہ؟ خدا کا قانون اٹل ہے۔ اس میں کوئی ردوبدل نہیں کر سکتا ——— یہ حقیقت اُن انبیاءؑ کے احوال و کوائف سے واضح ہو جاتی ہے جن کے تذکرے (اس قرآن میں) تم تک پہنچ چکے ہیں۔

اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ فگن نئے

وہی فطرتِ اسداللّٰہی، وہی مرحبی وہی عنتری

خدا کا اٹل قانون یہ جو کہا گیا ہے کہ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ـــــ قوانین خداوندی میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی ـــــ تو اس کا اعادہ متعدد مقامات پر ہوا ہے۔ اور یہی دین کی اصل ہے۔

سابقہ صفحات پر آیت (۶/۱۲) کے تحت بھی اس سلسلہ میں گفتگو ہو چکی ہے۔ علاوہ ازیں، حسب ذیل حوالے بھی دیکھئے: (۶/۱۱۶)؛ (۱۰/۶۴)؛ (۱۴/۲۴-۲۷)؛ (۱۸/۲۷)؛ (۵۰/۲۹)۔ اور سنتُ اللہ کے غیر متبدل ہونے کے سلسلہ میں (۱۷/۷۷)؛ (۳۳/۶۲)؛ (۳۵/۴۳)۔ نیز مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۵۳۔ اور اس کے تحت درج کردہ حوالے۔

اس کے بعد اس حقیقت کو (کہ جو لوگ عقل و فکر سے کام لے کر قوانین خداوندی کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتے اور اپنی ضد پر اڑے رہتے ہیں، وہ کسی طرح بھی اس دعوت کو قبول نہیں کریں گے) ایک اور انداز سے سمجھایا گیا۔ فرمایا:

۶/۳۵ وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ○

ان لوگوں کی طرف سے اس قدر مخالفت کے باوجود تم اس غم سے نڈھال ہو رہے ہو کہ یہ صحیح راستے کی طرف کیوں نہیں آتے؟ کیوں اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہیں (۱۸/۶)؟ لیکن تم لاکھ غم کھاؤ اور ہزار افسوس کرو، یہ پھر بھی صحیح راستے پر نہیں آنے کے۔ اگر تم ایسا کر سکو تو زمین میں کوئی سرنگ لگا کر (پاتال تک جا پہنچو) یا آسمان میں سیڑھی لگا کر عالم بالا تک پہنچ جاؤ۔ اور وہاں سے کوئی ایسا معجزہ لے آؤ جس سے ان کی تسلی ہو جائے تو یہ اس پر بھی ایمان نہیں لائیں گے (۱۷/۹۰-۹۳)۔ (تمہاری یہ آرزو کہ لوگ صحیح راستے پر آ جائیں، تمہارے خلوص اور انسانیت کے ساتھ تمہاری گہری ہمدردی کی دلیل ہے)، لیکن انہیں زبردستی صحیح راستے پر لانے کا سوال نہیں۔ اگر انسان کا اختیار و ارادہ سلب کر کے، سب کو ایک طریق پر چلانا مقصود ہوتا تو خدا کے لئے ایسا کرنا

معجزات میں کیا مشکل تھا؟ (۱۰/۹۹-۱۰۰)۔ لیکن اس کی مشیت یہ ہے نہیں۔ وہ انسان کا اختیار

نہیں چھیننا چاہتا۔ یہ ہے اس کی وجہ۔ سو تُم اُن لوگوں میں سے نہ ہو جانا جو حقیقت سے بے خبر ہونے کی وجہ سے کہا کرتے ہیں کہ اللہ نے تمام انسانوں کو نیک ہی کیوں نہ بنا دیا!

اس موضوع کی وضاحت مطالب الفرقان، جلد اوّل صفحہ ۳۱۲ - ۳۰۹ پر ہو چکی ہے، جہاں زیرِ نظر آیت بھی درج ہے۔ اس کے بعد کہا:

۶/۳۶ اِنَّمَا يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ يَسْمَعُونَ ؕ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ۝

ہم نے ہدایت اور گمراہی کے لئے قانون یہ مقرر کر دیا ہے کہ جو شخص عقل و بصیرت سے کام نہیں لے گا، اس پر حقیقت مُشتبہ رہے گی (۲/۱۸)۔ اس کے برعکس، جو بات کو دل کے کانوں سے سُنے گا، وہ اس پر لبیک کہے گا۔ باقی رہے وہ جو بے حس ہیں، تو وہ آہستہ آہستہ بیدار ہوں گے، اور رفتہ رفتہ دینِ خداوندی کی طرف آئیں گے۔ [اس کے لئے تمہیں بڑی استقامت سے کام لینا ہوگا (۲/۲۶)]۔ لیکن جو لوگ سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں ختم کر چکے ہوں، اور ضد اور تعصب کی بنا پر سُننے کے لئے تیار ہی نہ ہوں، وہ تباہ ہو جائیں گے (۲/۷)

یہ موضوع بھی اس سے پہلے آ چکا ہے۔ حوالہ کے لئے انڈکس میں "عقل و فکر" کا عنوان دیکھئے۔ مندرجہ بالا مفہوم میں آیت (۲/۲۶۰) کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس کی تشریح کے لئے مطالب الفرقان جلد سوم (صفحات ۴۷۶ - ۴۵۸) دیکھئے، اور آیت (۲/۷) کی تفسیر کے لئے جلد اوّل (صفحات ۱۵۸ - الآخر)

اس کے بعد ان لوگوں کے اس اعتراض کو پھر دہرایا گیا کہ رسولؐ معجزات کیوں نہیں دکھاتا؟

۶/۳۷ وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝

اِن (کٹ حجّتی کرنے والوں) کا اعتراض یہ ہے کہ خدا اپنے رسولؐ پر کوئی نشانی (حسّی معجزہ) کیوں نہیں نازل کرتا ان سے کہو کہ حسّی معجزات کا رونما کر دینا، خدا کے لئے ناممکن نہیں، لیکن اُنہیں اس حقیقت کا علم نہیں کہ خدا چاہتا یہ ہے کہ تم اپنی عقل و بصیرت سے کام لے کر غلط اور صحیح میں امتیاز کرو۔ وہ تمہاری عقل و فکر کو ماؤف کر کے تم سے حقیقت منوانا نہیں چاہتا۔

معجزات کے متعلق انڈکس دیکھئے، اور اس نکتہ کی وضاحت کے لئے کہ خدا کا قادرِ مطلق ہونے کے باوجود،

اپنے قوانین کے خلاف نہ کرنا، آیت (۶/۱۲) کے تحت سابقہ صفحات دیکھئے۔

معجزات طلبی

معجزات دکھا کر کسی کو اپنی دعوت (اسلام) کا قائل کرالینا، اس کے اختیار و ارادہ کو سلب کرلینے کے مترادف ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت کے لئے اگلی آیت میں دو قسم کی مخلوق کا ذکر کیا گیا۔ انسان کے سوا کائنات کی جملہ مخلوق کو اس راستے پر چلنے کے لئے مجبور پیدا کیا گیا ہے جو ان کے لئے متعیّن کیا گیا ہے۔ اور دوسرے، انسان جسے صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا گیا ہے۔ قوانین دونوں کے لئے دیئے گئے ہیں۔ لیکن ایک نوع ان کی اطاعت پر مجبور ہے۔ دوسری نوع کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو ان کی اطاعت کرے، اور چاہے ان سے انحراف برت لے۔ نتائج بہرحال ان کی روش کے مطابق مرتب ہوں گے۔

۶/۳۸ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّآ أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ ۚ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ إِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ۝

یہ طریقِ کار (کہ سب کو مجبوراً ایک ہی راستے پر چلایا جائے) خارجی کائنات میں اختیار کیا گیا ہے۔ تم دیکھو کہ جس قدر زمین پر چلنے والے ذی حیات ہیں، یا فضائے آسمانی میں اُڑنے والے پرندے، طبیعی تخلیق کے اعتبار سے، وہ بھی تمہارے ہی جیسی انواع ہیں۔ ان کے لئے ہم نے کتابِ فطرت میں تمام قوانین مکمل طور پر رکھے ہیں (یہی صورت انسانی راہنمائی کے لئے قرآنِ مجید کی ہے) اور وہ سب کے سب، بلاچون و چرا اپنے پروردگار کی طرف سے دی ہوئی راہنمائی کے گرد جمع رہتے ہیں۔ اس سے ذرا اِدھر اُدھر نہیں ہٹتے۔ (۲۴/۴۱)۔ یہ اس لئے کہ انہیں اختیار و ارادہ نہیں دیا گیا۔ مجبور پیدا کیا گیا ہے۔

اس آیت میں ایک ایسا عظیم دقیق نکتہ ہے جسے سائنسدان ہی (APPRECIATE) کرسکتے ہیں۔ کہا کہ کرۂ ارض پر پھیلے ہوئے ذی حیات تمہاری ہی قسم کی انواع ہیں۔ مطالب الفرقان (جلد اوّل) میں بیان کردہ نظریۂ ارتقاء پر غور کیجئے۔ اس کی رُو سے سائنس کا انکشاف یہ ہے کہ زندگی کی ابتداء ایک جرثومۂ حیات سے ہوئی۔ پھر وہ ارتقائی منازل طے کرتی اور آگے بڑھتی ہوئی پیکرِ انسانی تک آ پہنچی۔ اس سلسلہ میں جس قدر ذی حیات انواع

نظریۂ ارتقاء

وجود میں آئیں، وہ شکل و ہیئت میں الگ الگ ہیں، لیکن اپنی اصل کے اعتبار سے ایک دوسرے کی مثل ہیں۔ آیۂ زیرِ نظر میں "اُمَمٌ اَمْثَالُکُمْ" کے الفاظ آئے ہیں۔ اُمَم کا لفظ جمع ہے امّت کی اور اُمّت کا مادہ اُمّ ہے جس کے لغوی معنی "ماں" ہیں اور مجازی معنی اصل اور بنیاد۔ نظریۂ ارتقاء کے مکتشف، ڈاروِن نے اپنی جس کتاب میں اس نظریہ کی وضاحت کی ہے اس کا نام ہے (ORIGIN OF SPECIES)

"اصلِ انواع"۔ آپ غور کیجئے کہ یہ الفاظ کس طرح "اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ" کی تشریح کرتے ہیں، یعنی اپنی اصل اور منبع کے اعتبار سے یہ تمام انواع تمہاری ہی مثل ہیں۔

اس کے بعد بتایا کہ ان انواع کے لئے قوانینِ فطرت متعین کئے گئے ہیں جو صحیفۂ کائنات میں بکھرے پڑے ہیں، اور انسانوں کے لئے یہ قوانین بذریعہ وحی عطا کئے جو (اب) قرآنِ کریم کی دفتین میں محفوظ ہیں۔ اوّل الذکر اس مرکز پر جمع ہونے کے لئے مجبور ہیں:

۶/۳۹ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ ۭ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ۭ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○

(لیکن انسان کی حالت اُن سے مختلف ہے۔ اسے عقل و فکر دے کر، صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا گیا ہے۔ ان میں سے کچھ تو عقل و فکر سے کام لے کر، خدا کی راہنمائی اختیار کر لیتے ہیں۔ باقی) عقل کے دیئے گُل کرکے، اُسکے قوانین کو جھٹلاتے رہتے ہیں، اور یوں بہرے اور گونگے بن کر، جہالت اور تعصب کی تاریکیوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔

انسانوں کے لئے یہی خدا کا مقرر کردہ قانون ہے۔ سو جو شخص، اس قانون کے مطابق، غلط راستہ اختیار کرلے، وہ غلط راستے پر رہتا ہے۔ اور جو صحیح راستہ اختیار کرنا چاہے، اُس کے سامنے زندگی کی سیدھی اور توازن بدوش راہ آجاتی ہے۔

منافقین کا ایمان

اِس کے بعد تین آیتوں میں انسان کی اس مضطربانہ اور عاجلانہ ذہنیت کو سامنے لایا گیا ہے کہ جب یہ کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے تو خدا کو پکار پکار کو یاد کرنے لگتا ہے، اور جب وہ مصیبت رفع ہو جاتی ہے تو پھر اسے فراموش کر دیتا ہے۔ انسان کی اس قسم کی "خدا پرستی" کے متعلق کہیں کہا کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰي حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُۨ انْقَلَبَ عَلٰي وَجْهِهٖ ۚ (۲۲/۱۱)۔ "ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کی ہدایت اس طرح اختیار کرتے ہیں گویا کنارے پر بیٹھے ہیں۔ اگر خدا پرستی سے مفاد حاصل ہوتے ہیں، تو خدا پرست ہیں۔ اگر کوئی مصیبت آجاتی ہے، تو منہ پھیر کر دوسری طرف چل دیتے ہیں"۔ ایسی روش کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ فرمایا: خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ (۲۲/۱۱)۔ "دنیا اور آخرت دونوں میں خسارہ، اور یہ خسارہ ایسا کھلا ہوا ہے کہ اس کی وضاحت کے لئے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں"۔ اور کہیں کہا کہ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۤ لَآ اِلٰى

هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ إِلٰى هٰٓؤُلَآءِ (۴/۱۴۳) "نہ یکسو ہو کر اس طرف، نہ یکسو ہو کر اُس طرف۔ مکھی کی طرح بھنبھناتے اور منڈلاتے ہوئے"۔ یاد رکھئے! دین بھی یکسوئی کا نام ہے اور کفر بھی یکسوئی کا۔ یہ بین بین کی روش منافقین کی ہوتی ہے جن کا ٹھکانہ جہنم کا سب سے نچلا درجہ بتایا گیا ہے۔ حق پرستی کے ساتھ سودا بازی کرنا، منافقت ہے۔ اس مضمون کو اگلی تین آیتوں میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

۶ / ۴۰-۴۳
قُلْ أَرَءَيْتَكُمْ إِنْ أَتٰكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ أَوْ أَتَتْكُمُ السَّاعَةُ أَغَيْرَ
اللّٰهِ تَدْعُونَ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِينَ ۝ بَلْ إِيَّاهُ تَدْعُونَ فَيَكْشِفُ
مَا تَدْعُونَ إِلَيْهِ إِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُونَ ۝ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَآ
إِلٰٓى أُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَأَخَذْنٰهُمْ بِالْبَأْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ
يَتَضَرَّعُونَ ۝ فَلَوْلَآ إِذْ جَآءَهُمْ بَأْسُنَا تَضَرَّعُوا وَلٰكِنْ قَسَتْ
قُلُوبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

ان سے کہو کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ خدا کے علاوہ اور قوتیں بھی اختیار و اقتدار رکھتی ہیں، تو جس وقت کوئی طبیعی آفت (آندھی۔ سیلاب۔ وبا وغیرہ) آتی ہے، یا کوئی تباہ کُن انقلاب برپا ہونے لگتا ہے، تو تم ان قوتوں کو اپنی مدد کے لئے کیوں نہیں پکارتے؟ (بے ساختہ) خدا ہی کو کیوں پکارتے ہو؟ اُس وقت تُم ان تمام قوتوں کو بھول جاتے ہو ــــــ پھر، وہ مصیبت بھی خدا ہی کے قانون کے مطابق رفع ہوتی ہے۔ (لیکن اس کے بعد تم، قانونِ خداوندی کو پسِ پشت ڈال کر پھر غیر خدائی قوتوں کے پیچھے چلنے لگ جاتے ہو)۔

(اے رسولؐ!) یہ کچھ تمہارے ساتھ ہی مخصوص نہیں، شروع سے ایسا ہوتا چلا آیا ہے۔ تم سے پہلے بھی ہم، دیگر اقوام کی طرف، اپنے پیغامبر بھیجتے رہے ہیں۔ اُنہوں نے ہمارے قوانین کی خلاف ورزی کی تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ عام مصیبتوں اور تکالیف میں مبتلا ہو گئے۔ یہ ابتدائی تنذیر[1] ہوتی ہے تاکہ لوگ محتاط ہو جائیں اور اپنی اصلاح کرکے، قانونِ خداوندی کے سامنے جھک جائیں۔

لیکن اس تنذیر سے عبرت حاصل کرنے کے بجائے، ان کے دل اور زیادہ سخت ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ان کی مفاد پرستیوں کے جذبات اُن کے کاروبار کو اُن کی نگاہوں میں بڑا خوش نما بنا کر دکھاتے، اور ان سے کہتے کہ

[1] WARNING

جس کام میں اس قدر جلد اور آسانی سے مفاد حاصل ہو رہے ہوں، اُنہیں چھوڑ دینا کہاں کی عقلمندی ہے؟

اگلی آیت میں تاریخِ انسانیت کے ایک اہم گوشے کو سامنے لا کر بتایا گیا ہے کہ قوموں کی تباہی کے بنیادی اسباب کیا ہوتے ہیں۔ سورۃ النحل میں کہا گیا ہے کہ جب کوئی قوم انعاماتِ خداوندی (زندگی کی مرفہ الحالی اور رزق کی فراوانی) سے کفر برتتی ہے، اور نظامِ خداوندی کے بجائے اپنا خود ساختہ نظام قائم کر لیتی ہے تو فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ

قوموں کی تباہی کے اسباب

الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ (۱۶/۱۱۲) "اس پر بھوک اور خوف کا عذاب مسلّط ہو جاتا ہے"۔ یعنی قوموں کی تباہی کا ایک سبب، رزق کی تنگی، معاشی بدحالی، مفلسی، غریبی، محتاجی، اپنی روٹی کے لئے بھی گداگری ہوتا ہے۔ لیکن دُوسری طرف کہا کہ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا (۲۸/۵۸)۔ "کتنی قومیں ایسی تھیں جو دولت و ثروت کی فراوانی کی وجہ سے تباہ ہو گئیں"۔

قوموں میں بعض رذائم اور جرائم مفلسی اور بدحالی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور بعض جرائم، دولت کی فراوانی کے نشہ کی وجہ سے۔ اوّل الذکر معائب کو اگر فالج سے تعبیر کیا جائے تو ثانی الذکر کو سرسام قرار دیا جائے گا۔ تباہی بہرحال دونوں قسم کے معائب سے واقعہ ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم ایسا متوازن اقتصادی نظام عطا کرتا ہے جس میں نہ کوئی شخص مفلسی اور محتاجی کا فالج زدہ ہوتا ہے، اور نہ ہی کوئی دولت کی فراوانی کے سرسام میں مبتلا۔ قوموں کی اس قسم کی تباہی کے متعلق کہا:

۶/۴۴ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۝

اُنہیں یہ مفادِ عاجلہ حاصل اس لئے ہوتے کہ ہمارا قانونِ مکافاتِ عمل، عمل اور اس کے نتیجہ کے ظہور میں، مہلت کا وقفہ رکھتا ہے، اس لئے انسان کی غلط روش سے یہ نہیں ہوتا کہ وہ فوراً تباہ ہو جائے ـــــ چنانچہ وہ لوگ خدا کے قانون کو پسِ پشت ڈال دیتے، لیکن اس کے باوجود، اُن پر سامانِ زیست کے دروازے کھلے رہتے (۲۸/۵۸)۔ وہ اسی طرح، قوّت اور دولت کے نشہ میں بدمست ہوتے چلے جاتے، اور اس کے ساتھ ہی، اُن کی غلط روش کے تباہ کُن اثرات بھی آہستہ آہستہ جمع ہوتے رہتے، تا آنکہ اُن کے ظہور کا وقت آ جاتا، تو وہ قوم اپنی توقعات کے یکسر خلاف، گرفت میں آ جاتی۔ اور ان پر ایسی تباہی آتی کہ اُن کی باز آفرینی کی کوئی صورت باقی نہ رہتی۔

رزق کے دروازوں کا ایک طرح کھلنا، قوانینِ خداوندی کی اتباع سے ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ زمین و آسمان کی

برکات سے متمتع ہونا ہوتا ہے۔ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۔ (۷/۹۶) ۔ اور دوسری طرف یہی دروازے، قوانینِ خداوندی کو فراموش کرنے سے کھلتے ہیں، جس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ رزق وہی ہوتا ہے۔ اس کا مصرف نتائج بدل دیتا ہے۔

جائز ذرائع سے فراوانیٔ رزق

رزق نوعِ انسان کی ربوبیتِ عامہ کے لئے ہو تو نتیجہ تعمیر و تحسین۔ ذاتی یا گروہی ملکیت کے لئے ہو، تو نتیجہ تباہی اور بربادی۔ کس نوعیت کی تباہی اور بربادی؟ اس کے لئے آپ نے شاید آیت کے آخری الفاظ پر غور نہیں فرمایا۔ فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۔ ایسی تباہی جس سے وہ زندگی کی بازآفرینی کی طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں! اپنے مستقبل کی طرف سے مایوسی، شدید ترین عذاب ہوتا ہے اگر پودا اُوپر سے خشک ہو گیا ہے لیکن اس کی جڑ ثابت ہے تو اس کی بارِ دیگر سرسبزی و شادابی کی اُمید ہو سکتی ہے۔ لیکن جس پودے کی جڑ کٹ جائے، اُس کی حیاتِ نو کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا ہے۔ ایسی ہی قومیں زندگی کی بازآفرینی کی طرف سے مایوس ہوتی ہیں۔

۶/۴۵ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

اس طرح اس قوم کی جڑ کٹ جاتی جو دوسروں کے حقوق کو غصب کر کے انسانیت پر ظلم اور زیادتی کرتی تھی۔ جب ان کی تباہی سے نظامِ ربوبیت کی راہ میں حائل ہونے والے موانع دُور ہو جاتے، تو وہ نظام، دنیا کے لئے وجۂ ہزار حمد و ستائش بن جاتا۔ اس طرح یہ تخریبی مرحلہ تعمیری منزل کا پیش خیمہ بن جاتا۔ یہی ہمارا قانون ہے یہاں ہر تعمیر سے پہلے تخریب ہوتی ہے۔ حق کے نظام کے متمکن ہونے کے لئے، باطل کے نظام کی شکست و ریخت ضروری ہے۔ جب تک ظالم کی جڑ نہ کٹے، مظلوم کی کھیتی ہری نہیں ہوتی (ظالم کی تباہی پر ہر مظلوم بے ساختہ پکار اُٹھتا ہے کہ الحمد للہ ربّ العٰلمین ـــــ کس قدر سزاوارِ حمد ہے خدا کا عالمگیر نظامِ ربوبیت؟)

ظالم کی جڑ کٹ جاتی ہے

آپ غور فرمایئے کہ قرآن کریم نے کس مقام پر "الحمد للہ ربّ العٰلمین" کہا ہے؟ یہ وہ الفاظ ہیں جن سے قرآن کریم (سورہ فاتحہ) کا آغاز ہوتا ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے، نظامِ خداوندی کا مقصود و منتہیٰ، ربوبیتِ عالمینی ہے جو وجۂ حمدیت ہے۔ جو عناصر اس ربوبیت کا راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں، اُن کا راستہ سے ہٹا دینا عالمگیر انسانیت کے لئے جشنِ مسرت منانے کی تقریب ہوگی۔ ظالم کی جڑ کٹ جانے پر ہر مظلوم کی زبان پر بے ساختہ آئے گا کہ الحمد للہ ربّ العٰلمین

اور ان میں سے ہر ایک پکار اُٹھے گا ؎

مرگِ تو اہلِ جہاں را زندگی ست　　　باش! تا بینی کہ انجام تو چیست؟

عالمگیر ربوبیت کا راستہ روکنے والے، سرمایہ داروں سے جب کہا جائے کہ تم اس قدر مال و دولت کے واحد مالک کس طرح بن بیٹھے ہو، تو وہ (قارون کے الفاظ میں) جواب میں کہتے ہیں: اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ط (۲۸/۷۸) "اسے میں نے اپنی ہنر مندی سے کمایا ہے، یہ میری ذاتی صلاحیتوں کا حاصل کردہ ہے۔ اس میں کسی اور کو دخل دینے کا

نظامِ سرمایہ داری کی تردید

کیا حق حاصل ہے؟" قرآن کہتا ہے کہ یہ ذہنیت کسی ایک قارون تک محدود نہیں۔ دنیا کے ہر سرمایہ دار کی یہی ذہنیت ہوتی ہے۔ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ (۳۹/۴۹) "اور یہی ذہنیت ساری خرابیوں کی جڑ اور فسادِ آدمیت کی بنیاد ہے"۔ حصولِ علم کا ذریعہ سماعت و بصارت (حواس) ہیں۔ انہی سے اکتسابِ رزق کی صلاحیت ترتیب پاتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان سے یہ پوچھو کہ یہ ذرائع حصولِ علم تمہاری اپنی ہنر مندی کا نتیجہ ہیں یا تم نے کسی سے خریدے ہیں؟ یہ تو خدا کے عطا کردہ ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (۱۶/۵۳)۔ یہ سب نعماءِ خداوندی ہیں جو انسان کو بلا مزد و معاوضہ عطا ہوتی ہیں، لہٰذا اس کی رُو سے حاصل کردہ مال و دولت کا انسان "واحد مالک" نہیں ہو سکتا۔ یہ اسباب و ذرائع خدا کے عطا کردہ ہیں اور انسان کی صرف محنت ہے۔ لہٰذا اس کے ماحصل میں سے وہ صرف اپنی محنت کے معاوضہ کا حقدار ہے۔ [لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (۵۳/۳۹)] باقی سب خدا کا ہے جسے اُس کے حکم کے مطابق، ضرورتمندوں میں تقسیم کر دینا چاہیے۔ (تفصیل ان امور کی 'قرآن کے معاشی نظام' کے تحت ملے گی جسے انڈکس میں دیکھ لیجئے)۔ یہاں اس نکتہ کی وضاحت اس انداز سے کی:

۶/۴۶ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ط اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ○

(ان تاریخی شواہد کو سامنے لانے کے بعد، ان سے پوچھو کہ تم عوام کے حقوق کو یہ سمجھ کر غصب کرتے ہو کہ تم عقل و فکر میں اُن سے بڑھ کر ہو، اس لئے تمہیں حق پہنچتا ہے کہ تم، مکر و فریب سے اُن کا سب کچھ چھین جھپٹ لو۔ لیکن یہ بتاؤ کہ عقل و خرد کی تمام صلاحیتیں دی ہوئی کس کی ہیں؟ یہ نہ تو تمہاری خود پیدا کردہ ہیں، نہ تم نے انہیں کہیں سے خریدا ہے۔ یہ تمہیں خالقِ فطرت کی طرف سے ملی ہیں) اگر وہ سمع و بصر و قلب کی ان صلاحیتوں کو سلب کرلے، تو کیا کوئی اور قوت ایسی ہے جو ان صلاحیتوں کو تمہیں واپس

دیدے؟ ہم کس طرح مختلف دلائل و براہین کو پھیر پھیر کر ان کے سامنے لاتے ہیں، لیکن، یہ اس کے باوجود، حق و صداقت سے منہ موڑے رکھتے ہیں۔

اس حقیقت کو تسلیم نہ کرنے سے وہ ذہنیت پیدا ہوتی ہے جس کا نتیجہ قوموں کی تباہی ہوتا ہے۔

۶/۴۷ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

ان سے پوچھو کہ اگر وہ تباہ کن انقلاب تم پر اچانک آجائے۔ یا اُس کی علامات قبل از وقت اُبھر کر تمہارے سامنے آجائیں، تو اس سے تمہاری ہلاکت ہوگی یا کسی اور قوم کی؟ ہم تمہیں بتا چکے ہیں کہ جو قوم دوسروں پر ظلم و زیادتی کرتی ہے، وہ ہلاک ہو کر رہتی ہے، اور چونکہ تم ایسا ہی کرتے ہو، اس لئے تمہارے سوا اور کونسی قوم ہلاک ہوگی؟ اس انقلاب میں تمہاری ہی تباہی اور بربادی ہوگی۔

اس حقیقت کو بار بار بیان کیا گیا ہے کہ خدا نے انسان کو پیدا کیا۔ تو یہ نہیں کہ اسے بتایا نہ گیا ہو کہ زندگی کی کامرانیوں اور خوشگواریوں کی راہ کونسی ہے، اور تباہیوں اور بربادی کی طرف لے جانے والا راستہ کونسا؟ اس مقصد کے لئے اُس نے بعثتِ انبیاءِ کرامؑ کا سلسلہ جاری کیا تھا:

۶/۴۸-۴۹ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝

ہمارا قانون جو پیغمبروں کی وساطت سے بھیجا جاتا ہے، ہر دو نظامہائے زندگی کے نتائج کو کھلے طور پر بیان کر دیتا ہے ——— صحیح نظام کا نتیجہ زندگی کی خوشگواریاں۔ غلط نظام کا مآل، تباہی اور بربادی ———

اس کے بعد، جو قوم صحیح روشِ زندگی اختیار کر لیتی ہے، اسے کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوتا۔

اس کے برعکس، جو قوم ہمارے قوانین کو جھٹلا کر غلط روشِ زندگی پر مُصر رہتی ہے، اُس پر تباہی اور بربادی کا عذاب مسلّط ہو جاتا ہے ——— بے راہ روی کا یہی نتیجہ ہوا کرتا ہے۔

اس نکتہ کو پھر سمجھ لیجئے کہ حضراتِ مُرسلینؑ من اللہ کا فریضہ، رسالات (پیغامات) خداوندی کو انسانوں تک پہنچانا ہوتا تھا۔ خدا نے نوعِ انسانی تک جو آخری پیغام پہنچانا تھا، وہ قرآنِ کریم میں مکمل کر دیا گیا۔ اسے غیر متبدل قرار

دیا گیا، اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔ اس لئے نبی اکرمؐ کے بعد کسی مامور من اللہ کے آنے کی ضرورت نہ رہی۔ اسے ختمِ نبوّت کہا جاتا ہے۔

واضح راہ نمائی قرآن کریم نے ایمان و اعمالِ صالح اور دوسری طرف تکذیبِ رسالاتِ خداوندی کے عواقب کو ایسی محسوس شکل میں واضح کر دیا ہے کہ ان کی روشنی میں کوئی قوم اپنے آپ کو اس فریب میں مُبتلا نہیں رکھ سکتی کہ وہ ایمان و اعمالِ صالح کی پابند ہے یا تکذیب و کفر کی حامل۔ ایمان و اعمالِ صالح کا نتیجہ خوف اور حزن سے مامونیت اور تکذیب و فسق کا نتیجہ تباہی اور بربادی۔ سو ہر قوم اپنی حالت سے اندازہ کر سکتی ہے کہ وہ مومن ہے یا فاسق۔

انبیاء کرامؑ کا فریضہ یہ تھا کہ وہ غلط اور صحیح راستے میں امتیاز کر کے دکھا دیں، لیکن محسوسات کے خوگر انسان مطالبہ کرتے تھے کہ وہ انہیں کوئی معجزہ دکھائیں۔ یہ منشاءِ خداوندی کے خلاف تھا کہ انسان کی عقل و فکر کو ماؤف کر کے اُسے مجبوراً ایک خاص راستہ پر چلایا جائے۔ اس لئے اس مطالبہ کو مسترد کیا جاتا رہا۔ اس کی تشریح مطالب الفرقان جلد اوّل صفحہ ۹-۳۰ اور جلد سوم صفحہ ۲۴ پر گزر چکی ہے۔ (نیز سابقہ صفحات میں) یہاں بھی اسی کو دہرایا گیا ہے۔ فرمایا:

۶/۵۰ قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۭ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۭ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۧ

(ان سے کہہ دو کہ میں بھی، انبیاء سابقہؑ کی طرح، تمہیں یہی بتانے کے لئے آیا ہوں کہ کونسی روش کا نتیجہ کیا ہوگا)۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں، یا یہ کہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں۔ یا میں کوئی فرشتہ ہوں۔ میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں، اور جو کچھ مجھ پر خدا کی طرف سے وحی ہوتا ہے، اُس کا اتباع کرتا ہوں۔ اور اس کی روشنی میں، اپنی آنکھوں سے دیکھ کر راستہ چلتا ہوں۔ اس کے برعکس، تم نہ وحی کا اتباع کرتے ہو، نہ عقل و فکر سے کام لیتے ہو۔ بس اپنے اسلاف کے راستے پر آنکھیں بند کئے چلے جا رہے ہو۔

مجھے بتاؤ کہ کیا اندھا اور آنکھوں والا، دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم اتنا بھی نہیں سوچ سکتے؟

بینا اور اندھا برابر نہیں ہو سکتے یہاں دو لفظوں میں بات نکھار کر بیان کر دی۔ یعنی عقل و فکر سے کام لینے والا بینا، اور توہم پرستی اور جہالت پر اصرار کرنے والا اندھا۔ پوچھا کہ بتاؤ کہ کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ سو جب یہ دونوں ایک جیسے نہیں ہو سکتے، تو تم کیوں جہالت پر

اصرار کرتے ہو؟

آیت ۴۸ میں کہا گیا تھا کہ انبیاءؑ کا فریضہ تبشیر و تنذیر ہے۔ کہا گیا کہ انبیاء کرامؑ کو بے شک اپنا یہ فریضہ ادا کرتے رہنا چاہیئے، لیکن ان کی اس تبلیغ و تنذیر سے وہی لوگ مستفید ہو سکتے ہیں جو اس حقیقت پر یقین رکھیں کہ غلط کاموں کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔

۶/۵۱ وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝

اے رسول! تو، اس قرآن کی رُو سے، ان لوگوں کو زندگی کے پُرخطر راستوں سے آگاہ کر تا رہ جو خدا کے قانونِ مکافات پر یقین رکھتے ہیں، اور جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کی تو نہ اُن کا کوئی رفیق و مددگار ہو سکتا ہے، نہ سفارشی، جو انہیں اُس کے تباہ کن نتائج سے بچا سکے۔

اُنہیں اس طرح سمجھانے سے مقصد یہ ہے کہ شاید یہ زندگی کے خطرات سے اپنی حفاظت کریں۔

حضراتِ انبیاء کرامؑ کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ اُن کی دعوت کو سب سے پہلے وہ لوگ قبول کرتے تھے جو معاشرہ میں ضعیف و ناتوان، محتاج و محروم، مستبد قوتوں کے دبائے ہوئے اور کچلے ہوئے تھے۔ یہ اس لئے کہ نظامِ خداوندی کا مقصد ان انسانوں کو، پستیوں سے اُٹھا کر شرفِ انسانیت اور احترامِ آدمیت کی بلندیوں پر لے جانا ہوتا تھا۔ ان کے برعکس، دولتمند اور مستبد طبقہ اُس کی مخالفت کرتا تھا۔ کیونکہ اس نظام کی کامیابی میں اُنہیں اپنی موت نظر آتی تھی۔ وہ اس دعوت کی مخالفت تو اس بناء پر کرتے، لیکن اعتراض یہ کرتے تھے کہ ہم یہ کیسے برداشت کرلیں کہ یہ غریب اور مفلس انسان، جنہیں ہم اس معاشرہ میں ذلیل ترین افراد سمجھتے ہیں، ہمارے ہمدوش ہو جائیں۔ چنانچہ وہ مطالبہ کرتے کہ ان لوگوں کو اس جماعت سے نکال دیا جائے، تو ہم پھر اس دعوت کو سننے کے لئے تیار ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ اُن کے اِس مبنی پر تمرد اور رعونت مطالبہ کو کسی صورت میں بھی درخورِ اعتناء نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ رسولؐ کی طرف سے دو ٹوک الفاظ میں اسے مسترد کر دیا جاتا اس سے اُن کی مخالفت اور بھی بڑھ جاتی، اور اس مخالفت کا اوّلین ہدف، یہی کمزور اور ناتوان افراد بنتے۔ وحی اور رسالت کی ساری تاریخ اسی کشمکش کی داستانِ عبرت آموز ہے۔ سلسلۂ وحی کا آغاز حضرتِ نوحؑ سے ہوا تھا، اور قرآنِ کریم نے اُن کے تذکارِ جلیلہ کے سلسلے میں اسی کشمکش کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ (دیکھئے آیات (۱۱/۲۷-۲۹)؛ (۲۶/۱۱۱-۱۱۴)

غریبوں کی جماعت

حضرتِ نوحؑ کا جواب تھا: وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ط (۱۱/۲۹)۔ "میں تمہاری خاطر ان لوگوں کو دھتکار

نہیں سکتا جو اس دعوت کو قبول کر چکے ہیں"۔ یہی حضور نبی اکرمؐ سے فرمایا گیا:

۶/۵۲ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ ۖ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِم مِّن شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِم مِّن شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُونَ مِنَ الظَّالِمِينَ ○

اس دعوتِ انقلاب پر سب سے پہلے بالعموم کمزوروں اور مظلوموں کا طبقہ لبیک کہے گا، اور اکابرین یہ کہکر اس کی مخالفت کریں گے کہ ہم اس تحریک میں کسطرح شامل ہو جائیں، جس میں ہم اور یہ پست درجہ کے لوگ ایک ہی صف میں بٹھا دیئے جائیں؟ تم انہیں اس جماعت سے خارج کر دو، تب ہم تمہارے ساتھ شامل ہوں گے۔ سو دیکھنا! کہیں ایسا نہ کرنا کہ (ان لوگوں کی خاطر) اپنی جماعت سے اُن لوگوں کو دُور دُور رکھنا شروع کر دو جو خالصۃً 'لِوَجْہِ اللّٰہ' اس دعوت کے عام کرنے میں صبح و شام سرگرداں رہتے ہیں، اور اپنا کوئی ذاتی مفاد ان کے پیشِ نظر نہیں ہوتا۔ یہ چیز کہ تمہاری جماعت میں بیشتر غریب اور مظلوم شامل ہوتے ہیں، تمہیں کسی طرح موردِ الزام ٹھیرا نہیں سکتی۔ (یہ کیا کام کاج کرتے ہیں اور تم کیا کرتے ہو، اس بات کا تمہارے پروگرام پر کسی قسم کا اثر نہیں پڑنا چاہیے۔ تمہارا اور ان کا رشتہ کاروبار کا نہیں، دین کا ہے۔ اور دین کے رشتے میں قریب ترین وہی لوگ ہوتے ہیں جو اس کی خاطر زیادہ سرگرمِ عمل رہتے ہیں۔) اس لئے تمہاری یہ خواہش کہ اس جماعت میں بڑے بڑے لوگوں کو بھی شامل ہونا چاہیئے تاکہ وہ دین کی تقویت کا موجب بنیں، کسی طرح اِن غریبوں کے خلاف نہیں جانی چاہیئے۔ اگر تم نے اس مقصد کے پیشِ نظر، ان لوگوں کو دُور ہٹا دیا، تو یہ بڑی زیادتی ہوگی۔ (۱۱/۲۷-۳۰؛ ۲۶/۱۱۱-۱۱۴؛ ۱۸/۲۸؛ ۸/۶۲-۶۴؛ ۸۰/۱-۱۱؛ ۱۵/۸۸؛ ۴۸/۲۹؛ ۸/۷۲-۷۵؛ ۹/۱۰۰؛ ۳/۱۷۲)

اِس جماعت کی اہمیت کس قدر تھی، اور حضورؐ کو ان کی حفاظت اور رفاقت کے لئے کس شدت سے تاکید کی گئی تھی، اس کا تذکرہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آتا ہے۔ کہیں کہا گیا ہے کہ انہیں استقامت سے اپنے ساتھ رکھو (۱۸/۲۸)۔

جماعتِ صحابہؓ کی اہمیت

کہیں یہ کہ ان کی حفاظت اور نگہ پرداخت نہایت رافت اور محبت سے کرو (۱۵/۸۸)۔ سورہ انفال میں اس جماعت کی اہمیت ایسے الفاظ میں ثبت کی گئی ہے کہ جوں جوں نگۂ بصیرت اس پر غور کرتی ہے، ان حضرات کی عظمت اور رفعت درخشندہ سے درخشندہ تر ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ پہلے فرمایا کہ "اے رسولؐ! اللہ تعالیٰ اپنی نصرت اور جماعتِ مومنین کے ذریعے تمہیں تقویت پہنچائیگا (۸/۶۲)" یعنی صرف نصرتِ خداوندی نہیں، بلکہ نصرتِ خداوندی اور رفاقتِ جماعتِ مؤمنین دونوں کے ذریعے۔ اور

ایک ہی آیت کے بعد اس کی وضاحت ان بلیغ الفاظ میں کر دی:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِىُّ حَسْبُكَ ٱللَّهُ وَمَنِ ٱتَّبَعَكَ مِنَ ٱلْمُؤْمِنِينَ ۝ (۸/۶۴)

اے رسولؐ! تیرے لئے خدا اور یہ جماعت مومنین، جو تیرا اتباع کرتی ہے، کافی ہے۔

یعنی اکیلا خدا کافی نہیں۔ خدا اور یہ جماعت مومنین، دونوں مل کر تیرے لئے کافی ہوں گے۔ غور فرمائیے کہ صحابہ کبارؓ کی عظمت کے سلسلہ میں اس سے زیادہ کیا کہا جاسکتا تھا اور اس آیۂ جلیلہ کی تو ابتداء ہی ان الفاظ سے کی گئی تھی کہ مُّحَمَّدٌ رَّسُولُ ٱللَّهِ ۚ وَٱلَّذِينَ مَعَهُۥٓ (۴۸/۲۹) جس میں دینِ خداوندی کی نہایت جامع اور دلکش تصویر بڑے حسین اور دلآویز انداز میں کھینچی گئی ہے۔

دوسری طرف ان صحابہؓ کے ایمان اور ان کے مقام کی کیا کیفیت اور نوعیت تھی، اس کی تفصیل مطالب الفرقان جلد اوّل۔ صفحہ ۲۲۵ پر گزر چکی ہے۔

ان کے برعکس ان رعونت و تکبر کے پیکروں کی ذہنیت آشکارا کرنے کے لئے کہا گیا کہ:

۶/۵۳ وَكَذَٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لِّيَقُولُوٓا۟ أَهَٰٓؤُلَآءِ مَنَّ ٱللَّهُ عَلَيْهِم مِّنۢ بَيْنِنَآ ۗ أَلَيْسَ ٱللَّهُ بِأَعْلَمَ بِٱلشَّٰكِرِينَ ۝

یہ بڑے لوگ، ان چھوٹے لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ لو! یہ ہیں وہ جنہیں ہم میں سے انعاماتِ خداوندی کے لئے چن لیا گیا ہے۔ ذرا ان کی حالت تو دیکھو؟ تم نے دیکھا کہ ان باتوں سے، ان لوگوں کی نفسیاتی کیفیت کس طرح نکھر کر سامنے آگئی اور صاف معلوم ہو گیا کہ وہ کون سا جذبہ ہے جو انہیں حق و صداقت کی طرف آنے سے روک رہا ہے؟ تم ان سے کہدو کہ اس نظام میں عزت اور ذلت کے معیار بالکل مختلف ہیں۔ یہاں، جو جس قدر، قوانین خداوندی کا پاسدار اور قدر شناس ہوتا ہے، اتنا ہی زیادہ واجب التکریم سمجھا جاتا ہے۔ (۴۹/۱۳)

دوسری طرف اس جماعت کے متعلق کہا:

۶/۵۴ وَإِذَا جَآءَكَ ٱلَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِـَٔايَٰتِنَا فَقُلْ سَلَٰمٌ عَلَيْكُمْ ۖ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ ٱلرَّحْمَةَ ۖ أَنَّهُۥ مَنْ عَمِلَ مِنكُمْ سُوٓءًۢا بِجَهَٰلَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنۢ بَعْدِهِۦ وَأَصْلَحَ فَأَنَّهُۥ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

لہذا، جب تمہاری جماعت کے لوگ تمہارے پاس آئیں تو ان سے کہو کہ وہ بالکل نہ گھبرائیں، ان کے لئے ہر طرح کا

امن اور سلامتی ہے۔ یہ نظام، ان بڑے لوگوں کی خاطر تمہارا ساتھ نہیں چھوڑے گا۔ تمہارے پروردگار نے اپنے اُوپر واجب قرار دے رکھا ہے کہ تمہاری پوری پوری نشوونما ہو جائے۔ حتیٰ کہ اگر تم میں سے کسی سے کوئی بھول چوک بھی ہو جائے، اور اس کے بعد وہ اپنے کئے پہ نادم ہو، اور آئندہ کے لئے اپنی اصلاح کر لے، تو اُسے بھی اس نظام کی حفاظت اور مرحمت سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ (نظامِ عدل میں، عفو و اصلاح کی گنجائش رکھ دینا بھی خدا کی رحمت ہے۔ اس طرح "عدل" "رحم" اور ایک دوسرے سے متضاد نہیں رہتے۔ قانون کے مطابق "عفو" بھی "عدل" کا ایک گوشہ بن جاتا ہے)

اس آیت میں پھر کَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ آیا ہے جس کی تشریح سابقہ صفحات، آیت (۶/۱۲) کے تابع گزر چکی ہے۔ توبہ کے متعلق انڈکس دیکھئے نیز اُسی جلد میں آیت (۴/۱۷-۱۹) کی تفسیر۔ ان تصریحات کے بعد فرمایا:

۶/۵۵ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ۟

ہم اس طرح اپنے قوانین کو کھول کھول کر بیان کرتے ہیں تاکہ (سہو و خطا سے لغزش کرنے والوں اور دیدہ و دانستہ جُرم کرنے والوں کی راہیں ایک دوسرے سے، متمیز ہو جائیں۔

نظامِ عدل کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ قانون نہایت واضح طور پر ہر ایک کے سامنے آجائے[1]۔ یہ افراد کا فریضہ نہیں کہ وہ معلوم کرتے پھریں کہ قانون کیا ہے اور اس کا مفہوم و مطلب کیا۔ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ قانون کی اس طرح نشر و اشاعت کرے کہ وہ ہر ایک کے علم میں آجائے۔ اور پھر ایسا انتظام کرے کہ متنازعہ فیہ امور کے سلسلہ میں متعلقہ فریق معلوم کر سکیں کہ اس باب میں قانون کیا ہے۔ اور اس کا منشاء اور مفہوم کیا، تاکہ ہر فریق سمجھ لے کہ اس کا دعویٰ قانون کے مطابق ہے یا نہیں۔ اگر حکومت کی طرف سے ایسی مشینری متعین کر دی جائے تو مقدمات کے تصفیہ کے سلسلہ میں وہ تمام الجھنیں دُور ہو جائیں جن کی وجہ سے آجکل لوگوں کو اس قدر پریشانیاں اٹھانی پڑتی ہیں۔

قانون غیر مبہم ہونا چاہیئے

دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ اس طرح مجرمین کا راستہ واضح طور پر الگ اور متمیز ہو جائے۔ یہ بڑی امن کی راہ ہے۔ آجکل حالت یہ ہے کہ معاشرہ میں فریب کار اور جرائم پیشہ لوگ دوسروں کے ساتھ اس طرح گھلے ملے رہتے ہیں کہ شریف لوگ انہیں پہچان ہی نہیں سکتے اور اس طرح اُن کے دامِ فریب میں آجاتے ہیں۔ اگر ایسی صورت ہو کہ

---

[1] اس کی وضاحت سابقہ باب میں زیرِ آیت (۵/۱۹) اور اس سے پہلے زیرِ آیت (۴/۱۶۵) میں کی جا چکی ہے۔

مجرم متمیز ہوں گے جرائم پیشہ لوگ آسانی سے پہچانے جاسکیں تو شریف انسان بڑے امن میں رہیں۔ قرآنِ کریم نے مثالی معاشرہ کی ایک خصوصیت یہ بھی بتائی ہے کہ اس میں مجرمین شریف لوگوں سے الگ ہوں گے۔ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ۔ (۳۶/۵۹)۔ ایسے نمایاں طور پر الگ اور متمیز، کہ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ (۵۵/۴۱) "مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے"۔ اس طرح کوئی شخص دھوکا نہیں کھاسکے گا کہ جس سے وہ معاملہ کر رہا ہے وہ شریف ہے یا بدمعاش۔ یوں ان کی راہیں الگ الگ نظر آجائیں گی۔

پیچھے سے بات یوں چلی آرہی تھی کہ قوم کے بڑے بڑے سردار مطالبہ کرتے تھے کہ آپ ان مفلسوں اور ناداروں کو جنہیں وہ معاشرہ میں ذلیل سمجھتے تھے، اپنی جماعت سے الگ کر دیں تو پھر ہم آپ کے ساتھ شامل ہوسکیں گے۔ ظاہر ہے کہ اُن کا یہ مطالبہ سراسر ان کے پست جذبات پر مبنی تھا۔ یعنی ان کی انانیت اور تکبّر کے جذبات اسے برداشت نہیں کرسکتے تھے کہ جنہیں وہ ذلیل سمجھتے ہیں وہ اُن کے ہمدوش کھڑے ہو جائیں۔ ان سے کہا گیا کہ دین کا نظام قوانین پر مبنی ہے نہ کہ جذبات پرستی پر۔ قانون کا تقاضا مساواتِ انسانیہ ہے۔ اس لئے دین کا مدعی، قانون کو چھوڑ کر کسی کے جذبات کا اتباع نہیں کرسکتا۔ فرمایا:

۶/۵۶ قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّاۤ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۝

لہذا، (ان بڑے بڑے لوگوں سے) کہدو کہ تم خدا کو چھوڑ کر جنہیں پکارتے ہو، مجھے اُن کی اطاعت سے روک دیا گیا ہے۔ میں تمہاری خاطر ایسا نہیں کرسکتا۔ تمہارا مطالبہ جذبات پر مبنی ہے اور میری دعوت قانونِ خداوندی پر۔ لہذا میں اس قانون کو چھوڑ کر تمہارے جذبات کا اِتباع نہیں کرسکتا۔ اگر میں ایسا کروں تو میں بھی تمہاری طرح راہ گم کردہ ہو جاؤں گا۔ سیدھے راستے پر نہیں رہوں گا۔

قانون دلائل و براہین پر مبنی ہوتا ہے اور جذبات میں علم و بصیرت اور دلیل و بُرہان کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ جذبات پرست لوگ دھاندلی سے قانون کی تکذیب کرتے ہیں، اس لئے ان دونوں گروہوں میں مفاہمت کی صورت پیدا نہیں ہوسکتی:

۶/۵۷ قُلْ اِنِّيْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ ۝

مَیں اپنے نشو و نما دینے والے کی طرف سے ایک واضح راستے پر ہوں، اور تم اُسے جھٹلاتے ہو۔ (اس لئے مجھ میں اور تم میں مفاہمت کس طرح ہو سکتی ہے؟ تمہارا راستہ اور، میرا اور) باقی رہا تمہارا یہ کہنا کہ جس تباہی اور بربادی سے تم ہمیں ڈرا رہے ہو، وہ جلدی کیوں نہیں آتی، تو عمل اور اس کا نتیجہ برآمد ہونے میں ایک وقفہ ہوتا ہے (جیسے درخت کے پھل لانے کے لئے ایک مدّت درکار ہوتی ہے)۔ یہ میرے بس کی بات نہیں کہ میں اُس مدّت میں تخفیف کر کے، تباہی کو تمہارے سامنے جلدی سے آؤں۔ ان باتوں کا فیصلہ خُدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ اپنے قانون کو ٹھیک ٹھیک طور پر بتا دیتا ہے اور پھر اُسی کے مطابق فیصلے کرتا ہے۔ اُس سے بہتر فیصلہ کرنے والا کوئی اور نہیں۔

اسکے بعد مخالفین کے اِس اعتراض کو پھر سامنے لایا گیا جو وہ اکثر کرتے تھے۔ یعنی یہ کہ جس تباہی سے رسولؐ انہیں متنبہ کرتا ہے، وہ آتی کیوں نہیں اِس میں دیر کیوں ہو رہی ہے؟

۶/ ۵۸-۵۹ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَیْنِیْ وَبَیْنَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِیْنَ ۝ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا یَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ۝

اِن سے کہو کہ جس تباہی کے لئے تم جلدی مچا رہے ہو، اگر اُس کا جلدی سے آنا میرے اختیار میں ہوتا، تو میرے اور تمہارے درمیان کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ لیکن (یہ چیز میرے بس کی نہیں)۔ اس کا علم تو خدا ہی کو ہے کہ زیادتی کرنے والوں کے اعمال کے نتائج کے ظہور کا وقت کون سا ہے۔

اعمال کے اَن دیکھے نتائج، اور انسانی نگاہوں سے مستور حقائق و حوادث کو سامنے لے آنے والا قانون اُسی کا ہے۔ غیب کا علم اُس کے سوا کسی کو نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ کائنات کی خشکی اور تری (بحر و بر) میں کیا ہو رہا ہے۔ کس درخت سے کوئی پتہ کب جھڑے گا۔ زمین کی تاریکیوں میں دبا ہوا دانہ کب پھوٹے گا۔ کوئی تازہ یا خشک میوہ کب کھانے کے قابل ہوگا۔ یہ سب کچھ اُس کے کائناتی قوانین کے مطابق ہوتا ہے اور یہ قانونِ فطرت کی کھلی ہوئی کتاب میں درج ہے۔ (جو لوگ اس کتاب کو پڑھ لیں، اُنہیں ان امور کا علم حاصل ہو سکتا ہے اس علم سے خود اُن کائنات کے تالے کھل سکتے ہیں۔

یہاں دو باتیں کہی گئی ہیں۔ یعنی غیب کے متعلق کہا کہ لَا یَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ۔ غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو

نہیں۔ علمِ غیب کے متعلق مطالب الفرقان جلد اوّل ص ۹۵-۹۰ پر بحث ہو چکی ہے۔ دوسری بات یہ کہی کہ وہ (خدا) جانتا ہے جو بحر و بر میں ہے...... وغیرہ۔ ان امور کے متعلق صرف اتنا ہی کہا کہ خدا کو ان کا علم ہے ہے۔ یہ نہیں کہا کہ اس کے سوا انہیں کوئی نہیں جانتا یا جان سکتا۔ لہٰذا، یہ امور، غیب میں سے نہیں۔ یہ سب صحیفۂ کائنات میں مذکور ہیں اور قوانینِ فطرت کے مطابق رُو نما ہوتے رہتے ہیں۔ ان قوانین کا علم حاصل کرنے کی صلاحیت انسان کو عطا کر دی گئی ہے۔ جو لوگ ان قوانین کا علم حاصل کریں گے، انہیں اِن امور کا علم ہو جائے گا۔ (قوانینِ فطرت کے متعلق انڈکس میں "فطرت" کا عنوان دیکھئے)۔

علمِ غیب۔ اور قوانینِ فطرت

اسی قسم کی ایک اور آیت بھی ہے، جس پر غور نہ کرنے سے اُلجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ ج وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ج وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ط وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ط وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ط إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۝ ع (۳۱/۳۴)

یہ ظہورِ نتائج کی گھڑی، کب آئے گی، اس کا علم خدا ہی کو ہو سکتا ہے، اگرچہ اعمال کے نتائج مرتب ہونے کا عمل ہر وقت جاری رہتا ہے ــــــ جس طرح بارش برستی تو ایک وقت پر جا کر ہے، لیکن وہ بنتی شروع ہو گئی ہوتی ہے ایک مدت پہلے سے۔ یا جس طرح بچہ پیدا تو ہوتا ہے ایک وقتِ خاص پر جا کر، لیکن وہ رحمِ مادر میں بہت پہلے سے مختلف مراحل سے گزر رہا ہوتا ہے۔ خدا کو ان تمام مراحل کا علم ہوتا ہے۔

اِن امور، یعنی بارش یا جنین کے مختلف مراحل میں سے گزرنے کا علم تو تم بھی حاصل کر سکتے ہو، لیکن خدا وہ کچھ بھی جانتا ہے جو تم نہیں جان سکتے۔ (مثلاً) کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کل (مستقبل میں) کیا کرے گا، اور نہ ہی یہ بتا سکتا ہے کہ اس کی موت کس جگہ واقع ہو گی۔ خدا سب کچھ جاننے والا اور ہر بات سے باخبر ہے (اس لئے خدا کو اس بات کا علم ہے کہ ظہورِ نتائج کی گھڑی کب آئے گی۔ تمہیں اس کا یقین رکھنا چاہیئے کہ وہ ضرور آ کر رہے گی)

اس میں پہلے ہے: إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ۔ "علم الساعت خدا کے ہاں ہی ہے"۔ انسانوں کو اس کا علم نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد ہے: وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ج وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ط بارش اور جنین کے متعلق صرف اتنا ہی کہا ہے کہ خدا کو ان امور کا علم ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ ان کا علم صرف

خدا کو ہوتا ہے، انسانوں کو نہیں ہو سکتا۔ اِس کے بعد پھر دو امور کے متعلق کہا کہ انسان کو ان کا علم نہیں ہو سکتا۔ یعنی یہ کہ وہ کل کیا کرے گا، اور اُس کی موت کہاں واقع ہوگی۔ اس قسم کی آیات میں یہ فرق کرنا ضروری ہوتا ہے کہ وہ کون سے امور ہیں جن کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ ان کا علم صرف اُسی کو ہوتا ہے، اور کون سے امور ایسے ہیں جن کے متعلق کہا ہے کہ خدا کو ان کا علم ہوتا ہے۔ اِن (ثانی الذکر) امور کا علم انسان بھی حاصل کر سکتا ہے۔ یہ علم غیب نہیں۔ علمِ غیب وہی ہے جسے خدا نے اپنے لئے مخصوص کر رکھا ہے۔ وُہ علم کسی اِنسان کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ حتّٰی کہ (اگر خدا بذریعہ وحی عطا نہ کرے تو) رسولوں کو بھی نہیں۔

جس طرح کائنات میں سلسلۂ علت و معلول جاری ہے، یعنی ہر عمل کا نتیجہ قانونِ فطرت کی رُو سے مرتب ہوتا ہے۔ اِس طرح اِنسانی دُنیا میں قانونِ مکافات کا عمل کارفرما ہے جس کی رُو سے انسان کے ہر عمل کا نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ اگلی آیت میں اِن ہر دو قوانین کی مثال ایک ہی مقام پر دے دی گئی ہے فرمایا:-

۶/۶۰ وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ وَ یَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَیْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ یُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۠

(خارجی کائنات میں بہار و خزاں کی گردشوں کی طرح، خود تمہاری زندگی میں بھی لیل و نہار کی گردشیں جاری رہتی ہیں)۔ وہ جانتا ہے جو کچھ تم دن میں کرتے ہو۔ اس کے بعد وہ تمہیں رات کو سلا دیتا ہے، اور پھر تم دن میں اُٹھ بیٹھتے ہو ($\frac{۳۹}{۴۲}$)۔ اس طرح وقت گزرتا جاتا ہے تاکہ تمہارے اعمال کے نتائج کے ظہور کی مدت پوری ہو جائے۔ اور اس دوران میں تمہارا ہر قدم اُسی سمت کو اُٹھ رہا ہوتا ہے (اگرچہ تم اپنے ذہن میں سمجھ رہے ہوتے ہو کہ وہ بات آئی گئی ہو گئی)۔ حتّٰی کہ وہ وقت آ جاتا ہے جب تمہارے اعمال کے نتائج محسوس شکل میں تمہارے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔

"هُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ" کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے۔ اللہ وہ ہے جو تمہیں رات کو وفات دے دیتا ہے (یعنی مار دیتا ہے)۔ (اور پھر دن کو زندہ کر دیتا ہے)۔ ہم نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ "خدا وہ ہے جو تمہیں رات کو سلا دیتا ہے اور پھر تم دن میں اُٹھ بیٹھتے ہو"۔ یہ مفہوم قرآنِ کریم کے ایک اور مقام سے لیا گیا ہے جس میں ایک ایسی عظیم حقیقت کو بیان کیا گیا ہے جس کا صحیح مفہوم دورِ حاضر کے علم النفس

(سائیکالوجی) کی روشنی میں سمجھ میں آسکتا ہے۔ وہ آیت یہ ہے: اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِھَا ج "اللہ نفوس کو وفات دیتا ہے اُن کی موت کے وقت، اور جو لوگ مرتے نہیں اُن کی نیند کی حالت میں"

نیند اور موت میں فرق

ہم نے یہاں یَتَوَفّٰی کا ترجمہ "وفات دے دیتا ہے" کیا ہے اور نفوس کا لفظ بلا مفہوم رہنے دیا ہے۔ آیت کے اتنے حصے میں کہا گیا ہے کہ حالتِ موت اور حالتِ نیند میں نفسِ انسانی پر وفات طاری ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ہے: فَیُمْسِکُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْھَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰٓی اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی ط جن پر موت وارد ہو جاتی ہے، اُن کے نفس کو روک لیتا ہے اور جن پر موت طاری نہیں ہوتی۔ یعنی وہ صرف نیند کی حالت میں ہوتے ہیں، اُن کے نفس کو واپس بھیج دیتا ہے ایک معیّنہ مدت کے لئے۔" اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ (۳۹/۴۲) "جس حقیقت کو یہاں بیان کیا گیا ہے، اس میں اربابِ فکر وتدبر کے لئے مقصود ومنتہیٰ تک پہنچنے کے لئے نشانیاں ہیں۔"

کہا یہ گیا ہے کہ حالتِ نیند اور موت کے عالم میں نفسِ انسانی کو روک لیا جاتا ہے۔ اسے وفات دینے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کونسی چیز ہے جسے نیند اور موت کی حالت میں متوفّی کر دیا جاتا ہے۔ موت کی صورت میں اسے روک لیا جاتا ہے، اور نیند کی صورت میں اسے واپس بھیج دیا جاتا ہے۔

موت کی حالت میں کیا ہوتا ہے ہم نہیں جانتے۔ لیکن نیند کی حالت میں کیا ہوتا ہے، یہ ہمارا روزمرّہ کا تجربہ ہے۔ ظاہر ہے کہ نیند کی حالت میں، جاگنے والے اور سونے والے میں کوئی فرق نہیں ہوتا، بجز ایک بات کے۔ دونوں زندہ ہوتے ہیں۔ دونوں کے جوارح (دل۔ جگر۔ پھیپھڑے۔ تنفس وغیرہ) اپنی اپنی جگہ کام کرتے ہیں جسطرح بیداری کی حالت میں۔ لیکن ان میں ایک فرق ہوتا ہے۔ یعنی بیداری میں انسان کا شعور کام کر رہا ہوتا ہے۔ نیند کی حالت میں شعور کام نہیں کر رہا ہوتا۔ لیکن وہ معدوم نہیں ہوتا، صرف معطل ہوتا ہے کیونکہ کہا گیا ہے کہ جاگنے پر اسے واپس کر دیا جاتا ہے۔ لہٰذا، اس آیت میں نفس سے مُراد انسانی شعور ہے اور وفات دینے کے معانی عارضی طور پر معطل کر دینے کے۔

نفس کے معنی شعور

کہا یہ گیا ہے کہ جو کچھ نیند کی حالت میں ہوتا ہے، وہی کچھ موت کی حالت میں ہوتا ہے۔ یعنی دونوں حالتوں میں انسانی شعور معطل ہوتا ہے۔ موت کی حالت میں اسے اس دنیا میں واپس نہیں بھیجا جاتا، وہیں روک لیا جاتا ہے یعنی

موت کی حالت میں بھی شعور (نفسِ انسانی) معدوم نہیں ہو جاتا۔ وہ موجود ہوتا ہے، صرف اُس کی کارفرمائی، عارضی طور پر، معطل ہو جاتی ہے۔ دوبارہ زندگی کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ معطل شدہ شعور پھر کام کرنے لگ جائے گا۔

حیاتِ آخرت

لہٰذا، حیاتِ آخرت میں انسان کا موجودہ شعور، اپنی تمام صلاحیتوں۔ یعنی خیالات احساسات اور حافظہ کو بدستور لیئے ہوئے کارفرما ہوگا۔ اس زندگی میں اس کی کارفرمائی کا ذریعہ (MEDIUM) طبیعی جسم ہوتا ہے۔ حیاتِ آخرت میں یہ ذریعہ کس قسم کا ہوگا، ہم نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اس کا ذریعۂ فعالیت کچھ بھی ہو، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ شعور تو وہی ہوگا اور وہی اس کی کارفرمائیاں۔

اِس مقام پر اِس پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مزید تفصیل وہاں آئے گی جہاں حیاتِ آخرت پر بحث کی جائے گی۔
ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ ہم نے آیت (۶/۶۰) میں يَتَوَفّٰكُمْ کا ترجمہ سو جانا کیوں کیا ہے۔

بات ہو رہی تھی قانونِ مکافاتِ عمل کی۔ اس تسلسل میں فرمایا:

۶ / ۶۱-۶۲ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ○ ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ؕ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۟ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ○

اُس کا قانونِ مکافات تمام انسانوں پر غالب ہے۔ اُس نے ایسی قوتیں مقرر کر رکھی ہیں جو تم پر نگران رہتی ہیں (تاکہ تمہارا کوئی عمل بے نتیجہ نہ رہنے پائے۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ ظہورِ نتائج، انسان کی اِس زندگی میں ہو جائے۔ زندگی کا سلسلہ اِس سے آگے بھی چلتا ہے۔ چنانچہ) جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجاتا ہے تو ہمارے بھیجے ہوئے کارندے (قانونِ فطرت کے مطابق) اُس کی دنیاوی زندگی کی مدت کو پورا کر دیتے ہیں۔ اور اس میں کسی قسم کی کمی وبیشی نہیں کرتے (۱۳/۱۱؛ ۱۷/۱۳-۱۴؛ ۵۰/۲-۴)
اس کے بعد زندگی اگلے دَور میں داخل ہو جاتی ہے۔ اور وہاں نتائج، ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آجاتے ہیں۔ یہ نتائج خدا کے قانون کے مطابق مرتب ہوتے ہیں۔ اس میں کسی اور کا قانون نہیں چل سکتا۔ فیصلہ اُسی کا ہے۔ اُس کا قانونِ مکافات، نتائج مرتب کرنے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کرتا۔ یہ ساتھ کے ساتھ ہوتا رہتا ہے (یہ الگ بات ہے کہ ان کا مجموعی اثر ایک وقت کے بعد جا کر نمودار ہو)۔

سوال یہ ہے کہ وہ کیا چیز ہے جسے محفوظ کیا جاتا ہے؟ جواب ظاہر ہے کہ وہ انسان کے اعمال ہیں جو نتیجہ خیزی کے لئے محفوظ رکھے جاتے ہیں، جس طرح بیج، زمین میں محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ علم النفس اس پر شاہد ہے کہ انسان کے ہر

اعمال نامہ

عمل، حتّٰی کہ اس کے خیالات اور ارادوں تک کا اثر اس کی ذات (نفس) پر مرتب ہوتا رہتا ہے یہ ذات، ان تمام اثرات و نقوش کو ساتھ لے کر مرنے کے بعد آگے جاتی ہے۔ عام اصطلاح میں اسے "اعمال نامہ" کہا جاتا ہے۔ قرآنِ حکیم نے اس حقیقت کو مختلف انداز سے سمجھایا ہے، یہاں حَفَظَةً کہا ہے محفوظ کر لینے والے۔ سورۃ الرعد میں کہا ہے:

لَہٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَیْنِ یَدَیْہِ وَ مِنْ خَلْفِہٖ یَحْفَظُوْنَہٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ ؕ (۱۳/۱۱)

"انسان کے آگے اور پیچھے ایسی قوتیں متعین ہیں جو اس کے ہر عمل کا پیچھا کر کے اسے اس کے نتیجہ تک پہنچاتی۔ یوں انسان کا ہر عمل محفوظ ہو کر نتیجہ خیز ہوتا ہے۔"

سورۃ الانفطار میں ہے:

وَ اِنَّ عَلَیْكُمْ لَحٰفِظِیْنَ ۙ كِرَامًا كَاتِبِیْنَ ۙ یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝ (۸۲/۱۰-۱۲)

"اس نے تم پر محافظ مقرر کر رکھے ہیں ـــــ نہایت معزز اور امین ـــــ جو کچھ تم کرتے ہو انہیں اس سب کا علم ہوتا ہے۔ وہ اسے ریکارڈ کرتے رہتے ہیں۔ (اسے خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل کہا جاتا ہے)"۔

سورہ اسریٰ میں اس ریکارڈ (اعمال نامہ) کو بڑی بلیغ مثال سے سمجھایا گیا ہے۔ فرمایا: وَ كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰہُ طٰٓئِرَہٗ فِیْ عُنُقِہٖ ؕ "ہر انسان کا اعمال نامہ مرتب ہو کر اس کی گردن میں لٹکا رہتا ہے، جس کے نتائج تبدیل کرنے پر اسے کچھ اختیار نہیں ہوتا۔ (لفظِ طٰٓئِرَ میں یہ مفہوم مضمر ہے)۔ جب تک ظہورِ نتائج کا وقت نہیں آتا، وہ دستاویز لپٹی رہتی ہے: وَ نُخْرِجُ لَہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ كِتٰبًا یَّلْقٰىہُ مَنْشُوْرًا ۝ (۱۷/۱۳)

"جب ظہورِ نتائج کا وقت آجاتا ہے تو وہی لپٹی ہوئی دستاویز ایک کھلی کتاب کی شکل میں سامنے آجاتی ہے۔ یعنی اس وقت جو باتیں انسان کے نفسِ غیر شعوری کے تہ خانے میں مستور ہوتی ہیں۔ اس وقت نفسِ شعوریہ کے سامنے آجائیں گی۔ اسے اس وقت کہا جائے گا: اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ "تو اپنا اعمالنامہ خود پڑھ"۔ كَفٰی بِنَفْسِكَ الْیَوْمَ عَلَیْكَ حَسِیْبًا ۝ؕ (۱۷/۱۴) تمہارا حساب کرنے کے لئے کہیں باہر سے محاسب بلانے کی ضرورت نہیں۔ تو خود ہی اسے پڑھ لے اور خود ہی حساب کر کے بتا دے کہ تیرا مقام کونسا ہے!"

اس طرح سمجھایا گیا کہ "اعمال نامہ" کہیں خارج میں نہیں رکھا رہتا۔ انسان کے اعمال اس کی ذات پر اپنے

اثرات مرتب کرتے رہتے ہیں اور انہی نقوش کی حامل انسانی ذات اس کا اعمال نامہ ہوتا ہے۔ موت سے انسانی جسم فنا ہو جاتا ہے۔ اس کی ذات، جو اس کے اعمال کی حامل ہوتی ہے، محفوظ رہتی ہے۔ سورہ قٓ میں ہے کہ یہ منکرین حیاتِ آخرت کہتے ہیں کہ یہ تو عجیب سی بات نظر آتی ہے کہ ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ (۵۰/۳) "جب ہم مر جائیں گے اور گل سڑ کر مٹی ہو جائیں گے تو پھر زندہ ہونگے؟ یہ تو بڑی بعید از عقل بات ہے"! فرمایا: قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَ عِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ (۵۰/۴)۔ "ان سے کہو کہ انسان کی جس چیز کو زمین کم کر دیتی ہے، اس کا ہمیں علم ہے۔ موت اس کے طبعی جسم کو منتشر کرتی ہے۔ اسکی ذات پر اسے کچھ تصرف حاصل نہیں ہوتا۔ اور چونکہ انسانی اعمال کا تعلق اس کی ذات سے ہے نہ کہ اس کے جسم سے، اس لئے اس ذات کے محفوظ رہنے کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے اعمال سب محفوظ رہتے ہیں ——— وَ لَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ (۲۳/۶۲)۔ اور یہ کتاب سچی سچی بات کہہ دیتی ہے۔ یہ ہے جسے (۶/۶۲) میں حَفَظَةً کہا گیا ہے۔

اوپر کہا ہے اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۔ قانون صرف خدا کا کارفرما رہتا ہے۔ کائنات میں حکم صرف اس کا چلتا ہے۔ لیکن انسان کی حالت یہ ہے کہ جب کسی مصیبت میں پھنس جاتا ہے تو پھر خدا یاد آتا ہے۔ جب وہ مصیبت رفع ہو جاتی ہے تو پھر اپنی من مانی کرنے لگ جاتا ہے:

۶/۶۴-۶۳ قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ○
قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَ مِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ○

ان سے پوچھو کہ بحر و بر میں، جب کہیں بھی کسی مصیبت کا سامنا ہوتا ہے تو تمہیں اس مصیبت سے چھٹکارا کس قانون کے مطابق مل سکتا ہے؟ تم اس وقت، اپنی بے کسی اور بے بسی کی حالت میں، کبھی گڑگڑا کر، اور کبھی چپکے چپکے دل میں اسے مدد کے لئے پکارتے ہو، اور کہتے ہو کہ اگر خدا اس مصیبت سے ہمیں نجات دلا دے تو ہم ہمیشہ اس کے شکر گزار رہیں گے۔

ان سے کہو کہ ان مصیبتوں سے، بلکہ تمام مصیبتوں سے، چھٹکارا، خدا کے قانون کے مطابق ہی ملتا ہے لیکن اس کے باوجود، تمہاری یہ حالت ہے کہ تم (اپنی زندگی کے معاملات میں) قوانینِ خداوندی کے ساتھ، اور قوانین بھی شامل کر لیتے ہو۔ اور یوں ایک غلط نظام قائم کر کے اپنے لئے تباہی مول لے لیتے ہو۔

قانونِ خداوندی کا اتباع ہر حال میں کرنا چاہیئے۔ اگر اُس زمانے میں جب حالات سازگار ہوں، قوانینِ خداوندی کا اتباع کیا جائے تو مصیبت آئے ہی نہیں۔ صحت کی حالت میں احتیاط برتی جائے ـــــ احتیاط برتنے کے معنی یہ ہیں کہ جو باتیں مُمدِ صحت ہیں اُنہیں اختیار کیا جائے اور جو مضرِ صحت ہیں، اُن سے پرہیز کیا جائے۔ اگر ایسا کیا

قوانینِ خداوندی کی اطاعت ہر حال میں

جائے تو پھر بیماری آتی ہی نہیں۔ لیکن ہماری حالت یہ ہوتی ہے کہ صحت کے زمانے میں احتیاط نہیں برتتے، اور جب اِس بد پرہیزی کی وجہ سے صحت خراب ہو جاتی ہے، مرض کا حملہ ہو جاتا ہے، تو پھر ڈاکٹروں حکیموں کی طرف بھاگتے دوڑتے ہیں اور وہ جس قسم کے پرہیز بتاتے ہیں، اُن پر عمل کرنے کا تہیّہ کرتے ہیں۔ لیکن یہ تہیّہ چند دنوں تک رہتا ہے۔ پھر اُنہی بد پرہیزیوں پر اُتر آتے ہیں اور پھر بیمار پڑ جاتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر تم حالت صحت میں پرہیز کرو تو بیمار کیوں پڑو۔ ایک ہندی دوھا ہے ؎

دُکھ میں تو ہر کو بھجیں، سکھ میں بھجے نہ کو　　　جو سُکھ میں ہر کو بھجیں، تو دُکھ کاہکو ہو

افراد سے آگے بڑھیں تو یہی حالت اقوام کی ہوتی ہے۔ وہ خوش حالی اور سرفرازی کے زمانے میں ہر قسم کی بدعنوانیوں پر اُتر آتی ہیں، اور جب اِن بدعنوانیوں کے نتیجہ میں تباہی آتی ہے تو اس وقت اصلاحِ احوال کا خیال آتا ہے۔ اگر خوش حالی کے زمانے میں قوانینِ خداوندی کا اتباع کیا جائے تو تباہی آئے ہی کیوں !

قوانینِ خداوندی کی رُو سے غلط نظام کے نتیجہ میں جو تباہیاں آتی ہیں، اِس کی کئی ایک شکلیں ہوتی ہیں :

۶/۶۵ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّ يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ○

نظام کی پیدا کردہ تباہی مختلف شکلوں میں آتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سوسائٹی کے اُوپر کے طبقے میں خرابیاں عام ہو جاتی ہیں، اور اُن کی وجہ سے معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔ کبھی نیچے کے طبقے میں لاقانونیت کی وبا پھیل جاتی ہے تو وہ تباہی مچا دیتے ہیں۔ (۱۶/۴۵-۴۷)۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہ دونوں طبقے مخلوط پارٹیوں میں بٹ جاتے ہیں، اور خانہ جنگی پر اتر آتے ہیں (۶/۱۳۰)۔ اور یوں تباہ ہو جاتے ہیں۔

دیکھو! ہم کسطرح اپنے قوانین کو مختلف پہلوؤں سے سامنے لاتے ہیں تاکہ لوگ، اچھی طرح بات سمجھ سکیں۔

مذہبی عذاب کی مختلف شکلیں

قرآن کریم نے یہاں انسانی زندگی کے اجتماعی نظام کے بڑے عمیق حقائق بیان کئے ہیں۔ کبھی (اور اکثر) ایسا ہوتا ہے کہ عوام تو ٹھیک ہوتے ہیں لیکن قوم کا اوپر کا طبقہ (اربابِ اقتدار اور اعیانِ دولت و ثروت) بگڑ جاتے ہیں اور اُن کے بگڑنے سے سارا نظام تہس نہس ہو جاتا ہے۔ اس طرح اس قوم پر تباہی آجاتی ہے۔ سورہ نمل میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت صالحؑ کو قومِ ثمود کی اصلاح کے لئے مامور کیا تو اُنہوں نے عرض کیا کہ بار الہٰا! اس قوم کی اصلاح کسطرح ہوگی؟ وہ تو ساری کی ساری بگڑی ہوئی ہے۔ اس کے ایک ایک فرد کی اصلاح (ناممکن نہیں تو) مشکل ضرور ہے۔ ارشاد خداوندی ہوا کہ ساری کی ساری قوم بگڑی ہوئی نہیں، نہ ہی ان کے ایک ایک فرد کی اصلاح کی ضرورت ہے: وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ (۲۷/۴۸)۔ مملکت کے مرکزی مقام (دارالسلطنت) میں نو اربابِ اقتدار ہیں جو بگڑے ہوئے ہیں۔ انہی کے

اکابرین کی تقلید

تتبع میں ساری قوم بگڑ رہی ہے۔ اگر ان نو کی اصلاح کر دی جائے تو ساری قوم کی اصلاح خود بخود ہو جائے گی۔ عوام، اکابرینِ قوم کی تقلید کرتے ہیں۔ وہ انہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔ اگر وہ بدعنوان ہوں، تو ساری قوم میں بدعنوانی پھیل جاتی ہے۔ وہ صحیح راستے پر چلیں، تو قوم انکے اتباع میں صحیح راستے پر چلتی رہتی ہے۔ لہذا، قوموں میں تباہی کی ایک شکل (یا ایک وجہ) یہ ہوتی ہے کہ اُس کا طبقۂ بالا بگڑ جاتا ہے، تو ساری قوم بگڑ جاتی ہے۔ اور یوں مملکت میں بدنظمی پھیل جاتی ہے۔

دوسری شکل یہ ہوتی ہے کہ اربابِ اقتدار کا ظلم اور استبداد اس قدر حد سے بڑھ جاتا ہے کہ وہ قوم کے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے، اور اس کے ردِعمل کے طور پر عوام لاقانونیت پر اتر آتے ہیں اور اس طرح معاشرہ کا نظم و نسق تباہ ہو جاتا ہے۔ اور ملک میں فوضویت (انارکی) پھیل جاتی ہے۔

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سیاسی لیڈر عوام کو اپنے پیچھے لگا کر الگ الگ پارٹیاں بنا لیتے ہیں، اور وہ پارٹیاں آپس میں ٹکرا کر ملک کو تباہ کر دیتی ہیں۔

اجتماعی تباہی کی اِن شکلوں کی وضاحت کے بعد کہا کہ ہم ان امور کو اس لئے بار بار سامنے لاتے ہیں۔ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ۔ تاکہ لوگ غور و فکر سے کام لیں، اور جن اسباب و وجوہ سے معاشرہ پر تباہی آتی ہے اور اُن کی اصلاح کریں۔ قرآنی نظام میں ان میں سے کوئی صورت بھی پیدا نہیں ہوتی۔ اس کے بعد کہا:

۶/۶۶ وَكَذَّبَ بِهِ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ۚ قُل لَّسْتُ عَلَيْكُم بِوَكِيلٍ ۝

لیکن تیری یہ قوم اس پر بھی نہیں سمجھتی، اور ایسی ٹھوس حقیقت کو برابر جھٹلائے چلی جا رہی ہے۔ تم ان سے کہہ دو کہ (میرا کام تمہیں نیک و بد سمجھانا ہے)۔ میں تم پر داروغہ نہیں مقرر کیا گیا کہ تمہیں زبردستی صحیح راستے پر چلاؤں۔

رسولؐ ان پر داروغہ نہیں

قرآن کریم نے متعدد مقامات پر نبی اکرمؐ سے کہا ہے کہ آپ کا کام ان لوگوں کو صحیح راستہ دکھا دینا ہے۔ زبردستی اس راستہ پر چلانا نہیں۔ اگر انسانوں کو زبردستی راستہ پر چلانا مقصود ہوتا تو انہیں پیدا ہی اس طرح کیا جاتا کہ یہ (دیگر اشیائے کائنات کی طرح) مجبوراً قوانینِ خداوندی کی اطاعت کئے چلے جاتے۔ لیکن خدا نے انہیں اختیار و ارادہ کی صلاحیت اس لئے دی ہے کہ یہ خود اپنے فیصلے سے اپنے لئے راستہ اختیار کریں۔

باقی رہا ان کا یہ اعتراض کہ اگر ان کی غلط روش کا نتیجہ تباہی ہے، تو وہ تباہی ان پر آتی کیوں نہیں۔ فرمایا:

۶/۶۷ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ○

تم جو کچھ کر رہے ہو اس کا نتیجہ اپنے وقت پر نمودار ہو جائے گا۔ اس لئے کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ ہر واقعہ کے نتیجہ خیز ہونے کا ایک مقام ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ بات آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہے، اور لوگ سمجھتے ہیں کہ کچھ ہوا ہی نہیں رہا۔ تا آنکہ وہ ایک مقام پر پہنچ کر ٹھہر جاتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ سامنے آجاتا ہے۔ (۷/۱۸۲-۱۸۳)

یہ کہ عمل اور اس کے نتیجہ کے محسوس طور پر سامنے آنے میں مُہلت کا وقفہ ہوتا ہے، متعدد مقامات پر بیان ہو چکا ہے۔ انڈکس میں "مُہلت" کا عنوان دیکھئے۔ یہاں ہر واقعہ یا حادثہ کے لئے "مستقر" کا لفظ لا کر قرآن کریم نے ایک عظیم حقیقت بیان کی ہے۔ مستقر کے معنی ہوتے ہیں کسی متحرک شئے کا چلتے چلتے کسی نقطہ پر آ کر رک جانا۔ کہا یہ گیا ہے کہ عمل، اپنے نتیجہ خیزی کے مقام کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتا چلا جاتا ہے تا آنکہ وہ اس مقام پر آ کر رک جاتا ہے جہاں اس کا نتیجہ محسوس شکل میں سامنے آجاتا ہے۔ ہم اس حادثہ کو صرف اس وقت دیکھتے ہیں جب وہ محسوس طور پر ہمارے سامنے آتا ہے، حالانکہ وہ بہت پہلے سے مرتب ہونا شروع ہو چکا ہوتا ہے۔ سورۃ الاعراف میں ہے: وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (۷/۱۸۲)۔ جو لوگ ہمارے قوانین کی صداقت کو جھٹلاتے ہیں ہم انہیں اس طرح بتدریج (STEP BY STEP) تباہی کی طرف لئے جاتے ہیں کہ انہیں اس کا علم و احساس تک نہیں ہوتا۔ نتیجہ خیزی کا

یہ عمل بڑا اغیر محسوس ہوتا ہے۔ سورۃ الانبیاء کی آیات (۲۱/۱۱-۱۵) میں اس عمل کو بڑے دلنشین انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ مفہوم القرآن میں ان آیات کے معنی دیکھئے۔

احتیاطی تدابیر کے سلسلہ میں قرآن کریم نے ایک اہم اصول کی طرف توجہ دلائی ہے۔ بعض (بلکہ اکثر) امراض متعدی (CONTAGIOUS) ہوتے ہیں۔ اِس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس قسم کے مریضوں سے دُور رہا جائے۔ فرمایا:

۶/۶۸ وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ۭ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ○

قرآن کریم کو سنجیدگی سے نہ لینے والے

جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو ہمارے قوانین (قرآن) کو سنجیدگی سے نہیں سُنتے بلکہ اُس کے متعلق لغو اور بے کار باتیں کرتے ہیں، تو اُن سے کنارہ کش ہو جاؤ تاآنکہ وہ اس موضوع کو چھوڑ کر کسی دوسری بات میں مشغول ہو جائیں۔ اور اگر تم اپنے خیالات میں منہمک، یا گفتگو میں جذب ہونے کی وجہ سے اس بات کو بھول جاؤ تو جس وقت بھی یہ یاد آئے ان لوگوں سے اُٹھ جاؤ۔ یہ لوگ، قرآن جیسی بلند پایہ کتاب کے متعلق اس قسم کا رویہ اختیار کر کے بڑی زیادتی کرتے ہیں۔

ان امور کی تشریح آیات (۴/۱۴۰) و (۵/۵۷) میں آچکی ہے۔ (نیز دیکھئے ۷/۵۱)۔ اس کے بعد ہے:

۶/۶۹ وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ○

جو لوگ قوانین خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں، اُن پر اس کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ یہ لوگ قرآن کے متعلق اس قسم کی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ ہم نے اُنہیں (ایسے لوگوں سے الگ ہو جانے کی) تاکید اس لئے کی ہے کہ ان کے لئے ایسی باتوں سے بچنا ضروری ہے۔

اگلی آیت میں اِس تاکید کی مزید وضاحت کی گئی ہے جو (۶/۶۸) میں سامنے لائی گئی تھی:

۶/۷۰ وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ۖ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيۡعٌ ۚ وَاِنۡ تَعۡدِلۡ كُلَّ عَدۡلٍ لَّا يُؤۡخَذۡ مِنۡهَا ؕ اُولٰٓٮِٕكَ
الَّذِيۡنَ اُبۡسِلُوۡا بِمَا كَسَبُوۡا ۚ لَهُمۡ شَرَابٌ مِّنۡ حَمِيۡمٍ وَّعَذَابٌ
اَلِيۡمٌۢ بِمَا كَانُوۡا يَكۡفُرُوۡنَ ۝

جن لوگوں کی یہ حالت ہو کہ وہ (نظامِ خداوندی تو ایک طرف) خود اُس آئین اور ضابطہ کو بھی کچھ اہمیت نہ دیں جسے اُنہوں نے اپنے لئے اختیار کر رکھا ہے اور انسانی زندگی کو محض تماشا سمجھیں، اور اِس دھوکے میں رہیں کہ

ان تک قرآن پہنچاتے رہو

مقصدِ حیات عیش و عشرت ہے، اور بس۔ تم ایسے لوگوں کے پیچھے اپنی جان مت کھپاؤ۔ انھیں اُن کے حال پر چھوڑ دو۔ البتہ قرآنی تعلیم اُن کے سامنے پیش کرتے رہو۔ اس لئے کہ کسی شخص کو، اُس کے غلط اعمال کی وجہ سے، قرآن سے محروم نہیں رکھنا چاہیئے۔ یہ الگ بات ہے کہ اُسے، اِن غلط اعمال کے نتائج سے، قانونِ خداوندی کے سوا کوئی نہیں بچا سکتا۔ اس کے لئے نہ اُس کا کوئی رفیق اور نہ مددگار ہو سکتا ہے۔ نہ سفارشی۔ نہ ہی وہ کچھ بدلہ (کفارہ) دے کر ان کے نتائج سے بچ سکتا ہے۔ اُن لوگوں کو، اُن کے اعمال کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ کہ جو کچھ انھوں نے کیا ہے اُس کی سزا بھگتیں۔ (۵۲/۲۱ ؛ ۴۴/۳۸)۔ وہ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جاتے ہیں۔ حتّٰی کہ وہ چیزیں بھی، جو عام حالات میں انسان کی پرورش کا موجب بنتی ہیں، ان کے لئے تلخابۂ حیات، اور سوہانِ رُوح بن جاتی ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے صحیح راستے پر چلنے سے انکار کر دیا تھا اور حق و صداقت سے سرکشی برتی تھی (جس کا دل مضطرب اور پریشان ہو، اُسے خوشگوار چیزیں بھی زہر لگتی ہیں)۔

قرآنِ کریم کی کشادہ نگہی اور شفقت اور غمگساری ملاحظہ فرمایئے۔ اِس قسم کے غلط کار لوگوں سے الگ ہو جانے کی تاکید کے ساتھ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ اُن سے الگ تو ہو جاؤ، لیکن اُن تک خدا کا پیغام پہنچاتے رہو۔ تاکہ وہ اس وجہ سے زندگی کی سعادتوں اور خوشگواریوں سے محروم نہ رہ جائیں کہ اُن تک خدا کا پیغام نہیں پہنچا تھا۔ تمہارا فریضہ پیغاماتِ خداوندی کی تبلیغ ہے۔ تم اس فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرو۔ اس قسم کے غلط رو لوگوں کو تو بلکہ اس کی زیادہ ضرورت ہے۔ ڈاکٹر کا متعدی امراض کے مریضوں سے اپنی حفاظتی تدابیر اختیار کرتا اور اس طرح اُن سے ذرا ہٹ کر رہنا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن اِس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ان کا علاج چھوڑ دے۔ اسے اُن کا علاج بدستور جاری رکھنا چاہیئے۔

آپ غور کیجئے کہ قرآن کی حامل (کتاب اللہ کی وارث) قوم کی ذمہ داریاں کس قدر شدید ہیں۔ بے راہ رو

اقوام سے الگ رہنے کی تو تاکید ہے (یعنی یہ کہ اُن کی روش اختیار نہ کی جائے) ۔ لیکن اس کے باوجود یہ ضروری ہے کہ اُن تک قرآن کا پیغام پہنچاتے رہیں ۔

لیکن جو قوم خود ہی قرآن کو چھوڑ بیٹھی ہو، وہ دوسری اقوام تک اِس کا پیغام کیا پہنچائے گی ؟

قرآن مجید کی اصطلاحات بڑی غور طلب ہوتی ہیں ۔ پانی ممدِ حیات ہے اسی پر زندہ شئے کا سہارا ہے حیوانات تو ایک طرف ، نباتات کی روئیدگی، نشوونما اور ثمرباری کا بنیادی انحصار اسی پر ہے ۔ لیکن کسی پودے پر کھولتا ہوا پانی ڈالو، وہ اُسی وقت مُرجھا جائے گا ۔ اور پھر زندگی سے محروم ہو جائے گا ۔ پانی وہی تھا ۔ لیکن اُس کی کیفیت میں فرق آ جانے سے وہ ممدِ حیات ہونے کے بجائے مہلک ہو گیا ۔ اسی طرح یخ بستہ پانی بھی ۔

غلط نظامِ زندگی میں زندگی کی ضروریات کی چیزیں وہی ہوتی ہیں، لیکن وہ انسانی ذات کے لئے ممدِ حیات ہونے کے بجائے ہلاکت آفرین بن جاتی ہیں ۔ دُودھ ممدِ صحت ہے، لیکن وہی دُودھ اگر چُرا کر پیا جائے تو (طبیعی طور پر تو اِس کی تاثیر میں کچھ فرق نہیں ہوتا لیکن) انسانی ذات کے لئے وہ ہلاکت کا موجب ہو جاتا ہے ۔

اس آیت میں قانونِ مکافاتِ عمل کے سلسلہ میں جو الفاظ آئے ہیں، اُن کی تشریح جلد دوم (صفحہ ۲۲۸ ۔الخ) میں دیکھئے ۔ (یعنی آیت ۲/۱۸ کے تحت) ۔

جن لوگوں سے قطعِ علائق کر لینے کے لئے کہا گیا ہے، وہ ضرور پوچھیں گے کہ ہم میں کیا بُرائی ہے جو تم ہم سے اِس طرح الگ ہو رہے ہو؟ اور تم سے اظہارِ محبت کرتے ہوئے کہیں گے کہ صحیح راستہ وہی ہے جس پر ہم گامزن ہیں ۔ کہا کہ ان سے کہو کہ :

(۶/۷۱-۷۲) قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَ نُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِى اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِى الْاَرْضِ حَيْرَانَ ۖ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ ؕ وَهُوَ الَّذِىٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝

اِن سے کہو کہ کیا تم چاہتے ہو کہ ہم خدا کے قانون کو چھوڑ کر، ایسی ہستیوں کو پکارنے لگ جائیں جو ہماری ذات کو نفع نقصان پہنچانے کا اختیار نہیں رکھتیں، اور اس طرح ہم صحیح راستے پر گامزن ہو جانے کے بعد اُلٹے پاؤں پھر جائیں، اُس شخص کی طرح جسے اُس کے مُودسر جذبات نے، صحیح راستے سے بھٹکا کر، لق و دق صحرا میں چھوڑ دیا ہو، جہاں وہ حیران و پریشان کھڑا ہو ——— راہ گم کردہ اور تنہا ——— اور اس کے ساتھی اُسے آوازیں دے رہے ہوں کہ تو کدھر چلا گیا۔ اِدھر، ہماری طرف آؤ، صحیح راستہ یہ ہے۔ (لیکن، وہ ان کی آوازیں سننے کے باوجود، اُن تک نہ پہنچ سکے)۔

اِن سے کہدو کہ زندگی کا صحیح راستہ ایک ہی ہے۔ اور وہ ہے اللہ کی طرف سے عطا شُدہ راہنما (قرآن) کا راستہ ——— یعنی وہ راستہ جو عالمگیر انسانیت کی پرورش کرنے والے کا تجویز کردہ ہے۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اس راستہ کو اختیار کریں اور خدا کے عالمگیر نظامِ ربوبیت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔

اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم نظامِ صلوٰۃ قائم کریں اور خدا کے قانون کی پوری پوری نگہداشت کریں۔ اور اس حقیقت پر یقین رکھیں کہ نوعِ انسان نے آخر الامر اسی مرکز کے گرد جمع ہونا ہے۔

ہدایتِ خداوندی

اِس آیت میں دین کی بنیادی حقیقت کو ان چار الفاظ میں سمٹا دیا گیا ہے۔ کہ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ۔ ہدایت، راہنمائی، صحیح راستہ، وہ اور صرف وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے متعیّن فرمایا ہے اور جسے اُس نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ ہدایتِ خداوندی قرآنِ کریم کے اندر مذکور و محفوظ ہے، وہ مکمّل بھی ہے، اور غیر متبدل بھی (۶/۱۱۶)۔ اس کے سوا ہدایت کہیں اور نہیں۔ یہی توحید ہے اور اسی کو ضابطۂ ہدایت تسلیم کرنے کا نام اسلام ہے۔

یہاں خدا کی عطا فرمودہ ہدایت (قرآنِ مجید) کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کو دین کا منتہیٰ کہا گیا ہے جس کا عملی نظام، ربوبیتِ عالمینی ہے۔ اس کے بعد اقامتِ صلوٰۃ کہا گیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ سے مُراد نظامِ خداوندی کا قائم کرنا ہے، اور نماز کے وقتی اجتماعات اس نظام کے قیام کے ذرائع ہیں۔ (تفصیل ان امور کی صلوٰۃ کے عنوان میں ملے گی جس کے لئے انڈکس کی طرف رجوع فرما دیں)۔

اُوپر "لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" کہا گیا ہے۔ عالمین کی تشریح جلد اوّل۔ زیرِ آیت (۱/۱) کی جا چکی ہے۔ یہ انسانوں کی دنیا تک محدود نہیں۔ اس میں تمام "کائناتیں" آ جاتی ہیں۔ اِسے قرآنِ کریم نے ارض و سمٰوٰت کہہ کر بھی پکارا ہے۔ ربوبیتِ عالمینی کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے "کائناتوں" کو پیدا کیا تو ان کی

نشو ونما کا سامان بھی ساتھ ہی فراہم کر دیا۔ اس حقیقت کی طرف اگلی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے:

(۶/۷۳) وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ۖ وَيَوْمَ يَقُولُ كُن فَيَكُونُ ۚ قَوْلُهُ الْحَقُّ ۚ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنفَخُ فِي الصُّورِ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ ۝

یہ اُس خُدا کا قانون ہے جس نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو ایک حقیقت کے طور پر تعمیری نتائج مرتب کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور اس کی قوتوں کا یہ عالم ہے۔ کہ جونہی وہ کسی بات کا ارادہ کرتا ہے، اس کے وقوع پذیر ہونے کی ابتدا ہو جاتی ہے۔

اُس کی ہر بات مبنی بر حقیقت ہوتی ہے (۸۶/۱۳-۱۴)۔ یونہی شاعری نہیں ہوتی (۶۹/۴۱)۔ اس لئے کہ کائنات میں ہر جگہ اُسی کا اقتدارِ اعلیٰ کام کر رہا ہے۔ وہ ہر شئے کی موجودہ حالت کو جانتا ہے، اور اس کے امکانات اور مضمر صلاحیتوں سے بھی واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس وقت کیا ہو رہا ہے، اور اس کے بعد کیا ہونے والا ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ جس انقلاب کی اس وقت خبر دی جا رہی ہے، وہ آ کر رہے گا۔ حق اور باطل کی قوتوں کا ٹکراؤ ہو گا۔ اور یہ ٹکراؤ یونہی اتفاقیہ رونما نہیں ہو جائے گا۔ بلکہ خدائے خبیر کی محکم اسکیم کے مطابق ہو گا ——— وہی اسکیم جس کے مطابق حق و باطل کا ٹکراؤ ہوتا چلا آ رہا ہے اور جس میں حق، فاتح و منصور ہو کر سامنے آ جاتا ہے (۲۱/۱۸؛ ۸/۷-۸؛ ۴۲/۲۴؛ ۳۴/۴۸-۴۹)

تخلیقِ کائنات: اِس کے مبنی بر حق ہونے اور کُن فیکون، غیب و شہود وغیرہ کے سلسلہ میں تفصیلی بحث پہلے آ چکی ہے۔ انڈکس میں دیکھیئے۔ وَلَهُ الْمُلْكُ کے متعلق مطالب الفرقان جلد اوّل میں مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ۔ {(۱/۳) صفحہ ۲۸} دیکھیئے۔ نیز عنوانات ——— آخرت، اُخروی زندگی اور قیامت۔

نفخِ صور نَفخِ صُور کی تشریح کا اصل مقام، اُخروی زندگی اور اس کے متعلقات ہیں جن کا ذکر اپنے اپنے مقامات پر آئے گا۔ یہاں اتنا اشارہ کافی ہے کہ (۱) اس سے مُراد میدانِ جنگ میں فوجوں کا تصادم بھی ہے۔ اور (۲) مُردہ اقوام (پیکرانِ آب و گل) میں حیاتِ تازہ کی نمود بھی۔ صُوَر، صورت کی جمع بھی ہے۔ اور صورت کے معنی (FORM) یا پیکر ہیں۔ یعنی ان انسانوں میں جو "مٹی کے مادھو" بن چکے ہوں، زندگی کی حرارتیں اور توانائیاں پھونک کر انہیں زندہ اقوام کی صف میں لا کھڑا کرنا۔ مقصد اس سے حق و باطل کے تصادم اور کشمکش ہے۔

حق و باطل کی کشمکش کا ذکر آیا تو قرآنِ کریم نے ذہن کا رُخ داستانِ حضرت ابراہیمؑ کی طرف منتقل کر دیا، جن کی زندگی اس کشمکش کی مسلسل داستان تھی۔ اس داستان کے بیشتر گوشے سابقہ جلدوں میں بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں اُنکے اس واقعہ کا ذکر ہے جہاں اُنہوں نے اجرامِ فلکی کی الوہیت کے عقیدہ کی علیٰ وجہ البصیرت تردید کی تھی۔ پہلے ان کی اس تنبیہ کا ذکر جو اُنہوں نے خود اپنے والد کو کی تھی:

۶/۷۵ وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ آزَرَ أَتَتَّخِذُ أَصْنَامًا آلِهَةً ۖ إِنِّي أَرَاكَ وَقَوْمَكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ○

حق و باطل کی یہی کشمکش تھی جس سے ابراہیمؑ دوچار ہوا۔ اس کی ابتداء خود اس کے اپنے گھر سے ہوئی، جب اُس نے اپنے باپ، آذر سے کہا کہ یہ کیا ہے کہ تم نے اپنے ہاتھ کی تراشیدہ مورتیوں اور غیر خدائی قوتوں کو اپنا الٰہ بنا رکھا ہے! میرے نزدیک تو تم اور تمہاری قوم کھلی ہوئی گمراہی میں ہے۔

اس کے بعد اجرامِ فلکی کی الوہیت کی تردید ہے۔ لیکن اس سے پہلے دو لفظوں میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ خود اس نتیجے پر کیسے پہنچے تھے۔

جیسا کہ سابقہ جلدوں میں وضاحت سے بتایا گیا ہے، نبی کو جو علم بذریعہ وحی دیا جاتا تھا، وہ اُس کی اپنی فکر، تجربات یا مشاہدات کا نتیجہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ اسے براہِ راست خدا کی طرف سے عطا ہوتا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ جب وہ ان پیغامات اور حقائق کو دوسروں کے سامنے پیش کرتا تھا، تو وہ ان کی مخالفت کرتے تھے۔ اُنہیں ان کی صداقت کا قائل کرانے کے لئے ضروری تھا کہ اُن سے دلائل و براہین کی رُو سے بحث کی جائے۔ اُن دلائل کو چھوڑ کر جنہیں خود وحی نے بیان کیا ہوتا تھا، باقی دلائل و براہین نبیؑ کی اپنی فکر، تجربات و مشاہدات کی رُو سے حاصل کردہ ہوتے تھے۔ یہ مراحل نبیؑ کی بشریت کے دائرے میں ہوتے تھے۔

حضرت ابراہیمؑ کو یہ حقیقت تو بذریعہ وحی معلوم ہو گئی تھی کہ نہ تو انسانوں کے خود تراشیدہ بُت خدا ہو سکتے ہیں اور نہ ہی مظاہرِ فطرت کو درجۂ الوہیت حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن بُت پرستی کے خلاف اُنہوں نے اپنے والد کو جو دلائل دیئے تھے ظاہر ہے کہ اُن کے غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ اُن کی قوم بُت پرست کے علاوہ ستارہ

نبی کی بشریت

پرست بھی تھی۔ اُن کی اس باطل (بلکہ تو ہم) پرستی کی مخالفت کے سلسلہ میں بھی ضروری تھا کہ اُنہیں دلائل و براہین کی رُو سے اس کا قائل کیا جاتا۔ اس کے لئے اُنہوں نے اجرامِ فلکی کی نقل و حرکت کا بنظرِ غائر مشاہدہ اور معائنہ کیا، اور اس سے وہ اس قابل ہو گئے کہ حتم و یقین کے ساتھ

ان مخالفین سے بات کر سکیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن کریم نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

۶/۷۶ وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ○

اس مقصد کے لئے ہم نے ابراہیمؑ کو کائناتی نظام کا مشاہدہ کرایا تھا جس سے اُسے یہ یقین حاصل ہو گیا کہ ساری کائنات میں فقط خدائے واحد کا قانون جاری و ساری ہے۔ اس لئے نہ تو کائنات کی کوئی شے اپنے اندر خدا بننے کی قوت رکھتی ہے، اور نہ ہی یہاں ایک سے زیادہ ہستیوں کا اقتدار چل سکتا ہے۔

اس یقین تک پہنچنے کا یہ طریق وہی ہے جسے سورہ آل عمران کی آیات (۳/۱۹۰-۱۸۹) میں بیان کیا گیا ہے یعنی مسلسل غور و فکر کے بعد اس حقیقت کا علیٰ وجہ البصیرت مشاہدہ کرلینا کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ (۳/۱۹۰)۔ "اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس کارگہِ کائنات کو باطل نہیں پیدا کیا، بلکہ بالحق پیدا کیا ہے"۔

ان محکم دلائل سے آراستہ ہونے کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے قوم کی ستارہ پرستی کے خلاف مہم شروع کی۔ اگلی تین چار آیات میں اسی مہم کی تفصیل دی گئی ہے۔ واضح رہے کہ جو کچھ اگلی آیات میں کہا گیا ہے، وہ کسی ایک واقعہ کا تذکرہ نہیں۔ وہ اس مسلسل مہم کی داستان ہے:

۶/۷۷-۷۹ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ○ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ○ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ○

ستارہ پرستی کے خلاف دلائل

اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ مشاہداتی دلائل سے اپنی قوم کے باطل عقائد کا ابطال کرتا تھا۔ (مثلاً) جب رات کے وقت ستارہ نمودار ہوتا، (جس کی وہ قوم پرستش کرتی تھی) تو ابراہیمؑ اُن سے کہتا کہ اچھا! تم کہتے ہو کہ یہ میرا پروردگار ہے (اس کے سامنے جھکنا چاہیئے؟) اُس کے بعد جب وہ ستارہ ڈوب جاتا تو وہ اُن سے کہتا کہ، کیوں! یہی ہے جسے تم پروردگار ٹھہراتے ہو؟ بھلا ایسی چیز بھی پروردگار رہ سکتی ہے جو ابھی سامنے چمکتی ہو اور ابھی غروب ہو جائے

اسی طرح جب چمکتا ہوا چاند نکلتا (اور اس کی پرستش کی جاتی) تو وہ اپنی قوم سے کہتا کہ تم کہتے ہو، یہ میرا پروردگار ہے؟ اس کے بعد جب وہ بھی غروب ہو جاتا تو وہ اُن سے کہتا کہ تم مجھ سے کہتے تھے کہ میں اسے پروردگار تسلیم کرلوں؟ اگر میرے نشوونما دینے والے نے میری راہنمائی حقیقت کی طرف نہ کی ہوتی، تو میں بھی تمہاری طرح گمراہ ہو جاتا۔ اور اس قسم کے عناصر کو خدا ماننے لگ جاتا جنہیں اپنے آپ پر بھی کوئی اختیار نہیں۔

جب سورج اپنی تابناکیوں کے ساتھ طلوع ہوتا، اور وہ قوم اس کی پرستش کرتی تو وہ اُن سے کہتا کہ تم کہتے ہو کہ یہ بہت بڑا ہے، اس لئے اسے پروردگار تسلیم کرلو؟ جب وہ بھی غروب ہو جاتا، تو وہ اُن سے کہتا کہ یہ دیکھو، تمہارے پروردگار کا کیا حشر ہوا!

ان کائناتی دلائل کے بعد وہ اُن سے کہتا کہ تم جن قوتوں کو خدائی اختیارات و اقتدارات میں شریک سمجھتے ہو (وہ خواہ اجرامِ سماوی ہوں یا دیوی دیوتا۔ خواہ تمہارے مذہبی پیشوا ہوں یا خود تمہارا بادشاہ) میں اُن کے خدا ہونے کے تصوّر تک سے بیزار ہوں۔ (۳۷/۸۹)

آپ نے غور فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ نے (نظری بحث کے بجائے) مشاہداتی دلائل سے کس طرح اُن کی توہم پرستی کا ابطال کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جس حتم و یقین کے ساتھ، اور جس مدلّل انداز سے، ایک سائنسدان قرآنی حقائق کا اثبات کر سکتا ہے، نظری علوم کے، حاملین ایسا نہیں کر سکتے۔ نظری علوم کے حامل "سمجھا سکتے ہیں"، سائنسدان "دکھا سکتا ہے"۔ اور سمجھانے اور دکھانے میں جو فرق ہے، ظاہر ہے۔ قرآنِ کریم اسی لئے مشاہداتِ فطرت پر بار بار زور دیتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے بھی طریق اختیار کیا تھا، اور اسی بنا پر اُن کے دلائل قاطع ثابت ہوئے تھے۔ (۶/۸۴)۔ اس مقام پر حضرت ابراہیمؑ نے إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ کہا ہے (۶/۷۹) سورۃ الصّٰفّٰت میں إِنِّي سَقِيمٌ کہا ہے۔ (۳۷/۸۹)۔

سائنٹفک طریق استدلال

بدیہی طور پر یہاں واقعہ تو حضرت ابراہیمؑ کا بیان کیا گیا ہے، لیکن اس میں ایک ایسی حقیقت واضح کی گئی ہے جو ابدی بھی ہے اور غیر متبدل بھی۔ یہاں کہا یہ گیا ہے:

آفل کا مفہوم

لَا أُحِبُّ الْآفِلِينَ۔ چاند، سورج ستاروں کی جہت سے تو اس کا ترجمہ "ڈوب جانے والے" کیا جائے گا۔ لیکن افل کے درحقیقت معنی ہوتے ہیں وہ جو ایک حال پر نہ رہے، جس میں ہر آن تغیّر ہوتا رہے۔ زمانۂ نزولِ قرآن میں تو لوگوں کو چند ایک چیزوں

ہی میں تغیر نظر آتا تھا۔ لیکن اب سائنٹفک (SCIENTIFIC) تحقیقات اس نتیجہ پر پہنچی ہیں کہ کائنات کی ہر شئے میں، ہر آن تغیر (CHANGE) واقعہ ہوتا رہتا ہے۔ یہاں کوئی شئے، ایسی نہیں جو تغیر پذیر نہ ہو حتی کہ پتھر کی چٹان میں بھی ہر آن تغیر ہوتا رہتا ہے۔ کائنات مادہ سے تشکیل پذیر ہوئی ہے۔ اور مادہ کی تحلیل کی جائے تو وہ آخرالامر توانائی محض (PURE ENERGY) رہ جاتا ہے، جو مسلسل حرکت ہے، اور تغیرات کی آماجگاہ۔ لہذا، یہاں کہا یہ گیا ہے کہ تغیر پذیر شئے خدا نہیں ہو سکتی۔ بالفاظِ دیگر، مخلوق میں سے کسی کو بھی مقامِ الوہیت حاصل نہیں ہو سکتا۔ الٰہ (خدا) وہی ہو سکتا ہے جو تغیر پذیر (آفل) نہ ہو۔ سورۃ الرحمٰن میں ہے: كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝ (۵۵ ؍ ۲۶-۲۷)۔ اس کا عام ترجمہ

فنا اور بقا کا مفہوم

کیا جاتا ہے "کائنات کی ہر شئے فنا ہو جائے گی اور باقی صرف خدا کی ذات رہ جائیگی" اس میں شبہ نہیں کہ کائنات، جو مخلوق ہے، خدا کی طرح ابدی نہیں۔ ابدیت صرف خدا کو حاصل ہے۔ لیکن یہاں اشیائے کائنات کو فَانٍ کہا گیا ہے اور ذاتِ خداوندی کے لئے بقا کا لفظ آیا ہے۔ 'فنا' بقا کی ضد ہے۔ بقا کے معنی ہوتے ہیں اپنی حالت پر برقرار رہنا۔ اس لئے فنا کے معنی ہوں گے تغیر پذیر ہونا۔ بنابریں آیات (۵۵ ؍ ۲۶-۲۷) کے معنی یہ ہیں کہ کائنات کی ہر شئے میں ہر آن تغیر ہوتا رہتا ہے، اور تغیرات سے ماوراء صرف ذاتِ خداوندی۔ سورۃ القصص میں ہے: كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ (۲۸ ؍ ۸۸)۔ یہاں هَالِكٌ کے معنی بھی فَانٍ کے ہیں، لیکن ایک نہایت لطیف فرق کے ساتھ سائنسدانوں کی تحقیق یہ ہے کہ جس چیز کو ہم تغیر (CHANGE) کہتے ہیں، اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ چیز تو ویسے

ہلاکت

کی ویسی رہتی ہے، اس میں ایک تغیر واقع ہو جاتا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ تغیر (CHANGE) سے وہ شئے وہی نہیں رہتی۔ وہ معدوم ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ ایک نئی شئے متشکل ہوتی ہے۔ لیکن یہ تبدیلی ایسی سُرعت اور لطافت سے واقع ہوتی ہے کہ ہم اسے محسوس نہیں کر سکتے۔ ہم یہی سمجھتے ہیں کہ اس چیز میں تبدیلی آگئی ہے۔ اس تحقیق کی رُو سے (کہ وہ شئے معدوم ہو جاتی ہے) آپ غور کیجئے کہ قرآنِ کریم نے فَانٍ کے ساتھ هَالِكٌ کا لفظ لاکر کیسی عظیم حقیقت کی پردہ کشائی کی ہے۔ کائنات کی ہر شئے میں اس "عدم و وجود" کا (PROCESS) جاری ہے۔ اس سے ماوراء صرف خدا کی ذات ہے۔

ہلاکت میں تغیر کے ساتھ، قوت میں کمی آجانے کا مفہوم بھی ہوتا ہے۔ اور سائنس کے انکشافات اس کی بھی تصدیق کر رہے ہیں کہ اشیائے کائنات (بالخصوص اجرامِ فلکی) کی قوت اور حرارت میں ہر آن کمی واقع

ہو رہی ہے ——— کُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ ——— واضح رہے کہ آفِل، فَانٍ، ھالک اسم فاعل ہیں، اور اسم فاعل کا خاصہ یہ ہوتا ہے کہ جب تک اسے، خاص طور پر مستقبل کے ساتھ مشروط نہ کر دیا جائے، اس کے معنی حال کے ہوتے ہیں۔ جیسے: اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ط (۲/۳۰) کے یہ معنی نہیں کہ میں زمین میں خلیفہ بناؤں گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ "میں زمین میں خلیفہ بنا رہا ہوں"۔ اسی طرح فانٍ اور ھالکٌ کے یہ معنی نہیں کہ یہ چیزیں ایک دن فنا اور ہلاک ہو جائیں گی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اشیائے کائنات فنا اور ہلاک ہو رہی ہیں۔ یعنی ان میں تغیّرات کا سلسلہ جاری ہے۔ صرف ایک ذاتِ خداوندی ہے جو تغیّر پذیر نہیں، اور وہی الٰہ ہونے کے لائق ہے۔

نفسِ انسانی (ذاتِ انسانی) کے متعلق سابقہ جلدوں میں بتایا جا چکا ہے کہ یہ خدا کی عطا کردہ وہ "شے" ہے جس میں (علیٰ حدِ بشریت) صفاتِ خداوندی کی نمود ہوتی ہے۔ جس طرح خدا کی ایک صفت تغیر نا آشنا ہونا ہے،

نفسِ انسانی

اسی طرح نشوونما یافتہ انسانی ذات بھی تغیّر نا آشنا ہو جاتی ہے۔ بارڈیو نے اسے (CHANGE-LESSNESS IN CHANGE) سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی اس کائنات میں، جس میں ہر آن تغیّرات کا سلسلہ جاری رہتا ہے، انسانی ذات تغیر نا آشنا رہتی ہے۔ برگساں نے اس کے متعلق کہا ہے۔ (IT DOES NOT CEASE To EXIST) "یہ معدوم نہیں ہوتی"۔ آپ غور کیجئے کہ عصرِ حاضر کے مفکرین کس طرح قرآن کے الفاظ کی تشریح کر رہے ہیں۔

یہی معنی آفل کے ہیں۔ یعنی جس میں ہر آن تغیر ہوتا رہے۔ اور اسی حقیقت کا اعلان کیا تھا حضرت ابراہیمؑ نے جب کہا تھا کہ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ۔

ہمارے مفسرین!

حضرت ابراہیمؑ نے جس دلآویز طریق سے اپنی قوم کی گمراہی کی نقاب کشائی کی تھی، وہ ہمارے سامنے آگئی۔ لیکن ہمارے مفسرین میں سے اکثر یہ کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے جب کہا تھا: هٰذَا رَبِّیْ، تو انہوں نے کچھ وقت کے لئے (معاذ اللہ) ستارہ، چاند، سورج کو اپنا ربّ (معبود) سمجھ لیا تھا، اور ان کے غروب ہو جانے کے بعد، ان کی الوہیت سے انکار کیا تھا۔ ان کی اس غلط نگہی کی تردید کے لئے کسی خاص دلیل اور برہان کی ضرورت نہیں۔

یہ کہنا کہ ایک نبیؑ، حکما و عقلا کی طرح، ذاتی تجارب و مشاہدات کی ٹھوکروں کے بعد استقرائی طور پر

حقیقتِ نبوّت

صحیح نتیجہ پر پہنچتا ہے، حقیقتِ نبوت سے بیگانگی کی دلیل ہے۔ نبوّت اکتسابی ملکہ نہیں، جسے تجارب و مشاہدات سے حاصل کیا جائے۔ وہ خدا کی موہبتِ عظمیٰ ہے جس کا نزول قلبِ نبویؐ پر ہوتا ہے۔ لہٰذا حضرت ابراہیمؑ کے متعلق یہ سمجھنا کہ وہ (معاذ اللہ) کواکب پرستی کے شرک کے بعد توحید کی طرف آئے تھے۔ اتنی بڑی جسارت ہے جس کے تصوّر سے رُوح کانپتی ہے۔ خود قرآن کریم نے جس انداز و ترتیب سے اس واقعہ کو بیان کیا ہے، وہ اس پر شاہد ہے کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کے (معاذ اللہ) اعترافِ کواکب پرستی کا بیان نہیں، بلکہ قوم کے سامنے حقیقت سے پردہ اُٹھانے کا ایک موثر انداز ہے جس میں نظری دلائل کے بجائے علمی مشاہدہ کے طریقہ کو ترجیح دی گئی ہے۔ واقعہ کی ابتداء بُت پرستی کے خلاف حضرت ابراہیمؑ کے اعتراض سے ہوتی ہے۔ (دیکھئے (۶/۷۴))۔ اس کے بعد كَذٰلِكَ نُرِيٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۶/۷۵) سے ظاہر ہے کہ اس واقعہ سے پہلے ہی حضرت ابراہیمؑ ملکوتِ ارض و سماوات (نظامِ ارضی و سماوی) کے متعلق مقامِ علم و یقین تک پہنچ چکے تھے۔ اس کے بعد اصل

اندازِ براہیمی

واقعہ فَلَمَّا سے شروع ہوتا ہے جو دونوں آیتوں کے باہمی تعلق کی ایک محکم کڑی ہے یعنی پہلے نظامِ ارضی و سماوی کے رازہائے سربستہ حضرت ابراہیمؑ پر منکشف کئے گئے اور اس کے بعد (فَلَمَّا) یہ واقعہ پیش آیا۔ اس واقعہ کی آخری آیت (۶/۷۸) میں ارشاد ہے کہ جب سورج بھی ڈوب گیا، تو کہا: قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں۔ قوم سے تخاطب اس امر کی زندہ شہادت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ یہ باتیں اپنی قوم کو سمجھا رہے ہیں، سورج، چاند اور ستاروں کے حالات پر غور کر کے (معاذ اللہ) اپنے شرک سے تائب نہیں ہو رہے۔ اس سے بھی آگے بڑھئے، آیت ۸۰ میں ارشاد ہے: وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ــــ آپ کی قوم نے آپ سے جھگڑا شروع کر دیا ــــ یہ ٹکڑا پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ سارا معاملہ قوم کے ساتھ پیش آیا تھا۔ اور پھر آخری آیت (۶/۸۳) نے تو اس معاملہ کو بالکل شک و شبہ سے بلند کر کے رکھ دیا ہے، جہاں فرما دیا کہ وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ۔ یہ وہ دلیلِ محکم (حجّت) و برہانِ قاطع تھی جو ابراہیمؑ کو عطا ہوئی تھی۔ اب اس کے بعد معلوم نہیں کونسی چیز مبہم رہ جاتی ہے جو ذہن کو حضرت ابراہیمؑ کی (معاذ اللہ) ستارہ پرستی کی طرف منتقل کر دے؟ بجز اس کے کہ اسرائیلیات کے تتبع میں ہمارے مفسرین نے ایسا لکھ دیا ہے!

حضرت ابراہیمؑ نے مظاہر فطرت کی الوہیت کے ابطال کے بعد فرمایا:

۶/۸۰ إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ○

میں اپنی تمام توجہات کا مرکز صرف اُس ذاتِ بے ہمتا کو سمجھتا ہوں جو اس تمام کائنات کو عدم سے وجود میں لائی ہے (اور جس کا قانون یہاں اس طرح نافذ العمل ہے کہ اُس سے نہ ستاروں کو مفر ہے، نہ چاند اور سورج کو مجالِ سرتابی)، اس لئے میں اُس کے اقتدار میں کسی کو شریک نہیں کر سکتا۔ یہ میرا دوٹوک فیصلہ ہے۔

توحیدِ خالص اپنی تمام توجہات، خواہشات، آرزوؤں، تمناؤں، مقاصدِ حیات کو یکسو ہو کر اس مقصد کے لئے وقف کر دینا، جسے خدا نے متعین فرمایا ہے، یہ ہے خدا پر ایمان لانا اور شرک سے مجتنب ہونا۔ اور یہ کچھ اتباعِ قوانینِ خداوندی کی رُو ہی سے ممکن ہے۔ ان قوانین کی خصوصیت یہی بتائی گئی ہے کہ یہ تغیّر آشنا نہیں (۶/۱۱۶)۔ قوانینِ خداوندی کے سوا، انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو یہ خصوصیت ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی۔ انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو غیر متبدل سمجھنا (جیسا کہ فقہی قوانین کو سمجھا جاتا ہے) شرک ہے۔

لیکن اس قدر واضح اور قاطع دلائل کے باوجود وہ قوم حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ جھگڑتی رہی:

۶/۸۱ وَحَاجَّهُ قَوْمُهُ ۚ قَالَ أَتُحَاجُّونِّي فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدَانِ ۚ وَلَا أَخَافُ مَا تُشْرِكُونَ بِهِ إِلَّا أَن يَشَاءَ رَبِّي شَيْئًا ۗ وَسِعَ رَبِّي كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۗ أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ ○

وہ قوم اسی طرح، ابراہیمؑ سے رد و کد کرتی اور چاہتی کہ اُسے، اس کے مسلک سے ہٹا دے۔ وہ اُن سے کہتا کہ تم مجھ سے خدا کے بارے میں رد و کد کرتے ہو اور چاہتے ہو کہ میں اُس کا راستہ چھوڑ دوں، لیکن میں تمہاری بات کیسے مان سکتا ہوں (جب کہ خدا نے مجھے سیدھی راہ دکھا دی ہے۔ (تم مجھ سے کہتے ہو کہ تمہارے معبود بڑی قوتوں کے مالک ہیں اس لئے مجھے اُن سے ڈرنا چاہیئے۔ لیکن میں اُن کی

خوف، شرک میں ہوتا ہے حقیقت سے باخبر ہوں، اس لئے) اُن سے قطعاً نہیں ڈرتا۔ یہ مجھے کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ نقصان صرف قانونِ خداوندی کے مطابق پہنچتا ہے اور اس کی نگاہوں سے کوئی شے پوشیدہ نہیں رہ سکتی (اس لئے مجھے صرف اس کی احتیاط کرنی چاہیئے کہ اُس کے قانون کی خلاف ورزی نہ ہو)۔ حیرت ہے کہ اس قدر واضح دلائل کے بعد بھی

تم حقیقت کو نہیں مانتے؟ اس کے بعد کہا:

۸۲/۶ وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَالَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

توحید، خوف کی قاطع ہے

بھلا میں ان مٹی کی مورتیوں (معبودانِ باطل) سے کیوں ڈروں جنہیں کوئی اختیار و اقتدار حاصل نہیں۔ ڈرنا تو تمہیں چاہئے جو اللہ جیسی مختارِ کل ہستی کے ساتھ اوروں کو شریک ٹھہراتے ہو۔ حالانکہ اللہ نے تم سے کہیں یہ نہیں کہا کہ یہ واقعی میرے اختیار میں شریک ہیں۔

اگر تمہاری سمجھ میں یہ بات آگئی ہے تو بتاؤ کہ تم میں اور مجھ میں، کون امن و اطمینان کا زیادہ حقدار ہے (اور کسے لرزاں و ترساں رہنا چاہئے) تمہیں یا مجھے؟ (خوف، شرک کا لازمی نتیجہ ہے (۱۵۱/۳))، توحید سے انسان کے دل میں اس قدر قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتا)۔

شرک کا مفہوم کیا ہے، اور شرک سے خوف کسطرح پیدا ہوتا ہے۔ یا خوف کا نتیجہ شرک ہوتا ہے، اسے سابقہ جلدوں میں واضح کیا جا چکا ہے۔ (انڈکس میں شرک اور خوف کے عنوانات دیکھئے)۔ لہذا کسی تغیر پذیر اور فنا آشنا شے کو اپنے سے برتر سمجھ کر اس سے ڈرنا اور اس ڈر کی وجہ سے اس کے سامنے جھکنا شرک اور ظلم عظیم ہے۔ سورۃ القصص کی اس آیت کو ایک بار پھر سامنے لائیے جس میں کہا گیا ہے کہ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ط (۸۸/۲۸)۔ پوری آیت یوں ہے: وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ج اور دیکھنا تم مشرک نہ ہو جانا۔ یعنی وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ ۔ خدا کے ساتھ دوسروں کی بھی اِلٰہ (صاحبِ اقتدار) تسلیم نہ کر لینا۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ یاد رکھو! صاحبِ اقتدار صرف خدا کی ذات ہے۔ اس لئے کہ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ط اس کے سوا کائنات کی ہر شے تغیر پذیر ہے۔

حکومت صرف خدا کی ہے

اس سے سوال یہ پیدا ہوا کہ خدا کو اِلٰہ ماننے، اور اس کے سوا کسی اور کو اِلٰہ تسلیم نہ کرنے کا عملی مفہوم کیا ہے؟ فرمایا کہ اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ لَهُ الْحُكْمُ۔ یعنی حکومت صرف اسی کو حاصل ہے۔ اگر انسانوں کی حکومت کو تسلیم کر لیا جائے، تو یہ شرک ہے اور اس سے انسان کا قلب، خوف کا نشیمن بن جاتا ہے۔ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۸۸/۲۸)۔ زندگی کے تمام

معاملات کے تصفیہ کے لئے اُس کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ یعنی اس کا حل اس کی کتاب کی رُو سے تلاش اور اختیار کرنا چاہیئے۔ کہ غیر متغیّر صرف اُسی کے احکام و قوانین ہیں۔ امن و اطمینان اُنہی کو حاصل ہو سکتا ہے جو ان غیر متغیّر قوانین کی اطاعت کریں، نہ کہ انسانوں کی محکومیت اختیار کرنے والوں کو جنہیں معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ اُن کا آقا اس وقت کیا کر رہا ہے اور کل کو کیا کہہ دے گا! انسانوں کی حکمرانی میں کوئی آئین اور قوانین غیر متبدل نہیں ہوتے، نہ ہو سکتے ہیں۔ اِس لئے ان کے تابع رہنے والے اِنسانوں کو کبھی امن و اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا۔ امن نصیب ہوتا ہے اُن لوگوں کو:

۶/۸۳ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَھُمْ مُّھْتَدُوْنَ ۝

اِن حقائق کی روشنی میں، اِس میں شک کی گنجائش کہاں ہے کہ امن و اطمینان انہی کے لئے ہے جو قانونِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھیں اور عملاً اُس کی خلاف ورزی نہ کریں۔ ہر شے کو اُسکے صحیح مقام پر رکھیں، اور شرک سے مجتنب رہیں (۳۱/۱۳)۔ (کیونکہ امن اور بے خوفی کے لئے ایمان اور اعمالِ صالح بنیادی شرط ہے۔ ۲/۶۲) یہی وہ لوگ ہیں جو سیدھی راہ پر گامزن ہوں گے۔

یہاں کہا گیا ہے کہ امن اور ہدایت اُن کے حصے میں آتے ہیں جو اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ ملوث نہ ہونے دیں۔ قرآنِ کریم میں شرک کو ظلم، بلکہ ظلمِ عظیم کہا گیا ہے۔ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (۳۱/۱۳) ظلم کے معنی ہوتے ہیں جس شے کو جس مقام پر ہونا چاہیئے اُسے وہاں پر نہ رکھنا۔ شرک میں مظاہرِ فطرت یا انسانوں کو اُن کے مقامِ عبدیت سے اُوپر لے جا کر الوہیت کا درجہ دے دیا جاتا ہے، اور خدا کو اُس کے بلند و بالا مقامِ احدیت سے نیچے اُتار کر مخلوق کے ہمدوش کر دیا جاتا ہے۔ یہ ظلم ہے، بلکہ "ظلمِ عظیم"۔ یہاں یہ آیت جس سیاق و سباق میں آئی ہے، وہ واضح ہے۔ یعنی حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ میں کسی آفل کو خدا کا درجہ نہیں دے سکتا۔ اور آفل کے معنی ہم نے دیکھ لئے ہیں۔ یعنی تغیّر پذیر۔ اِس ایک لفظ نے، خدا کے سوا، ہر شے کی الوہیت کو باطل قرار دے دیا، کیونکہ کائنات میں تغیّر سے ماوراء صرف خدا کی ذات ہے۔ خدا نے کلمات اللہ اور سنت اللہ کو غیر متبدل کہا ہے۔ (۶/۱۱۶؛ ۳۳/۶۲)، یعنی قوانین و اقدارِ خداوندی ہی غیر متبدل اور تغیّر نا آشنا ہیں۔ انہی کی محکومیت اختیار کرنے سے انسان کو حقیقی امن نصیب ہو سکتا ہے، اور یہی راہ اسے اُس کی منزلِ مقصود تک پہنچا سکتی ہے۔ اگر ہم ان اقدار و قوانین کے بجائے انسانوں کے

شرک ظلم عظیم ہے

وضع کردہ قوانین واحکام کا اتباع کریں گے، تو یہ شرک ہوگا۔ اب آپ سوچیئے کہ کتاب اللہ کے بجائے انسانوں کے مرتب کردہ احکام وقوانین کا اتباع (خواہ وہ کسی نام سے موسوم ہوں) ظلم عظیم یعنی شرک قرار پائے گا۔ غور کیجئے کہ

مومن ہوتے ہوئے بھی مشرک

ہم نے کس طرح اپنے ایمان کے ساتھ اس ظلم کو ملوث کر رکھا ہے؟ قرآن کریم نے ہمارے ہی متعلق کہا تھا: وَمَا یُؤۡمِنُ اَکۡثَرُهُمۡ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمۡ مُّشۡرِکُوۡنَ۔ (۱۲/ ۱۰۶)۔

"ان میں اکثر لوگ ایسے ہیں کہ وہ دعوائے ایمان کے باوجود مشرک کے مشرک رہتے ہیں"۔ یہ وجہ ہے جو ہمیں نہ امن نصیب ہوتا ہے، نہ زندگی کی خوشگواریوں کے راستے ہمارے سامنے آتے ہیں۔

یہ تھے وہ قطعی دلائل اور حتمی براہین جن سے حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کی باطل پرستیوں کی تردید کی تھی۔

۶/ ۸۴ وَتِلۡکَ حُجَّتُنَاۤ اٰتَیۡنٰهَاۤ اِبۡرٰهِیۡمَ عَلٰی قَوۡمِهٖ ؕ نَرۡفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنۡ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّکَ حَکِیۡمٌ عَلِیۡمٌ ۝

یہ ہیں وہ قاطع دلائل جو ہم نے ابراہیمؑ کو، اُس کی قوم کے عقیدہ ومسلک کے خلاف دیئے تھے۔ (حقیقت یہ ہے کہ جو شخص بھی ہمارے کائناتی نظام پر غور وفکر کے بعد، وحدتِ خالق اور وحدتِ قانون کی صداقت کو تسلیم کر لیتا ہے) ہم اپنے قانونِ مشیت کے مطابق اُسے بلند مقامات عطا کر دیتے ہیں۔ یقیناً تمہارے نشوونما دینے والے کے فیصلے علم وحکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔ (یہ نہیں کہ یونہی، جسے جی چاہا، مقام بلند عطا کر دیا۔ جسے چاہا، ذلیل وخوار کر دیا!)

بلندئ درجات

درجات قانونِ خداوندی کی رُو سے بلند ہوتے ہیں اور (قانونِ خداوندی یہ ہے کہ) وَلِکُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوۡا ؕ ... (۴۶/ ۱۹) "ہر ایک کے مدارج اُس کے عمل کے مطابق متعین ہوتے ہیں"۔ ـــــــ اور حضرت ابراہیمؑ کے اعمال کے کیا کہنے! اُن کے مدارج بھی بلند ہوئے اور اُن کی ذریت میں بھی انبیاءؑ مبعوث ہوئے۔

۶/ ۸۴-۸۵ وَوَهَبۡنَا لَهٗۤ اِسۡحٰقَ وَیَعۡقُوۡبَ ؕ کُلًّا هَدَیۡنَا ۚ وَنُوۡحًا هَدَیۡنَا مِنۡ قَبۡلُ وَمِنۡ ذُرِّیَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَیۡمٰنَ وَاَیُّوۡبَ وَیُوۡسُفَ وَمُوۡسٰی وَهٰرُوۡنَ ؕ وَکَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ ۝ۙ وَزَکَرِیَّا وَیَحۡیٰی وَعِیۡسٰی وَاِلۡیَاسَ ؕ کُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِیۡنَ ۝ۙ وَاِسۡمٰعِیۡلَ وَالۡیَسَعَ وَیُوۡنُسَ وَلُوۡطًا ؕ وَکُلًّا فَضَّلۡنَا

عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝

(ابراہیمؑ اپنے مشن میں کامیاب ہوا۔ ازاں بعد) ہم نے اُسے اسحاقؑ جیسا بیٹا اور یعقوب جیسا پوتا عطا کیا۔ ان سب کو ہم نے زندگی کی سیدھی راہ دکھا دی تھی۔ وہی راہ جو اس سے پہلے نوحؑ کو دکھائی تھی۔ اور پھر ابراہیمؑ کی نسل میں داؤدؑ، سلیمانؑ، ایوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ اور ہارونؑ کو دکھلائی تھی۔ (اور وہ اس راہ پر چل کر کامیاب و کامران ہوئے تھے) یوں ہم ان لوگوں کی محنت کو بار آور کیا کرتے ہیں جو حُسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کریں۔

انہی میں زکریاؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ اور الیاسؑ کا شمار ہے۔ یہ سب صالحین میں سے تھے۔

نیز اسمٰعیلؑ، الیسعؑ، یونسؑ اور لوطؑ، اسی زمرہ میں شامل تھے۔ ان سب کو، زندگی کی خوشگواریوں میں اقوامِ عالم پر فضیلت حاصل تھی۔

یہاں تک ان حضرات کا نام لیا گیا جو متعیّن طور پر زمرۂ انبیاء میں شامل تھے۔ ان کے علاوہ:

۶/۸۸ وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ
اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

اور اُن کے آباء و اجداد، اور ان کی نسل، اور اُن کے بھائی بندوں میں سے بھی ہم نے کتنوں کو برگزیدہ کیا۔ اور زندگی کی اُسی توازن بدوش، سیدھی راہ پر چلایا۔

مذکورہ انبیاء کرامؑ کے آباء و اجداد، نسل یا بھائی بندوں میں سے ہر ایک کو نبوت نہیں ملی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں بعض انبیاء بھی ہوں۔ لیکن قرآن کریم نے ایسا بالتصریح نہیں کہا۔ اُن کے اجتبا (برگزیدگی) کا ہی ذکر کیا ہے۔ اور برگزیدہ ہر نیک عمل انسان ہو سکتا ہے۔ سورہ حج میں جماعتِ مومنین کے متعلق کہا ہے: هُوَ اجْتَبٰكُمْ ۔ (۲۲/۷۸)۔ "خدا نے تمہیں برگزیدگی عطا کی ہے"۔ یہ تمام خدا کے متعیّن کردہ راستے پر چلتے تھے۔

۶/۸۹ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَلَوْ اَشْرَكُوْا
لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

یہ خدا کی طرف عطا شدہ وہ رہنمائی ہے جس سے ہر وہ شخص جو صحیح راستہ پر چلنا چاہے، صحیح راستے کا پتہ نشان پا لیتا ہے۔ لیکن اگر یہ لوگ، اس راستے کے ساتھ دوسرے راستوں کو بھی ملا لیں، تو ان کی محنت رائیگاں ہو جائے گی (اُس مسافر کی طرح جو کبھی ایک راہ پر چل دے، کبھی دوسرے پر۔ یوں، دن بھر چلنے سے وہ تھک

تو ضرور جائے گا، لیکن منزلِ مقصود تک کبھی نہیں پہنچ پائے گا۔ منزل تک وہی پہنچے گا جو ٹھیک اُس راستے پر چلتا جائے جو اُس کی منزل کی طرف جاتا ہے۔)

یہ وہ ہیں:۔

۹۰/۶ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَإِن يَكْفُرْ بِهَا هَٰؤُلَاءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوا بِهَا بِكَافِرِينَ ○

یہ (جن کا اوپر ذکر کیا گیا) وہ لوگ ہیں جنہیں ہم نے کتاب (ضابطۂ قوانین)، حکومت (لوگوں میں کتابِ خداوندی کے مطابق فیصلے کرنے کے اختیارات) اور نبوّت (خدا کی طرف سے وحی پانے کا امتیازِ خصوصی) عطا کئے تھے[1] (۴۵/۱۶ ؛ ۳/۷۸)

کتاب و حکم و نبوّت

اگرچہ (اہلِ کتاب جو ان انبیاء کے اتباع کے مدعی ہیں) اِس ضابطۂ خداوندی پر چلنے سے انکار کرتے ہیں جو اب قرآن میں دیا گیا ہے، تو اس سے یہ ضابطہ لاوارث ہو کر نہیں رہ گیا) اسے ہم نے ان لوگوں کے سپرد کر دیا ہے جو اس کی صداقت سے انکار نہیں کرتے۔ (۳۵/۴۲)

اُوپر جن کا ذکر آیا ہے، اِن میں انبیاءؑ اور غیر انبیاء سب شامل ہیں[2]۔ ان میں سے نبوّت صرف انبیاءؑ کرام کو عطا ہوئی تھی، اور نبوّت سے مُراد وحی کے ذریعے ملنے والی کتاب تھی جو ہر نبیؑ کو ملی تھی (۲/۲۱۳)۔ اِس کتاب کو نبی اپنی ذات تک محدود نہیں رکھتا۔ اسے دوسروں تک بھی پہنچاتا تھا، اور جو اُس کی صداقت پر ایمان لے آتے تھے، وہ اُس کی اُمت میں شامل ہو جاتے تھے۔ اِس اعتبار سے کتاب میں انبیاءؑ اور غیر انبیاء دونوں شامل ہوتے تھے ——— انبیاءؑ بلا واسطہ اور اُس کی اُمت بالواسطہ۔ اس مفہوم کے اعتبار سے دوسری جگہ کہا ہے:
وَلَقَدْ آتَيْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ (۴۵/۱۶)۔ اور اُمّتِ مسلمہ (اُمّتِ محمدیہ)

---

[1][2] جن کا ذکر اُوپر آیا ہے اُن میں انبیاءؑ اور غیر انبیاء سب شامل ہیں (انبیاءؑ کے آباء۔ نسل اور بھائی بندوں میں غیر انبیاء بھی شامل ہیں)۔ لہذا، ان میں انبیاء کرام پر وحی کے ذریعے کتاب نازل کی (۲/۲۱۳)۔ انبیاء کی وساطت سے کتاب اُن کے متبعین کو ملی۔ اور اسے نافذ کرنے کی عملی قوت بھی۔ اس طرح کتاب وحکومت میں نبی اور غیر نبی دونوں شامل ہو جاتے ہیں۔ اور نبوّت صرف انبیاء کا خاصہ ہوتا ہے۔ رسول اللہؐ کے بعد نبوّت ختم ہو گئی اور کتاب و حکومت، حضورؐ کی اُمت میں آگے چلی۔

کو وارثِ کتاب قرار دیا ہے (۳۵/۳۲)
کتاب، ضابطۂ قوانین کو کہتے ہیں، اور قوانین بے مقصد ہوتے ہیں جب تک اُن کے ساتھ قوتِ نافذہ نہ ہو۔ اِسے حکومت کہا جاتا ہے۔ اس لئے انبیاءؑ اور اُن کی اُمت کو کتاب کے ساتھ حکومت بھی عطا ہوئی تھی۔ سو بات یوں ہوئی کہ
(i) نبوّت نہ ہو تو خدا کی کتاب نہیں مل سکتی۔
(ii) کتاب نہ ہو تو ہدایت نہیں مل سکتی۔
(iii) کتاب کے ساتھ حکومت نہ ہو تو کتاب کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ وہ محض وعظ بن کر رہ جاتی ہے۔
(iv) کتاب، بلا حکومت ہو تو وہ مذہب ہوتا ہے، اور کتاب کے ساتھ حکومت ہو تو دین متمکن ہوتا ہے، اور دین کا تمکن ہی منشائے خداوندی ہے۔ (۲۴/۵۵)۔
لیکن اِس حکومت سے مقصد لوگوں کو اپنا محکوم یا غلام بنانا نہیں۔ انہیں خدا کا عبد بنانا مقصود ہوتا ہے اس کی وضاحت آیت (۳/۷۸) میں کی جا چکی ہے۔ وہاں بھی کتاب اور حکومت اور نبوّت تینوں کا ذکر ہے۔
قرآنِ کریم نے ان تمام انبیاء کو امتِ واحدہ (ایک ہی برادری کے افراد) قرار دیا ہے: اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ (۲۱/۹۲)۔ یہ تمام انبیاءؑ ایک ہی اُمت کے افراد تھے۔ کیونکہ یہ سب خدائے واحد کے فرستادہ تھے۔ انہیں دین بھی ایک ہی دیا گیا تھا (۴۲/۱۳)۔ اس لئے ان کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

۶/۹۱ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّاۤ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ۝

یہ (انبیاءؑ) وہ ہیں جنہیں اللہ نے زندگی کی صحیح راہ دکھا دی تھی۔ پس (اے رسولؐ!) تم بھی اُسی راستے پر چلو جس پر اللہ نے اُنہیں چلایا تھا۔ (اور لوگوں کو اِسی راہ کی طرف دعوت دیتے جاؤ اور ان سے کہہ دو کہ) میں اس راہنمائی کے لئے تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔ یہ تو تمام نوعِ انسان کے لئے ضابطۂ حیات ہے (میری ذاتی ملکیت نہیں کہ تم سے اِس کی قیمت وصول کروں)۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، ایک چیز ہوتی ہے زندگی کے لئے اصول و اقدار۔ اُنہیں دین کہا جاتا ہے اور دوسری چیز ہوتی ہے ان اصولوں کو نافذ کرنے کے طور طریقے۔ اِسے اصطلاح میں شریعت (یا جزئیات)

کہا جاتا ہے۔ الدین تو شروع سے آخر تک ایک ہی تھا۔ لیکن اس پر چلنے کے طور طریقے (شریعتیں) ہر رسولؑ کے زمانے کے تقاضوں کے لحاظ سے مختلف تھیں۔ ان (احکام شریعت) میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی تھیں، اور بعض ان میں سے منسوخ بھی کر دی جاتی تھیں۔ (دیکھئے انڈکس میں عنوان ناسخ و منسوخ)۔ لہٰذا، شریعت ہر نبیؑ اور اس کی اُمت کی مختلف ہوتی تھی۔ آیۂ زیر نظر (۶/۹۱) میں جو کہا گیا ہے کہ تم اس ہدایت پر چلو جو ان

الدّین کا اتباع

تمام انبیاءؑ کو دے دی گئی تھی، تو اس سے مُراد الدّین ہے جو حضور نبی اکرمؐ کو (انبیاءؑ سابقہ کی طرح) بذریعہ وحی عطا ہوا تھا۔ اس سے مُراد ان (انبیاءؑ سابقہ) کی شریعتوں کا اقتدا نہیں، اس لئے کہ اوّل تو وہ شریعتیں اپنی غیر محرف شکل میں کہیں موجود نہیں تھیں۔ اور اگر موجود ہوتیں بھی، تو وہ وقتی اور ہنگامی تھیں۔ ابدی طور پر واجب الاتباع نہیں تھیں۔

اس آیت میں چار لفظوں میں ایک عظیم حقیقت کا بیان کیا گیا ہے۔ یعنی رسولؑ اعلان کرتا ہے لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ط " میں تم سے جو کچھ کہتا ہوں اور تمہارے لئے جو کچھ کرتا ہوں، اس کا تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔

اجرِ رسالت

رسول ایک ناصح مشفق کی طرح اپنی قوم کی طرف آتا تھا۔ اُس کی نصیحت اس قوم کے بھلے کے لئے ہوتی تھی۔ ناصح کی ایک خصوصیت یہ ہونی چاہیئے کہ جو کچھ وہ کہے، وہ حق اور صداقت پر مبنی ہو اور وہ اسے دلائل و براہین کی رُو سے پیش کرے تاکہ وہ قوم کی عقل و فکر کو اپیل کرے۔ اور دوسری خصوصیت یہ کہ اس نصیحت فرمائی میں اُس کا اپنا کوئی مفاد نہ ہو۔ وہ خالصتاً ان لوگوں کی بہی خواہی پر مبنی ہو۔ یہ خصوصیت بڑی گراں بہا ہوتی ہے، اور نصیحت کے مؤثر ہونے کے لئے بڑا قوی ذریعہ۔ اگر مخاطبین کو یقین ہو جائے کہ جو کچھ یہ شخص کہتا ہے، اس میں اس کا اپنا کوئی مفاد مضمر نہیں، تو اُن کا (کم از کم) ہوشمند طبقہ اُن سے کہہ سکتا ہے کہ جو کچھ یہ شخص کہتا ہے، اس میں اس کا اپنا کوئی فائدہ مضمر نہیں، اس لئے تم اس کی بات تو سُن لو۔ یہ جو دن رات اپنی جان کھپاتا ہے۔ اتنی تکلیفیں برداشت کرتا ہے۔ اتنی مشقتیں اٹھاتا ہے، اور اس میں اس کا اپنا کوئی فائدہ نہیں، تو سوچنے کی بات ہے کہ یہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ لہٰذا، بے غرض نصیحت اور بے اجر چارہ گری کا بڑا گہرا نفسیاتی اثر ہوتا ہے چنانچہ اسی قسم کا تھا وہ فردِ ہوشمند جسنے بستی کے تخریب کاروں سے کہا تھا کہ تم ان مُرسلینؑ کا اتباع کرو۔ تم دیکھتے نہیں کہ وہ تم سے اس بہی خواہی کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتے (۳۶/۲۱)۔ یہ وجہ ہے کہ ہر رسولؑ اپنے پیغام کو پیش کرنے کے ساتھ ہی یہ اعلان کرتا تھا کہ يٰقَوْمِ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ط (۱۱/۵۱)۔ " اے مری قوم! میں

اس کے لئے تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا [له]

حضور نبی اکرمؐ نے یہ کہکر کہ میں تم سے کوئی اجرِ رسالت نہیں مانگتا، اس کی وضاحت کر دی کہ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝ (۲۵/۵۷) "میرا مقصد فقط اتنا ہے کہ تم میں سے جو چاہے، خدا کی طرف جانے والا راستہ اختیار کر لے، اور یہی میرا اجرِ رسالت ہے۔ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ؕ (۳۴/۴۷) "اور یہ اجر خود تمہارے ہی فائدے کے لئے ہے۔ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ "میرا اجر، میرے خدا کے ہاں سے، مجھے ملے گا۔

یہ آیات اس قدر واضح ہیں کہ ان کا مفہوم سمجھنے کے لئے کسی تشریح اور تفسیر کی ضرورت نہیں۔ لیکن ایک آیت، بلکہ اس کے چند الفاظ ایسے ہیں جن کے اختلافی مفہوم سے اُمت مستقل طور پر دو پارہ ہوگئی ہے۔

قبل اس کے کہ میں اس آیت کے مفہوم کی طرف آؤں، یہ بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ، جیسا کہ میں شروع سے لکھتا چلا آرہا ہوں، میرا تعلق کسی مذہبی فرقہ سے نہیں۔ میں فرقہ بندی کو از روئے قرآن شرک سمجھتا ہوں

میرا تعلق کسی فرقہ سے نہیں

میں صرف مسلمان ہوں اور قرآن کریم کا طالب علم۔ اس طالب علم قرآنی کے سلسلے میں بھی میرا یہ ایمان ہے کہ کسی خاص عقیدہ، نظریہ یا تصوّر کو پہلے سے ذہن میں جاگزین کر کے قرآن کے سمجھنے کی کوشش کرنا بھی شرک ہے۔ قرآن کی طرف خالی الذہن ہو کر آنا چاہیئے اور اس طرح اس کی بارگاہ سے جو تعلیم ملے اس کی صداقت پر ایمان رکھنا چاہیئے۔ اس صراحت کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ آیت زیرِ نظر کے اختلافی مفہوم پر بحث کرتے ہوئے بھی مجھے نہ کسی فرقہ کی رعایت مقصود ہے، نہ کسی کی مخالفت مطلوب۔ میں صرف اسی نتیجہ کو پیش کروں گا جس تک میں، اپنی بصیرتِ قرآنی کی رُو سے، پہنچا ہوں۔

آپ دیکھ چکے ہیں کہ خدا کے ہر رسولؑ نے اس کا اعلان کیا، اور حضور نبی اکرمؐ نے تاکیداً فرمایا کہ "میں تم سے تبلیغ رسالت کا کوئی اجر نہیں چاہتا"

سورۃ الشورٰی کی آیت ۴۲/۲۳ میں ہے:

[له] حوالوں کے لئے دیکھئے:۔ (۱۰/۷۲ ؛ ۱۱/۲۹ ؛ ۱۱/۵۱ ؛ ۲۶/۱۰۹ ؛ ۲۶/۱۲۷،۱۴۵،۱۶۴ ؛ ۲۶/۱۸۰ ؛ ۳۴/۴۷)

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ؕ (۴۲/۲۳)۔

مودّة في القربىٰ

ایک گروہ اس کا ترجمہ کرتا ہے: "میں تم سے اپنی رسالت کا کوئی اجر نہیں مانگتا بجز اس کے کہ تم میرے رشتہ داروں سے محبت کرو"۔ شیعہ حضرات "رشتے داروں" سے مُراد لیتے ہیں "آلِ محمدؐ"۔ یعنی حضرت فاطمہؓ کے بطن سے حضرت علیؓ کی اولاد در اولاد آگے تک اُن کا سلسلہ)۔ انہیں عرفِ عام میں سیّد (سادات) کہا جاتا ہے۔ اس مفہوم کی رُو سے، سیّدوں کی محبّت، قیامت تک کے لئے، مُسلمانوں پر فرض قرار پاگئی۔ جس مسلمان کے دل میں کسی سیّد کے خلاف ذرا سا (نفرت اور عداوت تو ایک طرف) بیزاری اور تکدر کا جذبہ پیدا ہوگیا، وہ معصیتِ رسولؐ کا مرتکب ہوگیا! یہ تو ذرا آگے چل کر بیان کیا جائے گا کہ یہ ترجمہ یا مفہوم، خود عربی زبان کی رُو سے، بھی کس طرح ناقابلِ قبول ہے، اور یہ بھی کہ یہ کیسے وجود میں آیا۔ یہاں صرف یہ دیکھئے کہ اس مفہوم کی رُو سے قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کی ساری عمارت کس طرح منہدم ہو جاتی ہے۔ قرآنِ کریم، تکریمِ انسانیت کا پیغام لے کر آیا اور اُس نے تمام نوعِ انسان کو، ایک عالمگیر برادری کی شکل میں، متشکل کرنا، اپنا نصب العین قرار دیا۔ اِس کے لئے اُس نے نسلی امتیاز و تفریق کے تصوّر کی جڑ کاٹ دی۔ اُس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ تمام انسان پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب التکریم ہیں (۱۷/۷۰)۔ اور ان کے مدارج ان کے اعمال کی رُو سے متعین ہوتے ہیں — وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ؕ۔ (۴۶/۱۹)۔ اِس معیار کی رُو سے سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جس کے اعمال سب سے زیادہ اچھے ہیں۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ (۴۹/۱۳)۔ اس میں کسی کا بیٹا، باپ یا بھائی یا اور رشتہ دار ہونا کچھ فرق نہیں پیدا کرتا۔ قرآنِ کریم نے اس کی پہلی مثال سب سے پہلے پیغمبر کی زندگی سے پیش کی ہے۔ جب حضرت نوحؑ نے خدا سے درخواست کی کہ اس کے بیٹے کو غرقابی سے بچایا جائے کیونکہ وہ اس کے اہل میں سے ہے تو جواب ملا کہ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ "اے نوحؑ! وہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے" اس لئے کہ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ (۱۱/۴۶)۔ "اُس کے اعمال صالح نہیں"۔ اور اس کے بعد یہ تنبیہ کی کہ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ "جس بات کا تجھے علم نہ ہو، اُس کی ہم سے طلب نہ کیا کرو۔ اِنِّيْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ○ (۱۱/۴۶)۔ "تمہیں یہ نصیحت اس لئے کی جاتی ہے تاکہ تم جاہلوں جیسی باتیں نہ کرو"۔

نسل پرستی کے خلاف

آپ نے غور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ نبیؐ کا بیٹا ہونا بھی اِسے کسی رعایت کا مستحق قرار نہیں دے سکتا۔

اور آگے بڑھئے۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے مختلف مراحل میں سے گزرنے کے بعد اپنے آپ کو انسانیت کے بلند ترین مقام کا اہل ثابت کر دیا تو ارشادِ باری تعالیٰ ہوا: اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔ (۲/۱۲۴) "ہم نے تمہیں نوعِ انسان کی امامت کا مستحق قرار دے دیا۔" حضرت ابراہیمؑ نے عرض کیا کہ بارِ الہٰا! تیرا یہ وعدہ میرے ہی ساتھ ہے یا میری اولاد میں بھی یہ اس طرح منتقل ہوتا رہے گا۔ فرمایا: لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ۔ (۲/۱۲۴) "تیری اولاد میں سے جو تیرے نقشِ قدم پر چلتا رہے گا اُس کے ساتھ تو ہمارا یہ وعدہ برقرار رہے گا، لیکن جو اس سے انحراف کرے گا اور سرکشی برتے گا، اُس کے ساتھ ہمارا یہ وعدہ نہیں۔ اسے محض تمہاری اولاد میں سے ہونا کچھ فائدہ نہیں دے گا۔ اِس لئے حضرت ابراہیمؑ نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ (۱۴/۳۶) میرا وہی ہے جو میرا اتباع کرے گا، جو اس روش سے انحراف برتے، وہ میرا ہے ہی نہیں۔

انبیاءِ اکرامؑ کا رشتہ دار ہونا تو ایک طرف، نبی کریمؐ نے خود اپنے متعلق فرمایا: اِنِّیْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ۔ (۶/۱۵) "اگر میں بھی خدا کی معصیت کا مرتکب ہوں تو ڈرتا ہوں کہ اُس کے عذاب سے بچ نہیں سکوں گا۔"

اِن تصریحات (اور قرآن کریم کی بنیادی تعلیم، قانونِ مکافاتِ عمل) کی روشنی میں کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ حضور نبی اکرمؐ یہ فرمائیں گے کہ (اور وہ بھی ارشادِ خداوندی کی رُو سے کیونکہ آیت میں قُلْ لَّاۤ اَسْئَلُكُمْ .... ہے۔ اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ ......) میں تم سے اپنی رسالت کا یہ اجر مانگتا ہوں کہ تم میری آل (سیّدوں) سے محبت کرو خواہ وہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ خدا اور اس کے رسولؐ کی طرف سے اس قسم کی نسل پرستی کی تعلیم کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا! حضورؐ نے جو اُمت متشکل فرمائی، اس میں مختلف نسلوں، قوموں، قبیلوں، خاندانوں کے افراد شامل تھے اور اللہ تعالیٰ نے اِن سب (صحابہؓ) کو مستحقِ شرف و اجتبا قرار دیا تھا۔ ان میں حضورؐ کے رشتہ دار بھی تھے۔ انہیں کسی خصوصی مرتبہ کا حقدار نہیں ٹھہرایا تھا۔ اِن کے برعکس ابولہب حضورؐ کا حقیقی چچا تھا، اسے خُدا نے (نام لے کر) جہنم کا ایندھن قرار دیا تھا۔ اور حضورؐ کی رشتہ داری اس کے کسی کام نہیں آ سکی تھی! آپؐ نے حجۃ الوداع کے خطبہ کا آغاز اس طرح فرمایا تھا کہ

یاد رکھو! جاہلیت کے تمام دستور و آئین میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ میں نے انہیں مسل ڈالا ہے۔ اِس کے بعد فرمایا:

ایها الناس! الا ان ربکم واحد۔ و ان اباکم واحد الا لا فضل لعربی علی عجمی

ولا لعجمی علیٰ عربی - ولا لاحمر علیٰ اسود ولا لاسود علیٰ احمر - الا بالتقویٰ -

"اے نوعِ انسانی اُسے رکھو کہ تمہارا سب کا رب ایک ہے - تم تمام ایک ہی اصل کی شاخیں ہو - اس لئے عربی کو عجمی پر سُرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سُرخ پر کوئی فضیلت نہیں، مگر تقویٰ کے سبب"

آپؐ نے اپنی وفات سے پہلے جو آخری خطبہ ارشاد فرمایا، اس کے آخری الفاظ تھے :-

اے پیغمبر کی بیٹی فاطمہؓ! اور اے پیغمبر کی پھوپھی صفیہؓ! خدا کے ہاں کے لئے کچھ کرلو - میں تمہیں خدا سے نہیں بچاسکتا۔

آپ سوچیئے کہ جو پیغمبر (اپنی بیٹی) حضرت فاطمہؓ سے یہ کہے، کیا وہ یہ کہے گا کہ اس (فاطمہؓ) کی اولاد سے محبت کرنا تمام مسلمانوں پر فرض ہے خواہ وہ کیسی ہی کیوں نہ ہو؟ خدا نے تمام مومنوں کو بھائی بھائی کہا ہے (۴۹/۱۰) - رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (۴۸/۲۹) اُن کی خصوصیت بتائی ہے - یعنی ایک دوسرے کے ہمدرد اور غمگسار - اس میں آلِ محمدؐ کی کوئی تخصیص و تفریق نہیں کی - اس لئے حضورؐ خصوصیت سے، اپنی اولاد (آل) کے متعلق یہ کیسے کہہ سکتے تھے کہ ان سے محبت کرنا تم سب کا فریضہ ہے۔

آیت کے معانی اب آیئے آیت کے الفاظ کے معانی کی طرف - الفاظ ہیں "اَلْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى" (۴۲/۲۳) - قُربیٰ کے معنی قرابت یا رشتہ داری کے ہیں - "رشتہ دار" کے نہیں - رشتہ داروں کے لئے قرآن مجید میں ذَوِی الْقُرْبٰى آیا ہے (۲/۱۷۷) یعنی "رشتہ داری والے" - اگر میرے رشتہ دار کہنا ہوتا تو لِاَ قْرَبَائِیْ کہا جاتا۔

صلۂ رحمی، یا رشتہ داری کے تعلقات کی پاسداری (زمانۂ جاہلیت میں بھی) عربوں کی نمایاں خصوصیت تھی - لیکن یہ عجیب بات تھی کہ جب حضورؐ نے اپنی دعوت کا آغاز کیا، تو اُس کی مخالفت میں، قریش، اور قریش میں سے بھی بنی ہاشم، یعنی آپ کے قبیلہ اور خاندان کے افراد (قریب ترین رشتہ دار) سب سے آگے تھے - یعنی اُنہوں نے اس مخالفت میں اپنی قومی خصوصیت کو بھی پس پشت ڈال دیا - سورہ توبہ میں ہے:

كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ ...... (۹/۸)

"اِن لوگوں سے ایفائے عہد کی کیسے توقع کی جاسکتی ہے، جن کی حالت یہ ہے کہ اگر ان کا تم پر زور چلے تو یہ عہد و پیمان تو ایک طرف رہا، رشتہ داری کے تعلقات اور معاشرتی روابط کو بھی بالائے طاق رکھ دیں۔"

اس سے آگے ہے: لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ (۹/۱۰) - "اُن کی حالت یہ ہے کہ ان میں سے جو شخص اسلام لے آتا ہے، یہ اُس سے رشتہ داری کے عام تعلقات کی بھی پاسداری نہیں کرتے اور اسے

ایسی ایسی اذیتیں پہنچاتے ہیں جن کی مثال نہیں ملتی۔

یہ تھا اسلام کی ابتدائی دعوت کے دوران نبی اکرمؐ اور جماعتِ مومنین کے خلاف اُن کے رشتہ داروں کی مخالفت کی شدت کا عالم۔ اس کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے، حضورؐ نے اُن سے کہا تھا کہ

میں تم سے اپنی رسالت کا تو کوئی اجر نہیں مانگتا، لیکن تم میری اور جماعتِ مومنین کی مخالفت اور اذیت رسانی میں اِس حد تک تو نہ بڑھ جاؤ کہ اپنی قومی خصوصیت کے خلاف رشتہ داری کے عام (معاشرتی) تعلقات کو بھی بالائے طاق رکھ دو۔

یہ مفہوم ہمارا ہی اخذکردہ نہیں۔ متقدمین میں بھی یہی مفہوم لیا جاتا تھا۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے:

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے اِس آیت کی تفسیر دریافت کی گئی تو حضرت سعید بن جبیرؓ نے کہا اس سے مُراد قرابتِ آلِ محمدؐ سے ہے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا: تم نے عجلت سے کام لیا۔ سنو! قریش کے جس قدر قبیلے تھے، سب کے ساتھ حضورؐ کی رشتہ داری تھی۔ تو مطلب یہ ہے کہ تم اس رشتہ داری کا لحاظ رکھو جو مجھ میں اور تم میں ہے۔ حضرت مجاہدؒ۔ حضرت عکرمہؒ۔ حضرت قتادہؒ۔ حضرت سدیؒ۔ حضرت ابومالکؒ۔ حضرت عبدالرحمٰنؒ وغیرہ بھی اس آیت کی یہی تفسیر کرتے ہیں[1]۔

(تفسیر ابن کثیر۔ اردو ترجمہ مولانا محمد جوناگڑھی۔ پچیسواں پارہ صفحہ ١٢)

بعض لوگوں کا خیال ایک اور طرف گیا ہے۔ عربوں کی خانہ جنگی مشہور تھی۔ ایک ایک جنگ سالہا سال تک جاری رہتی تھی۔ اس سے ان کا معاشرہ تباہ ہو رہا تھا۔ اسلام کی تعلیم خونریزی اور مفسدہ پردازی کے سخت خلاف تھی۔ یہی حضورؐ کی دعوت تھی۔ لیکن وہ لوگ اس کی مخالفت کرتے تھے۔ آپؐ نے ان سے فرمایا تھا کہ میں تمہیں جو دعوت دیتا ہوں اِس سے مقصد یہ ہے کہ تم باہمی خانہ جنگی سے رُک جاؤ۔ اِس میں تمہارا بھلا ہے۔ میں اس کے لئے تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ چاہتا یہ ہوں کہ تم باہمی رشتوں ناطوں ہی کا خیال کرو اور اس جنگ و قتال کے سلسلہ کو ختم کرو۔ اگر تم نے ایسا کر دیا تو مجھے میری محنت کا صِلہ مِل گیا۔ اس کی تائید سورۃ السبا کی اُس آیت سے بھی ہوتی ہے جسے پہلے درج کیا جا چکا ہے ــــ یعنی: قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ (٣٤/٤٧) "میں تم سے جو اجرِ رسالت مانگتا ہوں، وہ خود تمہارے بھلے کے لئے ہے"۔ مخالفین کو بات سمجھانے کا یہ کیا دلنشین انداز ہے۔

---

[1] واضح رہے کہ یہ اسلام کے ابتدائی دور کی بات ہے۔ بعد میں ان لوگوں سے تعلقات منقطع کرنے کے احکام نازل ہوگئے تھے۔

غلط مفہوم کیسے لیا گیا

اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ قرآن کریم کی ایسی واضح تعلیم اور خود اس آیت کے صاف الفاظ کی موجودگی میں وہ مفہوم کسطرح وجود میں آگیا جس کا پہلے ذکر کیا گیا ہے؟

یعنی یہ کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ میرا اجرِ رسالت یہ ہے کہ تم میری آل سے محبت کرو۔ یہ مفہوم پیدا کردہ ہے ان روایات کا جو سیاسی محرکات اور مصالح کی رُو سے وضع کی گئی تھیں۔ یہ داستانِ سیاست بڑی دراز ہے جو ان صفحات میں سما نہیں سکتی۔ اسے آپ میری کتاب "شاہکارِ رسالت" میں دیکھ سکتے ہیں۔ ملخصاً یوں سمجھئے کہ بنی ہاشم اور بنی امیہ میں شروع سے مخاصمت چلی آ رہی تھی۔ جب حکومت بنی امیہ کے ہاں آ گئی تو بنی ہاشم کا جذبۂ مخاصمت مشتعل ہو گیا۔ چنانچہ بنی عباسؓ نے اُن کے خلاف سازشی تدابیر شروع کر دیں۔ ان کا مرکز ایران تھا، اور ابو مسلم خراسانی اس سازش کی دعوت کا سب سے بڑا نقیب۔ اُنہوں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ بنی عباس کے نام میں عوام کے لئے کوئی کشش نہیں۔ کشش اسی نام میں ہو سکتی ہے جس کی نسبت رسول اللہؐ سے ہو۔ چنانچہ اُنہوں نے طے یہ کیا کہ کسی کا نام لئے بغیر کہا یہ جائے کہ "امامت اہل بیت" کا حق ہے۔ اس مسلسل پراپیگنڈا کا نتیجہ تھا کہ ۱۳۲ھ میں بنو امیّہ کی حکومت کا تختہ اُلٹ گیا۔ اور اقتدار بنو عباس کے ہاتھ میں آ گیا۔ زمامِ اقتدار تو ان کے ہاتھ میں تھی، لیکن سب سے زیادہ اثر ایرانیوں کا تھا۔ ان کے علاوہ وہاں "اہلِ بیت" (یعنی ساداتؓ[1]) بھی تھے۔ اُنھیں شکایت تھی کہ سلطنت حاصل تو اُن کے نام سے کی گئی ہے، لیکن اس پر قبضہ بنو عباس نے جما لیا ہے۔ چنانچہ ان میں باہمی چپقلش شروع ہو گئی۔ ان تینوں گروہوں میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی فضیلت کا دعویٰ کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ روایات کی رُو سے ہی ہو سکتا تھا۔ چنانچہ وضعی روایات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

(ضمناً) شیعہ حضرات کی روایات کی چار کتابیں تو ان کی اپنی ہیں، اور سُنی حضرات کی روایات کے چھ معتبر ترین مجموعے (صحاح ستہ) اُن کے اپنے۔ ان سب کے جامعین ایرانی ہیں۔ مندرجہ بالا تینوں گروہوں کے حق میں جو روایات وضع ہوئیں، وہ ان مجموعوں میں موجود ہیں۔

---

[1] حضرتِ فاطمہؓ کی وفات کے بعد حضرت علیؓ نے متعدد شادیاں کیں۔ چنانچہ روایات میں ہے کہ اُن کے ہاں اٹھارہ بیٹے اور اٹھارہ بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ان میں سے جو اولاد حضرت فاطمہؓ کے بطن سے ہوئی اُنہیں سیّد کہا جاتا ہے۔ اور جو اولاد دوسری بیویوں کے بطن سے ہوئی اُنہیں علوی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

وضعی روایات سورۃ الجمعہ میں رسول اللہؐ کی تبلیغِ رسالت کا ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ یہ تبلیغ اُن مخاطبین تک ہی محدود نہیں ——— وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ ط

(۶۲/۳) اس کا سلسلہ اُن لوگوں تک بھی پہنچے گا جو ہنوز اِن (مخاطبین) کے ساتھ ملے نہیں۔ جامع ترمذی میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ

کسی نے سوال کیا کہ وہ کون لوگ ہیں؟ رسول اللہؐ خاموش رہے۔ پھر اپنا ہاتھ (حضرت) سلمانؓ (فارسی) کے اُوپر رکھا اور فرمایا: قسم ہے اُس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر ایمان ثریا پر بھی معلق ہو گا، تو اس کی قوم میں ایسے لوگ ہوں گے جو اس کو پالیں گے۔

سورۃ محمدؐ میں ہے:

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ لا ثُمَّ لَا یَکُوْنُوْٓا اَمْثَالَکُمْ (۴۷/۳۸) ”اگر تم دین سے پھر جاؤ گے تو خدا تمہاری جگہ ایک اور قوم کو لے آئے گا جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔“

جامع ترمذی میں حضرت ابو ہریرہؓ ہی کی روایت ہے کہ

لوگوں نے پوچھا کہ یا رسول اللہؐ! کس قوم کو اللہ ہماری جگہ چن لے گا؟ آپ نے (حضرت) سلمانؓ (فارسی) کے مونڈھے پر ہاتھ مار کر فرمایا:

”اس کی قوم کو۔ اس کی قوم کو۔“

اس قسم کی روایات سے اہلِ فارس کی برتری کی سند نبی اکرمؐ کی زبانِ مبارک سے مہیا کرنا مقصود تھا کیونکہ وہی خلافتِ عباسیہ میں جملہ مناصبِ حکومت پر قابض تھے۔

اب آئیے عباسیہ کی طرف۔ تفسیر جامع البیان میں آیت اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی کی تفسیر میں کہا گیا ہے:

آنحضرتؐ نے حضرت عباسؓ سے فرمایا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ کسی شخص کے دل میں ایمان اُس وقت تک داخل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ تم (یعنی حضرت عباسؓ اور ان کی اولاد) کو اللہ اور رسولؐ کے لئے محبوب نہ رکھے۔　(نیز تفسیر ابن کثیر۔ اردو ترجمہ۔ پچیسواں پارہ صفحہ ۱۳)

اِس سے آلِ عباسؓ کی محبت مسلمانوں کے لئے اِیمان کی شرط قرار پا گئی۔

جہاں تک سادات کا تعلق ہے، ان کے حق میں تو ایران میں تحریک کے زمانے ہی سے پراپیگنڈا

شروع ہو گیا تھا، اس لئے ان کی فضیلت، علوِ مرتبت اور مناقب و محامد سے روایات کے مجموعے بھرے پڑے ہیں۔ شیعہ حضرات کے، روایات کے، چار مجموعے ہیں، جن میں سب سے زیادہ مشہور اور مستند الکافی کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں اہلِ بیت (یا سادات) کے حق میں کس قسم کی روایات ہیں، اس کا اندازہ صرف ایک روایت سے لگا لیجئے:

امام جعفر صادق (علیہ السلام) نے فرمایا ...."ہم وہ ہیں جن کی اطاعت اللہ نے فرض قرار دی ہے۔ لوگوں کو بدوں ہماری معرفت کے چارہ نہیں، اور ہم سے جاہل رہنا قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ جس نے ہم کو پہچانا، وہ مومن ہے۔ اور جس نے انکار کیا، وہ کافر ہے۔ اور جس نے ہم کو نہ پہچانا، لیکن انکار نہ کیا، وہ گمراہ ہے جب تک اس ہدایت کی طرف نہ لوٹے جس کو اللہ نے ہماری اطاعتِ واجبہ کی صورت میں فرض کیا ہے..... فرمایا امام محمد باقر (علیہ السلام) نے۔ ہماری محبت ایمان ہے۔ اور ہمارا بغض کفر...... یہی اللہ اور اس کے ملائکہ کا دین ہے۔"

(الشافی۔ ترجمہ الکافی۔ جلد اوّل ص ۲۱۵-۱۶)

ان تصریحات کی روشنی میں بآسانی سمجھ میں آجائے گا کہ آیت "مودۃ فی القربیٰ" کا یہ مفہوم کیسے لیا گیا کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میں تم سے کچھ اجرِ رسالت نہیں مانگتا بجز اس کے کہ تم میری آل سے محبت کرو چنانچہ جامع ترمذی میں حضرت سعید بن جبیر کی یہ روایت درج ہے:

اس آیت میں قربیٰ کے معنی آلِ محمدؐ کے ہیں۔ یعنی میری تبلیغ کا اجر کچھ نہیں سوائے اس کے کہ میری اولاد کے ساتھ محبت رکھو۔

صحیح بخاری اور جامع ترمذی میں ہے کہ

جب یہ آیت نازل ہوئی ــــ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ (۳۳/۵۶) ــــ اے مومنو! نبیؐ پر درود بھیجو اور سلام۔ تو حضرت بشیرؓ بن سعدؓ نے نبی (صلعم) سے دریافت کیا کہ ہم کس طرح آپؐ پر درود بھیجا کریں؟ آپؐ نے دیر تک سکوت کیا، پھر فرمایا کہ کہو: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ....... (ایضاً ص ۲۵)

درود کا مفہوم، مطالب الفرقان جلد سوم (صفحہ ۱۱۳) پر بتایا جا چکا ہے۔ یہاں صرف اتنا اضافہ کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا۔ صَلُّوْا عَلَيْهِ۔ رسولؐ پر درود بھیجو (۳۳/۵۶) اور روایت نے اس

حکمِ خداوندی میں " وَآلِہٖ " کا اضافہ کرکے اس کی تکمیل کر دی! اور یہ درُود شیعہ حضرات کا ہی نہیں، سُنّی حضرات اِسے ہر نماز میں بھی پڑھتے ہیں اور لاکھوں بار اس کا ورد بھی کرتے ہیں۔ لہذا، ہر سُنّی، اپنی نمازوں میں سیّدوں پر درُود بھیجتا ہے، خواہ اُن کا کردار کیسا ہی کیوں نہ ہو۔

اور آگے بڑھیئے۔ حضورؐ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا:

وَانی قد ترکت فیکم مالن تضلوا بعدہٗ ان اعتصمتم بہٖ کتاب اللّٰہِ

میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑ چلا ہوں کہ اگر تم نے اسے مضبوط پکڑے رکھا تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ وہ چیز کیا ہے؟ کتاب اللہ۔ (صحاح - بحوالہ شبلی - سیرت النبیؐ - جلد دوم صفحہ ۱۵۶)

لیکن ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا تھا:-

میں تم میں ایسی چیز چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر تم اسے مضبوط تھامے رہے تو بہکوگے نہیں۔ ایک دوسری سے زیادہ عظمت والی ہے۔ کتاب اللہ جو خدا کی طرف سے ایک لٹکائی ہوئی رسّی ہے جو آسمان سے زمین تک آتی ہے۔ اور دوسری چیز میری عترت، میری اہل بیت ہے، اور یہ دونوں جدا نہ ہوں گی یہاں تک کہ دونوں میرے پاس حوضِ کوثر پر آئیں۔ (ابن کثیر - پچیسواں پارہ صفحہ ۱۴)

آپ غور کیجیئے کہ اس روایت کی رُو سے، کتاب اللہ اور عترت (اولاد) رسُول اللہؐ دونوں ہم پایہ ہوگئے اس طرح کہ ایک دوسرے سے زیادہ عظمت والی ہے۔ اور حضورؐ نے اُمت سے فرمایا کہ اگر یہ دونوں کو تھامے رکھیں گے تو گمراہ نہ ہوں گے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجیئے کہ آلِ محمّد کا مرتبہ کیا ہے۔ اور یہ دونوں روایتیں سُنیوں کے احادیث کے مجموعوں میں ہیں۔ ان کے جمعہ اور عیدین کے خطبہ میں ان کے پنجتن پاک کے خصوصیت سے نام لئے جاتے ہیں۔ اور ان پر درود بھیجا جاتا ہے۔ سُنیوں ہی کی ایک اور روایت ہے:-

(حضرت) ابوذرؓ کہتے ہیں کہ انہوں نے کعبہ کے دروازے کو پکڑ کر یہ بیان کیا کہ میں نے نبیؐ کو یہ فرماتے سُنا ہے آگاہ ہو کہ میرے اہلِ بیت تمہارے لئے نوحؑ کی کشتی کے مانند ہیں۔ جو شخص کشتی میں سوار ہوا۔ اُس نے نجات پائی اور جو کشتی میں سوار ہونے سے پیچھے رہ گیا، وہ ہلاک ہو گیا۔

(مشکوٰۃ - اردو ترجمہ، جلد دوم - صفحہ ۴۴۳)

یعنی، ایمان، ہدایت، نجات سب رسولؐ اللہ کی آل (عترت - اہلِ بیت) کی محبّت اور ان کے ساتھ وابستگی سے مشروط ہیں، اور یہ ہے وہ اجرِ رسالت جس کا مطالبہ حضورؐ نے فرمایا تھا۔[1]

---

[1] ان امور کی تفصیل کے لئے میری دیگر تصانیف - لغات القرآن، شاہکارِ رسالت، معراجِ انسانیت اور ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ مقامِ حدیث دیکھئے۔

یہ ہے روایات کی رُو سے "مودۃ فی القربیٰ" کی آیت کی تفسیر، قرآنِ کریم کی رُو سے اس کا مفہوم پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔

مذکورہ صدر مباحث، آیت ۶/۹۱ کے ضمن میں تھے۔ اب آگے بڑھیئے۔ فرمایا:

۶/۹۲ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ ؕ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِیْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِیْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ ○

جب یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ رسولؐ تو عام انسانوں جیسا ایک انسان ہے۔ خدا اس کی طرف اپنی وحی کیسے بھیج سکتا ہے، تو (اس سے نظر آتا ہے کہ) یہ لوگ خدا کے متعلق صحیح اندازہ ہی نہیں لگا سکے۔ (انہوں نے سمجھ رکھا ہے کہ خدا کی ہر بات نرالی اور اچنبھے کی ہونی چاہیئے)۔ (۲۲/۷۵ ؛ ۳۹/۶۷ ؛ ۶/۱۰۲)۔

ان سے پوچھو کہ اگر تمہارا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ جس کتاب کو کسی بشر (انسان) کی طرف نازل کیا جائے، وہ من جانب اللہ نہیں ہوسکتی، تو وہ کتاب کس کی طرف سے آئی تھی جو موسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی؟ (موسیٰؑ بھی تو عام انسانوں جیسا انسان ہی تھا)۔ اُس کتاب میں بھی حقائق کی روشنی اور انسانوں کے لئے صحیح راہنمائی تھی۔ تم نے اس کتاب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اب تم اُس میں سے تھوڑے سے حصے کو (اپنی مصلحتوں کے مطابق) ظاہر کرتے ہو، اور باقی کتاب کو چھپا کر رکھتے ہو۔ حالانکہ اُس کتاب میں، اُن امور کا علم دیا گیا تھا جنہیں نہ تم جانتے تھے، نہ تمہارے آباء و اجداد۔

اِن سے کہو کہ اُس کتاب کو بھی اللہ ہی نے نازل کیا تھا (اور ایک انسان ہی کی طرف نازل کیا تھا۔ اگر یہ لوگ اسکے باوجود، اپنی ضد سے باز نہ آئیں تو ان کے پیچھے جان کھپانے کی ضرورت نہیں)۔ انہیں چھوڑ دو کہ یہ اپنی لغویات سے کھیلتے رہیں۔

(نیز آیات ۲۲/۷۴ ؛ ۳۹/۶۷) دیکھیئے

مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ بڑا غور طلب ہے۔ ایک مغربی مفکر (غالباً لاک) نے کہا ہے

کہ تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ فلاں قوم نے اپنے لئے کس قسم کا معبود اختیار کر رکھا ہے، تو میں اس قوم کے تمدن۔ معاشرت۔ معیشت۔ سیاست وغیرہ سب کے متعلق بتا دوں گا۔

یہ حقیقت ہے کہ خدا کے تصور کا قوموں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ آپ دنیا کی کسی مذہب پرست قوم کو لیجئے۔ وہ کسی نہ کسی شکل میں ایک معبود کو مانتی ہوگی۔ لہذا یہاں تک ان قوموں میں اشتراک ہوگا۔ یعنی کسی معبود کو ماننا۔ لیکن جب آپ ان کے معبود کے تصور (یا تفصیل) میں جائیں گے، تو کسی قوم کا معبود دوسری قوم کے معبود سے نہیں ملے گا۔ ہر ایک کا "خدا" الگ الگ ہوگا۔ خدا کوئی محسوس شئے تو ہے نہیں کہ اسے سامنے لاکر دکھا دیا جائے۔ محسوس ہونا تو ایک طرف، وہ تو "برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم" ہے۔ لہذا اس کے متعلق ذہنوں میں تصور ہی قائم کیا جا سکتا ہے۔ قرآن نے کہا کہ خدا کا وہی تصور صحیح ہو سکتا ہے جو ان صفات کی رو سے قائم کیا جائے جو اس نے خود وحی کے ذریعہ بتائی ہیں، اور وہ اب اپنی اصلی شکل میں صرف قرآن کے اندر ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن صرف اس ایمان باللہ کو صحیح تسلیم کرتا ہے جو قرآنی صفات کے مطابق لایا جائے۔ دوسرے مذاہب کو تو چھوڑیئے، خود ہماری اپنی (مسلمانوں کی) حالت یہ ہے کہ ہم نے بھی اپنے اپنے ذہن (یا عقیدہ) کا الگ الگ خدا تجویز کر رکھا ہے۔ "قرآنی خدا" پر ایمان کہیں نظر نہیں آتا۔ اور اس لئے ہماری یہ حالت بھی ہے! خدا پر ایمان درست ہو جائے تو دیکھئے ہماری حالت کس طرح سنور جاتی ہے۔ اسلام کے صدر اوّل میں جو عظیم انقلاب برپا ہوا تھا، وہ بنیادی طور پر اللہ کے صحیح تصور کی بدولت تھا۔ اس کے بعد یہ تصور بحث و نظر کا موضوع بن گیا اور ہم دن بدن گرتے چلے گئے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی　　آج کیا ہے فقط اک مسئلۂ علم کلام
روشن اس ضو سے اگر ظلمت کردار نہ ہو　　خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام　(ضرب کلیم)

زیر نظر آیت میں اس نے مذہب پرست طبقہ کی اس غلط نگہی کی طرف اشارہ کیا ہے، جس کی رو سے وہ سمجھتے ہیں کہ خدا کا ہر کام "اعجوبہ" ہونا چاہیئے۔ اس نے کہا کہ یہ خدا کا غلط تصور ہے۔ انسانی دنیا میں اس کے کام مبنی بر حکمت ہوتے ہیں۔ جو علم و بصیرت کی رو سے سمجھ میں آسکتے ہیں۔ اس کی طرف سے نازل کردہ تعلیم (کتاب) کی یہی خصوصیت ہوتی ہے۔ اسی خصوصیت کی حامل کتب سابقہ تھیں۔ اس کی مشہود یہ کتاب (قرآن مجید) ہے۔

۶/۹۲ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ
اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ۚ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ
وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝

اسی طرح خدا نے اس کتاب کو ایک انسان پر نازل کیا ہے۔ یہ بڑی بابرکت کتاب ہے، اور اس تعلیم کو سچ کر دکھانے والی جو اس سے پہلے دی گئی تھی۔ (اے رسولؐ!) تم اس کے ذریعے (پہلے) اس مرکزی مقام (مکّہ) اور اس کے گرد و پیش کے باشندوں کو اُن کی غلط روشِ زندگی کے تباہ کُن نتائج سے آگاہ کرو۔ اس پر وہی لوگ ایمان لائیں گے جو زندگی کو اسی دنیا کی زندگی نہیں سمجھتے بلکہ اس کے بعد کی زندگی کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اور اُنہیں یقین ہے کہ موجودہ غلط نظام کی جگہ ایک صحیح نظام آکر رہے گا۔ اس مقصد کے لئے یہ لوگ خدا کے مقرر کردہ نظامِ صلوٰۃ کی حفاظت کرتے ہیں۔

برکت کے معنی

یہاں کتاب اللہ کو "مبارک" کہا گیا ہے۔ ہمارے ہاں (لفظِ ثواب کی طرح) برکت کا مفہوم بھی محض ذہنی سا ہے۔ لیکن عربی زبان میں اس کا مفہوم بڑا اہم ہے اور جب اس لفظ کو قرآن کے لئے استعمال کیا جائے تو اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ بَرَكَةٌ کے معنی اس ثبات کے ہیں جس کے ساتھ نمو بھی ہو۔ یعنی ایک چیز اپنے مقام پر مستحکم بھی ہو اور اس کے ساتھ ساتھ بڑھ بھی رہی ہو۔ درخت اس کی نمایاں مثال ہے۔ وہ اپنے مقام پر مستحکم نہ ہو تو اُس کا وجود باقی نہیں رہتا، اور اگر اس میں نشوونما نہ ہو تو بھی وہ بے مقصد رہ جاتا ہے اور اسے اُکھیڑنا پڑتا ہے۔ ثبات اور نشوونما کا امتزاج ہے جس سے درخت شجرِ طیب بنتا ہے۔ قرآن مجید میں جو اصول اور اقدار دیئے گئے ہیں، وہ اپنی جگہ پر مستحکم اور غیر متبدل ہیں لیکن ان کی روشنی میں ایسی ..... جزئیات وضع کی جا سکتی ہیں جو زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دیں۔ استحکام اور نشوونما (ثبات اور تغیّر) کے اس امتزاج سے یہ کتابِ عظیم مبارک قرار پاتی ہے۔ اس سے وہ معاشرہ یا نظام قائم ہوتا ہے جسے اُس نے الصّلوٰۃ سے تعبیر کیا ہے۔ (انڈکس میں دیکھئے صلوٰۃ)

خدا اور آخرت پر ایمان

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ قرآن پر وہی لوگ ایمان لاتے ہیں، جو آخرت پر ایمان لاتے ہیں (آخرت کے مفہوم کے لئے انڈکس دیکھئے) ایمان بالقرآن کی بُنیاد خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان ہے۔ قرآن میں اس قانون کی تفصیل دی گئی ہے اس لئے ایمان بالقرآن اور ایمان بالآخرت لازم و ملزوم ہیں۔ ہمارا نہ قرآن پر ایمان ہے نہ آخرت پر۔

یعنی ان الفاظ پر "ایمان" ہے، ان کے مقصود و مطلوب پر نہیں۔ اس لئے ہماری صلوٰۃ بھی رسمی نماز بن کر رہ گئی ہے۔
رسول اللہ ﷺ کی رسالت تمام نوعِ انسان کے لئے تھی۔ لیکن اس منتہیٰ تک بتدریج پہنچ جانا مقصود تھا۔
اس کا آغاز حضورؐ نے اپنے عشیرہ و اقربا سے کیا ——— وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (٢٦/٢١٤)

تبلیغ کے دائرے کی وسعت

اس کے بعد اس کا دائرہ اصلِ مکّہ اور اس کے گرد و نواح تک وسیع کیا گیا۔ (زیرِ نظر آیت)۔ اس کے بعد پوری کی پوری قوم کو مخاطب کیا گیا۔ اور یہ سلسلہ قوم کے دائرہ سے بھی آگے چلا گیا۔ ختمِ نبوت کے بعد یہ سلسلہ اُمّتِ محمدیہ کی وساطت سے آگے بڑھنا تھا۔ یہ سلسلہ ایک وقت تک جاری رہا۔ اور اس کے بعد . . . .
اس کے بعد ہم آ گئے جن کا خود اپنا ہی قرآن پر ایمان نہیں۔ لیکن قرآن کا پیغام نہ کسی خاص قوم تک محدود ہے، نہ کسی خاص خطۂ ملک تک محصور۔ یہ تمام نوعِ انسان کے لئے ضابطۂ زندگی ہے، اور (قرآن کے دعویٰ کے مطابق) اسے دنیا کے تمام ضوابط پر غالب آ کر رہنا ہے، سو ایسا ہو کر رہے گا۔
اس کے بعد کہا کہ وحی صرف انبیاء کرام کو عطا ہوتی ہے۔ غیر از نبی اگر اس کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ کاذب اور فریب کار ہے:

٦/٩٤ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ ۗ وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰۤئِكَةُ بَاسِطُوْۤا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ۗ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝

ان سے کہو کہ اس سے بڑھ کر سنگین مجرم کون ہو سکتا ہے، جو اپنے ذہن سے باتیں وضع کرے اور انہیں منسوب کر دے خدا کی طرف۔ یعنی اپنی طرف سے وضع کردہ عقائد و احکام کو شریعتِ خداوندی کہہ کر پیش کرے، یا اس کا مدعی ہو کہ اس کی طرف خدا کی وحی آتی ہے (خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لے) حالانکہ وحی صرف انبیاءؑ کی طرف آتی ہے، اور سلسلۂ انبیاءؑ کی آخری کڑی یہ رسولؐ ہے۔ لہٰذا اس رسولؐ کی موجودگی میں یا اس کے بعد، یہ دعویٰ کہ مجھے خدا کی طرف سے براہِ راست علم حاصل ہوتا ہے، کذب و افترا ہے۔ اور پھر اس سے بڑھ کر مجرم کون ہے جو یہ کہے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے، میں بھی اس جیسا دے سکتا ہوں (٢/٢٣)۔ یاد رکھو! وحی کی مثل کوئی شے

نہیں ہو سکتی، نہ ہی کسی انسان کا حکم، وحی کا درجہ رکھ سکتا ہے۔

یہ لوگ، اس وقت تو یوں بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہے ہیں، لیکن (اے مخاطب) کاش تو اُس منظر کو دیکھ سکتا جب حق و باطل کے تصادم کے وقت، یہ لوگ میدانِ جنگ میں دم توڑ رہے ہونگے۔ اور ہماری کائناتی قوتیں (ملائکہ) ان پر مسلط ہو رہی ہوں گی کہ اُس ایگو[1] کو باہر نکالو، جو تمہارے غرور کا باعث تھا۔ اب وہ وقت آچکا ہے جب تمہیں (شکست کی) رسوا کُن سزا ملے گی۔ کیونکہ تم خدا کے خلاف ناحق افترا کیا کرتے اور غرورِ نفس کی بنا پر، اُس کے قوانین سے سرکشی برتا کرتے تھے۔

اس میں تین گروہوں، یا دعاوی کا ذکر ہے۔ ایک وہ مذہبی پیشوا جو خود قوانین وضع کریں اور انہیں شریعتِ خداوندی کہکر عام کریں۔ (انڈکس میں دیکھئے شریعت سازی)۔ آپ آجکل عام طور پر اس قسم کے الفاظ سنیں گے کہ اسلام یہ کہتا ہے۔ اسلام کی رُو سے یہ جائز ہے، وہ ناجائز ہے۔ اسلام کا فیصلہ یہ نہیں۔ اسلام کا حکم یہ ہے۔ لیکن اس کے لئے وہ کوئی خدائی سند (قرآنی حکم) پیش نہیں کریں گے۔ اگر آپ اسے کریدیں گے تو نظر آئے گا کہ اس سے مُراد اربابِ شریعت کے فتویٰ۔ فقہ کے مسائل۔ بزرگوں کے اقوال یا وضعی روایات ہوں گی۔ کسی انسان کی کسی بات کو خدا کی بات کہنا اِفترٰی عَلَی اللہ ہے۔ مذہب میں ہوتا ہی یہ ہے۔ انسانوں کے فیصلوں کو خدا کی شریعت کہکر نافذ کیا جاتا ہے۔

تھیاکریسی

دوسرے لوگ وہ ہیں جو ختمِ نبوت کے بعد وحی کے مدعی ہوتے ہیں۔ (ختمِ نبوت کی بحث سابقہ جلدوں میں آچکی ہے، انڈکس دیکھئے)۔ لہذا، نبی کریمؐ کے بعد وحی کا مدعی، مکذب اور مفتری عَلَی اللہ ہے (انڈکس میں وحی کا عنوان دیکھئے)۔ وحی براہِ راست علم حاصل ہونے کا نام ہے، اور وحی کا سلسلہ ختم ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ حضورؐ کے بعد، خدا سے براہِ راست علم، کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ لہذا، کشف، الہام کو خدا کی طرف سے براہِ راست حاصل شدہ علم کہنا بھی افتریٰ ہے۔ (انڈکس میں الہام اور کشف دیکھئے)۔

قرآن کریم بے مثل و بے نظیر کتاب ہے۔ اُس نے تمام نوعِ انسان کو چیلنج دیا کہ وہ اس کی مثل بنا کر دکھائیں اس سلسلہ کی ایک شاخ تو بعض فلاسفروں کا یہ (باطل) نظریہ ہے کہ جنہیں انبیاءؑ کہا جاتا ہے، وہ درحقیقت

---

[1] EGO۔ پندارِ نفس، جو جھوٹی عزت کے احساس سے انسان کو اعترافِ حق سے باز رکھتا ہے۔

نابغہ شخصیتیں (GENIUS) ہوتی تھیں جو اپنے غیر شعوری محسوسات اور خیالات کو منزل من اللہ وحی سمجھ بیٹھے تھے۔ یہ چیز کسی خاص شخصیت تک محدود نہیں۔ نابغہ اب بھی پیدا ہو سکتے ہیں (اور ہوتے ہیں)۔ ہم نے وحی کی بحث کے سلسلہ میں اس قسم کے نظریات کا ابطال کیا ہے۔ وحی بے مثل و بے نظیر ہوتی تھی جو غیر از انبیاءؑ کسی انسان کو نہیں ملتی تھی، اور اب اس کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔

قرآن کی مثل

لیکن "قرآن کی مثل" کا ایک عقیدہ خود ہماری وضعی روایات کا پیدا کردہ ہے۔ اور (قیامت بالائے قیامت یہ کہ) اسے منسوب کیا جاتا ہے حضور نبی اکرمؐ کی طرف۔ (مثلاً) اس قسم کی روایت

مقدم بن معدیکربؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ مجھے قرآن اور اس کی مثل اس کے ساتھ (مثلہٗ معہٗ) دیا گیا ہے۔ خبردار ہو کہ ایک پیٹ بھرا شخص اپنے چھپر کھٹ پر پڑا ہوا کہے گا کہ بس، اس قرآن کو لازم جانو۔ جو چیز تم قرآن میں حلال پاؤ، اسے حلال سمجھو، اور جس کو حرام پاؤ اس کو حرام سمجھو۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ حرام کیا رسول اللہؐ نے، وہ اس کے مانند ہے جس کو حرام کیا خدا نے۔

(مشکوٰۃ۔ اعتصام بکتاب وسنت۔ اردو ترجمہ جلد اوّل صفحہ ۸۸)

یہ مثلہٗ معہٗ (قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل) وہی ہے جسے وحی خفی کہا جاتا ہے اور جو روایات میں درج ہے۔ اس سے احادیث کو وحی قرار دیا جاتا ہے۔ (یہ تمام بحثیں پہلے آ چکی ہیں، اس لئے ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے نزدیک اس قسم کی روایات کبھی رسول اللہؐ کی نہیں ہو سکتیں۔ یہ بعد کی وضع کردہ ہیں۔)

آیت کے آخری حصّہ کو ہم نے اسی دنیا کے تصادمات پر منطبق کیا ہے۔ اگر اس کا تعلق انسان کی طبیعی موت سے سمجھا جائے تو اس کی تشریح اُس پر کی جائے گی جہاں آخرت کی زندگی اور اس کے تضمنات سے متعلق بحث ہوگی۔

اگلی آیت میں ایک بڑا عمیق نکتہ سامنے آتا ہے:

۶/۹۵ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ۚ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ع

اور خدا کہے گا کہ (تمہیں اپنی متبعین کی جمعیت پر بڑا ناز تھا۔ لیکن) آج تم ہماری عدالت میں تنہا آ گئے ویسے ہی تنہا جیسے ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا۔ اور جو کچھ ہم نے تمہیں (مال و دولت وغیرہ) عطا کیا تھا سب

پیچھے چھوڑ آئے۔ ہم تمہارے ساتھ، تمہارے اُن رفقاء کو کبھی نہیں دیکھ رہے جنکے متعلق تمہیں زعم تھا کہ وہ ہر حالت میں تمہارا ساتھ دیں گے۔ آج تمہارے ان کے تعلقات منقطع ہو گئے۔ اور جسے تم حقیقت سمجھا کرتے تھے، وہ سراب نکلا۔

یہی خدا کا قانونِ مکافات ہے۔ نہ کوئی فرو پیدا ہوتے وقت، کسی اور کے یا اپنے سابقہ جنم کے، گناہوں کے اثرات اپنے ساتھ لاتا ہے (وہ سادہ لوح لے کر آتا ہے)۔ اور نہ ہی اس کے اعمال کے نتائج بھگتنے میں کوئی دوسرا شریک ہو کر اس کی مصیبت کو بانٹ سکتا ہے۔ اپنے اعمال کے نتائج کو خود بھگتنا، انسانی ذات کی انفرادیت کا فطری نتیجہ ہے۔ ($\frac{19}{95}$)۔

[انسان کی ذات، نفس، وہ ہے جسے وہ "میں" کہکر پکارتا ہے۔ باقی ہر شے کو میری کہتا ہے، حتّٰی کہ اپنے جسم کو بھی "میرا جسم" کہکر پکارتا ہے۔ موت کے بعد یہ "میں" تو آگے جاتا ہے، اور ہر وہ شے جسے وہ میری کہتا تھا پیچھے رہ جاتی ہے۔ یہی انسان کی انفرادیت (INDIVIDUALITY) ہے، اور یہی اس کے تمام اعمال کی ذمہ دار۔]

فُرادٰی کے ایک معانی وہ ہیں جنہیں مندرجہ بالا مفہوم کے پہلے حصہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اور دوسرے وُہ جن کا ذکر مفہوم کے دوسرے حصے میں کیا گیا ہے۔ اس کی تشریح سابقہ جلدوں میں نفس کے عنوان کے تحت کی جا چکی ہے۔ بالخصوص دوسری جلد میں جس کے صفحہ ۲۹ پر زیرِ نظر آیت درج ہے۔

آیت زیرِ نظر کے الفاظ "وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی" سے ایک نہایت لطیف (باریک ترزمو) نکتہ عرصہ سے میرے ضمیر میں پہلو بدل رہا ہے لیکن وہ ابھی تک "مصرعِ موزوں" نہیں بن سکا۔ اس کے لئے مسالہ (MATERIAL) تو میرے پاس کافی ہے لیکن اس کے عنوان (یعنی مقصود) کے لئے مجھے موزوں الفاظ نہیں مل رہے۔ میرے منہ سے یہ الفاظ آپ کو شاید اچنبہ سا لگیں ——— جس شخص کی ساری زندگی الفاظ کی کہکشانی دنیا میں گزری ہو، اس کی یہ معذرت کہ اسے اپنے موضوع کے عنوان کے لئے موزوں الفاظ نہیں مل رہے، یقیناً عجیب سا لگتا ہے۔ لیکن ہے یہ واقعہ اور اس کی وجہ ہماری زبان کی کوتاہ دامنی ہے۔

انسان دنیا میں آتا ہے تو وہ بنا بنایا نہیں آتا۔ اس نے کچھ بننا ہوتا ہے۔ بالفاظ صحیح، اس نے اپنے آپ کو کچھ بنانا ہوتا ہے۔ ضروریات زندگی، اشیائے کائنات کے سامان، اسباب یا ذرائع ہوتے ہیں جن سے اس نے

اپنے آپ کو کچھ بنانا ہوتا ہے۔ قرآن کا اعجاز ہے کہ اس نے اس تمام موضوع کو ایک لفظ کے اندر سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ اس نے سازوسامانِ حیات کو متاع سے تعبیر کیا ہے۔ عام الفاظ میں متاع ان اشیاء کو کہتے ہیں جن سے وقتی ضروریات پوری کی جائیں۔ بالخصوص وہ سامان جو سفر کے لئے ضروری ہو۔ مثلاً ڈول۔ رسّی، مشکیزہ راستے کے لئے ضروریات کے مطابق کچھ کھانے پینے کا سامان۔ اس لفظ میں دو اہم مفاہیم شامل ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ متاع زاید از ضرورت یا ذخیرہ کرنے کے لئے نہیں ہوتی۔ ضرورت پوری کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ اس سے قرآن کے معاشی نظام کی بنیاد سمجھ میں آجاتی ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ اشیاء مقصود بالذات نہیں۔ یہ کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ یعنی ان سے انسان وہ کچھ بن سکتا ہے جو کچھ بننا اس کا مقصد حیات ہے۔ جس طرح کمہار (ککلی گر) کی مٹی مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ اس مٹی کا اس نے کچھ بنانا ہوتا ہے ——— بڑی، آبخورہ، ہنڈیا، مٹکا وغیرہ۔

اب دو چیزیں ہمارے سامنے آگئیں۔ ایک وہ جو کچھ انسان نے اپنے آپ کو بنانا ہے۔ اور دوسرے وہ سامان جس سے اس نے کچھ بننا ہے۔ سامان ضروری ہے لیکن مقصود بالذات نہیں۔ مقصود بالذات وہ ہے جو اس نے بننا ہے۔

یہ ہے وہ موضوع جس کے لئے میرے پاس (MATERIAL) تو فراواں ہے لیکن عنوان کے لئے موزوں الفاظ نہیں ملتے۔ انگریزی زبان زیادہ وسیع اور منجھی ہوئی ہے۔ اس میں یہ الفاظ مل جاتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ یورپ سے واپسی پر مسولینی کی دعوت پر اسے ملنے گئے تھے۔ اس زمانے کے مسولینی کے دبدبہ اور طنطنہ کا عالم ہی کچھ اور تھا۔ زمانہ وہ تھا جب اقوام مغرب ایک ہونے والی جنگ (دوسری عالمگیر جنگ) کی تیاریوں کے سلسلہ میں اسلحہ کی دوڑ میں ہانپ رہی تھیں۔ گفتگو کا یہی موضوع تھا۔ مسولینی نے کہا کہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اس دور میں

ONE WHO HAS STEEL, HAS EVERYTHING

علامہ نے اس سے کہا کہ میں اس میں ذرا سی لفظی تبدیلی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ

ONE WHO IS STEEL, IS EVERYTHING

انہوں نے "HAS" کو IS میں تبدیل کر کے بات کہاں سے کہاں پہنچا دی!

اسی (IS) کے لئے مجھے کوئی موزوں لفظ نہیں مل رہا! علامہ اقبالؒ کا سارا فلسفۂ خودی اسی (IS) کی تفسیر ہے۔

لیکن اس کے لئے ایک جامعہ لفظ مجھے ان کے ہاں بھی نہیں ملا۔ وہ بھی اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ (قرآن کی خصوصیت یہ ہے کہ)

آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا

بات یہاں بھی ایمائیت سے آگے نہیں بڑھ سکی۔

قارئین نے میری تحریروں میں جرمن، امریکن عالم نفسیات (ERICH FROMM) کے اکثر اقتباسات دیکھے ہوں گے۔ پچھلے دنوں ایک عزیز کی وساطت سے مجھے ایک کتاب ملی جو شاید اس کی آخری تصنیف تھی۔ اس کا موضوع بھی تھا جسے میں نے اوپر پیش کیا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اسے، بعد از تلاش بسیار، اس کے لئے عنوان مل گیا۔ اس کی کتاب کا ٹائیٹل ہے

TO HAVE — OR — TO BE

اس (TO BE) میں جو وسعت اور گہرائی ہے وہ لفظوں میں بیان نہیں کی جا سکتی۔

"خودگری" یا "خویشتن سازی" میں بھی (TO BE) جیسی جامعیت نہیں حتیٰ کہ یہ برگساں کے (BEING) سے بھی مختلف اور آگے ہے۔ قرآن نے جب کہا ہے کہ "ولقد جئتمونا فرادیٰ" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام (HAVES) تم پیچھے چھوڑ آؤ گے کیونکہ انہوں نے اپنا مقصد پورا کر دیا تھا۔ اور (BE) ہمارے ہاں آ جائے گا۔ قرآن کی تعلیم کا نچوڑ اور مقصود و منتہیٰ یہی ہے۔ اور اس کے لئے اس میں بڑا (MATERIAL) ہے اگر حالات نے اجازت دی تو اس موضوع کو مرتب کرنے کا میرا ارادہ ہے ——— یہ الگ بات ہے کہ اس کا ٹائٹل مجھے اس وقت بھی نہ ملے۔

اس ضمنی بحث کے بعد پھر آیت (۶/۹۵) کی طرف آ جائیے۔

خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ (پہلی بار پیدا کیا)۔ سے قرآن کریم نے عقیدۂ تناسخ کی بھی تردید کر دی جس کی رُو سے کہا یہ جاتا ہے کہ ایک انسان لاکھوں اور کروڑوں مرتبہ، جون بدل بدل کر، دنیا میں آتا ہے۔ قرآن نے ان کی موجودہ زندگی کو پہلی مرتبہ کی پیدائش قرار دیا۔ اور اس کے بعد کی زندگی کو حیاتِ آخرت، جس سے دُنیا کی طرف مراجعت نہیں ہو گی۔ انسان کی، مرنے کے بعد کی، زندگی کے متعلق فرمایا:

۶/۹۶ اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ؕ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ○

باقی رہا انسان کو مرنے کے بعد زندہ کرنا، سو یہ بھی ہمارے لئے کون سی مشکل بات ہے۔ اسے سمجھنے

کے لئے تم نظامِ کائنات پر غور کرو۔ بیج (بظاہر) مُردہ ہوتا ہے، لیکن اس میں زندگی کی صلاحیت خوابیدہ ہوتی ہے۔ مناسب ماحول سے وہ خوابیدہ صلاحیت بیدار ہو کر حیاتِ نو (کونپل) کی شکل میں نمودار ہو جاتی ہے۔ اور باقی بیج مٹی میں مل جاتا ہے۔ پودا، پھر بیج پیدا کرتا ہے۔ اور اس بیج سے سلسلۂ حیات آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس طرح خدا کا قانون موت سے زندگی پیدا کرتا اور زندگی کو موت میں تبدیل کرتا رہتا ہے۔

یہی قانون افراد کی صورت میں کارفرما ہے اور اسی کے مطابق قوموں کی موت و حیات کے بھی فیصلے ہوتے ہیں۔ یہ ہے خدا کا قانونِ موت و حیات۔ تم اس سے منہ موڑ کر کدھر بہکے جا رہے ہو؟

قوانینِ فطرت کی کارفرمائی کی اور مثالیں:

۶/۹۷ فَالِقُ الۡاِصۡبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيۡلَ سَكَنًا وَّ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ حُسۡبَانًا ؕ ذٰلِكَ تَقۡدِيۡرُ الۡعَزِيۡزِ الۡعَلِيۡمِ ۝

خدا کا یہی قانونِ گردش ہے جو رات کا پردہ چاک کر کے نُورِ سحر کو نمودار کر دیتا ہے (اور اس طرح شب کی تاریکیوں کو دن کے اُجالے میں بدل دیتا ہے)۔ تم دن بھر کام کرتے ہو۔ اس کے بعد وہ دن کے کاروبار پر رات کا پردہ گرا دیتا ہے۔ اور تمہارے لئے آرام و سکون کا وقت آ جاتا ہے۔ اسی قانون کے مطابق چاند اور سورج اپنے اپنے وقت پر طلوع و غروب ہوتے رہتے ہیں، اور اس طرح، تمہارے لئے مہینے اور سال شمار کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں (۱۰/۵ ؛ ۱۷/۱۲)۔ یہ سب اندازے اور پیمانے اُس خدا کے مقرر کردہ ہیں جو ہر شے کی حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے، اور ایسی زبردست قوتوں کا مالک ہے کہ کوئی شے اُس کے مقرر کردہ اندازے سے ذرا اِدھر اُدھر نہیں ہٹ سکتی۔

اجرام کی گردش کی رُو سے، سورج اور چاند دونوں سے حساب کا کام لیا جا سکتا ہے۔ اس موضوع پر مطالب الفرقان جلد سوم میں بحث ہو چکی ہے۔ (دیکھئے صفحہ ۲۳۰)۔

ایک اور مثال:-

۶/۹۸ وَهُوَ الَّذِىۡ جَعَلَ لَـكُمُ النُّجُوۡمَ لِتَهۡتَدُوۡا بِهَا فِىۡ ظُلُمٰتِ الۡبَـرِّ وَالۡبَحۡرِ‌ ؕ قَدۡ فَصَّلۡنَا الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ۝

اُس کے اس کنٹرول کا نتیجہ ہے کہ فضائے آسمانی میں تیرنے والے ستارے (۲۱/۳۳ ؛ ۳۶/۴۰) یوں ٹھیک ٹھیک اندازے سے گردش کرتے ہیں، کہ تم بیابانوں اور سمندروں کے سفر میں، رات کی تاریکیوں میں

اُن سے راستے کے نشانات متعیّن کر لیتے ہو (اور اس میں کبھی غلطی نہیں ہوتی)۔

ہم نشان لوگوں کے لئے جو علم و بصیرت سے کام لیتے ہیں، اپنے قوانین کو کس قدر واضح کر دیا ہے۔ (کہ وہ ذرا سے غور و فکر سے، اُنہیں بخوبی سمجھ سکتے ہیں)۔

دوسرے مقام پر قرآن مجید نے ستاروں کی راہنمائی کو، وحی کی راہنمائی کے لئے بطورِ شہادت پیش کیا ہے۔ (۵۳/۱-۴) تفصیل اس کی اپنے مقام پر آئے گی۔

قرآنِ کریم نے نظامِ کائنات کے مختلف گوشوں کو بطورِ شہادت پیش کرنے کے بعد فرمایا کہ: قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ——— یہ مثالیں حقیقت تک پہنچنے کے لئے، نشاناتِ راہ ہیں۔ لیکن اُن ہی لوگوں کے لئے جو علم و بصیرت سے کام لیں۔ اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ قرآنِ کریم نے علومِ سائنس کی تحصیل پر کس قدر زور دیا ہے۔ اِن علوم اور ان کی رُو سے انکشافات کو قرآنی حقائق تک پہنچنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ (انڈکس میں کائنات کا عنوان دیکھئے)۔

اِن شہادات کے بعد وہ انسانی دُنیا کی طرف آتا ہے اور کہتا ہے:۔

۶/۹۹ وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ط قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ○

(یہ خارجی کائنات میں قوانینِ خداوندی کی کارفرمائی تھی۔ اب وہاں سے نیچے اُتر کر، ذرا انسانی دنیا کی طرف آؤ اور دیکھو کہ وہاں اُس کا قانونِ ارتقاء کس حسن و خوبی سے عمل پیرا ہے)۔ اِس قانون کی رُو سے تمہاری زندگی کی ابتداء، ایک جرثومۂ حیات[1] سے ہوئی (۴/۱ ؛ ۳۹/۶)۔ اس کے بعد تم نے ارتقائی منازل طے کرنا شروع کیں، اس طرح کہ تمہارا کاروانِ زندگی کچھ وقت کے لئے ایک منزل میں ٹھہرا۔ پھر اُس منزل نے اُسے دوسری منزل کے سپرد کر دیا (۱۱/۶)۔ اس طرح یہ قافلہ منزل بہ منزل، آگے بڑھتا گیا تا آنکہ تم مقامِ آدمیت تک پہنچ گئے۔

ہم نے اپنے قوانین کو اُس قوم کے لئے کس قدر نکھار کر بیان کر دیا ہے جو سمجھ سوچ سے کام لیتی ہے۔ (۶/۹۹)

---

[1] SINGLE LIFE-CELL

تخلیقِ انسانی کی بحث، مطالب الفرقان جلد دوم (ص۳) میں تفصیل سے آچکی ہے۔ (وہاں زیرِ نظر آیت بھی دی گئی ہے)۔ نظریۂ ارتقاء کے سلسلے میں انڈکس دیکھئے۔ اگرچہ وہاں اس نظریہ کی وضاحت کی گئی ہے، لیکن اِس آیت میں دو لفظ ایسے آئے ہیں جن کی تشریح کئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔

نظریۂ ارتقاء

نظریۂ ارتقاء کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ زندگی جامد شے نہیں۔ متحرک ہے۔ یہ اپنے اوّلین جرثومے سے حرکت کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ لیکن مسلسل حرکت نہیں کئے جاتی۔ ایک منزل میں آکر تھوڑی دیر کے لئے رُکتی ہے۔ وہاں کے ماحول سے سامانِ نشو و نما اپنے اندر جذب کرتی ہے اور جب اس میں اگلی منزل تک پہنچنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے تو پھر چلنا شروع کر دیتی ہے۔ اِس طرح وہ رُکتی اور چلتی ہوئی اپنی منزل کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس کے لئے قرآن کریم نے مستقر اور مستودع کی اصطلاحات استعمال کی ہیں جو بڑی جامع بھی ہیں اور ادبی نقطۂ نگاہ سے بھی بڑی لطیف۔ جب کوئی شے حرکت کرتی ہوئی کسی جگہ رُک جائے، تو اسے قرار کہتے ہیں۔ رُکی ہوئی تو منجمد شے بھی ہوتی ہے، لیکن اس کے لئے قرار کا لفظ نہیں بولتے۔ یہ لفظ صرف متحرک اشیاء کے عارضی طور پر رُک جانے کے لئے بولا جاتا ہے۔

اس رُک جانے کے بعد وہ اگلی منزل کی طرف روانہ ہو جاتی ہے۔ قرآن نے اسے مستودع سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں کسی کی امانت کو اُس کے سپرد کر دینا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ چیز اس منزل کے پاس (جو اس کا مستقر تھا) فطرت نے بطور امانت رکھی تھی۔ اس نے وہ امانت اس کے سپرد کر دی جس کی وہ امانت تھی۔ اور اس طرح مستقر اور مستودع کی منزلیں طے کرتی ہوئی، زندگی سلسلۂ ارتقاء کی حدِ آخر تک پہنچ گئی۔

آپ نے غور کیا کہ سائنس جیسے خار دار موضوع کو بھی قرآن کس قدر شاداب و شگفتہ انداز میں پیش کرتا ہے! لیکن اس کے باوجود یہ حقائق اُنہی لوگوں کی سمجھ میں آسکتے ہیں جو تفقہ (غور و فکر) سے کام لیں۔

تخلیق کے بعد وہ ربوبیت (نشو و نما) کی طرف آتا ہے اور کہتا ہے کہ دیکھو! ہم نے اس کے لئے بھی کس قدر حیرت انگیز انداز سے انتظام کیا ہے:

۶/۱۰۰ وَهُوَ الَّذِىٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ
شَىْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ

مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ
وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ
وَيَنْعِهٖ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝

تم اس پر بھی غور کرو کہ اُس نے تمہیں پیدا کیا، تو اس کے ساتھ ہی (بلکہ اس سے بھی پہلے) تمہاری نشو و نما کا سامان کس حسن و خوبی سے بہم پہنچا دیا۔ وہ اس کے لئے بادلوں سے مینہ برساتا ہے، جس سے ہر قسم کی روئیدگی نکلتی ہے۔ پھر اس روئیدگی سے ہری ہری ٹہنیاں اُبھرتی چلی جاتی ہیں اور ٹہنیوں میں گُتھے ہوئے اناج کی بالیں لٹکنے لگ جاتی ہیں۔ اسی طرح کھجور کے درخت سے پھل پیدا ہوتے ہیں جس کے خوشے جھکے پڑتے ہیں۔ یہی صورت انگور، زیتون اور انار (اور دوسرے پھلوں) کے باغات کی ہے ——— کوئی آپس میں ملتے جلتے۔ کوئی بالکل الگ ———
تم ان کے پھلوں کو اس وقت دیکھو جب وہ شروع میں شاخوں میں لگتے ہیں اور اس کے بعد یہ دیکھو کہ وہ کس طرح بتدریج، غیر محسوس طور پر پختگی تک پہنچتے ہیں۔
جو لوگ نظامِ کائنات کی محکمیت پر یقین رکھتے ہیں، اُن کے لئے خدا کے قانونِ ارتقاء میں حقیقت تک پہنچنے کی، کتنی بڑی نشانیاں ہیں۔

نظامِ کائنات میں آیات

یہاں کہا ہے: اِنَّ فِىْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ——— ان میں اس قوم کے لئے آیات ہیں جو ان کی صداقتوں پر یقین رکھتی ہے۔ یہ کونسی "صداقتیں" ہیں جن پر یقین رکھنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ پیچھے سے مظاہرِ کائنات اور قوانینِ فطرت کا ذکر مسلسل چلا آرہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں انہی قوانین کی صداقتوں پر یقین کی طرف اشارہ ہے۔ لہٰذا، مومن ہونے کے لئے قوانینِ فطرت کی محکمیت اور نظامِ کائنات کے مبنی برحقیقت ہونے پر علیٰ وجہ البصیرت یقین رکھنا ضروری ہے۔ اس راستے سے انسان، اقدارِ خداوندی اور انسانی زندگی سے متعلق وحی کے عطا کردہ اصول و قوانین کی صداقت پر ایمان لا سکتا ہے۔ یہ ایمان علیٰ وجہ البصیرت ہوتا ہے جو کبھی ڈگمگاتا نہیں۔ قرآنِ کریم نے اسی لئے علومِ فطرت کی تحصیل و تحقیق پر اس قدر زور دیا ہے۔ اگر ایسی صورت نہ ہو تو انسان (لفظی ایمان کے باوجود) توہم پرستیوں کا شکار ہو جاتا ہے

فرمایا:-

۶/۱۰۱ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍ

بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝

یہ ہے وہ خدا جس کے متعلق ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ وہ تنہا کائنات کا نظم و نسق قائم نہیں رکھ سکتا۔ کچھ غیر مرئی (UN - SEEN) قوتیں بھی ہیں جو اس کے ساتھ شریک ہیں۔ حالانکہ یہ غیر مرئی قوتیں (جو کائنات میں جاری و ساری ہیں) خود خدا ہی کی پیدا کردہ ہیں۔

پھر ان کی اس جہالت کو بھی دیکھو کہ انہوں نے خدا کے لئے بیٹے اور بیٹیاں بھی بنا رکھی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ، خدا کے متعلق، انسان، اس قسم کے تصورات، اپنے ذہن سے تراش لیتا ہے۔ وہ (خدا) ان باطل تصورات سے مبرّا اور بلند ہے۔

اور اس کے لئے سب سے بیّن مثال عیسائیوں کے عقیدہ ابنیت حضرت مسیحؑ کی ہے۔

۶/۱۰۲ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

[پہلے کہا جا چکا ہے کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خدا کی ہر بات فوق الفطرت اور اعجوبہ ہونی چاہیئے، وہ خدا کے متعلق صحیح اندازہ نہیں لگاتے (۶/۹۲)۔ یہ بات غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔ خدا کے تخلیقی پروگرام کا ایک حصہ وہ ہے جس کا تعلق عالم امر (یعنی تخلیق سے پہلے مرحلے) سے ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مرحلہ میں ہنوز "مخلوق" ہی نہیں تھی، تو مخلوق سے متعلق (مادہ اور طبیعی) قوانین بھی کارفرما نہیں تھے۔ وہاں کے معاملات انسانی عقل و فکر سے ماوراء، فلہذا، "اعجوبہ" ہوتے ہیں۔ جب کائنات کی تخلیق ہو گئی، تو قوانین فطرت بھی ظہور میں آ گئے۔ اب اس مرحلہ میں خدا کے سب کام ان قوانین کے مطابق طے پاتے ہیں۔ وہ چاہے تو بے شک ان کے خلاف بھی سب کچھ کر سکتا ہے، لیکن وہ ایسا کرتا نہیں۔ لہذا یہاں کے معاملات میں کچھ بھی "اعجوبہ" نہیں۔ ان دونوں مراحل کو ایک مثال سے سمجھئے]۔

وہ کائنات کو عدم سے وجود میں لایا۔ ظاہر ہے کہ یہ واقعہ فطرت کے کسی قانون کے مطابق نہیں تھا۔ فطرت کے قوانین کی رو سے کوئی معلول (EFFECT) علت (CAUSE) کے بغیر ظہور میں نہیں آ سکتا۔ اب بعض لوگ کہتے ہیں کہ خدا کا بیٹا بھی ہے۔ اولاد کے لئے قانون فطرت یہ ہے کہ اس کی پیدائش نر و مادہ (مرد اور عورت) کے جنسی اختلاط سے ہوتی ہے۔ اور یہ حقیقت ہے، جسے خود یہ لوگ بھی تسلیم کرتے ہیں، کہ خدا کی بیوی نہیں۔ اور جب خدا کی بیوی ہی نہیں، تو اس کے ہاں اولاد کیسے ہو سکتی ہے۔

وہ ہر شے کا خالق ہے۔کسی کا والد نہیں۔اور اس کا عمل تخلیق، سرتاسر، علم و حکمت پر مبنی ہے۔
ذرا سوچو کہ "خدا کے بیٹے" کا عقیدہ کس قدر باطل ہے، بیٹا سلسلۂ تولید[1] کا نتیجہ ہوتا ہے۔

خدا اور قوانینِ فطرت

یہ آیت مطالب الفرقان جلد دوم کے صفحہ ۳۴۳ پر آچکی ہے۔اور حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے متعلق چوتھی جلد میں بڑی تفصیل سے گفتگو کی جا چکی ہے۔اس لئے یہاں کسی تشریح میں جانے کی ضرورت نہیں، بجز اس بنیادی نکتہ کے دہرانے کے کہ تخلیقِ کائنات کے بعد جب خدا نے قوانین مقرر کر دیئے تو ان قوانین کی خلاف ورزی (یا ان میں استثنا) اور تو اور، وہ خود بھی نہیں کرتا۔

اور اس کے بعد کس برجستگی سے فرمایا کہ

۶/۱۰۳ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝

یہ ہے اللہ جو تمہارا نشو و نما دینے والا ہے اور جس کا قانون، تمام کائنات میں جاری و ساری ہے۔اس کے سوا کسی اور کا اقتدار و اختیار نہیں۔وہ ہر شے کا خالق اور کارساز ہے۔لہٰذا تم بھی اسی کے قوانین کی محکومیت اختیار کرو۔

جس قوم کا خدا اس قسم کا ہو، سوچئے کہ اس کی زندگی کس قدر قانون کی پابند ہوگی۔یعنی قوانینِ فطرت کے علاوہ، ان قوانین کی بھی پابند جنہیں خدا نے انسانی زندگی کے لئے متعین فرمایا ہے! پوچھئے لاک سے کہ اس قسم کی قوم کے متعلق اس کا اندازہ یا فیصلہ کیا ہے؟

لیکن اس سے ایسا پوچھتے وقت اس کے سامنے خود نہ آئیے، کیونکہ اگر ہم اس کے سامنے آ گئے تو وہ ہمارے خدا کا اندازہ ہماری حالت سے لگائے گا، اور یہ جس قسم کا اندازہ ہوگا وہ ظاہر ہے۔اس لئے پس پردہ رہ کر اس سے یہ پوچھئے۔اور اس سے یہ کہئے کہ اس خدا کی یہ کیفیت بھی ہے کہ

۶/۱۰۴ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۚ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝

انسان کا علم، محسوسات تک محدود ہے۔اس کی نگاہیں، غیر محدود و غیر محسوس ذاتِ خداوندی کی

---

[1] PROCREATION

کنہ وحقیقت تک پہنچ ہی نہیں سکتیں۔ اس کے برعکس، علمِ خداوندی، تمام نگاہوں کو محیط ہے۔ وہ ایسا لطیف ہے کہ محسوسات کے دائرے میں آ ہی نہیں سکتا۔ اس کے ساتھ ایسا خبیر ہے کہ تمام اشیائے کائنات کے احوال وکوائف سے واقف ہے۔ "لطیف" ہونے کی جہت سے وہ تمہاری نگاہوں کے احاطہ میں نہیں آسکتا۔ خبیر ہونے کی وجہ سے وہ تمہاری نگاہوں کا احاطہ کرلیتا ہے۔

ان حقائق کی وضاحت، مطالب الفرقان جلد دوم (صفحہ ۲۷۶) اور جلد سوم (صفحات ۲۲-۲۱) میں ہو چکی ہے۔ یہاں صرف اتنا اعادہ کافی ہے کہ یہ جو ہمارے ہاں عقیدہ ہے کہ "اولیاء اللہ" خدا سے ملتے جلتے رہتے ہیں، اور ہر شب اس کی محفل میں شریک ہوتے ہیں، وہ قرآنِ کریم کے صریحًا خلاف ہے۔ قرآن کا واضح ارشاد ہے کہ "کوئی آنکھ خدا کو نہیں دیکھ سکتی"۔ اس کا ادراک بھی نہیں کر سکتی یعنی ذاتِ خداوندی، انسان کے فکری احاطہ میں آ ہی نہیں سکتی۔

غلط عقیدہ

پھر جس طرح اس کی ذات غیر مرئی ہے اور اس کا اندازہ صرف اس کی تخلیق پر غور وفکر سے ہو سکتا ہے، اسی طرح اس کے قوانین بھی غیر مرئی ہیں۔ ان کی حقیقت کا علم، ان کے محسوس ومرئی نتائج سے ہو سکتا ہے۔ قانونِ خداوندی جب الفاظ کے پیکروں میں ہوتا ہے، غیر مرئی ہوتا ہے۔ اسے کلمات اللہ کہہ کر پکارا جاتا ہے جب وہ عمل میں آکر محسوس نتائج پیدا کرتا ہے، تو اسے سنت اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ان روشن دلیلوں کے بعد فرمایا:

۶/۱۰۵ قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ
وَمَنْ عَمِیَ فَعَلَیْهَا ؕ وَمَآ اَنَا عَلَیْكُمْ بِحَفِیْظٍ ۝

لہٰذا، اے رسولؐ! تم ان سے کہدو کہ تم سے مطالبہ ذاتِ خداوندی کی کنہ وحقیقت تک پہنچنے کا نہیں۔ مطالبہ اس کے قوانین کی اطاعت کا ہے۔ اور یہ قوانین، جو یکسر علم وبصیرت پر مبنی ہیں۔ وحی کے ذریعے تمہارے پاس آچکے ہیں۔ (خدا کے ساتھ تمہارا تعلق صرف اس وحی کی بنا پر ہے جو قرآن میں محفوظ ہے)۔
پس جو شخص عقل وبصیرت سے کام لے کر ان قوانین کی صداقت کو تسلیم کرے گا، اس کا فائدہ خود اس کی ذات کو پہنچے گا۔ جو ان کی طرف سے آنکھیں بند کرلے گا، اس کی غلط روش کا تباہ کن نتیجہ اسی کو بھگتنا پڑے گا۔ میں تم پر پاسبان مقرر نہیں کیا گیا کہ تمہیں، بھیڑ بکریوں کی طرح، ایک خاص راستے پر چلنے کے لئے مجبور کردوں۔

علم و بصیرت

غور کیجئے! سابقہ آیت میں کہا گیا تھا کہ تم بصارت (آنکھوں کی بینائی) سے خدا کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اِس کے بعد سوال پیدا ہوا کہ پھر خدا کے متعلق کچھ معلوم کیسے ہو؟ فرمایا کہ اُس نے اپنی طرف سے "بصائر" نازل کر دیئے ہیں۔ یعنی وہ اِن حقائق کو از روئے بصیرت سمجھاتا ہے۔ اور جو کچھ ان حقائق سے اِس طرح سمجھا جا سکے، تم خدا کے متعلق اتنا ہی جان سکتے ہو۔ اس سے زیادہ جاننے کا نہ کوئی ذریعہ ہے، نہ ہی تم اس کے مکلف ہو۔ یہ جو "علم لدنی" اور "معرفت" کو خدا کو جاننے پہچاننے کے ذرائع بتائے جاتے ہیں۔ قرآن کریم سے ان کی کوئی سند نہیں ملتی۔ (تفصیل کے لئے تصوف کا عنوان دیکھئے)۔

آیت کے آخری حصہ (فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ۚ) نے قانونِ مکافاتِ عمل اور ہر انسان کی انفرادیت کی ایک اور سند بہم پہنچا دی۔

اس کے بعد ہے:-

۶/۱۰۶ وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ○

اس طرح ہم اپنے قوانین کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لاتے اور اُدھر اُدھر اُن کی وضاحت کرتے رہتے ہیں تاکہ یہ لوگ اسے تسلیم کریں کہ تم نے، اُنہیں نہایت دلنشین انداز سے بیان کر دیا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان قوانین کی حقیقت و اہمیت اُنہی پر واضح ہو سکے گی جو علم و بصیرت سے کام لیں گے۔

تصریفِ آیات

جیسا کہ میں نے متعدد مقامات پر لکھا ہے، قرآن کریم نے خود ہی بتا دیا ہے کہ اسے صحیح طور پر سمجھنے کا طریق کیا ہے۔ وہ طریق ہے تصریفِ آیات۔ عام انسانی تصانیف کا انداز یہ ہوتا ہے کہ اسے مختلف ابواب میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، اور جو موضوع جس باب سے متعلق ہوتا ہے اس میں اُس موضوع سے متعلق سب کچھ لکھ دیا جاتا ہے۔ اس طرح وہ موضوع بیک نگاہ سامنے آ جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم کا انداز یہ نہیں۔ اس میں ایک بات ایک مقام پر کہی جاتی ہے۔ اس میں اضافہ کسی اور جگہ کیا جاتا ہے۔ استثناء کسی اور جگہ۔ اس کی تشریح اور وضاحت کسی اور سلسلہ میں سامنے لائی جاتی ہے۔ پھر ایک ہی بات (اصول یا قاعدہ) کو مختلف مقامات میں بیان کیا جاتا ہے۔ اس طریق وضاحت و صراحت کو تصریفِ آیات[1] کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یعنی آیات کو پھیر پھیر کر بیان کرنا۔

[1] تصریف و تدریسِ آیات کے سلسلہ میں دیکھئے (۳/۲۸)؛ (۶/۴۶)؛ (۶/۶۵)؛ (۷/۵۸)؛ (۱۷/۴۱)؛ (۱۷/۸۹)؛ (۱۸/۵۴)
(۲۰/۱۱۳)؛ (۴۶/۲۷)

لوٹا لوٹا کر لانا۔ یہ تکرار نہیں ہوتی۔ جس مقام پر اس آیت کو لایا جاتا ہے، وہ آیت معاملۂ پیشِ نظر کی نہایت عمدگی سے وضاحت کر دیتی ہے، اور خود اس کا مفہوم بھی زیادہ نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ لہٰذا قرآن کریم کے سمجھنے کا طریقہ یہ ہے کہ جو موضوع پیشِ نظر ہو، اس کے متعلق دیکھا جائے کہ قرآن مجید میں دیگر مقامات پر اس موضوع کے متعلق کیا آیا ہے۔ ان مقامات کو یکجا مرتب کر لیا جائے تو پھر بات ایسی نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ اس کے سمجھنے میں کوئی مشکل نہیں رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح قرآن کریم کے سمجھنے کے لئے سارے قرآن پر نگاہ ہونی ضروری ہے۔ میں نے قرآن کریم کو اس انداز سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں میری ساری عمر صرف ہوگئی۔ لیکن بتوفیقِ ایزدی یہ مرحلہ اس طرح کامیابی سے طے ہوگیا کہ میرے لئے قرآن کا کوئی مقام مشکل نہ رہا۔

جب میں نے قرآن کریم کو خود سمجھ کر اسے دوسروں کو سمجھانے کا فریضہ اختیار کیا، تو انہیں بھی اسی طریق سے قرآن سمجھایا۔ میری تمام تصانیف میں یہی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ چونکہ میرا مقصد یہ بھی ہے کہ قرآن سمجھنے کے متمنّی میرے فہمِ قرآن ہی پر انحصار نہ کریں، بلکہ اسے خود بھی سمجھیں، اس لئے میں نے یہی طریق انہیں بھی بتایا ہے۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ ہر شخص کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ خود تصریفِ آیات سے قرآن کا مفہوم متعین کرے۔ اُن کی محنت بچانے کے لئے میں نے یہ کام اُن کے لئے خود کر دیا اور قرآن کی تعلیم اور پیغام کو (SUBJECT-WISE) تقسیم کرکے، اسے مرتب شکل میں پیش کر دیا۔ میری اس کتاب کا نام "تبویب القرآن" ہے جو تین ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ جو حضرات قرآن پر غور و تدبر کرکے اسے از خود سمجھنا چاہیں، وہ اگر میری دو تصانیف لغات القرآن اور تبویب القرآن سے مدد لے لیں، تو ان کے لئے یہ راستہ طے کرنا آسان ہو جائے گا۔

درس کے معنی آیۂ زیرِ نظر (۶/۱۰۶) میں تصریفِ آیات کا مقصد یہ بتایا گیا ہے ۔۔۔ لِيَقُولُوا دَرَسْتَ ۔۔۔ تاکہ یہ لوگ اس کا اعتراف کریں کہ تو نے اسے نہایت وضاحت سے سمجھا دیا ہے۔ اس ضمن میں ۔۔۔ "دَرَسْتَ" کا لفظ بھی بڑا غور طلب ہے۔ گیہوں کے دانے اس کی بالوں کے اندر ملفوف ہوتے ہیں۔ دانوں کو بالوں سے الگ کرنے کے لئے کسان اسے "گاہتے" ہیں۔ اس کے لئے وہ کرتے یہ ہیں کہ خشک فصل کو گول دائرے میں زمین پر بچھا دیتے ہیں اور پھر اس پر بیلوں کو چلاتے رہتے ہیں۔ بیل سارا دن اس دائرے میں چکر کاٹتے رہتے اور گیہوں کی بالوں کو اپنے پاؤں تلے روندتے مسلتے رہتے ہیں تاآنکہ غلہ کے دانے چھلکوں (بھوسے) سے الگ ہو جائیں۔ عربی زبان میں اس عمل کو دَرَسٌ کہتے ہیں (اس سے آپ درس کے

معنی بھی سمجھ لیجئے) ۔اس آیت میں کہا گیا ہے کہ تصریفِ آیات سے مقصد درس ہوتا ہے ۔معانی، الفاظ کے چھلکوں میں لپٹے ہوئے ہوتے ہیں ۔اور عملِ تصریف و تدریس سے، وہ چھلکوں سے الگ ہو کر باہر آجاتے ہیں ۔میری لغات القرآن عملِ تدریس (گاہنے) کی مظہر ہے ۔اور تبویب القرآن تصریف کا نتیجہ ۔اگر کوئی ''شہری دانشور'' کسان کو گیہوں گاہتے ہوئے دیکھے تو وہ کہہ دے گا کہ اس کی عقل ماری گئی ہے جو بیلوں کو دائرے میں چلائے جا رہا ہے ۔اگر انہیں سیدھے راستے پر چلائے تو وہ شام تک بیس تیس میل کی مسافت طے کریں ۔اسے کیا معلوم کہ اس تدریس کا مقصد کیا ہے ۔جو سطحیین، قرآن کے انداز و اسلوب پر تکرار کا اعتراض کرتے ہیں، وہ دراصل گاہنے کی حقیقت کو نہیں سمجھتے ۔

قرآن کی وضاحت خود خدا نے کر دی

عملِ تصریف و تدریس کے بعد کہا کہ وَلِنُبَيِّنَهٗ ــــ تاکہ ہم اسے نکھار اور ابھار کر واضح کر دیں ۔اس سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی وضاحت اور تشریح خود خدا نے اپنے ذمہ لی تھی ۔فرمایا: ثُمَّ اِنَّ عَلَيۡنَا بَيَانَهٗ (۷۵/۱۹) ''اس کے بعد اس کتاب کے حقائق اور معانی کا اظہار ہمارے ذمہ ہے'' بیانٌ (مادہ ۔ب ۔ی ۔ن) کے بنیادی معنی الگ الگ کرنا اور مخفی چیزوں کو نمودار کرنا، دونوں ہیں ۔جب شاخوں سے پتیاں نکلتی اور شگوفوں کی نمود ہوتی ہے ۔اس کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے ۔آپ دیکھئے تصریف و تدریس اور بیان سے کس طرح اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ قرآنِ کریم میں کوئی راز (مخفی) نہیں ۔اس کے تمام رموز و اسرار کو خود اللہ تعالیٰ نے تصریف و تدریس سے واضح کر دیا ہے ۔اس کے کوئی باطنی معانی نہیں ۔اسی جہت سے قرآنِ کریم کو کتابِ مبین کہا گیا ہے اور تِبۡيَانًا لِّكُلِّ شَيۡءٍ (۱۶/۸۹) بھی ۔یعنی خود بھی نہایت واضح اور ظاہر ہے، اور دین سے متعلق ہر بات کو واضح اور ظاہر کرنے والی بھی ۔

لیکن یہ تمام عمل میکانکی نہیں کہ از خود ہوتا چلا جائے گا ۔یہ سب کچھ کہنے کے بعد فرمایا ۔لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ (۶/۱۰۶) ۔اس سے وہی استفادہ کر سکیں گے جو علم و بصیرت سے کام لیں گے ۔قرآن مجید کے متعلق، اس وضاحت کے بعد حضورؐ سے فرمایا کہ

۶/۱۰۷ اِتَّبِعۡ مَاۤ اُوۡحِىَ اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ○

بہر حال، اے رسولؐ! یہ تمہارا ساتھ دیں یا نہ دیں ۔تم اس ضابطۂ خداوندی کا اتباع کرتے جاؤ جو تمہارے

نشوونما دینے والے کی طرف سے، تمہاری طرف وحی کیا جاتا ہے۔ یاد رکھو! خدا کے سوا کسی اور کا قانون ایسا نہیں جس کا اتباع کیا جائے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خدا کے قانون کے ساتھ، اوروں کے قوانین بھی شامل کئے جا سکتے ہیں ——— یا یہ خیال کرتے ہیں کہ خارجی کائنات میں تو خدا کا قانون نافذ العمل ہے، لیکن انسانی دنیا میں انسانوں کا خود ساختہ قانون چلنا چاہیئے ——— تم ان سے کنارہ کشی اختیار کر لو۔

رسول اللہ ﷺ کو اتباعِ قرآن کا حکم

غور کیجیئے! خود حضورؐ کو بھی اسی قرآن کے اتباع کا حکم دیا گیا ہے۔ (اور اس حقیقت کو متعدد مقامات پر دہرایا گیا ہے)۔ اس سے ایک اصول واضح ہے۔ اور وہ یہ کہ حضورؐ کے بعد جو کچھ حضورؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے (وہ تاریخ میں ہو یا کتبِ احادیث میں) وہ اگر قرآن کریم کے مطابق ہے تو اس کے متعلق کہا جا سکے گا کہ حضورؐ کی طرف اس کی نسبت صحیح ہے اگر وہ قرآن کے خلاف ہے تو بلا تامل کہہ دیا جائے گا کہ وہ وضعی ہے۔ حضورؐ کی طرف اس کی نسبت صحیح نہیں۔ حضورؐ کا کوئی ارشاد یا عمل قرآن کے خلاف نہیں ہو سکتا کیونکہ آپ قرآن کا اتباع فرماتے تھے اور اس کی خلاف ورزی کو معصیت قرار دیتے تھے۔ (۱۰/۱۵)

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ایک مشفق طبیب کی طرح حضورؐ پر یہ امر کہ لوگ تباہی کا راستہ کیوں اختیار کئے ہوئے ہیں اور صحیح راستہ کی طرف کیوں نہیں آجاتے۔ کس قدر گراں گزرتا تھا۔ (۲۶/۳)۔ آیت (۶/۱۰۷) میں کہا گیا ہے کہ مشرکین سے اعراض برتو، تو اس سے حضورؐ کے قلبِ دردمند میں ان کی تباہی کے تصور سے افسردگی کا پیدا ہو جانا فطری امر تھا۔ اس کے لئے فرمایا:

۶/۱۰۸ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ؕ وَ مَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ○

تم اس سے افسردہ خاطر ہو کہ یہ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ اگر ہم چاہتے تو اپنے کائناتی قانون کے مطابق، انسانوں کو مجبور پیدا کر دیتے ——— اور اس طرح یہ کبھی دوسرے قوانین کی اطاعت اختیار نہ کرتے۔ لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ اس لئے کہ ہم، انسان کا اختیار و ارادہ، جو ہم نے اسے دیا ہے، سلب نہیں کرنا چاہتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے تمہیں نہ ان پر پاسبان مقرر کیا ہے نہ داروغہ۔ کہ تم انہیں مجبوراً صحیح راستے پر چلاؤ۔ (۶/۱۴۹ ، ۴۳/۲۰)

چونکہ ہم اس موضوع پر بہت کچھ لکھ چکے ہیں (دیکھئے عنوان "تقدیر") اس لئے اس مقام پر کچھ مزید لکھنے کی ضرورت نہیں۔

جب مشرکین سے اعراض برتنے کا کہا تو ساتھ ہی جماعت مومنین سے کہہ دیا کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ تم ان کے معبودوں، اور بزرگوں کو برا بھلا کہنے لگ جاؤ۔ باطل عقائد اور مسالک سے اختلاف اور اعراض کی اور بات ہے۔ اس کے جواب دینے کا موقعہ آئے تو دلیل و برہان کی رو سے جواب دیا جائے۔ ابتذال کی پست سطح پر اترنا مومنین کا شیوہ نہیں ہونا چاہیئے۔

۶/۱۰۹ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا
بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ كَذَٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ
مَرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

اے جماعت مومنین! اس میں شبہ نہیں کہ ان لوگوں کے معبود، باطل ہیں اور تم باطل پرست نہیں ہو۔ لیکن دیکھنا! کہ تم ایسی پست سطح پر نہ اتر آنا کہ ان کے معبودوں کو گالیاں دینے لگ جاؤ۔ تم نے ایسا کیا تو یہ لوگ، جہالت کی بنا پر، خدا کو گالیاں دینے لگ جائیں گے۔

باطل معبودوں کو برا بھلا مت کہو

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں (دانستہ سرکشی اختیار کرنے والوں کے سوا) جو کچھ کوئی کرتا ہے، اچھا سمجھ کر ہی کرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ جہالت کی وجہ سے اچھے اور برے میں تمیز نہیں کر سکتا۔ اس لئے غلط راستے پر چلنے والے پر اس کی غلط روی کو واضح کرنا چاہیئے اور اس کے سامنے صحیح راستہ لانا چاہیئے۔ ایسے برا بھلا کہنے سے اس میں الٹی ضد پیدا ہو جائے گی۔ اگر وہ سمجھانے کے باوجود صحیح راستہ کی طرف نہ آئے تو اس میں بھی غصے ہو جانے کی کوئی بات نہیں۔ اس کا نقصان اسی کو ہوگا۔ یاد رکھو! تمام لوگوں کے اعمال کے نتائج خدا کے قانون مکافات کے مطابق مرتب ہو رہے ہیں۔ ان کا ہر قدم اسی کی طرف اٹھ رہا ہے۔ ظہور نتائج کے وقت انہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ وہ صحیح روش پر چل رہے تھے یا غلط پر۔

آپ غور کیجئے۔ غلط روش پر چلنے والوں کی جہالت کو کیسے بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ کہا یہ لوگ غلط کام اس لئے کرتے ہیں کہ انہیں وہ کام غلط یا برے دکھائی نہیں دیتے۔ وہ انہیں اچھا سمجھ کر کرتے ہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ انہیں ان کے اعمال کو بے نقاب کر کے دکھا دیا جائے کہ وہ کیسے ہیں۔ اور ایسا علم و بصیرت

کی رو سے ہوگا۔ بُرا بھلا کہنے سے نہیں۔ باطل مذاہب کے پیرو، اپنے عقیدہ کی رو سے، مذہبی امور میں جس قدر مشقتیں اٹھاتے اور صعوبات برداشت کرتے ہیں وہ اس لئے ہے کہ وہ ان کاموں کو نیکی یا (ہماری اصطلاح میں) ثواب، کا کام سمجھ کر کرتے ہیں۔ اگر وہ انہیں بُرا سمجھیں تو ایسا کریں ہی کیوں! آپ دیکھئے کہ قرآن کریم غیر مذاہب کے پیرؤں کے ساتھ کس قسم کا انداز اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

دیگر مقامات میں کہا ہے کہ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۶/۴۳)۔ ان کے غلط کاموں کو شیطان مزین بنا کر دکھاتا ہے۔ شیطان کے متعلق بتایا جا چکا ہے (دیکھئے انڈکس) کہ یہ انسان کے غلط جذبات کا دوسرا نام ہے۔ جذبات، سرکشی اور مفاد پرستی کے بھی ہوتے ہیں اور باطل مذہبیت کے بھی۔ اس کا علاج یہ ہوتا ہے کہ جذبات کے تابع چلنے کے بجائے، علم و بصیرت اور دلائل و براہین سے کام لیا جائے۔

یہ، دلائل و براہین سے کام نہ لینے کا نتیجہ ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر یہ رسولؐ کوئی معجزہ دکھا دے تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ یعنی رسولؐ انہیں علم و بصیرت کی دعوت دیتا ہے (۱۲/۱۰۸) اور یہ اس سے توہم پرستی کا مطالبہ کرتے ہیں (انڈکس میں معجزات کا عنوان دیکھئے)۔

۶/۱۱۰ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○

یہ (مخالفین) خدا کی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ اگر انہیں کوئی محسوس نشانی دکھا دی جائے تو وہ اس پر ایمان لے آئیں گے۔ اے رسولؐ! تم ان سے کہہ دو کہ اس قسم کی نشانیاں بھیجنے نہ بھیجنے کا معاملہ خدا سے متعلق ہے (میرا کام تو خدا کا پیغام تم تک پہنچانا ہے)۔

معجزات طلبی

(اے جماعت مومنین! ہو سکتا ہے کہ ان مخالفین کے اس مطالبہ سے تم میں سے بھی بعض کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ اگر انہیں اس قسم کا کوئی معجزہ دکھا دیا جائے تو اچھا ہی ہے۔ یہ اس طرح ایمان لے آئیں گے) لیکن تمہیں ان کی دلی کیفیت معلوم نہیں۔ یہ معجزہ دیکھ کر بھی ایمان نہیں لانے کے۔ ویسے بھی، معجزات دکھا کر مومن بنانا ہمارے قانونِ مشیّت کے خلاف ہے۔ اسلئے تم ان کی ان باتوں کا خیال نہ کرو۔ قرآن کو عقل و بصیرت کی بنا پر پیش کرتے رہو۔)

اور یہ امر واقعہ ہے۔

۶/۱۱۱ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَ اَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ نَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝

(ان معترضین و مخالفین میں سے، اہلِ کتاب کا معاملہ تو بالکل صاف ہے) یہ پیغام، اس سے پہلے بھی ان کی طرف آتا رہا ہے، لیکن یہ اس پر ایمان نہیں لائے۔ اس لئے کہ پیغامِ خداوندی کی صداقت کو عقل و بصیرت کی رو سے پرکھا اور سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جو لوگ تعصب۔ توہم پرستی اور اسلاف کی اندھی تقلید کو اپنا مسلک بنا لیں، اُن کی عقلیں اوندھی ہو جاتی ہیں، اور وہ اپنی پیدا کردہ تاریکی کی طغیانیوں میں بہے چلے جاتے ہیں۔ (۲۷/۱۴)

ضد پر اڑے رہنا اگرچہ اس میں اشارہ اہلِ کتاب کی طرف معلوم ہوتا ہے لیکن اس سے ایک اور ذہنیت کا اظہار بھی مقصود نظر آتا ہے۔ وہ ذہنیت یہ ہے کہ اگر ایک بار، بلا سوچے سمجھے منہ سے نکل گئی تو پھر ہزار کوشش کیجئے، وہ اپنی ضد پر اڑے رہیں گے، خواہ دل میں اپنی غلطی کا احساس بھی کیوں نہ ہو گیا ہو۔ (۲۷/۱۴)

آٹھواں پارہ شروع

۶/۱۱۲ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَاۤ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓـئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ۝

یقین مانو۔ اگر ہم (بفرضِ محال) ان کی طرف فرشتے نازل کر دیتے۔ ان سے مردے باتیں کرنے لگ جاتے اور ہم ان کے سامنے دنیا جہان کی چیزیں لاکھڑی کرتے۔ تو یہ پھر بھی ایمان نہ لاتے۔ اس لئے کہ ایمان وہی لاسکتا ہے جو وہ طریقہ اختیار کرے جسے خدا نے، ایمان لانے کے لئے، تجویز کر رکھا ہے۔ (یعنی عقل و بصیرت سے کام لینا۔ ۱۰/۱۰۰)۔ اور ان میں سے اکثر کا یہ عالم ہے کہ وہ عقل و بصیرت کے پاس تک نہیں پھٹکتے۔ اور اپنی جہالت پر نازاں رہتے ہیں۔ اس لئے اس قسم کے لوگ کیسے ایمان لائیں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ ان کے انکار اور سرکشی کی وجہ کچھ اور ہے، اور وہی چیز انہیں اس طرف آنے نہیں دیتی۔

یعنی ان کی مفاد پرستی۔

" اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ " کے معنی یہ ہیں کہ ایمان وہی شخص لاسکتا ہے جو خدا کے قانونِ مشیّت کے مطابق عقل و فکر سے کام لے کر پیغامِ خداوندی پر غور و فکر کرے۔ اس کی وضاحت آیت کے اگلے ٹکڑے (وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ) نے کر دی۔ کہ اس کے برعکس یہ لوگ جہالت میں ڈوبے رہتے ہیں اور ڈوبے رہنا چاہتے ہیں۔ خود ان کی طرف سے معجزات کا مطالبہ اسی جہالت کا مظاہرہ ہے۔ لہٰذا، یہ لوگ کس طرح ایمان لاسکتے ہیں۔ ان کے عوام کی یہ حالت ہے کہ جہالت سے نکلنا نہیں چاہتے اور ان کا سرغنے پیغامِ خداوندی کے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں۔

۶/۱۱۳ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۚ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ۝

یہ بات کوئی نئی نہیں۔ جو نبی بھی آیا، اس کی قوم کے بڑے بڑے سرغنے، خواہ وہ شہروں میں بسنے والے متمدن افراد تھے یا باہر، بدویت کی زندگی بسر کرنیوالے غیر مہذب، اُس کی مخالفت کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ (۲۵/۳۱؛ ۲۲/۵۲)۔ (اس لئے کہ، اس دعوتِ انقلاب کی، اُن کی مفاد پرستیوں پر زد پڑتی تھی)۔ اس کے لئے

انبیاء کے دشمن

وہ باہمی خفیہ سازشیں کرتے، اور عوام کو اپنے ساتھ رکھنے کے لئے، ان سے طرح طرح کی ملمع بازی کی باتیں کرتے۔ (اس لئے، اے رسولؐ! تم ان کی اس روش سے کبیدہ خاطر نہ ہو) اگر مقصود یہ ہوتا کہ دعوتِ آسمانی کی کہیں مخالفت ہی نہ ہو اور سب لوگ اسے 'طوعاً وکرہاً' مانتے چلے جائیں، تو ہم اپنے قانونِ مشیت کے مطابق ایسا بھی کر سکتے تھے۔ لیکن یہ ہمارے پروگرام کے خلاف ہوتا جس کی رو سے ہم نے انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا ہے۔ اس لئے، تم ان سے اور ان کی فریب کاریوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو (اور اپنے پروگرام کی تکمیل میں سرگرمِ عمل رہو)۔

شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ

" شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ " کی تشریح مطالب الفرقان جلد دوم (صفحات ۵۲-۵۳) پر کی جا چکی ہے۔ یہاں اتنا اضافہ کافی ہے کہ عربوں کی بہت تھوڑی آبادی شہروں میں متمدن زندگی بسر کرتی تھی اور ان کی اکثریت شہروں سے دور، صحراؤں میں خانہ بدوشی کی حالت

میں رہتے تھے۔ عربوں کے ہاں جن ان بدوی قبائل کو کہتے تھے کیونکہ وہ نگاہوں سے اوجھل رہتے تھے۔ (اس لفظ کے بنیادی معنی یہی ہیں) اور انس شہری آبادی کو جو ایک دوسرے سے مانوس (SOCIAL LIFE) کی زندگی بسر کرتے تھے۔ قرآن کریم میں "جن وانس" جہاں بھی آیا ہے اس سے یہی دو آبادیاں مراد ہیں۔ رہتے تو یہ الگ الگ تھے لیکن ان کا آپس میں میل جول رہتا تھا۔ جیسے ہمارے ہاں (آج سے کچھ عرصہ پہلے تک (NOMADIC TRIBES) خانہ بدوش لوگ شہروں میں آتے جاتے رہتے تھے ——— قلندر، مداری، مٹی کے کھلونے بیچنے والی ان کی عورتیں وغیرہ۔ اب بھی شہروں میں آتے رہتے ہیں۔ لیکن مستقل رہائش ان کی باہر صحراؤں اور جنگلوں میں ہی ہوتی ہے۔ عرب میں اب تک یہ دونوں آبادیاں ایک دوسرے سے متمیز زندگی بسر کرتی ہیں۔

جنّات یہ جو ہمارے ہاں مشہور ہے کہ فلاں کو جن چمٹ گیا۔ اور فلاں جگہ جنّات رہتے ہیں، یہ سب توہم پرستی ہے۔ اس قسم کی کسی مخلوق کا ذکر قرآن کریم میں نہیں۔ لوگ اس ضمن میں جتنے قصے بیان کرتے ہیں، تحقیق کرنے پر وہ توہم پرستی پر مبنی افسانے ثابت ہوتے ہیں۔ (یہ راقم الحروف کی شنید نہیں، دید بلکہ آپ بیتی ہے۔ تفصیل اس کی میری کتاب ——— (تصوف کی حقیقت) میں ملے گی)۔

قرآن کہتا ہے کہ عوام کے یہ سرغنے، انہیں جھوٹ اور فریب پر مبنی ملمع سازی کی نہایت دلکش باتیں سناتے رہتے ہیں تاکہ وہ جہالت میں ڈوبے رہیں، اور عقل وفکر سے کام لے کر، اس پیغام خداوندی کی طرف آنے نہ پائیں ہمارے واعظ اکثر اسی قسم کے افسانے عوام کو سناتے رہتے ہیں تاکہ وہ قرآن کریم کی طرف توجہ نہ دے سکیں۔ ان مفاد پرست گروہوں کی یہ ٹیکنیک شروع سے چلی آرہی ہے۔ بنی اسرائیل کا "سامری" انہی میں سے تھا۔ سامری کے معنی ہی قصہ گو اور افسانہ تراش کے ہیں۔ اس سے ان کا مقصد کیا ہوتا ہے اسے اگلی آیت میں یوں بیان کر دیا کہ:

6/114 وَلِتَصْغٰۤى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ○

ان ملمع سازیوں اور فریب کاریوں سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو دنیاوی زندگی کے مفاد ہی کو منتہیٰ سمجھتے ہیں اور حیاتِ اخروی، اور خدا کے قانونِ مکافات پر یقین نہیں رکھتے، ان کی طرف جھکے رہیں۔ انکی ہاں میں ہاں ملاتے رہیں۔ اور جو کارستانیاں یہ کرتے ہیں، وہ بھی ان میں شریک رہیں ——— یہ چاہتے ہیں

کہ سارہ معاشرہ انہی کے ڈھب پر چلتا جائے تاکہ کوئی کسی کو روکنے ٹوکنے والا نہ ہو۔ (وہ تم سے بھی اسی قسم کی مفاہمت کرنا چاہتے ہیں)۔ ان سرغنوں کا مقصد قوم کی اصلاح نہیں ہوتا۔ جن باتوں سے عوام خوش ہوں یہ انہی میں انہیں اُلجھائے رکھتے ہیں اور جس طریق سے وہ دولت حاصل کرتے ہیں، انہیں ویسا ہی کرنے دیتے ہیں تاکہ وہ ان کی مخالفت پر نہ اتر آئیں۔

یہاں ایک اہم نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ اس قسم کی ملمع سازیوں اور فریب کاریوں سے وہی لوگ متاثر ہوتے ہیں جو خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل (حیاتِ آخرت) پر یقین نہیں رکھتے۔ مکافاتِ عمل پر یقین رکھنے والوں کی اثر پذیری کا معیار اور ہوتا ہے۔ وہ غلط اور صحیح، حق اور باطل، فریب اور صداقت میں تمیز کرنا جانتے ہیں کیونکہ اس کیلئے ان کے پاس صحیح معیار ہوتا ہے۔

اور ان سب کے جواب میں، ایک اصولی بات کہدی کہ:

۶/۱۱۵ أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا ۚ وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنَزَّلٌ مِّن رَّبِّكَ بِالْحَقِّ ۖ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ۝

حکومت صرف کتاب اللہ کی

ان سے پوچھو کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں خدا کو چھوڑ کر، کسی اور کے قانون کے مطابق اپنے اور تمہارے معاملات کے فیصلے کرنے لگ جاؤں، حالانکہ اس نے تمہاری طرف ایک واضح اور نکھرا ہوا ضابطۂ قوانین بھیجا ہے۔ جن لوگوں کو یہ کتاب دی گئی ہے (یعنی جماعتِ مومنین کے ارباب علم و بصیرت۔ ۴۷/۱۳) وہ اس حقیقت کو پا گئے ہیں کہ یہ فی الواقعہ تیرے نشوونما دینے والے کی طرف سے، حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے۔ اس لئے ان مخالفین کے ساتھ جھگڑا کرنے کی ضرورت نہیں۔

یہ آیت دین کا عروۃ الوثقیٰ ہے۔ دین، حکومتِ خداوندی کا دوسرا نام ہے۔ اور حکومتِ خداوندی کی عملی شکل کتاب اللہ کی حکمرانی ہے۔ اس کی وضاحت مطالب الفرقان جلد سوم (صـ۹) پر آچکی ہے۔ وہیں یہ آیت بھی درج ہے۔ یہاں دو باتیں غور طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ کتاب اللہ کو مفصل کہا گیا ہے۔ تفصیل کے معنی ہوتے ہیں

مفصّل کے معنی

بات کو نکھار کر، الگ الگ کر کے، بیان کرنا۔ ہمارے ہاں تفصیل کے معنی (DETAILS) ہوتے ہیں۔ قرآن اس معنی میں (DETAILED) نہیں کہ اس میں

قوانین کی جزئیات تک بھی دی ہوئی ہیں۔ قرآن نے قوانین، اصولی طور پر دیئے ہیں اور اسے ہر زمانے کی اسلامی حکومت پر چھوڑا ہے کہ وہ ان قوانین کی جزئیات، اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق خود وضع کرے۔ قرآنی اصول و قوانین ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے اور حکومت کی مرتب کردہ جزئیات (عندالضرورت) بدلتی رہیں گی۔ اور اس حقیقت کو اگلی آیت میں یوں بیان کر دیا کہ:

۶/۱۱۶ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○

مکمل اور غیر متبدل کتاب

اس قرآن میں خدا کا ضابطۂ قوانین، تمام صداقتوں کو اپنے اندر لئے، اور عدل و توازن کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے، مکمل ہو چکا ہے۔ اب ان قوانینِ خداوندی میں کوئی تغیر و تبدل کرنے والا نہیں —— یعنی، یہ مکمل ایسا ہے کہ اس میں اضافے کی گنجائش نہیں۔ اور محکم ایسا کہ اس میں تغیر و تبدل کی ضرورت نہیں۔ (۱۸/۲۷) اسی لئے اب کسی نبیؑ کے آنے کی ضرورت نہیں رہی (۳۳/۴۰)۔ اور خدا نے خود اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا ہے۔ (۱۵/۹)۔ یہ اس لئے کہ اس خدا کا ضابطۂ قوانین ہے جو سب کچھ سُنتا، اور ہر بات کا علم رکھتا ہے۔ (اس لئے یہ ہو نہیں سکتا کہ انسانی راہنمائی کے لئے جو کچھ دیا جانا ضروری تھا اس میں سے کوئی بات لاعلمی کی بنا پر رہ گئی ہو۔

اس اعلانِ عظیم نے اسلام کو تمام ادیانِ عالم میں منفرد حیثیت عطا کر دی۔ اس نے کہہ دیا کہ جو کچھ خدا نے نوعِ انسان سے کہنا تھا وہ کہہ دیا۔ اب ان سے کہنے کی کوئی بات باقی نہیں رہی۔ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ۔ قرآن میں پہنچکر دین مکمل ہو گیا۔ یہ ہوئی پہلی منفرد خصوصیت۔ دوسری یہ کہ، نہ صرف یہ کہ اس میں کسی اضافے کی ضرورت نہیں بلکہ یہ بھی کہ اس میں کسی تغیر و تبدل کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ قیامت تک غیر متبدل رہے گا (دوسری جگہ ہے۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ۔ (۱۸/۲۷)۔ کوئی ایسا نہیں جو اس میں تبدیلی کر سکے۔ نیز ۶/۳۴) نیز (۱۰/۶۴) (۱۴/۲۴-۲۷)۔ سابقہ صفحات میں آیت (۶/۳۴) کے تحت بھی اس موضوع پر گفتگو ہو چکی ہے۔

مکمل اور غیر متبدل ہونے کی خصوصیات کا ذکر یہاں آیا ہے اور آیت (۱۵/۹) کی رو سے خدا نے اس کی حفاظت کا ذمہ خود لے رکھا ہے۔ قرآن کے متعلق ان تینوں خصوصیات سے ختم نبوت از خود ثابت ہو جاتی ہے خدا نے جو کچھ نوعِ انسان سے کہنا تھا وہ قرآن میں آکر مکمل ہو گیا۔ اس میں کسی تبدیلی کی بھی ضرورت نہیں ہو گی اور

یہ قیامت تک محفوظ بھی رہے گا۔ تو پھر کسی نبیؐ کے آنے کی ضرورت کیا ہے؟ نبی تو خدا کا پیغام لے کر آتا تھا۔ جب خدا نے اب کوئی پیغام نوعِ انسان کو دینا ہی نہیں تو وہ نبیؐ کس مقصد کے لئے بھیجے گا؟۔ (انڈکس میں ختمِ نبوّت کا عنوان دیکھئے)۔

اگلی آیت میں قرآن کریم نے واضح کر دیا کہ غلط اور صحیح کا معیار انسانوں کی رائے نہیں۔ نہ کسی ایک انسان کی اور نہ ہی انسانوں کی اکثریت کی۔ فرمایا:

۶/۱۱۷ وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝

اب رہا یہ سوال کہ یہ ضابطۂ خداوندی اس روش کے خلاف دعوت دیتا ہے جس پر نوعِ انسان کی اکثریت گامزن ہے تو یہ اعتراض کچھ وزن نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ کسی مسلک کے صحیح ہونے کی یہ کوئی دلیل نہیں کہ اسے اکثریت نے اختیار کر رکھا ہے۔ اگر تم (اس خیال کے مطابق) لوگوں کی اکثریت کا اتباع شروع کر دو، تو یہ چیز تمہیں خدا کی راہ سے ہٹا کر گمراہ کر دے گی۔ دنیا کی اکثریت کا یہ عالم ہے کہ لوگ محض ظن و تخمین کے پیچھے ہو لیتے ہیں (اور یقینی علم کے بجائے) قیاس آرائیوں سے کام لیتے رہتے ہیں۔ (اس کے برعکس، خدا کی وحی جو کچھ پیش کرتی ہے، وہ سرتاسر علم و حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔)

مغربی جمہوریّت کے خلاف

اس آیت نے ڈیماکریسی یا جمہوریت کے نظام کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ یہ آج سے چودہ سو سال پہلے نازل ہوئی تھی جب دنیا ہنوز ڈیماکریسی کے نظام سے واقف تک نہیں تھی۔ اور قرآن کریم نے اس زمانے میں اس کا ابطال کر دیا۔ ڈیماکریسی کسے کہتے ہیں اور اس کے متعلق عصرِ حاضر کے دانشور کس نتیجہ پر پہنچے ہیں، قرآن کریم نے جو کچھ کہا ہے اس کی صداقت اور عظمت سامنے نہیں آسکے گی جب تک اس نظام (ڈیماکریسی یا جمہوریت کی تاریخ بیان نہ کر دی جائے۔ یہ بات ہوگی تو ذرا طویل، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کی ضرورت لاینفک ہے۔ بالخصوص ہمارے زمانے میں آپ اسے غور سے دیکھئے۔

کاروانِ انسانیت کی تاریخ، ناکام تجربات کی مسلسل داستان ہے۔ انسان ایک نظریہ وضع کرتا ہے اور اس پر تجربہ شروع کر دیتا ہے۔ صدیوں کی جانکاہ مشقتوں اور زہرہ گداز صعوبتوں۔ لرزہ انگیز خونریزیوں اور دہشتناک فسادانگیزیوں۔ مہیب لڑائیوں اور تباہ کن جنگوں کے بعد یہ حقیقت اس کے سامنے آتی ہے کہ وہ نظریہ غلط تھا

اس کے بعد، وہ اس کی جگہ ایک اور نظریہ وضع کرتا ہے، جو بالعموم سابقہ نظریہ کی ضد ہوتا ہے، اور اس پر تجربہ شروع کر دیتا ہے۔ وہ نظریہ بھی، اسی قسم کے فساد انگیز مراحل سے گزر کر ناکام ثابت ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی تمدنی زندگی کی ابتدا سے لے کر آج تک اسی قسم کے عمل اور ردِّ عمل (ACTION AND RE-ACTION) تجارب سے گزر کر یہاں تک پہنچا ہے۔ ان نظریات اور تجربات کا تعلق اس کی زندگی کے ہر گوشے ـــــ معاشرت، معیشت، سیاست وغیرہ سے ہے۔ سرِدست ہم اس کے سیاسی پہلو، اور وہ بھی اس کے ذیلی شعبے، اسلوبِ حکومت سے متعلق گفتگو کریں گے اور دیکھیں گے کہ وہ آج کس مقام پر کھڑا ہے اور اپنے مستقبل کے متعلق کیا سوچ رہا ہے۔

انسان مدنی الطبع واقعہ ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے بہر حال، مل جل کر رہنا ہے۔ مل جل کر رہنے کا لازمی نتیجہ ہے کہ افراد اور گروہوں کے باہمی مفاد میں ٹکراؤ ہو۔ ان میں تنازع ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ جن دو فریقوں میں باہمی تنازع ہو، وہ اسے از خود نہیں سلجھا سکتے۔ اس کے لئے کسی تیسرے فریق، (ثالث) کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی سے حکومت کا تصور پیدا ہوا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ سب سے پہلے، انسان نے قبائلی زندگی اختیار کی جو خاندان ہی کی بڑھی ہوئی شکل کا نام تھا۔ اس اندازِ زندگی میں قبیلہ کا بزرگ، یعنی مورثِ اعلیٰ، واجب الاحترام

قبائلی زندگی

سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کے فیصلے سب کے لئے واجب الاتباع تھے۔ یہ حکومت یا مملکت کا پہلا خاکہ تھا۔ اس میں عام طور پر مرد ہی سربراہ ہوتا تھا اگرچہ کہیں کہیں عورتیں بھی سربراہ نظر آتی ہیں۔

انسان کی ابتدائی زندگی میں (اور ابتدائی کیا؟ اب بھی جہاں جہاں جہالت ہے وہاں) پروہتوں (PRIESTS) کو بہت بڑا مقام حاصل تھا۔ وہ فوق الفطرت قوتوں کے حامل اور دیوتاؤں کی اولاد یا ان کے نائب تصور کئے جاتے تھے۔ ہر شخص ان سے ڈرتا اور کانپتا تھا اور ان کے حکم کی خلاف ورزی کا تصور تک بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ان پروہتوں نے جب دیکھا کہ لوگ بزرگِ خاندان (یا قبیلہ) کو اس لئے سربراہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے دل میں اس کا احترام ہوتا ہے تو انہوں نے سوچا کہ لوگوں کے دل میں جو ان کا (پروہتوں کا) احترام ہے، اس سے کیوں نہ فائدہ اٹھایا جائے۔

تھیاکریسی

چنانچہ انہوں نے کہا (اور عوام سے منوالیا) کہ درحقیقت حقِ حکومت انہی کو حاصل ہے۔ اس سے تھیاکریسی (مذہبی پیشواؤں کے الوہیاتی اختیارات) کے بیج حکومت کی طرح پڑی۔

کہیں ایسا بھی ہوا کہ کسی زور آور نے کسی طرح قوت فراہم کر لی اور اپنے ساتھ اسی قسم کے اور شہ زور افراد ملا لئے تو انہوں نے کمزور انسانوں کو دبانا شروع کر دیا۔ اس طرح "حکومت بزورِ قوت" کا انداز وجود میں آیا۔

اسے ملوکیت یا شاہنشاہیت کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا۔ ان ارباب قوّت (راجاؤں۔ بادشاہوں) نے جلد ہی

ملوکیّت محسوس کر لیا کہ خالی قوّت کے بل بوتے پر لوگوں کو دبائے رکھنے میں خاصی دقتیں پیش آتی ہیں۔ قوّت کے ساتھ احترام یا عقیدت کا عنصر بھی شامل ہونا چاہیئے۔ دوسری طرف مذہبی پیشواؤں نے دیکھا کہ قوّت کے بغیر خالی عقیدت کے زور پر اقتدار قائم نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ اس باہمی ضرورت کے تحت بادشاہوں اور مذہبی پیشواؤں (راجاؤں اور پروہتوں) نے باہمی سمجھوتا کر لیا۔ مذہبی پیشواؤں نے، راجہ کو ایشور کا اوتار، اور سلطان کو ظل اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ) قرار دے دیا اور بادشاہوں نے کہا کہ انہیں یہ خدائی اختیارات، مذہبی پیشواؤں کی وساطت سے حاصل ہیں۔ عملی زندگی میں انہوں نے دوائرِ اقتدار بانٹ لئے۔

سیکولرازم مذہبی دائرے میں حکمرانی مذہبی پیشواؤں کی تسلیم کر لی گئی اور دنیاوی معاملات میں بادشاہوں کی۔ اسے سیکولر اندازِ حکومت کہا جاتا ہے۔

اس مختصر سی روئداد سے ہم نے دیکھ لیا کہ انداز و اسالیبِ حکومت کتنے ہی کیوں نہ بدلتے رہے ہوں، نظریہ شروع سے اخیر تک ایک ہی کار فرما رہا ہے۔ یعنی انسانوں کی انسانوں پر حکومت۔ اس نظریہ کے تابع، حکمرانوں کے ہاتھوں محکوم انسان جس وحشت و بربریت کا شکار ہوئے اور جن مظالم کا تختۂ مشق بنے، ان کے تصوّر سے خود انسانیت کی روح کانپ اٹھتی ہے۔ جب یہ بہیمیت اور درندگی انتہا تک پہنچ گئی تو مغرب کے بعض مفکّرین کے دل میں اس کے خلاف ردّعمل پیدا ہؤا اور انہوں نے سوچا کہ اندازِ حکومت کچھ ایسا ہونا چاہیئے جس میں انسان کی حکومت انسان پر نہ ہو۔ ان کی فکر اس نتیجہ پر پہنچی کہ نظامِ حکومت لوگوں کے باہمی معاہدہ سے

نظریۂ میثاق قائم ہونا چاہیئے۔ اسے نظریۂ میثاق (THEORY OF SOCIAL CONTRACT) کہا جاتا ہے۔ اس کی ابتداء مشہور مفکّر، ہابز اور لاک سے ہوئی تھی لیکن چونکہ اس کی عملی تفاصیل روسو — (ROUSSEAU - 1712 - 1778) نے مرتّب کی تھیں اس لئے ہم اس سرگزشت کو وہیں سے شروع کرتے ہیں۔ اس نے کہا کہ ہر انسان چاہتا ہے کہ اس کی آزادی برقرار رہے لیکن تمدّنی زندگی میں یہ ناممکن ہو چکا ہے، اس لئے اس کا علاج یہ ہے کہ تمام انسان مل کر اپنی اپنی انفرادیت کو اجتماعی معاشرہ میں جذب کر دیں۔ اس طرح اس معاشرہ کے احکام کا اتباع ہر فرد کی اپنی ذات کا اتباع ہوگا اور کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محکوم نہیں ہوگا۔ اس اجتماعی معاشرہ کو روسو، اجتماعی ارادہ (GENERAL WILL) سے تعبیر کرتا ہے۔

اس نے کہا کہ ہر فرد کے "دو ارادے" ہوتے ہیں۔ ایک ذاتی اور ایک بہ حیثیت شہری ہونے کے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت ایک فرد کے ان ارادوں میں ٹکراؤ ہو جائے۔ ایسی صورت میں ذاتی ارادے کو اجتماعی ارادے کے تابع رکھنا ہی عین آزادی ہے۔

الفاظ کی حد تک تو یہ نظریہ بڑا خوش آئند بلکہ دلکش تھا لیکن اس کے بعد جب اس کی عملی تفسیر کا مسئلہ سامنے آیا تو اس میں دشواری پیدا ہوئی۔ مسئلہ یہ سامنے آیا کہ اس "اجتماعی ارادے" کا تعین کس طرح کیا جائے؟ اس کے جواب میں روسو نے کہا کہ اس کے لئے ہر فردِ معاشرہ کی رائے دریافت کی جائے۔ لیکن یہ کہنے کے بعد اسے خود ہی خیال آیا کہ ایک مملکت کے تمام افراد کی آراء کا معلوم کرنا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہو گا۔ تو پھر کیا کیا جائے؟ اس کے لئے اس نے لاک کے نظریہ کا سہارا لیا جس نے کہا تھا کہ حکومت، افراد کے نمائندگان پر مشتمل ہونی چاہیئے اور اگر ان نمائندوں میں کبھی اختلاف ہو جائے تو فیصلہ اکثریت کی رائے کے مطابق ہونا چاہیئے۔ روسو اور لاک کے نظریات کے اس امتزاج کو قبول کر لیا گیا اور اس کے مطابق اسلوبِ حکومت کو ڈیماکریسی کہہ کر پکارا گیا۔ اس کا ترجمہ جمہوریت کیا جاتا ہے۔

ڈیماکریسی

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ ڈیماکریسی کی بنیاد حسبِ ذیل مفروضات پر قائم ہوتی ہے:-

۱۔ اس اندازِ حکومت میں، حاکم اور محکوم کا امتیاز نہیں رہتا۔ اس میں عوام خود اپنی حکومت آپ قائم کرتے ہیں۔

۲۔ عوام کا منشا ان کے نمائندگان کے ذریعے معلوم ہو سکتا ہے۔

۳۔ کسی فیصلے کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار ان نمائندگان کی اکثریتِ رائے ہوتا ہے۔ اور

۴۔ اقلیت کو اکثریت کے فیصلے صحیح تسلیم کرنے پڑتے ہیں اور تمام افرادِ مملکت پر ان کی اطاعت لازمی ہوتی ہے۔

شخصی حکومتوں کے ڈسے ہوئے مظلوم انسانوں نے اس نظریہ کو آیۂ رحمت سمجھا۔ اس کی شان میں مدح و ستائش کے قصائد نشید ہوئے۔ اس کے نفاذ پر مسرت اور شادمانی کے جشن منائے گئے۔ انسانیت نے سمجھ لیا کہ اس نے آزادی کے فردوسِ گم گشتہ کو پھر سے پا لیا ہے۔ اس کا شہرہ مغرب تک ہی محدود نہ رہا۔ اطرافِ عالم میں اس پر تبریک و تہنیت کے پھول برسائے گئے۔ دنیا کی قریب قریب ہر قوم نے آگے

بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ جمہوریت۔ جمہوریت۔ جمہوریت کے نعروں سے کرۂ ارض گونج اٹھا۔ جس نے اس اندازِ حکومت کو اختیار نہ کیا، یا اُس کی مخالفت کی، اُسے انسانیت کا دشمن قرار دیا گیا۔

لیکن اس غلغلے اور طنطنے کی ہنوز صدائے بازگشت بھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ اُسی مغرب سے اس قسم کی آوازیں بلند ہونی شروع ہوگئیں کہ یہ نظریہ بڑا فریب انگیز ہے۔ اسے نافذ کیا گیا تھا یہ کہہ کر کہ اس سے انسانوں پر انسانوں کی حکومت ختم ہو جائے گی لیکن ہوا یہ کہ اس سے انسانوں پر انسانوں کی حکومت پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ مسلط ہو گئی، اس فرق کے ساتھ کہ عہدِ جاہلیت میں حکمران بے نقاب سامنے آتے تھے۔

جمہوریت کے خلاف

اب اس دورِ تہذیب میں وہ جمہوریت کا نقاب اوڑھ کر آتے ہیں اور عوام کو اس فریب میں مبتلا رکھتے ہیں کہ تم پر کوئی اور حکومت نہیں کر رہا۔ یہ تمہاری اپنی حکومت ہے۔ تم اپنے آپ پر خود حکومت کرتے ہو۔

لندن یونیورسٹی کے پروفیسر (ALFRED COBBAN) نے (CRISIS OF CIVILISATION) کے نام سے ایک بلند پایہ کتاب شائع کی تھی جس میں اس نے تہذیب مغرب کے بحران کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس کی تباہی کا بڑا سبب، اندازِ جمہوریت ہے۔ اس نے کہا تھا:

> اس نظریہ کو اگر بنظرِ امعان دیکھا جائے تو "عوام کے اقتدارِ اعلیٰ" کا فریب نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ اگر سیاست کو نظری حیثیت سے نہیں، بلکہ عملی حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ حاکم اور محکوم کو ایک ہی تصور کرنا، عملی ناممکنات سے ہے۔ عملاً حکومت افراد کے ایک طبقے پر مشتمل ہوتی ہے اور رعایا افراد کے دوسرے طبقے کا نام ہوتا ہے۔ جب معاشرہ اپنی قبائلی زندگی سے ذرا آگے بڑھ جائے تو پھر حاکم اور محکوم کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ یہ سمجھ لینا کہ دونوں ایک ہی ہیں، مملکت کو لامتناہی اختیارات کا حامل بنا دیتا ہے۔ (ص ۶۸)

اس نظریہ کے متعلق کہ اکثریت جسے صحیح کہہ دے، وہ صحیح ہوتا ہے، پروفیسر مذکور لکھتا ہے:۔

> عوام کے اقتدارِ اعلیٰ کے نظریہ کی تائید میں روایتی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ حکومت یا تو قوت سے قائم کی جائیگی یا باہمی رضامندی سے۔ اور چونکہ یہ غلط ہے کہ جس چیز کو قوت صحیح کہہ دے وہ بالضرور صحیح ہو، اس لئے یہی درست ہے کہ حکومت کو باہمی رضامندی پر مبنی ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ دلیل نہ تو منطقی طور پر صحیح ہے، نہ ہی صداقت پر مبنی۔ اگر

کسی بات کو لاکھ آدمی بھی صحیح کہدیں تو وہ (محض اس لئے کہ اتنے لوگوں نے اسے صحیح کہہ دیا ہے) صحیح نہیں ہو سکتی۔ فیصلہ وہی صحیح ہو سکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو، نہ کہ وہ جسے زیادہ لوگ صحیح کہنا شروع کر دیں۔ روسو کہتا ہے کہ "منشائے عمومی ہمیشہ صحیح ہوگا، ورنہ وہ منشائے عمومی کہلا نہیں سکے گا۔" لیکن اگر یہ نظریہ صحیح ہے کہ صحیح وہی ہو سکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو۔ تو پھر اکثریت اور اقلیت کا سوال باقی نہ رہا۔ سوال یہ رہ گیا کہ جو چیز اخلاقی بنیادوں پر درست ہے، وہی صداقت ہے۔ (ص ۴۶)

اس کے بعد وہ لکھتا ہے:۔

اقتدارِ اعلیٰ لفظی طور پر بڑا بلند آہنگ تصور ہے لیکن اس کا صحیح مفہوم صرف اس صورت میں سمجھ میں آ سکتا ہے جب ہم یہ دیکھیں کہ روزمرّہ کی زبان میں اس کا مطلب کیا ہے؟ اقتدارِ اعلیٰ سے مفہوم "اختیاراتِ مطلقہ" ہے۔ یعنی بلاحدود وقیود حکومت، خواہ ایسی حکومت ایک فرد کی ہو یا ایک جماعت کی۔ بنا بریں "اقتدارِ اعلیٰ" کے نظریہ کو محض ایک نظری سوال سمجھ کر نظر انداز نہیں کر دینا چاہیئے۔ آج اسی مفروضہ کو حقیقتِ ثابتہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ قوم کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہے۔ اور اس کے بعد بحث صرف اس مسئلہ کے متعلق رہ جاتی ہے کہ اختیارات کسی فردِ واحد کے ہاتھ میں ہونے چاہئیں، یا کسی نمائندہ جماعت کے ہاتھ میں۔ لیکن ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ "اقتدارِ اعلیٰ" کا یہ تصوّر صحیح بھی ہے یا نہیں۔ یہ ہے اصل مسئلہ۔ یعنی یہ مسئلہ کہ قانون کا سرچشمہ عوام کا منشا ہے یا اس کے علاوہ کوئی اور سرچشمہ ہے۔ (ص ۵۸)

اس اقتباس کو ذرا غور سے پڑھیئے کیونکہ اس میں ایسے اصولی نکات پیش کئے گئے ہیں جن کی اہمیت اس وقت سامنے آئے گی جب ہم جمہوریت کا تجزیہ قرآنِ مجید کی روشنی میں کریں گے۔

کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر (ACEWING) نے اپنی کتاب (INDIVIDUAL THE STATE AND WORLD GOVERNMENT) میں ڈیماکریسی کے متعلق بڑی شرح و بسیط سے بحث کی ہے۔ اس بحث کے دوران وہ لکھتا ہے کہ روسو نے یہ سمجھا تھا کہ جمہوری نظام میں استبداد یا غصب حقوق کا خطرہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ لوگ اپنے اوپر استبداد، یا خود اپنے حقوق کا غصب کبھی روا نہ رکھیں گے۔ لیکن

اگر روسو، عصرِ حاضر میں جمہوری نظام کے عملی تجربہ سے پہلے اپنی کتاب نہ لکھتا تو وہ نظامِ جمہوریت کے متعلق کبھی اس خوش فہمی سے کام نہ لیتا۔ (ص ۱۱۶)

پروفیسر جوڈ (C. M JOAD) کو بھی، جو پہلے نظامِ جمہوری کا بڑا حامی تھا، بعد میں یہ کہنا پڑا کہ

سائنس (یعنی مادی نقطۂ نگاہ سے) ہر چیز کی قیمت اس کی کمیت (QUANTITY) کے لحاظ سے مقرر ہوتی ہے، کیفیت (QUALITY) کی رُو سے نہیں۔ سائنس کے عام ہونے کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اسی اصول کو سیاست پر بھی منطبق کر لیا گیا۔ چنانچہ جمہوری اندازِ حکومت میں فیصلے "سروں کی گنتی" سے ہونے لگے۔ ہر سر ایک ووٹ، خواہ ایک سر مفکر کا اور دوسرا گدھے کا ہی کیوں نہ ہو۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ

کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید۔ (DECADENCE)

مشہور فرانسیسی مفکر، (RENE GUENN) لکھتا ہے:۔

فریبِ جمہوریت

اگر لفظِ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ لوگ خود اپنی حکومت آپ قائم کریں تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہے جس کا وجود ناممکنات سے ہے اور جو نہ کبھی پہلے وجود میں آئی ہے اور نہ آج کہیں موجود ہے۔ ایسا کہنا ہی جمع بین النقیضین ہے کہ ایک ہی قوم بیک وقت حاکم بھی ہو اور محکوم بھی...... حاکم اور محکوم کا تعلق دو الگ الگ عناصر کے وجود کا متقضی ہے۔ اگر حاکم نہیں تو محکوم بھی نہیں۔ ہماری موجودہ دنیا میں جو لوگ کسی نہ کسی طرح قوت اور اقتدار حاصل کر لیتے ہیں ان کی سب سے بڑی قابلیت اس میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دل میں یہ عقیدہ پیوست کر دیں کہ (ان پر کوئی حاکم نہیں بلکہ) وہ خود اپنے آپ پر حاکم ہیں...... عام رائے دہندگی کا اصول اسی فریب دہی کی خاطر وضع کیا گیا ہے۔ (اس اصول کی رُو سے) سمجھا یہ جاتا ہے کہ قانون اکثریت کی مرضی سے وضع ہوتا ہے اور اس حقیقت کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے کہ اکثریت کی یہ مرضی ایک ایسی شے ہے جسے نہایت آسانی سے ایک خاص رُخ پر لگایا بھی جا سکتا ہے اور بدلا بھی جا سکتا۔

(CRISIS OF THE MODERN WORLD -- P. 106)

ڈین انگے (DEAN INGE) نے اپنی کتاب (THE FALL OF IDOLS) میں ڈیماکریسی کے خلاف مختلف مفکرین اور مدبرین کے اقوال نقل کئے ہیں۔ ایک اقتباس ہے:۔

آزاد لوگ جنگ کے زیادہ متمنی ہوتے ہیں اور جمہوریتیں مطلق العنان بادشاہوں سے بھی زیادہ اپنے جذبات کی غلام۔ (MIRABEAU)

ایک اور:

جمہوریت، فطری طور پر تو اپنے آپ کو مثالی نظام محسوس کر سکتی ہے لیکن عملی طور پر یہ ایک ناممکن نظریہ ہے۔
(IRVING BABBIT)

اور خود ڈانگلے کی اپنی رائے یہ ہے کہ

ایک مکمل جمہوریت بھی اس حد تک جمہوری نہیں ہوسکتی جس حد تک یہ نظریہ، جمہوریت اسے جمہوری بتاتا ہے (ص ۱۱)

۱۹۴۷ء میں، اقوامِ متحدہ کی ثقافتی مجلس (UNESCO) نے ایک تحقیقاتی کمیٹی اس غرض سے منعقد کی تھی کہ وہ جمہوری نظامِ حکومت کے متعلق سائنٹیفک انداز سے چھان بین کرے۔ اس کمیٹی نے دنیا بھر کے مفکرین اور مدبرین سے جمہوریت سے متعلق مقالات حاصل کئے اور انہیں ایک کتابی شکل میں شائع کرایا۔ اس کا نام ہے (DEMOCRACY IN A WORLD OF TENSION) اس کمیٹی نے سب سے پہلے یہ سوال پیش کیا تھا کہ جمہوریت کا مفہوم کیا ہے؟ جوابات کی اکثریت میں اعتراف کیا گیا تھا کہ یہ اصطلاح بالکل مبہم (AMBIGUOUS) ہے۔ آج تک اس کا مفہوم ہی متعین نہیں ہوسکا۔ اس کے بعد کمیٹی نے دوسرا سوال پیش کیا کہ "کیا اکثریت کا فیصلہ ہمیشہ درست ہوتا ہے اور اس کے خلاف احتجاج کرنا جمہوریت کے خلاف ہے؟" اس کے جواب میں کہا گیا کہ "یہ سمجھنا غلط ہے کہ اکثریت کا فیصلہ غلطی سے پاک ہوتا ہے۔ وہ غلط بھی ہوسکتا ہے۔ اس لئے اقلیت کو حق حاصل ہے کہ وہ اکثریت کے فیصلے کے خلاف ایجی ٹیشن کرے اور اسے بدلوا دے۔"

یہ ہیں جمہوریت کے متعلق دورِ حاضر کے مفکرین . . . . کے خیالات۔ میں نے یہاں اختصار سے کام لیا ہے۔ جو حضرات تفصیل میں جانا چاہیں، وہ میری کتاب "انسان نے کیا سوچا؟" میں "سیاست" کا باب ملاحظہ فرمالیں۔

اقتدارِ اعلیٰ

سوال یہ ہے کہ جمہوریت کو مسترد کرنے کے بعد، یہ مفکرین کس قسم کا نظام چاہتے ہیں؟ اس باب میں بنیادی اور متفق علیہ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ، انسانوں کے ہاتھ میں اقتدار دینے کے یکسر خلاف ہیں، خواہ اس کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ فرانسیسی مفکر (BERTAND DE JOUVENEL) نے ایک اعلیٰ پایہ کی کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (SOVEREIGNTY) وہ اس میں لکھتا ہے:-

یہ ادنیٰ تامل یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ اگر آپ ایک دفعہ اس اصول کو تسلیم کرلیں کہ انسانی مرضی اور ارادے کو اقتدارِ مطلق حاصل ہوسکتا ہے تو اس کے بعد جو نظامِ حکومت بھی قائم ہوں گے، حقیقت کے اعتبار سے وہ

سب ایک جیسے ہوں گے۔ نظامِ ملوکیت اور جمہوری نظام بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن اس اصول کی رُو سے دونوں کا شعوری قالب ایک ہی ہوتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں اقتدار ہو یہ اُصول اسے یکساں حقِ مطلق العنانی عطا کر دیتا ہے۔ (ص ۱۹۹)

حکومت قانون کی

ان کا مطالبہ یہ ہے کہ حکومت انسانوں کی نہیں، قانون کی ہونی چاہیئے۔ اس کے بعد ان کے ہاں بحث یہ چل رہی ہے کہ وہ قانون کس قسم کا ہونا چاہیئے؟ اس حقیقت کو امریکی ماہرِ آئین، ایڈورڈ کارون، اپنی کتاب (THE HIGHER LAW) میں بڑی وضاحت سے سامنے لاتا ہے۔ وہ اس میں مشہور مفکّر (CICRO) کے یہ الفاظ نقل کرتا ہے:۔

حقیقی قانون مبنی بر حکمت اور فطرت سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ یہ فضا میں ہر جگہ پھیلا ہوا، غیر متبدّل اور ابدی ہوتا ہے۔ یہ قانون معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے روکتا ہے۔ یہ مملکت کا فریضہ ہے کہ کوئی ایسا قانون نافذ نہ کرے جو اس قانون کے خلاف ہو۔ اسے اس کا بھی حق حاصل نہیں کہ وہ اس میں کسی قسم کی ترمیم کرے نہ ہی وہ اسے منسوخ کر سکتی ہے۔ نہ ہماری پارلیمان، اور نہ ہی سینیٹ کو اس کا اختیار ہے کہ وہ لوگوں کو اس قانون کی قید سے آزاد کر دے .... نہ ہی اس قانون کی کیفیت یہ ہے کہ روما کے لیئے الگ قانون ہو اور ایتھنز کے لئے الگ۔ ایک قانون آج ہو اور دوسرا کل۔ یہ ایک ازلی غیر متبدل قانون ہے جو ابدی طور پر تمام اقوام کو اپنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہے۔ (ص ۱)

مشہور اطالوی مدبّر میزینی (MAZZINI) اس باب میں اور بھی وضاحت سے لکھتا ہے:۔

اس میں شبہ نہیں کہ عام رائے دہندگی کا اصول بہت اچھی چیز ہے۔ یہی وہ قانونی طریق کار ہے جس سے ایک قوم تباہی کے مسلسل خطرات سے محفوظ رہ کر اپنی حکومت آپ قائم کر سکتی ہے۔ لیکن ایک ایسی قوم میں جس میں

قانون کیسا ہو؟

وحدتِ عقائد نہ ہو جمہوریت اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے کہ وہ اکثریت کے مفاد کی نمائندگی کرے اور اقلیت کو مغلوب رکھے۔ ہم یا تو خدا کے بندے بن سکتے ہیں یا انسان کے۔ وہ ایک انسان ہو (ملوکیت۔ آمریت) یا زیادہ انسان (جمہوریت) بات ایک ہی ہے۔ اگر انسان کے اوپر کوئی اقتدارِ اعلیٰ نہ ہو تو پھر کونسی چیز ایسی رہ جاتی ہے جو ہمیں طاقتور افراد کے تغلّب سے محفوظ رکھ سکے؟ اگر ہمارے پاس کوئی ایسا مطلق اور ناقابلِ تغیّر قانون نہ ہو، جو انسانوں کا وضع کردہ نہ ہو، تو ہمارے پاس وہ کونسی میزان رہ جاتی ہے جس سے ہم یہ پرکھ سکیں کہ فلاں کام یا فیصلہ عدل پر مبنی ہے یا نہیں۔ خدا کے علاوہ جو بھی حکومت

قائم ہو اس میں نتائج کی حقیقت ایک ہی رہتی ہے، خواہ اس کا نام بونا پارٹ رکھ لیا جائے، خواہ انقلاب۔ اگر خدا درمیان میں نہ رہے تو اپنے زمانۂ سطوت میں ہر ایک مستبد بن جائے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یاد رکھئے کہ جب تک کوئی حکومت خدا کے قوانین کے مطابق نہیں چلتی، اس کا کوئی حق مسلّم نہیں۔ حکومت تو منشائے خداوندی کی ترویج و تنفیذ کے لئے ہے۔ اگر وہ اپنے اس فریضہ کی سرانجام دہی میں قاصر ہے تو تمہارا یہ حق ہی نہیں بلکہ فریضہ ہے کہ ایسی حکومت کو بدل ڈالو۔ (QUOTED BY GRIFFITH-IN-INTER PRETERS OF MAN- P.P. 46-47)

اس قانون کو ابدی اور غیر متبدّل کہنے کے ساتھ ہی ان مفکّرین نے یہ بھی واضح کر دیا کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسانی زندگی پابجولاں یا محبوس ہو کر رہ جائے۔ انہوں نے اس امر کی وضاحت کر دی کہ یہ قوانین و اصول تو بےشک غیر متبدل رہیں گے لیکن ان پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق (جنہیں وہ قانون کی تعبیرات کہہ کر پکارتے ہیں) حالات کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہیں گے۔ وہائٹ ہیڈ (جس کا انتقال کچھ ہی عرصہ پہلے ہوا ہے) ہمارے زمانے کا بہت بڑا مفکّر تھا۔ وہ اس باب میں لکھتا ہے:۔

زندگی کو مستقل طور پر ایک ہی قالب میں محبوس رکھنا ناممکن ہے۔ اس لئے مذہب کو بھی سائنس کی طرح بدلتے تقاضوں کا لحاظ رکھنا پڑے گا۔ اس کے اصول ابدی ہوں گے لیکن ان اصولوں کی تعبیرات حالات کے ساتھ بدلتی رہیں گی۔ (SCIENCE AND THE MODERN WORLD- PP. 218-19)

ممتاز مغربی مفکّر (ERNEST BARKER) میز بنی کی ہم نوائی میں کہتا ہے:۔

مملکت کی اطاعت

مملکت کے ساتھ میری وفاشعاری ان اقدار کے تابع ہے جن کے تحفّظ کے لئے مملکت کا وجود عمل میں آیا ہے اگر مملکت ان اقدار کی وفاشعار نہیں رہتی تو انہی اقدار کے تقاضا کی رُو سے میں مجبور ہو جاتا ہوں کہ اپنی وفاشعاری کو عدمِ وفاشعاری میں بدل دوں تو اس طرح ایک خوشگوار فرمان پذیری کے بجائے بادلِ نخواستہ مزاحمت کی روش اختیار کروں۔ (صفحہ ۱۹۵) حقیقت یہ ہے کہ یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ مملکت اپنے معاہدہ کا بنیادی حق رکھتی ہے جس کی رُو سے اس کی اطاعت ہم پر بہرحال واجب ہو۔ امر واقعہ یہ ہے کہ مملکت عدل کی مظہر اور اسے عمل میں لانے کا ذریعہ ہے۔ ہم پر مملکت کے ارباب اختیارات کے احکامات کی پابندی اس لئے لازم ہوتی ہے کہ مملکت عدل قائم کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اگر مملکت ایسی نہیں رہتی تو اس کے ساتھ ہماری وفاشعاری اور اطاعت ختم ہو جاتی ہے۔

آگے چل کر وہ لکھتا ہے :-

حقیقت یہ ہے کہ سیاسی اطاعت کا وجوب مشروط ہوتا ہے، مطلق نہیں ہوتا۔ یہ اطاعت ہر حالت میں واجب نہیں ہوتی ۔ یہ اس وقت تک واجب رہتی ہے جب تک یہ حق کسی بلند تقاضے کے ساتھ نہ ٹکرائے۔

PRINCIPLES OF SOCIAL AND POLITICAL THEORY – P.P. 193; 195; 220.

یہاں آپ نے دیکھا کہ ان مفکّرین کے نزدیک حقِ حکومت نہ فرد کو حاصل ہے نہ اکثریت کو۔ حکمرانی صرف اقدار کی مطلوب و مقصود ہوتی ہے۔ ان اقدار میں عدل کا تقاضا سرِفہرست ہے۔ مغربی جمہوریت کی رُو سے، اگر کسی متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ مملکت کے رائج الوقت قانون کے مطابق کر دیا جائے، تو اسے مطابقِ عدل کہا جائیگا لیکن اب یہ مفکّرین کہتے ہیں کہ دیکھنا یہ چاہیئے کہ وہ قانون کس قسم کا ہے جس کے مطابق فیصلہ کیا جا رہا ہے۔ اگر وہ قانون انسانوں کا وضع کردہ ہے تو اس کی رُو سے فیصلہ مبنی بر عدل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

عدل کا مفہوم

(EMIL BRUNNER) ہمارے دَور کا فلسفۂ قانون کا بہت بڑا ماہر ہے وہ اس باب میں لکھتا ہے :-

جو شخص فی الواقعہ سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی بر عدل اور فلاں ظلم پر مبنی ہے وہ درحقیقت کہتا یہ ہے کہ عدل اور ظلم کے ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے جو تمام انسانی قوانین، معاہدات، رسوم و رواج سے ماوراء ہے۔ وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی معیار ناپے اور پرکھے جا سکتے ہیں۔ یا تو اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل کے لئے اس قسم کا مطلق الوہیاتی (خداوندی) معیار موجود ہے، ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی بن کر رہ جائے گا جو ایک کے نزدیک قابلِ قبول ہوگا اور دوسرے کے نزدیک ناقابلِ قبول۔ عدل کے لفظ سے مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہوگا جس کے ساتھ حقِ مطلق (الحق) ہونے کی تقدیس شامل ہوگی اور یا پھر یہ محض جھوٹے نگوں کی ملمع سازی ہوگی۔

(JUSTICE AND THE SOCIAL ORDER.)

سوال یہ ہے کہ اس قسم کا قانون ملے گا کہاں سے؟ اس کا جواب کسی "مذہب پرست" شخص کی زبان سے نہیں، عصرِ حاضر کے بلندترین سائنسدان آئن سٹائن کی زبان سے سنیئے۔ اس نے اپنی عمر کے آخری حصّہ میں ایک کتاب شائع کی تھی جس کا نام ہی (OUT OF MY LATER DAYS) ہے۔ وہ اس میں لکھتا ہے :-

سائنس صرف یہ بتا سکتی ہے کہ "کیا ہے" وہ یہ نہیں بتا سکتی کہ "کیا ہونا چاہیئے"۔ اس لئے اقدار کا متعین کرنا

اس کے دائرے سے باہر ہے۔ سائنس کے علمبرداروں نے اکثر اوقات اس امر کی کوشش کی ہے کہ وہ، سائنس کی رُو سے اقدار کے متعلق قطعی فیصلہ نافذ کر دیں۔ (یہ ان کی غلطی ہے جس کی وجہ سے) وہ مذہب کے خلاف محاذ قائم کر بیٹھے ہیں۔ سائنس کے نزدیک بس ایک "شئے" ہوتی ہے۔ اس کی دُنیا میں آرزو۔ اقدار۔ خیر و شر نصب العین حیات کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ سائنس نہ تو اقدار متعین اور قائم کر سکتی ہے اور نہ ہی انسانی سینے کے اندر داخل ہو سکتی ہے۔

آگے چل کر یہ سائنس دان کہتا ہے:۔

وحی پر مبنی

یہ اقدار تجربات کے بعد وضع نہیں ہوتیں۔ یہ مقدس ہستیوں کی وساطت سے بذریعہ وحی ملتی ہیں۔ ان کی بنیادیں عقل پر نہیں ہوتیں۔ لیکن وہ تجربہ کی کسوٹی پر بالکل پوری اُترتی ہیں اس لئے کہ صداقت کہتے ہی اسے ہیں جو تجربہ سے درست ثابت ہو۔

اور اسی پایہ کا ایک اور عالمِ طبیعیات ایڈنگٹن، اپنی کتاب (SCIENCE AND THE UNSEEN WORLD) میں لکھتا ہے:۔

اصل سوال خدا کی ہستی کا نہیں بلکہ اس امر کا یقین ہے کہ خدا بذریعۂ وحی انسانوں کی راہ نمائی کرتا ہے۔

غور کیجئے کہ قرآنِ کریم نے چودہ سو سال پہلے جو کچھ کہا تھا دُنیا کس طرح اس کی طرف آرہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قولِ فیصل یہ نہیں کہ ایک بات کو کتنے لوگ صحیح یا سچا سمجھتے ہیں۔ صحیح اور سچی بات وہی ہے جسے وحیِ خداوندی صحیح اور سچی قرار دے ...... فیصلہ کا معیار یہی ہے۔ نہ کہ انسانوں کی آراء۔ اس لئے:

(۱۱۸/۶) اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ○

لہٰذا، گمراہی اور راست روی کا معیار خدا کی وحی ہو سکتی ہے۔ یہی وہ معیار ہے جس کے مطابق تیرا پروردگار فیصلہ کرتا ہے کہ کون اس کے تجویز کردہ راستے سے ہٹ گیا اور کون اس پر چل رہا ہے۔

"اَكْثَرَ مَنْ فِى الْاَرْضِ" (۱۱۶/۶) میں ساری دنیا کے انسان آجاتے ہیں خواہ وہ کہیں ہوں اور کسی زمانے سے متعلق ہوں۔ لیکن زمانۂ نزولِ قرآن میں مخالفین کی اکثریت یہودیوں پر مشتمل تھی۔ ان کا ایک بنیادی اعتراض یہ بھی تھا کہ اگر اسلام دینِ خداوندی ہے تو پھر یہ کیوں ہے کہ کئی ایک ایسی چیزیں جو اُن کی شریعت میں حرام تھیں

قرآن نے انہیں حلال قرار دے دیا ہے۔ اس کی تفصیلی بحث پہلے آ چکی ہے (دیکھئے عنوان ناسخ و منسوخ اور حرام و حلال۔ اس سلسلہ میں آیت (۶/۱۴۵) بھی دیکھئے)۔ قرآن کریم نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ان کا ذکر پہلے آ چکا ہے

ذبح کے وقت اللہ کا نام

(بالخصوص ۵/۳ میں)۔ ان کے علاوہ باقی سب چیزیں حلال ہیں۔ لیکن ان کیلئے بھی ایک شرط عائد کر دی گئی ہے۔ اور وہ یہ کہ انہیں ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا جائے۔ اس ضمن میں ذیل کی دونوں آیات سامنے رکھیئے۔

۶/۱۱۹ فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ إِن كُنتُم بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِينَ ۝

(اس معیار کی روشنی میں تم ان اہل کتاب کے اس اعتراض کا جائزہ لو جو یہ کہتے ہیں کہ قرآن نے بعض ایسی چیزوں کو حلال کیوں قرار دے دیا جنہیں وہ حرام سمجھتے ہیں۔ حرام اور حلال کا معیار، خدا کی وحی ہو سکتی ہے، کسی کا اپنا مسلک نہیں ہو سکتا، خواہ اس مسلک پر چلنے والوں کی تعداد کتنی ہی کیوں نہ ہو)۔

لہذا، اگر تم قانونِ خداوندی (قرآن) پر ایمان رکھتے ہو تو (جن چیزوں کو خدا نے حلال قرار دیا ہے ان میں سے) جن پر خدا کا نام لیا جائے، انہیں اطمینان سے کھاؤ[1]

اور اگلی آیت۔

۶/۱۲۲ وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ ۗ وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ لِيُجَادِلُوكُمْ ۖ وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ ۝

جس پر خدا کا نام نہ لیا جائے

بنا بریں یہ نہ کہو کہ کسی چیز کو خدا کے بجائے کسی اور کی طرف منسوب کرنے سے کیا بگڑتا ہے۔ اور اس پر خدا کا نام لے دینے سے کیا سنورتا ہے۔ وہ چیز دونوں صورتوں میں یکساں رہتی ہے ــــ اس سے ایک گہرا نفسیاتی اثر ہوتا ہے جس سے انسان کے قلب میں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ لہذا جس چیز پر خدا کا نام نہ لیا جائے اسے مت کھاؤ[2]۔ یہ چیز تمہیں صحیح راستے

---

[1] اس سے مقصد جانوروں کو ذبح کرتے وقت خدا کا نام لینا ہے۔ (۲۲/۳۶، ۲۸)

[2] جس جانور پر ذبح کرتے وقت خدا کا نام نہ لیا جائے یا جس چیز کو غیر اللہ کی طرف منسوب کر دیا جائے، وہ حرام ہو جائے گی۔

سے دوسری طرف لے جائے گی۔ مخالفین کی جماعت کے سرغنے اپنے رفقاء کو اکساتے رہتے ہیں کہ وہ تم سے ان باتوں میں الجھتے جھگڑتے رہیں (اور کوشش کریں کہ تم ان کی بات مان جاؤ)۔ اے جماعتِ مومنین! اگر تم نے ان کی بات مان لی تو تم بھی، انہی کی طرح مشرک ہو جاؤ گے۔

ان احکام سے دو باتیں واضح ہوگئیں۔ ایک یہ کہ حلال جانوروں میں سے بھی انہی کا گوشت کھانا جائز ہے جن پر (ذبح کرتے وقت۔ ۲۲/۳۶-۲۸) اللہ کا نام لیا جائے۔ اور دوسرے یہ کہ جن پر اللہ کا نام نہ لیا جائے ان کا گوشت کھانا حلال نہیں ہوگا۔ ان آیات سے واضح ہے کہ:

حلال و حرام ۱۔ جن جانوروں پر ذبح کرتے وقت اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا جائے۔

۲۔ یا کسی کا بھی نام نہ لیا جائے۔ وہ ذبیحہ حلال نہیں ہوگا۔ حلال وہی ہوگا جس پر اللہ کا نام لیا جائے، اور صرف اللہ کا۔

درمیان کی آیت ہے:

۶/۱۲۰ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ۗ وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ۝

جب خدا نے تمہیں واضح طور پر بتا دیا ہے کہ کون کون سی چیزیں حرام ہیں ——— اور وہ بھی مجبوری کی حالت میں جائز قرار پا جاتی ہیں۔ (۵/۳ ؛ ۶/۱۴۶)۔ تو جن چیزوں کو اس نے حلال و طیب قرار دیا ہے اور ذبح کرتے وقت ان پر اللہ کا نام لیا جاتا ہے ان کے کھانے میں کیا تردد ہو سکتا ہے؟ (انہیں اگر خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کر دیا جائے تو وہ حرام ہو جاتی ہیں)۔ یہ لوگ جو اس طرح کی باتیں کرتے ہیں (کہ فلاں چیز پہلے، یہودیوں کے ہاں، حرام تھی۔ اب تم اسے کیوں حلال قرار دیتے ہو) تو انکی کوئی بات وحی کے علم و یقین پر مبنی نہیں۔ محض ان کے ذاتی خیالات ہیں جن کی بنا پر یہ تمہیں صحیح راستے سے بہکانا چاہتے ہیں۔ خدا نے حرام و حلال کی جو حدیں باندھی تھیں، ان لوگوں نے ان حدوں کو از خود آگے بڑھا دیا۔ اب اس بات کا پورا پورا علم، وحیٔ خداوندی (قرآن) میں دیا گیا ہے کہ حرام و حلال کی صحیح حدود کون سی ہیں اور کون ان حدود سے آگے بڑھ رہا ہے۔

یہاں ایک اہم نکتہ بیان کیا گیا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے، چند ایک چیزوں کے سوا، باقی سب حلال ہیں۔

حلال کے ساتھ طیّب بھی

اب یہ ضروری نہیں کہ جو چیزیں حلال ہوں تم پر لازم ہے کہ ان سب کو بالضرور کھاؤ۔ قرآن کریم نے حلال کے ساتھ "طیّب" بھی کہا ہے ۔ یعنی حلال چیزوں میں سے جو چیزیں تمہیں طبعاً پسند ہوں ۔ مزاج کے موافق ہوں ۔ طبی نکتہ نگاہ سے تمہارے لئے مضر نہ ہوں خوش گوار ہوں ۔ مرغوبِ خاطر ہوں ۔ وہ کھاؤ ۔ (اس سلسلہ میں انڈکس میں عنوان طیّب بھی دیکھئے) ۔

یہ جو قرآن نے کہا مَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا ...... تو اس سے ایک اہم نفسیاتی کیفیت کی طرف اشارہ ہے ۔ ایک ہندو، اگر مسلمان ہو جائے تو وہ معاشرہ کی دیگر رسومات بآسانی اختیار کرے گا لیکن اگر اس کے سامنے گائے کا گوشت رکھ دیا جائے تو اس سے اس کی طبیعت ابا کرے گی ۔ اس لئے کہ وہ جس چیز کو ساری عمر اپنے لئے حرام سمجھتا چلا آ رہا تھا اس کی طرف اس کی فوراً رغبت نہیں ہو سکتی ؛ اس حد تک تو ٹھیک ہے ۔ جب تک اس کا جی نہ چاہتے وہ نہ کھائے ۔ اُسے اس کی طبیعت کے خلاف اس پر مجبور نہیں کیا جائے گا ۔ لیکن اگر اس کا یہ ردِّ عمل اس لئے ہو کہ وہ اسے ابھی تک حرام سمجھتا ہے تو یہ ٹھیک نہیں ۔ جب وہ قرآن پر ایمان لے آیا ہے تو اس کا حلت و حرمت کا معیار بدل جائے گا اور اسے ہر اس چیز کو حلال سمجھنا ہوگا جسے قرآن نے حلال قرار دیا ہے ۔ اگر وہ ان میں سے بعض چیزوں کو بدستور حرام سمجھتا ہے تو یہ ایمان بالقرآن کے خلاف ہے ۔ کسی چیز کے "غیر طیّب" (نامرغوب) ہونے کی وجہ سے، اسے نہ کھانا اور بات ہے اور اسے حرام سمجھنا اور بات ۔ اور اس کی وضاحت اگلی آیت میں نہایت بلیغ انداز سے کر دی جب فرمایا کہ :-

۶/۱۲۱ وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ ○

پھر، اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھ رکھو کہ جن باتوں سے روکا جائے اُن سے محض رسمی طور پر مت رُکو، بلکہ اُس ممانعت کی اصل و روح کو بھی پیشِ نظر رکھو ۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو یہ سمجھتے ہیں کہ احکام کی صرف ظاہری پیروی ہی مقصود ہے، ان کی غرض و غایت سے کچھ واسطہ نہیں ۔

ظواہر اور غائب دونوں کو ملحوظ رکھو

اور نہ ہی ان میں سے جو یہ کہتے ہیں کہ احکام کے صرف باطنی مفہوم کا اتباع مقصود ہے، ظواہر کی کوئی حیثیت نہیں یہ دونوں غلطی پر ہیں ۔ جن باتوں کو ناجائز قرار دیا گیا ہے —— اس لئے کہ ان سے تمہاری ذات میں اضمحلال واقع ہوتا ہے —— اُن کے ظاہر و باطن دونوں سے بچنا ضروری ہے تاکہ تمہارے فکر اور عمل میں پاکیزگی اور پختگی پیدا ہو ۔ جو لوگ اس کی خلاف ورزی کریں گے ،

اس کا نتیجہ انہیں بھگتنا پڑے گا۔

ظاہر الاثم اور باطنہ کے معنی

"ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ" لفظ تو دو ہیں لیکن ان میں قرآن نے دونوں جہانوں کے حقائق سمیٹ کر رکھ دیئے ہیں۔ مثلاً

۱۔ بکرا حلال جانور ہے۔ اسے ذبح بھی اللہ کا نام لے کر کیا گیا ہے۔ اس کے حلال ہونے کی شرائط پوری ہو گئی ہیں۔ لیکن اگر وہ چوری کا بکرا ہے تو وہ رزق حلال نہیں۔ حرام ہے۔ اوّل الذکر شرائط کا تعلق ظواہر سے ہے۔ آخری شرط کا تعلق باطن سے ہے۔ قرآن کے مطابق عمل اس وقت سمجھا جائے گا جب ظاہر و باطن دونوں شرائط پوری ہوں گی۔ غور کیجئے کہ ان شرائط کی رُو سے ہمارے معاشرہ کا کس قدر رزق حلال ہوتا ہے اور کس قدر (حلال نظر آنے کے باوجود) حرام۔ (انڈکس میں رزق۔ حرام۔ طیّب کے عنوانات دیکھئے)۔ ناجائز طریق سے حاصل کئے ہوئے پیسے کا خریدا ہوا رزق، ظاہراً ہزار حلال ہو فی الحقیقت حرام ہی ہے۔

۲۔ خریدا ہوا بکرا ہے۔ ذبح کرتے وقت نام بھی اللہ کا لیا گیا ہے۔ لیکن اس کا گوشت کسی پیر کی نیاز کے طور پر کھایا جا رہا ہے۔ یہ بھی ظاہر کا حلال اور باطن کا حرام ہے کیونکہ قرآن کریم نے ہر اس چیز کو حرام قرار دیا ہے جو غیر اللہ کی طرف منسوب ہو۔ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ (۵/۳)۔

۳۔ قرآن کے احکام و شعائر رسماً یا میکانکی طور پر ادا کئے جائیں تو انسان کی ذات (سیرت و کردار) اس سے متاثر نہیں ہو گی۔ یا یوں کہئے کہ ان کی صداقت کا احساس دل کی گہرائیوں سے نہیں اُبھرتا۔ تو یہ بھی اثم باطن کے ذیل میں آجائے گا۔

اہل طریقت کا غلط مسلک

اور آگے بڑھیئے تو بات اور بھی اہم سامنے آتی ہے۔ ہمارے ہاں ارباب طریقت (اہل تصوّف) میں سے اکثر کا یہ عقیدہ اور مسلک ہے کہ ظاہر احکام شریعت کی پابندی لازمی نہیں۔ انسان کو دل سے ان احکام کا پابند ہونا چاہیئے۔ یہ ظاہر الاثم ہے۔ اسلام تو نظامِ زندگی ہے اور نظام میں مقصد اور اس کے اصول کے عملی طور طریق دونوں ضروری ہوتے ہیں۔ اس لئے ظاہر شریعت سے بے اعتنائی برت کر دعویٰ یہ کرنا کہ "مقربین" کا اتباع کر رہے ہیں، منشائے قرآن کے خلاف ہے۔

اس کے برعکس ہمارے ہاں فرقہ ظاہریہ کے معتقدین بھی ہیں جو مقاصد اور معانی کو کچھ اہمیت نہیں دیتے۔ احکام شریعت کی پیروی ظاہری شکل میں کافی سمجھتے ہیں۔

یہ دونوں مسالک قرآن کے منشاء کے خلاف ہیں۔ قرآن کریم کی رُو سے، مقصد، اور اس کے حصول کے طور طریق۔

الفاظ اور ان کے معانی ۔ عمل اور اس کی غایت ۔ کتاب اور اس کی حکمت لازم و ملزوم ہیں ۔ اسی حقیقت کو دو لفظوں میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ اسلام میں دین اور دنیا یا دنیا اور آخرت کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا ہے ۔ (دیکھئے عنوانات دنیا ۔ دین ۔ ظواہر) ۔

ظواہر و باطن کے اسی امتیاز کو سامنے لا کر قرآن، انسانی فکر کو بہت بلند مقام کی طرف لے گیا ہے ۔ اس نے کہا کہ تمہاری نگاہوں میں موت اور حیات کا محض طبعی تصور ہے تمہارے نزدیک سانس کی آمد و رفت کا نام زندگی ہے اور اس سلسلہ کے ختم ہو جانے کا نام موت ہے ۔ لیکن قرآنی نقطۂ نگاہ سے موت اور زندگی کا ایک تصور اس سے الگ اور بلند ہے ۔ فرمایا:

۶/۱۲۲ اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِى النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِى الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

موت اور حیات کا قرآنی تصور

"تم اپنی اور ان کی حالت کا موازنہ یوں کرو کہ، ایک شخص مردہ ہو ۔ اسے از سرِ نو زندگی عطا ہو جائے، اسکے بعد اسے ایسی نورانی قندیل دیدی جائے جس سے وہ خود بھی روشنی میں چلے اور دوسروں کو بھی صحیح راستے پر چلائے ۔ اس کے برعکس، دوسرا شخص ہے جو سخت تاریکیوں میں گھرا ہوا ہے اور ان سے نکلنا نہیں چاہتا ۔ کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کبھی نہیں ——— یہی حالت ان، صداقت سے انکار کرنے والوں، کی ہے ۔ انہیں چمگادڑ کی طرح اندھیرا بہت اچھا لگتا ہے اور روشنی آنکھوں میں کھٹکتی ہے ۔ اس لئے یہ، وحیِ خداوندی کے بجائے اپنے خود ساختہ معتقدات و رسومات میں خوش رہتے ہیں ۔

موت اور حیات کے معنوی مفہوم کے لئے انڈکس میں عنوان "موت" دیکھئے ۔ ان مقامات میں اس نکتہ پر سیر حاصل بحث ہو چکی ہے ۔ لیکن اس مقصد کے پیشِ نظر کہ قرآنی نظام ان لوگوں کے ہاتھوں قائم ہو سکے گا ۔ نیز جلد چہارم میں زیرِ آیت (۳/۴) جہاں بتایا گیا ہے کہ خدائے زندہ کا پیغام حیات آور انہی افراد و اقوام کے لئے منفعت بخش ہو سکتا ہے جو زندہ ہوں یا جن میں زندہ ہونے اور زندہ رہنے کی صلاحیت اور تڑپ ہو ۔ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (۳۶/۷۰) انہی کے ہاتھوں یہ نظام قائم ہو گا (دیکھئے انڈکس جلد چہارم) ۔

اس دعوت اور نظام کی مخالفت کرنے والوں کے متعلق کہا:

۱۲۴/۶ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ۭ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝

یہ ہے وہ نفسیاتی کیفیت جس کی بنا پر ہمیشہ یہی ہوتا رہا کہ جہاں کسی نے خدا کے عالمگیر نظامِ ربوبیت کی دعوت دی، وہاں کے اکابر مجرمین نے اس دعوت کی مخالفت کے لئے منصوبے باندھنے شروع کر دیئے۔ اگر وہ ذرا بھی عقل و شعور سے کام لیتے تو ان پر یہ حقیقت کھل جاتی کہ ان کی اس منصوبہ بندی میں خود ان کا اپنا نقصان تھا۔ اس لئے کہ نظامِ خداوندی کا قیام ان کی بہتری کے لئے تھا۔ (اگر کسی گاؤں کے لوگ اپنے ہاں ہسپتال بنانے کی مخالفت کریں تو یہ مخالفت خود ان کے اپنے مفاد کے خلاف ہوگی)۔

اکابر مجرمین کی طرف سے مخالفت

قرآن کریم، سلب و نہب اور ظلم و استبداد پر مبنی نظام کے ارباب حل و عقد کو "اکابر مجرمین" کہہ کر پکارتا ہے۔ اس کی رُو سے، مجرم تو اس نظام کے تمام افراد ہوتے ہیں، لیکن ان میں سے اکابر مجرمین (اربابِ اقتدار (لیڈر) ہوتے ہیں جب حضرت صالحؑ کو قومِ ثمود کی اصلاح کے لئے مامور کیا گیا تو انہوں نے بحضور رب العزت گذارش کی کہ بارِالہا! وہ قوم اس قدر کثیر التعداد ہے، اور ساری کی ساری بگڑی ہوئی ہے، اس کی اصلاح کس طرح ممکن ہوگی، تو جواب ملا کہ وہ قوم بے شک ساری کی ساری بگڑی ہوئی ہے لیکن وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ۝ (۴۸/۲۷)۔ اس مملکت کے دارالسلطنت میں نو صاحبِ اقتدار ہیں جو سارے فساد کی جڑ ہیں۔ ان کے بگڑنے سے ساری قوم بگڑ رہی ہے۔ ان کی اصلاح ہو جائے تو ساری قوم سنور جائے گی۔

قرآن کی رُو سے، قوموں کے بگاڑ اور اصلاح کے سلسلہ میں ان اربابِ اقتدار اور لیڈروں کی ذمہ داری بنیادی ہوتی ہے۔ یہی ہیں جو کاروان قوم کو (قرآن کے الفاظ میں) اس منڈی میں لا اتارتے ہیں جہاں اس جنس کا سدا کوئی خریدار نہیں ہوتا (۲۸-۲۹/۱۴)۔ لیکن وہ ان متبعین (FOLLOWERS) کو بھی بری الذمہ قرار نہیں دیتا۔ وہ ان سے کہتا ہے کہ تمہیں کس نے کہا تھا کہ تم آنکھیں بند کر کے دُوسروں کے پیچھے چلتے جاؤ۔ تمہیں چاہیئے تھا کہ اپنی عقل و بصیرت سے کام لیتے اور تباہی اور بربادی کے راستے پر ان کے پیچھے نہ ہو لیتے۔ ان لیڈروں اور اربابِ اقتدار کی اپنی قوت کچھ نہیں تھی۔ تم ان کی تقویت کا سامان بنے تو انہوں نے اس قدر تباہیاں مچا دیں۔ تم پر یہ حکومت بھی اسی لئے کرتے رہے تھے کہ تم ان کے سامنے جھکے رہے۔ اگر تم اُٹھ کھڑے ہوتے تو یہ

خود ہی بے دست و پا ہو جاتے۔

این خدا نا سجدۂ اش کردی خداست چوں یکے اندر قیام آئی فناست

لہٰذا یہ اور تم دونوں جہنم کے عذاب کے مستحق ہو۔ جب کسی قوم پر تباہی آتی ہے تو اس میں عوام اور خواص سب ماخوذ ہو جاتے ہیں۔ (۸/۲۵)۔

اس حقیقت کو قرآن نے اپنے مخصوص تمثیلی انداز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ عوام اور ان کے لیڈر، مذہبی پیشوا اور ارباب اقتدار، سب جہنم کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ اور وہاں ایک دوسرے کو طعن و تشنیع بنا رہے ہیں۔ تفصیل اس کی مطالب الفرقان جلد چہارم۔ زیر آیت (۷/۵) ص ۵۴۹ گزر چکی ہے۔ (دیکھئے انڈکس جلد چہارم)۔

یوں قرآن کریم عوام اور ان کے لیڈروں۔ مذہبی پیشواؤں اور حکام کو یکساں تباہی کا ذمہ وار قرار دیتا ہے۔

بات منکرین کی ہو رہی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ ان اکابر مجرمین کی انانیت اور تکبر کا یہ عالم ہے کہ جب انہیں وحیٔ خداوندی کے اتباع کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ:

۶/۱۲۵ وَإِذَا جَآءَتْهُمْ ءَايَةٌ قَالُوا۟ لَن نُّؤْمِنَ حَتَّىٰ نُؤْتَىٰ مِثْلَ مَآ أُوتِىَ رُسُلُ ٱللَّهِ ۘ ٱللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُۥ ۗ سَيُصِيبُ ٱلَّذِينَ أَجْرَمُوا۟ صَغَارٌ عِندَ ٱللَّهِ وَعَذَابٌ شَدِيدٌۢ بِمَا كَانُوا۟ يَمْكُرُونَ ۝

پھر، ان کی کیفیت یہ ہے کہ جب ان کی طرف ہماری کوئی وحی آتی ہے تو یہ کہتے ہیں کہ ہم تو اس پر صرف اس صورت میں ایمان لائیں گے کہ، جس طرح رسولوں پر وحی نازل ہوتی ہے، اسی طرح ہم پر بھی براہِ راست وحی نازل ہو۔ (ان سے کہدو کہ خارجی دنیا میں تو خدا کا قانون یہی ہے کہ وہ ہر نوع کے ہر فرد کو براہِ راست وہ راہنمائی دے دیتا ہے جس کے مطابق اس نے زندگی بسر کرنی ہوتی ہے، لیکن انسانی دنیا میں اس کا یہ پروگرام نہیں۔ یہاں پر قاعدہ ہے کہ ایک منتخب فرد کو وحی دی جاتی ہے اور وہ اس وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ (۴۲/۵۱)۔ اور یہ بات ان کی مرضی پر چھوڑتا ہے کہ وہ چاہے اسے تسلیم کریں اور چاہے اس سے انکار کر دیں۔ اگر ہر فرد کو براہِ راست وحی دی جائے، تو اشیائے کائنات کی طرح، انسان بھی اس کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جائے اور عقل و فکر کو کام میں لا کر صحیح فیصلہ کرنے کا سوال باقی نہ رہے، حالانکہ یہی چیز باعث

شرف انسانیت ہے)
اس مقصد کے لئے خدا خوب جانتا ہے کہ وہ کون سا فرد ہے جسے اس بلند منصب (یعنی وحی دیئے جانے) کیلئے منتخب کرنا چاہیئے (۳/۱۲۸)

لیکن یہ سب انکی کٹ حجتیاں ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ناجائز کمائی کا لہو کچھ اس طرح ان کے منہ کو لگ گیا ہے کہ یہ اسے چھوڑنا چاہتے ہی نہیں۔ ان سے کہدو کہ تم جو جی میں آئے کر دیکھو، تمہیں ایک دن، اس نظام کے آگے جھکنا پڑے گا، اور اس وقت تمہیں ان سازشوں کی سخت سزا ملے گی۔

سابقہ جلدوں میں وحی، نبوت، رسالت کے متعلق تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ انڈکس میں متعلقہ عنوانات دیکھیئے۔ جہاں سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ وحی میں کسی کے کسب و ہنر کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ یہ خالصۃً وہبی علم تھا جسے اللہ تعالیٰ اس برگزیدہ ہستی کو عطا کر دیتا تھا۔ جسے اس مقصد کے لئے منتخب کیا جاتا تھا۔

(ضمناً) قرآن کریم نے ان مجرمین کے اس قسم کے مطالبہ کو "مکر" کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی وہ اس قسم کا مطالبہ سنجیدگی سے نہیں کرتے تھے۔ یہ محض کٹ حجتیاں اور اپنے جرائم کی پردہ پوشی کی فریب کارانہ تدبیریں ہوتی تھیں۔

۶/۱۲۶ فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ؕ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

(اسی قسم کی دونوں جماعتیں شروع سے چلی آ رہی ہیں —— یعنی ماننے والوں کی، اور مخالفت کرنے والوں کی —— اور یہ کچھ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے)۔ وہ قانون یہ ہے کہ جو شخص تعصب اور کم ظرفی کو چھوڑ کر، اپنی نگاہوں میں اتنی وسعت اور سینے میں اتنی کشاد پیدا کر لے کہ اسلام کے حقائق پر کھلے دل سے غور و فکر کر سکے، اس پر صحیح راستہ واضح ہو جاتا ہے۔ لیکن جو شخص تعصب اور تنگ نظری سے کام لے، اس پر یہ راہ واضح نہیں ہوتی۔ تعصب سے اس کا سینہ اس قدر تنگ ہو جاتا ہے کہ حق کو قبول کرنا اس کے نزدیک بڑی سخت گھاٹی پر چڑھنے کے مرادف ہو جاتا ہے، جہاں قدم قدم پر اس کی سانس پھول جائے (۹۰/۱۲-۱۱)۔

سینے کی کشاد

جو لوگ عقل و فکر سے کام نہ لیں اور یوں ہی وحی کی صداقت سے انکار کئے جائیں، (۶/۴) ان پر بات واضح

نہیں ہوسکتی۔ اُن کے لئے معاملہ ہمیشہ مشتبہ رہتا ہے (۱۰/۱۰۰)۔
کہا کہ اس قسم کی کٹ حجتیوں اور فریب کارانہ سازشوں کا نتیجہ رجس ہوتا ہے۔ رجس کے معنی ہوتے ہیں، معاملہ کا یکسو اور صاف نہ ہونا۔ اس میں شک، تردد، التباس پیدا ہوجانا۔ اور اس کی وجہ سے اضطراب لاحق ہوجانا۔ سورہ یونس میں ہے۔ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ (۱۰/۱۰۰) جو لوگ عقل وفکر سے کام نہیں لیتے ان پر معاملات مشتبہ رہتے ہیں۔ شدید ترین۔ رجس منافقت کو کہا گیا ہے (۹/۹۵) مومنین کی کیفیت ان کے برعکس ہوتی ہے (۹/۱۲۵-۱۲۴)۔
ان کے برعکس صاف۔ سیدھی۔ واضح راہ، وحی کی عطا کردہ ہے۔

۶/۱۲۷-۱۲۸ وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيمًا ۗ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ۝ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

ان کے برعکس، جو لوگ عقل وفکر سے کام لے کر وحی کی صداقت پر ایمان لے آتے ہیں، وہ، تیرے نشوونما دینے والے کی طرف سے متعین کردہ، سیدھی اور متوازن راہ پر چلتے ہیں۔
دیکھو! ہم اپنے قوانین وحقائق کو، اُن لوگوں کے لئے جو انہیں پیشِ نظر رکھنا چاہیں، کس قدر واضح طور پر بیان کر دیتے ہیں۔
یہ وہ لوگ ہیں جن کے حسنِ عمل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں، ان کے نشوونما دینے والے کی طرف سے، ہر طرح کی سلامتی نصیب ہوتی ہے، اور قانونِ خداوندی کی کارسازی اور رفاقت انہیں میسر آجاتی ہے۔
اس جماعت کا مقصد نظامِ خداوندی کا قائم کرنا ہوتا ہے۔

۶/۱۲۹ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَقَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ۗ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۗ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝

جب وہ نظام قائم ہوگا تو ان مخالفین کی تمام پارٹیاں اکٹھی کی جائیں گی۔ شہری لوگ جو اسکیمیں بنایا کرتے تھے، اور بدوی، جو ان سکیموں کو کامیاب بنانے کے لئے ان کے دست و بازو بنا کرتے تھے ——

ان بدوی لوگوں سے کہا جائے گا کہ تم نے ان شہری پارٹیوں سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔ اور ان پارٹیوں کے سرغنے اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہوں گے کہ ہم اس دعوت کی مخالفت میں ایک دوسرے کو استعمال کیا کرتے تھے تا آنکہ وہ وقت آپہنچا جو ہمارے اعمال کے ظہورِ نتائج کے لئے مقرر تھا۔ (اور آج ہم اس طرح بندھے کھڑے ہیں)۔ ان سے کہا جائے گا کہ تمہارا ٹھکانہ تباہیوں کا وہ جہنم ہے جس میں تمہیں ہمیشہ رہنا ہوگا۔ اس میں تبدیلی خدا ہی کے قانون کے مطابق ہو سکتی ہے۔ اور ایسا ہوگا نہیں[1]۔ وہ قانون یکسر علم و حکمت پر مبنی ہے۔

"جن و انس" کا قرآنی مفہوم سابقہ صفحات (زیر آیت ۶/۱۱۳) آچکا ہے۔ ظہورِ اسلام کے زمانے میں جب یہ نظام قائم ہوا ہے تو اس کی مخالفت کے لئے قریش وغیرہ شہری لوگ اور بدوی قبائل سب متحد ہو گئے تھے لیکن انہیں اس قدر فاش شکستیں ہوئیں کہ یہ اٹھنے کے قابل نہ رہے اور ذلت اور پستی کے عذاب میں مبتلا ہو گئے یہ ان کے ساتھ اس دنیا میں ہوا۔ اور اُخروی عذاب اس سے بھی شدید ہوگا۔

یہی تھا اسلامی نظام کے خلاف ان پارٹیوں کا متحدہ محاذ جس کے متعلق فرمایا:

۶/۱۳۰ وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝

اس طرح ہم، سرکش لوگوں کی مختلف پارٹیوں کو، اُن کے مشترکہ جُرم کی بنا پر، ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیا کرتے ہیں۔ اور یوں وہ اپنے کئے کی سزا بھگتنے کے لئے ایک ہی بن جاتے ہیں۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ یہ سنت اللہ (خدا کی غیر متبدل روش) ہے کہ:

۱۔ کسی قوم کو تباہ نہیں کیا جاتا جب تک اسے پہلے متنبہ نہ کر دیا جائے کہ ان کی غلط روش کا نتیجہ کیا ہوگا۔

۲۔ ان میں غلط اور صحیح کے سمجھنے کی صلاحیت نہ پیدا ہو چکی ہو۔ (دیکھئے آیات ۴/۱۶۵ ؛ ۵/۱۹ ۔ مطالب الفرقان جلد چہارم)۔

اسی سنت اللہ کے مطابق فرمایا:

۶/۱۳۱-۳۲ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ

---

[1] قرآنی اسلوب یہ ہے کہ جہاں اِلَّا کے بعد مَا شَآءَ اللّٰهُ وغیرہ آئے، جس سے مقصود مشیتِ خداوندی ہوتی ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ پہلے کہا گیا ہے اُس کے خلاف کبھی نہیں ہوگا۔ ملاحظہ ہو لغات القرآن ۔ جلد چہارم ۔ صفحہ ۱۶۱۸ عنوان (ن۔ س۔ ی)

اَبْتِیْ یُنْذِرُوْنَکُمْ لِقَآءَ یَوْمِکُمْ ھٰذَا ؕ قَالُوْا شَہِدْنَا عَلٰٓی اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْہُمُ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا وَشَہِدُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ اَنَّہُمْ کَانُوْا کٰفِرِیْنَ ۝ ذٰلِکَ اَنْ لَّمْ یَکُنْ رَّبُّکَ مُہْلِکَ الْقُرٰی بِظُلْمٍ وَّ اَہْلُہَا غٰفِلُوْنَ ۝

ہم اُس دن دونوں گروہوں ــــــ بدویوں اور شہریوں ــــــ سے پوچھیں گے کہ کیا تمہاری طرف ہمارے پیغمبر نہیں آئے تھے جو تمہارے اپنے ہی بھائی بند تھے۔ کوئی غیر نہیں تھے۔ وہ تمہارے سامنے ہمارے قوانین پیش کرتے تھے اور تمہیں آگاہ کیا کرتے تھے کہ ایک دن تمہارے اعمال کے نتائج تمہارے سامنے آکر رہیں گے (۳۹/۷۱)۔ اس پر وہ اقرار کرینگے کہ یہ ٹھیک ہے۔ اس کے لئے کسی خارجی شہادت کی بھی ضرورت نہیں، ہم خود اپنے خلاف شہادت دیتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ صداقت تو ان لوگوں کے سامنے آجاتی ہے اور اسے پہچاننے میں بھی کوئی دقت نہیں ہوتی۔ لیکن طبیعی زندگی کے پیش پا افتادہ مفاد کی چمک دمک نگاہوں میں خیرگی پیدا کر دیتی ہے اور وہ اس کے فریب میں آجاتے ہیں۔ لیکن جب ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج ان کے سامنے آتے ہیں تو اس وقت ان کی آنکھیں کھلتی ہیں اور وہ اپنے خلاف آپ شہادت دیتے ہیں کہ اُنہوں نے حق و صداقت کا انکار کرکے واقعی جُرم کیا تھا۔ (۶/۳۱)۔

تباہی کی دو شرائط (یہ سب کچھ اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ یہ بتا دیا جائے کہ) تیرا رب یہ نہیں کرتا کہ کسی قوم کو اس کا تو علم ہی نہ دیا جائے کہ وہ کون سے قوانین ہیں جن کے انکار سے تباہی آتی ہے، اور نا ہیں، اس جُرم کی پاداش میں تباہ کر دیا جائے کہ تم نے اِن قوانین سے انکار کیوں کیا تھا! ایسا کرنا بڑی زیادتی ہے۔ اور خدا کسی پر زیادتی نہیں کیا کرتا۔

ان قوموں کی تباہیاں اور جماعتِ مومنین کی کامرانیاں اور خوش حالیاں یونہی اتفاقیہ واقع نہیں ہو جاتیں۔ یہ سب ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

۶/۱۳۳ وَلِکُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ؕ وَمَا رَبُّکَ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ ۝

ہمارے قانون کی رُو سے، سزا اور جزا عمل کے مطابق ملتی ہے، اور عمل ہی کے مطابق ہر ایک کا درجہ متعیّن ہوتا ہے۔ اس کے لئے ہم نے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ کسی کا کوئی عمل، ہمارے قانونِ مکافات کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہنے پائے۔

مدارج مطابق اعمال

یہاں ایک نکتہ بھی سامنے آتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ ہر انسان محض انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہے (۱۷/۷۰)۔ اس کی یہ تکریم اور شرف، عطیۂ خداوندی ہوتا ہے۔ اس کے بعد معاشرہ میں اور میزانِ خداوندی میں اُن کے مدارج کا تعین اُن کے اعمال کے مطابق ہوتا ہے اور انہی اعمال اور مدارج کی رُو سے قوموں کے مستقبل کا فیصلہ ہوتا ہے۔

۶/۱۳۴ وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۚ إِن يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِن بَعْدِكُم مَّا يَشَاءُ كَمَا أَنشَأَكُم مِّن ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ آخَرِينَ ۝

ان سے کہدو کہ خدا کا نظام کسی خاص قوم کا محتاج نہیں کہ وہ اسی کے ہاتھوں قائم ہوگا، کسی اور کے ہاتھوں قائم نہیں ہوسکے گا۔ وہ اپنی مہربانی سے ہر قوم کو نشوونما حاصل کرنے کے مواقع بہم پہنچاتا ہے۔ اسی طرح اُس نے تمہیں بھی مواقع بہم پہنچائے ہیں۔ اگر تم اس کے قانون کے مطابق، ان مواقع سے فائدہ نہ

استبدال و استخلاف قومی

اٹھاؤ گے اور اپنے اندر زندہ رہنے کی صلاحیت پیدا نہیں کرو گے، تو وہ تمہیں زندہ قوموں کی صف سے نکال دے گا اور تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے لیگی جسطرح اُس نے تمہیں (بنی اسرائیل کی تباہی کے بعد) ایک دوسری قوم (بنی اسماعیل) کی نسل سے اُٹھ کھڑا کیا ہے۔ (یہ ہے ہمارا قانونِ استخلاف و استبدالِ اقوام)

(۲۱/۱۱-۱۵) ؛ (۹/۳۸-۳۹) ؛ (۴۷/۳۸) ؛ (۷۰/۴۱-۴۲) ؛ (۵/۵۴)

قوموں کے استبدال و استخلاف اور اُن کے عروج و زوال سے متعلق قانون کے لئے انڈکس دیکھیئے۔ اور اسکے بعد کہا کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے، وہ خالی دھمکی نہیں۔ یہ خدا کا قانون ہے جس کا نتیجہ تمہارے سامنے آکر رہے گا۔

۶/۱۳۵ إِنَّ مَا تُوعَدُونَ لَآتٍ ۖ وَمَا أَنتُم بِمُعْجِزِينَ ۝

(اسے بگوشِ ہوش سُن لو کہ ہماری یہ تنذیر خالی دھمکی نہیں)۔ جو کچھ تم سے کہا جاتا ہے، وہ ہو کر رہے گا۔ تم ہمیں ایسا کرنے سے باز نہیں رکھ سکتے۔ تم ہمیں بے بس نہیں کر سکتے۔

یہ ہوگا کیسے؟ اس کے لئے صاف اور واضح پروگرام بتا دیا:

۶/۱۳۶ قُلْ يَا قَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ مَن تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۗ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ۝

ان سے کہدو کہ (اس باب میں کسی بحث تمحیص، یا جھگڑے جھمیلے کی ضرورت نہیں)۔ تم اپنے پروگرام

کے مطابق کام کرتے جاؤ۔ میں اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتا ہوں۔ اس کے بعد نتائج خود بتا دیں گے ـــــ اور بہت جلد بتا دیں گے ـــــ کہ آخر الامر دنیا میں کامیابی کسے ہوتی ہے۔ اس لئے کہ یہ خدا کا اٹل قانون ہے کہ جو قوم انسانیت کے حقوق میں کمی کرتی ہے، اس کی کھیتی کبھی بار آور نہیں ہو سکتی۔ ظالم کبھی پنپ نہیں سکتا۔

دعاوی کے سچّے اور جھوٹے ہونے کا معیار ـــ نتائج

تم کہتے ہو کہ جس روش پر تم چل رہے ہو اس کا نتیجہ کامرانیاں اور فتح مندیاں ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ تمہاری روش کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔ فلاح و بہبود اس روش کا نتیجہ ہوگا جس کی طرف ہم دعوت دیتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ دونوں طرف سے یہ نظری دعویٰ ہے۔ یہ کیسے معلوم ہو کہ کس کا دعویٰ سچّا ہے۔ کہا کہ یہ کچھ مشکل نہیں۔ تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کئے جاؤ۔ ہم اس میں مداخلت نہیں کریں گے۔ ہم اپنے پروگرام پر عمل کرتے ہیں تم اس میں دخل نہ دینا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد نظر آجائے گا کہ کس کا دعویٰ سچّا ہے اور کس کا جھوٹا۔ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ ظالم کی کھیتی کبھی پنپ نہیں سکتی۔ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے کہ ظلم کا یہ انجام کس طرح سامنے آجاتا ہے۔

آپ غور کیجئے کہ قرآن نے دعوے کی صداقت کے پرکھنے کا کس قدر عظیم اصول پیش کیا ہے؟ "مذہب" میں ہر عمل کے نتیجہ کو "قیامت" پر اٹھا رکھا جاتا ہے۔ دین میں دعوے کا (PRAGMATIC TEST) ہوتا ہے۔ یعنی وہ دعاوی کے سچّے اور جھوٹے ہونے کا معیار عملی نتائج قرار دیتا ہے۔ مذہب میں اپنے اپنے دعاوی کے ثبوت کے لئے مناظرے اور مباحثے کئے جاتے ہیں۔ اور مباحثوں اور مناظروں سے کبھی فیصلہ کن حقیقت سامنے نہیں آتی۔ دین ایک نظام قائم کرتا ہے اور اس کے محسوس نتائج جو اسی دنیا میں سامنے آجاتے ہیں، اس کے دعوے کی صداقت کا ثبوت بن جاتے ہیں جن کے جھٹلانے کی کسی کو جرأت نہیں ہو سکتی۔

ہم دن رات، چلّا چلّا کر، اعلان کرتے رہتے ہیں کہ دنیا میں اسلام ہی سچّا مذہب ہے۔ لیکن اس کا کوئی عملی ثبوت ہم پیش نہیں کر سکتے۔ نتیجہ یہ کہ ہمارے دن رات کے دعاوی اور تبلیغی مشنوں کے باوجود، دنیا اس کی طرف رُخ نہیں کرتی۔ اگر ہم کسی ایک خطۂ زمین میں قرآنی نظام قائم کر دیں تو اس کے زندہ اور درخشندہ نتائج کو دیکھ کر دنیا فوج در فوج اس کی طرف آجائے۔

قرآن کریم نے اس چیلنج کو متعدد مقامات میں دہرایا ہے (مثلاً) زیر نظر آیت کے علاوہ (۱۱/۹۳؛ ۱۱/۱۲۱؛ ۳۹/۳۹)
اسی سلسلہ میں انڈکس میں عنوان "مکافاتِ عمل" اور قانونِ مکافاتِ عمل بھی دیکھئے۔ مطالب الفرقان۔ جلد دوم۔

صفحات ۹۴ - ۱۴۸) پر زیر نظر آیت کی تشریح بھی دی گئی ہے۔ قرآن کا یہ دعویٰ بڑا عظیم ہے اور جس اعتماد کے ساتھ اسے پیش کیا گیا ہے، وہ بہت بڑا چیلنج ہے۔ لیکن اس کے لئے مومنین کی جماعت کی ضرورت ہے جو اسے دنیا کے سامنے پیش کرے۔ ہم تو ان آیات کو بھی اس "ثواب" کی خاطر پڑھ لیتے ہیں جو آخرت میں جا کر ملے گا۔

صدرِ اوّل کی جماعتِ مومنین نے مخالفین کے سامنے یہ دعویٰ پیش کیا اور پھر اس کے عملی نتائج سے، جو چند سالوں کے عرصہ میں محسوس شکل میں دنیا کے سامنے آگئے تھے، اُس کا ثبوت بہم پہنچا دیا۔ مخالفین میں اس چیلنج کے قبول کرنے کی جرأت نہ پیدا ہوئی۔ اس کی وجہ کیا تھی، اسے قرآن اگلی آیات میں بتاتا ہے۔ ان آیات کو یکجا درج کر دیا جاتا ہے۔

۶ / ۱۳۷-۱۴۱
وَجَعَلُوا لِلَّهِ مِمَّا ذَرَأَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْأَنْعَامِ نَصِيبًا فَقَالُوا هَٰذَا
لِلَّهِ بِزَعْمِهِمْ وَهَٰذَا لِشُرَكَائِنَا ۖ فَمَا كَانَ لِشُرَكَائِهِمْ فَلَا
يَصِلُ إِلَى اللَّهِ ۖ وَمَا كَانَ لِلَّهِ فَهُوَ يَصِلُ إِلَىٰ شُرَكَائِهِمْ ۗ سَاءَ مَا
يَحْكُمُونَ ۝ وَكَذَٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِنَ الْمُشْرِكِينَ قَتْلَ أَوْلَادِهِمْ
شُرَكَاؤُهُمْ لِيُرْدُوهُمْ وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ ۖ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ
مَا فَعَلُوهُ ۖ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ ۝ وَقَالُوا هَٰذِهِ أَنْعَامٌ وَحَرْثٌ
حِجْرٌ لَا يَطْعَمُهَا إِلَّا مَنْ نَشَاءُ بِزَعْمِهِمْ وَأَنْعَامٌ حُرِّمَتْ
ظُهُورُهَا وَأَنْعَامٌ لَا يَذْكُرُونَ اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا افْتِرَاءً عَلَيْهِ ۚ
سَيَجْزِيهِمْ بِمَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۝ وَقَالُوا مَا فِي بُطُونِ هَٰذِهِ
الْأَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِذُكُورِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلَىٰ أَزْوَاجِنَا ۖ وَإِنْ يَكُنْ
مَيْتَةً فَهُمْ فِيهِ شُرَكَاءُ ۚ سَيَجْزِيهِمْ وَصْفَهُمْ ۚ إِنَّهُ حَكِيمٌ
عَلِيمٌ ۝ قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ قَتَلُوا أَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ
عِلْمٍ وَحَرَّمُوا مَا رَزَقَهُمُ اللَّهُ افْتِرَاءً عَلَى اللَّهِ ۚ قَدْ ضَلُّوا
وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ۝

اور لوگ بھلا تمہارے مقابلے میں کیسے کامیاب ہو سکتے ہیں، جن کی جہالت کا ابھی تک یہ عالم ہے کہ اُنہوں

نے عجیب و غریب قسم کے عقائد و رسومات وضع کر رکھے ہیں جو یکسر توہم پرستی پر مبنی ہیں۔ (مثلاً) یہ لوگ اس فصل میں سے، اور ان مویشیوں میں سے، جو خود خدا کے پیدا کردہ ہیں، ایک حصہ الگ کر لیتے ہیں اور، بزعم خویش، کہتے ہیں کہ یہ حصہ خدا کا ہے۔ اسی طرح ایک اور حصہ الگ کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے (خدا کے) شریکوں کا ہے۔ جو حصہ اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لئے مختص کرتے ہیں اسے ان کے

توہم پرستیاں

پیر پروہت لے جاتے ہیں۔ اس میں سے اللہ تعالیٰ کو کچھ نہیں پہنچتا۔ (یعنی خدا کے مستحق بندوں کو کچھ نہیں ملتا)۔ اور جو اللہ کے لئے نکالتے ہیں، وہ بھی ان کے پیر پروہت یہ کہہ کر لے جاتے ہیں کہ ہم اسے اللہ تک پہنچا دیں گے۔ اس طرح نام تو اللہ کا لیتے ہیں اور لے جاتے ہیں ان کے وہ پروہت جو معبودان باطل کے نمائندے بنتے ہیں۔

پیر اور پروہت

ذرا سوچئے کہ انکے یہ عقائد کس قدر بُرے ہیں؟ (۶/۱۳۶) یہیں تک بس نہیں۔ انکی توہم پرستی اور جہالت کا یہ عالم ہے کہ جنہیں یہ خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں، انکے متعلق ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اگر ہم انکے حضور اپنی اولاد قربان کریں تو یہ بڑی نیکی کا کام ہے۔ (یہ سب انکے مذہبی پیشواؤں کی کارستانیاں ہیں جو اس قسم کی توہم پرستیوں کو دین خداوندی کا نقاب

قتل اولاد

اوڑھا کر پیش کرتے ہیں، اور سادہ لوح عقیدتمندوں کے ہاتھوں) ان کی اولاد جیسی عزیز شے کو ہلاک کرا دیتے ہیں۔

(ہم جانتے ہیں کہ اس قسم کی باتوں کو دیکھ کر تمہارا جی بہت کڑھتا ہے اور تم چاہتے ہو کہ یہ اس قسم کے عقائد کو چھوڑ کر دین حقہ اختیار کر لیں۔ لیکن، جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، یہ کچھ افہام و تفہیم کے ذریعے کرنا ہوگا۔ ورنہ اگر انسان کو مجبوراً سیدھے راستے پر چلانا مقصود ہوتا تو) ان کی کیا مجال تھی کہ اس قسم کی حرکات کرتے (لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ اس لئے تم ان تک ہمارا پیغام پہنچاتے رہو اور اس کے بعد) انہیں، مع ان کے خود تراشیدہ عقائد و مسالک کے ان کے حال پر چھوڑ دو۔ (۶/۱۳۸)

(ان کی جہالت آمیز رسموں کا کیا پوچھتے ہو!) یہ، اپنے مویشیوں اور کھیتیوں سے کچھ حصہ الگ کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسے کوئی نہیں کھا سکتا۔ بجز ان کے جنہیں ہم، اپنے عقیدے کے مطابق، کھلانا چاہیں۔ اس طرح، یہ بعض جانوروں کے متعلق کہہ دیتے ہیں کہ (یہ فلاں پیر کا اونٹ ہے) اس پر کوئی سواری نہیں کر سکتا۔ اسی طرح بعض جانور ہیں جنہیں ذبح کرتے وقت، یہ اللہ کا نام نہیں لیتے (ان کا نام لیتے ہیں جن کے لئے انہیں بطور نذر و نیاز ذبح کیا جاتا ہے)۔

اب عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب ان کے اس قسم کے خود تراشیدہ عقائد و رسومات کے

نتائج ان کے سامنے آجائیں گے۔ اب جہالت اور توہم پرستی کا دور جانے والا ہے۔ (۶/۱۳۹)
اسی طرح ان کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ فلاں جانور کے پیٹ میں جو بچہ ہے اسے صرف مرد کھا سکیں گے عورتوں پر اس کا گوشت حرام ہوگا۔ لیکن اگر وہ بچہ مردہ پیدا ہو تو اس میں مرد اور عورتیں سب شریک ہو سکتے ہیں۔ اب عنقریب انہیں، ان کی ان توہم پرستیوں کی سزا ملے گی (اور خدا کا وہ دین عام ہو جائے گا جو) یکسر علم و حکمت پر مبنی ہے۔ (۶/۱۴۰)

ذرا سوچئے کہ جو لوگ، ایسے باطل عقائد کی بنا پر، محض جہالت اور حماقت سے اپنی اولاد جیسی متاع عزیز کو اپنے ہاتھوں ہلاک کر دیتے ہیں، اور جو کچھ اللہ نے کھانے پینے کو دیا ہے اسے، محض اپنی افترا پردازیوں سے، اپنے اوپر حرام قرار دے لیتے ہیں، اور پھر ان توہمات کو منسوب کرتے ہیں خدا کی طرف۔ تو ایسے لوگ اپنا کس قدر نقصان کرتے ہیں؟

جو لوگ اس طرح جہالت اور توہم پرستیوں کے غلط راستوں پر آنکھیں بند کئے چلتے ہیں، ان پر زندگی کی صحیح راہیں کس طرح کھل سکتی ہیں؟ (ہم نے پہلے کہا ہے کہ یہ لوگ تمہارے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکتے (۶/۱۳۷) اب اس کی وجوہات تمہارے سامنے آگئیں۔ کامیابی کے لئے دو بنیادی شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے دل میں، قوانین خداوندی کے سوا، کسی کا خوف نہ ہو۔ اور دوسرے یہ کہ انسان عقل و فکر سے کام لے۔ جو لوگ پتھر کی مورتیوں، جانوروں اور مویشیوں، اور اپنے جیسے انسان —— پیروں اور پروہتوں —— سے اس درجہ خائف ہوں کہ انہیں خدا بنا لیں، اور جہالت کا وہ عالم ہو جس کا ذکر کیا جا چکا ہے، وہ قوم، اس قوم کا مقابلہ کس طرح کر سکتی ہے جس کا دل، خوف سے خالی اور جس کا دماغ عقل و بصیرت سے منور ہو۔ اسلام، قوموں میں اسی قسم کا انقلاب پیدا کرتا ہے۔)

ان آیات میں عوام کی جہالت کا ذکر تو ہے ہی لیکن آیت (۶/۱۳۷) میں بتایا گیا ہے کہ یہ درحقیقت مذہبی پیشواؤں کی کارستانیاں ہیں جو اپنے (تھوڑے سے) مفاد کی خاطر لوگوں کی جہالت کی گرہوں کو مضبوط سے مضبوط تر کرتے رہتے ہیں۔

مذہبی پیشوائیت

ان آیات کا تعلق زمانہ نزول قرآن کے جہلا، اور ان کے فریب کار مذہبی پیشواؤں سے ہی نہیں۔ ان کا تعلق خود ہم سے بھی ہے۔ ہمارے ہاں مُردوں سے متعلق مذہبی رسومات دیکھئے۔ اسقاط۔ قُل۔ جمعراتیں۔ چالیسویں۔ ان میں کھانے پینے کی چیزیں پھل۔ کپڑے سب مولوی صاحبان لے جاتے ہیں اور کہتے یہ ہیں کہ ان کا ثواب مرحوم کو پہنچے گا۔ یہ تو انفرادی "ایصال ثواب"

ہماری توہم پرستیاں کی تقریبات ہیں۔ اجتماعی طور پر بزرگوں کے مزاروں پر نذر، نیاز۔ ان کے عرس اور آئے دن کی تقریبات پر کروڑوں روپے، انہی پیشواؤں اور متولیوں کے جیب میں چلے جاتے ہیں۔ اور عوام مطمئن ہوتے ہیں کہ سب کچھ اللہ کے نام پر ہوتا ہے اور (مرحوم) "حضرت صاحب" تک پہنچ جاتا ہے جس کے بدلے میں وہ ان کی مرادیں پوری کر دیتے ہیں۔ جو کچھ زمانۂ جاہلیت عرب میں ہوتا تھا اور جس کے خلاف قرآن نے یہ کچھ کہا تھا، وہ سب ہم مسلمانوں کے ہاں ہوتا ہے اور اسے عین اسلام (بلکہ مغز اسلام) کہا جاتا ہے۔

علاوہ اس کے کہ ان توہم پرستانہ رسومات پر اس قدر مال و دولت کا ضیاع ہوتا ہے، اس شرک سے سینے جس قدر خوف سے معمور ہوتے ہیں، اس سے انسانیت تباہ ہو جاتی ہے۔ (اس کی تفصیل کے لئے شرک اور خوف کے عنوانات دیکھئے)۔

آپ کسی وعظ کی مجلس میں جائیے۔ مولوی صاحب جھوم جھوم کر ان آیات کی تلاوت فرما رہے ہونگے اور ان توہم پرستیوں کی مذمت کر رہے ہونگے۔ وہ انہیں زمانہ قبل از اسلام کی جاہلیت سے متعلق تو بتائیں گے، اپنے مخاطب (مسلمانوں) سے کبھی یہ نہیں کہیں گے کہ یہ خود تمہارا ہی بیان ہے اور اس لئے نہیں کہیں گے کہ یہ خود ان کا معاشی مسئلہ ہے ——— جب مذہب کو ذریعہ معاش بنا لیا جائے تو اس کا یہی نتیجہ ہوتا ہے، اور ذریعہ رزق کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ عوام کو توہمات کی تاریکیوں میں مستحکم رکھا جائے۔ اس قسم کی قومیں کبھی ان قوموں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں جو علم و عقل سے کام لے کر حالات کا مقابلہ کریں۔ ہم (مسلمان) جو صدیوں سے نکبت و زبوں حالی کی زندگی بسر کرتے چلے آ رہے ہیں اس کی وجہ اسی قسم کی توہم پرستانہ مذہبیت ہے۔ جو شخص ان کے خلاف لب کشائی کی جرأت کرے، اسے مادہ پرست۔ مغرب زدہ۔ ملحد۔ بے دین قرار دے کر نکو بنا دیا جاتا ہے۔

ان دیوی دیوتاؤں اور پیروں فقیروں کے مقابلہ میں، اللہ تعالیٰ ہے جس نے تمام سامان رزق پیدا کیا ہے۔

۶/۱۴۲ وَهُوَ الَّذِيٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّ غَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّ النَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّ غَيْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۖ

وَلَا تُسْرِفُوْا ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ۙ

(یہ ہیں ان کے دیوی دیوتا اور پیر پروہت - ان کے برعکس) خدا کی ذات وہ ہے جس نے (تمام انسانوں کی پرورش کے لئے) باغات کا سلسلہ پھیلا دیا ہے - بعض بڑے بڑے مضبوط درخت جو بغیر کسی سہارے کے کھڑے ہیں بعض نرم و نازک (انگور کی سی بیلیں) جو ٹٹیوں پر چڑھائی جاتی ہیں - نیز سر بفلک کھجوروں کے پیڑ - اور مختلف پیداوار والی کھیتیاں - اور زیتون اور انار ——— ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی، اور الگ تھلگ بھی -

جب یہ درخت ثمر بار ہوں تو ان کے پھل شوق سے کھاؤ - اور اس میں سے "اس کا حق" دے دیا کرو - (یعنی اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد، باقی دوسرے انسانوں کی پرورش کے لئے عام کر دو - (۲/۲۱۹) اور (اپنی ضروریات کے تعین میں بھی) اسراف سے کام نہ لو - خدا اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا -

اس آیت میں حقہ کے معنی "اللہ کا حق" کئے جاتے ہیں اور اس کے بعد حقوق اللہ اور حقوق العباد کی فہرستیں مرتب کی جاتی ہیں - قرآن کریم میں کہیں بھی "حقوق اللہ" کے الفاظ نہیں آئے - قرآن کریم میں انسانوں کے باہمی

حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بحث

حقوق اور ذمہ داریوں ہی کا ذکر ہے - قرآن کریم کی تعلیم اور پیغام کا مقصد انہی حقوق اور ذمہ داریوں کا تعین اور ان سے عہدہ برا ہونے کی تلقین کرنا ہے - ان احکام خداوندی کے مطابق عمل پیرا ہونے کا نام "خدا کی اطاعت" ہے، نہ کہ "اس کے حقوق کی ادائیگی - بادنیٰ تدبر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قرآن مجید میں جن امور کے متعلق "فی سبیل اللہ" کہا گیا ہے ان کا تعلق انسانوں کی فلاح و بہبود سے ہے - اللہ تو غنی عن العالمین ہے -

حقّہ، کا مفہوم

اس آیت میں حقّہ کا ایک اور مفہوم بھی ہو سکتا ہے - آپ "قرآن کے معاشی نظام" کے موضوع کو دیکھئے - اس میں آپ دیکھیں گے کہ زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا - وہ اسلامی مملکت کی تحویل میں رہتی ہے تاکہ وہ اس کا ایسا انتظام کرے جس سے افرادِ انسانیہ کو رزق بہم پہنچتا رہے - اس انتظام کے تابع کاشتکار زمین کی کاشت کریں گے - ظاہر ہے کہ اس فصل میں سے ان کاشتکاروں کی ضروریات بھی پوری ہوں گی - اور جو اس سے زائد ہو گا، وہ حکومت کے پاس چلا جائے گا تاکہ وہ اسی سے دوسرے

معاشی نظام

ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرے - اس فصل میں سے جس قدر حصہ حکومت کی تحویل میں چلا جائے گا، اسے حقّہ سے تعبیر کیا گیا ہے - یعنی اس کے واجبات (DUES) -

یوں اس فصل میں خود کاشت کار اپنا حق (ضرورت کے مطابق حصہ) لے لیگا اور دیگر ضرورت مند اپنا حصہ بذریعہ حکومت کی وساطت سے اُن تک پہنچے گا۔ ان الفاظ کے معانی کچھ بھی لیجیے، مقصد یہی ہے کہ اس فصل میں جس طرح کاشتکار کا حق ہے، اسی طرح دیگر ضرورت مندوں کا بھی حق ہے۔ اور اسی اصول پر قرآن کے معاشی نظام کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ اگلی آیت میں "رَزَقَكُمُ اللّٰهُ" کے الفاظ نے بات اور بھی واضح کر دی۔ یعنی جو کچھ خدا نے پیدا کیا ہے، وہ انسانوں کے لئے ذریعہ رزق ہے۔ خدا کو اس میں سے کچھ نہیں چاہیئے۔

۶ / ۱۴۲-۱۴۵

وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ؕ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا
تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۙ ثَمٰنِيَةَ
اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ
اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ نَبِّئُوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ
كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۙ وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ
حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ
اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ
النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۧ

اور دیکھو! اُسی خدا نے تمہارے لئے چار پائے پیدا کر دیئے ہیں ——— کچھ بلند قامت، جو بوجھ لادنے کے کام آتے ہیں۔ اور کچھ پست قامت (زمین سے لگے ہوئے)۔

جو کچھ اس نے تمہارے لئے سامانِ رزق پیدا کیا ہے، اُسے شوق سے کھاؤ۔ لیکن اپنے پست جذبات کے پیچھے نہ لگو (جن کا تقاضا یہ ہے کہ سب کچھ اپنے لئے سمیٹ کر رکھ لو۔) ایسا کرنا، عالمگیر انسانیت سے کھلی ہوئی دشمنی ہے ——— نہ ہی توہم پرستی میں پڑو۔

ان توہم پرستوں سے پوچھو کہ خدا نے ان مویشیوں میں سے (جو تمہارے ہاں عام طور پر پائے جاتے ہیں) آٹھ قسمیں پیدا کی ہیں (۳۹/۶)۔ بھیڑ۔ نر اور مادہ۔ اور بکری۔ نر اور مادہ (باقی چار کا ذکر آگے آتا ہے)۔

حرام و حلال کی انسانی فہرستیں

ان سے پوچھو کہ (تم نے جو حرام اور حلال کی فہرستیں از خود مرتب کر رکھی ہیں، اُن کی کوئی خدائی سند بھی ہے؟) خدا نے کہیں بھی یہ کہا ہے کہ ان (بھیڑ بکریوں) کے نر حرام ہیں (اور مادہ حلال) یا مادہ حرام ہیں (اور نر حلال)۔ یا اُن بچوں کو حرام

قرار دیا ہے ۔ جو ان کے پیٹ میں ہوں ۔ ان سے کہو کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو (کہ تمہاری حرام اور حلال کی فہرستیں خدا کی مرتب کردہ ہیں) تو مجھے بتاؤ کہ تمہارے پاس اس کی سند کیا ہے ؟ (۶/۱۴۴)

اسی طرح خدا نے نر اور مادہ اونٹ پیدا کئے ہیں اور گائے اور بیل بھی ۔ (یہ سب مل کر آٹھ نر اور مادہ ہو گئے یعنی چار نر اور چار مادہ) ۔ ان سے پوچھو کہ کیا ان میں سے کبھی خدا نے نروں کو حرام کیا ہے یا مادیوں کو ۔ یا ان بچوں کو جو ان کے پیٹ میں ہوں ۔ (تم جو کہتے ہو کہ تمہاری حرام و حلال کی تقسیم خدائی تقسیم ہے تو بتاؤ کہ) جب خدا نے ایسا حکم دیا تھا تو تم اُس وقت موجود تھے ؟ (اے ، ان کے مذہبی پیشواؤ ! تم سوچو کہ) تم جو علم و سندِ خداوندی کے بغیر، لوگوں کو اس طرح گمراہ کرتے ہو، اور اپنی خود ساختہ فہرستوں کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہو، تو اس سے بڑا جرم اور کیا ہو سکتا ہے ؟ اور ایسے اکابر مجرمین، قانونِ خداوندی سے کس طرح ہدایت حاصل کر سکتے ہیں ؟

اگلی آیت میں پھر واضح کر دیا کہ حلت و حرمت کے اختیارات سب خدا کو حاصل ہیں ۔ کسی انسان کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ حرام و حلال کی فہرستیں مرتب کرنے بیٹھ جائے ۔

۶/۱۴۶ قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

ان سے کہو کہ (حرام و حلال کا اختیار صرف خدا کو ہے) ۔ اُس نے میری طرف جو کچھ وحی کیا ہے، میں اس میں کسی چیز کو، جسے عام طور پر لوگ کھاتے ہیں، حرام نہیں پاتا، بجز (ان چار چیزوں کے ۔ یعنی) مردار ۔ بہتا ہوا لہو ۔ خنزیر کا گوشت ۔ حکم خداوندی کے علی الرغم، ان کا کھانا شرفِ انسانیت کی نشو و نما کے روک دینے کا باعث اور غلط راستوں کی طرف لے جانے کا موجب ہے ۔ نیز جس (حلال) چیز کو خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر دیا جائے ۔ (یہ چیزیں حرام ہیں ۔ انہیں مت کھاؤ ، بجز اس کے کہ) اگر کوئی شخص (حلال چیزوں کے نہ ملنے کی وجہ سے) مجبور ہو جائے اور اس کی نیت "قانون شکنی یا ہوس پروری کی نہ ہو ۔ اور وہ اپنی اضطراری ضرورت سے آگے نہ بڑھے (تو اپنی جان کی حفاظت کے لئے ان چیزوں میں سے جو میسر آجائے اسے کھا سکتا ہے) ۔ ایسی حالت میں ان چیزوں کے کھانے سے تمہاری ذات پر جو مضر اثرات مرتب ہوں گے ، قانون کے احترام کا محکم احساس تمہیں ان اثرات سے محفوظ رکھے گا ۔ اور تمہاری صلاحیتوں کی نشو و نما بدستور ہوتی رہے گی ۔ (۲/۱۷۳) (۵/۳)

ان امور کی وضاحت "حرام وحلال" کے عنوان میں ہو چکی ہے [انڈکس میں دیکھیئے]

آیت (۶/۱۱۹) میں، یہودیوں کے اس اعتراض کا ذکر کیا گیا تھا (جو وہ کہتے تھے کہ) جو چیزیں ان کی شریعت میں حرام ہیں، قرآن نے انہیں حلال کسطرح قرار دے دیا۔ اگلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ وہ چیزیں ان پر کیوں حرام قرار دی گئی تھیں۔

۶/۱۴۷ وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ ۖ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۚ ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُم بِبَغْيِهِمْ ۖ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ○

یہودیوں پر حرام کردہ اشیاء

اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ ہم نے یہودیوں پر تمام ناخن دار جانور حرام کر دیئے تھے اور گائے اور بکری کی چربی بھی حرام کر دی تھی، بجز اس چربی کے جو ان جانوروں کی پیٹھ یا انتڑیوں کے ساتھ لگی ہو۔ یا جو ہڈیوں کے اندر ملی ہو۔ (تو یہ چیزیں عام حالات میں حرام نہیں تھیں۔ بات یہ تھی کہ) انہیں ان کی قانون شکنی کی سزا دی گئی تھی، اور بطور سزا ان چیزوں کو حرام قرار دے دیا گیا تھا (۴/۱۶۰)۔ یہ ہے اصل واقعہ (لہذا ان کا یہ اعتراض کہ جن چیزوں کو خدا نے پہلے حرام قرار دے دیا تھا، اب انہیں کیسے حلال قرار دیا جا رہا ہے، بے بنیاد ہے)۔

اس ضمن میں آیت (۴/۱۶۰) دیکھیئے۔

یہاں ایک نکتہ غور طلب ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ یہودیوں پر جو زائد چیزیں حرام قرار دی گئی تھیں، تو ایسا ان کے جرائم کی سزا کے طور پر کیا گیا تھا۔ قرآن کریم نے مسلمانوں پر چند ایک چیزیں حرام قرار دی تھیں، لیکن ہمارے فقہا نے ان کے علاوہ بھی حرام اشیاء کی، لمبی چوڑی فہرستیں مرتب کر دیں جو تمام امت پر، قیامت تک، حرام قرار دے دی گئیں۔ سوال یہ ہے کہ یہودیوں پر تو ایسا، ان کے جرائم کی سزا کے طور پر کیا گیا تھا، امت محمدیہ پر ایسا ان کے کن جرائم کی بنا پر کیا گیا ہے؟

ہمارے فقہا کی فہرستیں

اس کے بعد کہا کہ قرآن کریم میں ان چیزوں کو حلال قرار دینے کا (جنہیں یہودیوں پر حرام قرار دیا گیا تھا) ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ان کی سزا کی مدت ختم کر دی جائے۔ یعنی یہ اگر قرآن پر ایمان لے آئیں تو وہ چیزیں ان پر حلال ہو جائیں لیکن یہ ہیں کہ خدا کی اس رعایت اور رحمت سے بھی فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے۔ جیل خانہ کا دروازہ، ان کے لئے کھول

دیا گیا ہے، لیکن یہ باہر آنا ہی نہیں چاہتے۔ سو جو شخص اپنے اُوپر اس طرح سزا وار کرے، یا سزا کو برقرار رکھنا چاہے اسے اس عذاب سے کون چُھڑا سکتا ہے؟

۶/۱۴۸ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ○

لیکن اگر اس تبیانِ حقیقت کے بعد بھی یہ لوگ نہ مانیں، اور تمہیں جھٹلاتے چلے جائیں۔ (اور کہیں کہ نہیں! یہ تمام چیزیں حرام ہیں) تو ان سے کہدو کہ خدا تو اپنی ربوبیت اور رحمت کے دامن کو وسیع رکھنا چاہتا ہے۔ (لیکن، اگر تم اس کے باوجود، اسے سکیڑنا چاہتے ہو، اور اپنے ہاں کی حرام چیزوں کو اب بھی حلال نہیں تصوّر کرنا چاہتے اور اس طرح اپنی سزا کی مدّت کو ختم کرنے پر رضامند نہیں ہوتے، تو تمہاری مرضی)۔ جو خود مجرم بنے رہنا چاہے، اس سے سزا کیسے ٹل سکتی ہے؟ (جو اپنا دروازہ بند رکھنا چاہے، اُس کے کمرے میں روشنی کیسے آسکتی ہے؟) اور اپنی اس ضد اور حماقت کی تائید میں وہی کہنہ دلیل!

۶/۱۴۹ سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ۭ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا ۭ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ۭ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ○

عقیدۂ تقدیر کی تردید

یہ لوگ جب چاروں طرف سے لاجواب ہو جاتے ہیں اور اپنے مسلک کے جواز میں کوئی سند یا دلیل پیش نہیں کر سکتے، تو پھر یہ کہنے لگ جاتے ہیں کہ (دنیا میں خدا کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوتا)۔ اگر خدا کو منظور ہوتا تو ہم یا ہمارے آباؤ اجداد کبھی شرک نہ کرتے۔ نہ ہی کسی شے کو حرام قرار دیتے (اس لئے اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ یہ سب مرضئ مولا ہے)۔

یہ بات بھی کچھ نئی نہیں۔ ان سے پہلے لوگ بھی اس قسم کی کٹ حجتیوں سے حقیقت کو جھٹلاتے رہے، تا آنکہ انہوں نے، اپنی غلط روش کے نتیجہ میں ہمارے عذاب کا مزہ چکھ لیا۔ ان سے پوچھو کہ کیا تمہارے پاس اس دعوے کی کوئی دلیل ہے (کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار نہیں۔ یہ مجبورِ محض ہے۔ جو کچھ ہوتا ہے خدا کے حکم سے ہوتا ہے)۔ اگر ہے تو اسے پیش کرو۔ (۳۶/۴۷ ز ۴۳/۲۰ ز ۶/۱۰۸) حقیقت یہ ہے کہ تمہارے پاس کوئی سند اور دلیل نہیں۔ تم محض ظن و قیاس کے پیچھے چلتے اور اٹکلیں دوڑاتے رہتے ہو۔

اس کی تفصیل کے لئے عنوان تقدیر دیکھیے۔ اس کے برعکس دلیل۔

۶/۱۵۰ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ○

ان سے کہو کہ محکم اور حقیقت رس دلیل صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے وحیٔ الٰہی کی دلیل۔ (اگر تمہارے

حجۃ البالغہ

پاس وہ دلیل ہے تو اسے پیش کرو۔ باقی رہا مشیئت کا مسئلہ۔ تو) اگر خدا چاہتا تو وہ تمہیں بھی کائناتی قانون کے تابع رکھتا (اور اختیار و ارادہ نہ دیتا)۔ اس صورت میں تم بھی (جبراً اور قہراً) سب کے سب اُس کے قانون کے مطابق چلتے۔ (لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ اُس نے ایسا نہیں کیا۔ اُس نے تمہیں صاحب، اختیار و ارادہ پیدا کیا)۔

اس سے واضح ہے کہ دین میں قابلِ قبول سند، شہادت، دلیل صرف اللہ (یعنی کتاب اللہ) کی ہو سکتی ہے۔ اسی سلسلہ میں کہا:۔

۶/۱۵۱ قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ○

ان سے کہو کہ ذرا اُن لوگوں کو سامنے تو لاؤ جو اس کی گواہی دیں کہ ان چیزوں کو خدا نے حرام قرار دیا تھا۔ (اگر یہ اپنے احبار و رہبان کو لائیں، تو اُن سے اس باب میں خدا کی سند مانگو۔ اگر وہ اس پر بھی اپنی ضد سے باز نہ آئیں تو تم ان سے کہدو کہ) ہم تمہارے ساتھ، اس غلط مسلک کے صحیح ہونے کی شہادت نہیں دے سکتے۔

جو لوگ دینِ خداوندی کی تکذیب کریں، مستقبل کی زندگی (اور خدا کے قانونِ مکافات) پر یقین نہ رکھیں (کیونکہ اگر انہیں اس قانون پر یقین ہو تو وہ یہ کچھ کریں ہی کیوں؟) اور اپنی خود ساختہ شریعت کو وحیٔ خداوندی کا درجہ دے دیں۔ تم اُن کے مسلک کی پیروی مت کرو۔

جیسا کہ اُوپر کہا جا چکا ہے، قابلِ تسلیم شہادت، کتاب اللہ کی ہو سکتی ہے۔ لیکن ان کے پاس اللہ کی کتاب اپنی اصلی شکل میں تھی نہیں۔ ان کے پاس سند یا شہادت اُن کے فقہا (احبار و رہبان) کے احکام یا فیصلے تھے۔

سند صرف خدا کی کتاب ہے

قرآن کے نزدیک یہ شہادت قابلِ قبول نہیں تھیں۔ اصول یہ ہے کہ کوئی قول یا فیصلہ، جو کتاب اللہ کے خلاف جائے، وہ دین میں سند اور حجت نہیں ہو سکتا خواہ وہ کسی کا ہو (یا اس کی نسبت کسی کی طرف کیوں نہ کی گئی ہو)۔ یہودیوں کی مشکل

بہ تھی کہ ان کے پاس خدا کی کتاب اپنی اصلی شکل میں تھی نہیں ۔ اس لئے انہیں اپنے فقہاء کے فیصلوں پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ لیکن ہماری حالت عجیب ہے ۔ ہمارے پاس خدا کی کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود ہے ۔ لیکن ہم دین میں سند اور حجت اس کتاب کو نہیں بلکہ انسانوں کی شہادات (فقہ ۔ تاریخ ۔ روایات) کو قرار دیتے ہیں ، یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی بات قرآن سے ٹکرائے تو عقیدہ یہ ہے کہ سند انسانوں کے قول کو سمجھا جائے ۔ اور قرآن کے حکم کو منسوخ قرار دیا جائے۔

اس کے بعد قرآن کریم نے اپنے چند ایک بنیادی احکام کو مرتکز کر کے یک جا بیان کر دیا ہے ۔ فرمایا:۔

۶/۱۵۲ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝

(یہ تو رہا کھانے پینے کی چیزوں کے متعلق ۔ اس کے بعد) ان سے کہو کہ آؤ! میں تمہیں بتاؤں کہ تمہارے نشو و نما دینے والے نے تم پر کن باتوں کو واجب قرار دیا ہے ۔ یہ کہ

۱ ۔ خدا کے ساتھ کسی کو شریک مت ٹھہراؤ ۔ (یعنی اس کے قانون کے ساتھ کسی اور کے قانون کو واجب الاتباع نہ سمجھو ۔ اطاعت صرف خدا کے قوانین کی کرو ۔)

۲ ۔ والدین کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ ۔ (وہ بڑھاپے کی وجہ سے تمہاری نگرانی اور مدد کے محتاج ہیں ۔ اُن کی مدد کرو ۔ اس طرح جو کمی اُن میں آگئی ہے اسے پورا کر دو)

۳ ۔ اپنی اولاد کو، اِس خدشہ سے کہ اُن پر خرچ کر کے تم غریب ہو جاؤ گے ، صحیح تعلیم و تربیت اور نشو و نما سے محروم نہ رکھو۔[1] ہمارا نظام اِس بات کی ذمہ داری لیتا ہے کہ وہ تمہارے لئے اور تمہاری اولاد

---

[1] قتل کے بنیادی معنی مار ڈالنا اور ذلیل و خوار کرنا دونوں ہیں ۔ یہاں پر (نیز ۱۷/۳۱ میں) کہا یہ گیا ہے ، کہ تم اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے "قتل نہ کرو"۔ جہاں تک تاریخ بتاتی ہے ، جاہلیہ عرب میں ، ایک آدھ قبیلہ کے سوا ، مفلسی کے ڈر سے اولاد کو قتل کرنے کا رواج کہیں نہیں ملتا ۔ البتہ شرم کی وجہ سے لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کی شہادت ملتی ہے ، اور

کے لئے سامانِ زیست مہیا کرے گا۔ (۱۷/۳۱) ؛ (۱۱/۴)۔

۴۔ بے حیائی کی باتوں کے قریب بھی نہ پھٹکو ——— خواہ وہ کھلی ہوئی بے حیائی ہو یا پوشیدہ۔

۵۔ کسی جان کو، جسے خدا نے واجب الاحترام قرار دیا ہے، ناحق قتل مت کرو۔ (ناحق قتلِ نفس بڑا سنگین جرم ہے)۔ (۱۷/۳۳) ؛ (۵/۳۲)۔ یہ ہیں وہ اہم امور جن کا تمہیں خدا نے حکم دیا ہے تاکہ تم عقل و فکر سے کام لے کر اُن پر کاربند ہو۔

"حَرَّمَ عَلَيْكُمْ" کے معنی حرام قرار دینا ہی نہیں۔ اس کے معنی واجب، لازم قرار دینا بھی ہیں۔ ان احکام میں بعض کے متعلق کہا جائے گا کہ خدا نے ایسا کرنا حرام قرار دیا ہے۔ اور بعض کے متعلق یہ کہ اس لئے ایسا کرنا واجب قرار دیا ہے مثلاً والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک واجب ہے اور فواحش کا ارتکاب حرام ہے۔ یہ احکام حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ شرک اور والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک کے متعلق انڈکس دیکھئے (نیز ۱۷/۲۳-۲۴ ؛ ۱۶/۴۱ ؛ ۲۹/۸ ؛ ۳۱/۱۴-۱۵ ؛ ۳۶/۶۸)

۲۔ قتلِ اولاد (مفلسی کے خوف سے)۔ جہاں تک تاریخ بتاتی ہے، جاہلیہ میں (ایک آدھ قبیلہ کے سوا) مفلسی کے ڈر سے اولاد کو قتل کرنے کا رواج کہیں نہیں ملتا۔ شرم کی وجہ سے لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کی شہادت ملتی ہے۔ قرآن نے بھی اس کا ذکر کیا ہے (۱۶/۵۸-۵۹ ؛ ۸۱/۸-۹) اس اعتبار سے ہم سمجھتے ہیں کہ زیرِ نظر آیت میں مفلسی کے خوف سے اولاد کو قتل کر دینے کا ذکر نہیں۔

جیسا کہ مطالب الفرقان جلد دوم (صفحہ ۱۷۳) میں لکھا جا چکا ہے، عربی زبان میں قتل کے معنی جان سے مار ڈالنا ہی نہیں۔ کسی کو کمزور اور پست کر دینے، یا ذلیل و خوار کر دینے کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہاں مفلسی کے ڈر سے قتلِ اولاد سے مفہوم انہیں تعلیم و تربیت سے محروم رکھنا، یا مناسب

(صفحہ نمبر ۱۳۰ کا بقیہ فٹ نوٹ) قرآن کریم نے بھی اس کا ذکر کیا ہے (مثلاً ۱۶/۵۸-۵۹ ؛ ۸۱/۸-۹)۔ اس اعتبار سے ہم سمجھتے ہیں کہ اس مقام پر، افلاس کے ڈر سے، اولاد کو مار ڈالنے کا ذکر نہیں۔ انہیں صحیح تعلیم و تربیت نہ دینے کی طرف اشارہ ہے۔ اسی لئے ہم نے اس مفہوم کو ترجیح دی ہے۔ اِس مفہوم کی رُو سے، یہ حکم کسی خاص قوم یا زمانہ سے مختص نہیں رہتا۔ اس کا اطلاق عمومی ہو جاتا ہے۔ جہاں تک کسی کو مار ڈالنے کا تعلق ہے، اس کی بابت اسی مقام پر الگ کہا گیا ہے۔ اولاد کا مار ڈالنا اُسی میں آجائے گا۔

نشوونما نہ کرنا ہے۔ ویسے بھی قتل (بمعنی مار ڈالنے) کے متعلق بھی اسی آیت میں آیا ہے ـــــ قتلِ نفس بغیر الحق، میں قتلِ اولاد بھی آجاتا ہے۔

رزق کی ذمہ داری

۳۔ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ ـــــ ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔ خدا کی یہ ذمہ داری کسطرح پوری ہوتی ہے، اسے عنوان ''قرآن کا معاشی نظام'' ۔ مطالب الفرقان ۔ جلد اوّل ۔ (صفحہ ۱۰۵) میں دیکھیئے۔ یہ ذمہ داری اُسی مملکت کے ہاتھوں پوری ہوگی جو خدا کے نام پر قائم کی جائے گی۔

۴۔ فواحش کے قریب بھی نہ جاؤ۔ فحش کا لفظ بڑا جامع ہے۔ جو عام بے حیائی سے لے کر اُس کے منتہیٰ تک کے لئے بولا جاتا ہے۔ فواحش سے ممانعت کے سلسلے میں یہ کہنا کہ ان کے قریب تک نہ جاؤ، نفسیاتی اہمیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ پھر ما ظہر و ما بطن نے اسے اور بھی جامع بنا دیا۔ یہ بحث سابقہ صفحات میں گزر چکی ہے۔ باطن کے متعلق اس نے کہا ہے کہ يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ ۔ (۴۰/۱۹)۔ وہ (خدا) نگاہ کی خیانت اور دل کے پوشیدہ خیالات تک سے واقف ہوتا ہے۔ ویسے تو ہر کام کے ضمن میں (بالعموم) لیکن جنسیات (SEX) کے ضمن میں بالخصوص، اس حدود فراموشی کا آغاز نیت یا ارادے سے ہوتا ہے۔ اس کو قرآن نے نگاہ کی خیانت یا دل کے پوشیدہ خیالات سے تعبیر کیا ہے۔ اگر نیت یا دل میں فتور نہ ہو تو فحش کاری تک کی نوبت کبھی نہیں آتی۔ اس لئے قرآن کریم، نگاہ کی پاکبازی اور قلب کے تقویٰ پر بڑا زور دیتا ہے۔ انسانی جذبات میں،

جنسی خواہش اور ارادہ

جنسی خواہش سب سے زیادہ پُرزور ہوتی ہے۔ یہ اگر اُبھر آئے تو اس کا روکنا (ناممکن نہیں تو) مشکل ضرور ہوتا ہے۔ اسے نیت یا ارادہ کس طرح آسانی سے روک دیتا ہے اس کا اندازہ ایک مثال سے لگائیے۔ ایک نوجوان، بدقماش لڑکا جنسی بے باکی میں اس قدر حدود فراموش ہے کہ راہ چلتی لڑکیاں تک اس کی دست درازی سے مامون نہیں ہوتیں۔ وہی لڑکا رات کو اپنے کمرے میں سوتا ہے۔ اس کمرہ میں اس کی جوان (اور خوبصورت) بہن بھی سو رہی ہوتی ہے۔ کمرہ میں ہی نہیں پورے مکان میں کوئی اور نہیں ہوتا۔ لیکن یہ لڑکا اپنی بہن کی طرف نگہ بد سے دیکھتا تک نہیں! ایسا کیوں ہے؟ وہ کون سی قوت ہے جو اس کی جنسی بے باکی اور بدنہادی پر اس قدر زبردست کنٹرول رکھے ہوئے ہے؟ صرف دل کا ارادہ یا نیت ہے۔

قرآن کریم اپنی عدیم النظیر تعلیم سے، قلب و نگاہ کی تربیت اس انداز سے کرتا ہے کہ قوم کے نوجوان لڑکے،

ہر لڑکی کو اپنی بہن سمجھتے ہیں اس لئے ان کی طرف نگاہ تک اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ ایسا کنٹرول کسی اور طریق سے نہیں ہو سکتا۔ وہ "باطن" پر کنٹرول سے "ظواہر" کی حدود بندی کر دیتا ہے۔ اور یہی لَا تَقْرَبُوْا سے مراد ہے۔

۵۔ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ۔ انسانی قتل کے متعلق انڈکس میں دیکھئے۔ نیز سابقہ صفحات میں آیت (۵/۳۲) کے تحت۔ یہاں جو کہا نَفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ۔ تو اس کے ایک معنی یہ ہیں کہ "انسانی جان جس کا ناحق قتل کرنا خدا نے حرام قرار دیا ہے" اور دوسرے معانی یہ کہ ہم نے ہر انسانی جان کو واجب الاحترام قرار دیا ہے، اس لئے اسے ناحق قتل مت کرو۔

عورت کی دیت مرد سے نصف

(ضمناً) قرآن کریم نے ہر انسانی جان کو یکساں واجب الاحترام قرار دیا ہے (۱۷/۲)۔ اس میں مرد اور عورت کی کوئی تفریق نہیں۔ لیکن ہماری فقہ میں ہے کہ جرم قتل میں جو خون بہا دلایا جائے، تو مقتولہ عورت کا خون بہا، مقتولہ مرد کے خون بہا سے آدھا ہوگا! العظمۃ اللہ! یعنی ان حضرات کے نزدیک، عورت کی جان کی قیمت مرد کی جان کی قیمت سے آدھی ہے۔

اس کے باوجود ہم ساری دنیا سے چلّا چلّا کر کہتے ہیں کہ اسلام نے عورت کو وہ مقام مساوات و ہمدوشی عطا کیا ہے جس کی مثال کسی مذہب اور تہذیب میں نہیں ملتی! یہ ہے اس مساوات کی شہادت!

قتل بالحق اور قتل بغیر الحق کے متعلق بھی انڈکس میں دیکھئے۔ انہی احکام کے تسلسل میں فرمایا:

۶/۱۵۳ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝

اس کا یہ بھی حکم ہے کہ

دیگر اہم احکام

۶۔ یتیموں کے مال کو ہاتھ تک نہ لگاؤ، اِلّا یہ کہ خود ان کے فائدے، اور نگہداشت کے لئے عمدہ طریق سے کچھ خرچ کرنا پڑے۔ یہ بھی اس وقت تک کہ وہ جوانی کی عمر تک نہ پہنچ جائیں۔ (۴/۶ ؛ ۱۷/۳۴)۔

۷۔ ماپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا کرو۔ (یعنی معاشی معاملات میں ہمیشہ حق اور انصاف کو

پیشِ نظر رکھو۔ (۱۷/۳۵ ؛ ۸۳/۳-۱) ۔ یاد رکھو! ان احکام سے یہ نہ سمجھو کہ تم پر خواہ مخواہ پابندیاں عائد کی جارہی ہیں ۔ بات یہ نہیں ۔ ہمارے احکام اور قوانین کا مقصد تو یہ ہے کہ انسانی ذات میں وسعتیں پیدا ہوں ——— صحیح قوانین کی پابندی سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے (۲/۲۸۶ ؛ ۷/۴۲ ؛ ۲۳/۶۲) ۔

۸ ۔ اور تم جب بھی کوئی بات کہو ، عدل کو سامنے رکھو ، خواہ اس کی زد تمہارے قریبی رشتہ دار پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو ۔ (۴/۱۳۵) ۔

۹ ۔ اپنے اس عہد و پیمان کو پورا کرو جو تم نے ، مومن ہونے کی جہت سے ، اللہ تعالیٰ کے ساتھ کر رکھا ہے (۹/۱۱۱) ۔

یہ ہیں وہ احکام جنہیں خدا اس لئے بیان کرتا ہے کہ تم انہیں ، زندگی کے ہر گوشے میں سامنے رکھو ۔

۱ ۔ یتامیٰ کے متعلق بحث سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے ۔ (دیکھیئے انڈکس) ۔

۲ ۔ کیال اور میزان کو عدل و انصاف کے ساتھ پورا رکھنے کے متعلق " معاشی نظام " میں بحث آچکی ہے ۔ ان الفاظ کا مطلب صرف ماپ اور تول کے پیمانوں اور اوزان کا ٹھیک رکھنا ہی نہیں ۔ اس سے مراد معاشی نظام کو عدل کے تقاضوں کے مطابق قائم کرنا ہے ۔

۳ ۔ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۔ کا مفہوم ، مطالب الفرقان ۔ جلد سوم (ص ۴۹۱) میں گزر چکا ہے ۔

۴ ۔ عدل کے متعلق انڈکس میں دیکھیئے ۔ نیز چوتھی جلد میں آیت (۴/۱۳۵) کے تحت ۔

۵ ۔ عهد الله سے عمومی مراد تو خدا کے ہر حکم کی تعمیل ہے ۔ انسان جب خدا اور اس کی کتاب پر ایمان لاکر جماعتِ مومنین میں شریک ہو جاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا سے عہد کرتا ہے کہ وہ اس کے ہر حکم کی تعمیل کرے گا ۔ جامع شکل میں یہ عہد آیت (۹/۱۱۱) میں آیا ہے ۔

اور یہ ہے وہ صراطِ مستقیم جس پر حضور نبی اکرمؐ خود گامزن تھے اور جس کے اتباع کا حکم مومنین کو دیا گیا ۔

۶/۱۵۴ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

(ان سے کہہ دو کہ) یہ ہے تمہارے خدا کی مقرر کردہ، متوازن بدروش راہ، جو تمہیں سیدھی منزلِ مقصود تک لے جائے گی۔ میں بھی اسی راہ پر چلتا ہوں۔ تم بھی اسی پر چلو۔ اسے چھوڑ کر اور راستوں کو اختیار نہ کرو۔ وہ تمہیں خدا کی راہ سے الگ کر دیں گے۔ اُس نے تمہیں اس کا اس لئے حکم دیا ہے کہ تم زندگی کے تمام خطرات سے محفوظ رہ کر، امن و سلامتی سے اپنے نصب العین تک جا پہنچو۔

صراطِ مستقیم ہمارے ہاں "اطاعتِ رسول"، "اتباعِ سنتِ رسولؐ" وغیرہ مسائل پر بڑی لمبی چوڑی بحثیں ہوتی ہیں۔ ان بحثوں کا کسی نقطۂ آخرین تک پہنچنا تو کجا، ابھی تک خود "سنت" کا کوئی متفق علیہ مفہوم ہی متعین نہیں ہو سکا، نہ ہی یہ طے پایا ہے کہ حضورؐ کی یہ "سنت" جامع طور پر کس کتاب میں ملے گی۔ (یہ بحث" ادارہ طلوعِ اسلام" کی طرف سے شائع کردہ کتاب" مقامِ حدیث" میں ملے گی)۔

سنت رسول اللہؐ لیکن قرآن کریم نے دو لفظوں میں اس بحث کو سمٹا دیا، جب مختلف احکامات دینے کے بعد، حضورؐ کی زبان مبارک سے کہلوا دیا کہ) اِنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۔ "یہ ہے وہ صراطِ مستقیم جس پر میں گامزن ہوں۔ تم سب اسی کا اتباع کرو"۔ اس سے واضح ہے کہ قرآنی احکام کا اتباع ہی اتباعِ سنت رسول اللہؐ ہے۔ اسے کسی اور جگہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا حکم خدا نے دیا ہے۔ جس کا نتیجہ تقویٰ ہے۔

سنت رسول اللہؐ کی تفصیلی بحث چوتھی جلد میں زیر آیت (۳/۹۳) کی جا چکی ہے۔

پہلے بات یہودیوں سے ہو رہی تھی۔ ان قرآنی احکام کے بعد ان سے کہا:

۶/۱۵۵ ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ۟

(اُن سے یہ بھی کہہ دو) ہم نے، اس سے پیشتر، موسیٰؑ کو بھی، اسی قسم کا ضابطۂ قوانین دیا تھا تاکہ، اس کے ذریعے، اُس قوم پر اتمامِ نعمت کر دیا جائے جو حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرے۔ اُس میں تمام ضروری احکام کو الگ الگ کر کے، نکھار کر، بیان کر دیا گیا تھا۔ اس میں صحیح راہ نمائی اور انسانی ذات کی نشوونما کا سامان تھا۔ یہ سب اس لئے دیا گیا تھا کہ وہ قوم، خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر یقین رکھے۔

جن احکام کا قرآنِ مجید میں اعادہ کیا گیا ہے، اسی قسم کے احکام کتاب موسیٰؑ میں بنی اسرائیل کو دیئے تھے۔

کتابِ موسیٰؑ

لیکن انہوں نے اپنی کتاب میں تحریف کر دی۔ یہ جو انہیں قرآنی احکام اور اپنے احکامِ شریعت میں تفاوت اور اختلاف نظر آتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی کتاب میں تحریف ہو چکی ہے (جس کا خود انہیں بھی اعتراف ہے۔ اس کی تفصیل، میری کتاب "مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں" میں ملیگی) اس کے بعد اس کتاب کو اسلئے نازل کیا گیا ہے کہ سابقہ آسمانی کتابوں میں سے کوئی بھی اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہی تھی۔ نیز اس لئے کہ اسے دین کا آخری ضابطہ قرار دینے کے لئے اس میں احکام کی تکمیل کر دینا مقصود تھا۔

۶/۱۵۶ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۙ

اب اس کے بعد، یہ مبارک کتاب (قرآنِ کریم) دی گئی ہے۔ پس، اب تم سب اس کا اتباع کرو اور تخریبی راستوں سے بچتے رہو، تاکہ تمہاری انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ہو سکے۔

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کی طرف راہ نمائی بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ عرب میں حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد سکونت پذیر تھی۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کے بعد اس قوم کی طرف کوئی رسولؑ نہیں آیا تھا۔ (۳۶/۶)۔ اس اعتبار سے بھی ان کی طرف کتاب کا بھیجنا ضروری تھا۔

۶/۱۵۷-۵۸ اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۪ وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ۙ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ؕ سَنَجْزِى الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ۝

اہلِ عرب کی طرف کتاب

یہ کتاب اس لئے بھی تمہاری طرف نازل کی گئی ہے کہ تم یہ نہ کہو کہ ہم سے پہلے، یہود و نصاریٰ کی طرف جو کتاب بھیجی گئی تھی ہم اس کے پڑھنے پڑھانے سے ناواقف تھے۔

یا تم یہ کہو کہ اگر ہماری طرف بھی ضابطۂ قوانین بھیجا جاتا تو ہم ان سے بھی زیادہ ہدایت یافتہ بن کر دکھاتے۔

لہذا، تمہاری طرف (بھی) تمہارے نشوونما دینے والے کی جانب سے وہ کتاب آ گئی جس میں واضح دلائل ہیں۔ اس میں (سفرِ زندگی کے لئے) صحیح راہ نمائی ہے اور انسانی ذات کی نشوونما کا پورا پورا سامان۔

اب بتاؤ کہ اس سے زیادہ بدبخت اور کون ہوگا جو احکامِ خداوندی کو جھٹلائے اور ان سے منہ موڑے۔ لیکن جو لوگ ان سے منہ موڑتے ہیں وہ کسی اور کا نقصان نہیں کرتے۔ خود اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔ ان کی اس روش کا نتیجہ ان کیلئے بدترین قسم کی تباہی ہوگا۔

یہاں قرآنِ کریم نے ایک ایسی بات کہی ہے جو ہمارے لئے موجبِ صد عبرت ہے۔ پہلے کہا کہ قرآن کے اوّلین مخاطب (اہلِ عرب) کی طرف قرآن مجید اتمامِ حجت کے لئے بھیجا گیا۔ یعنی اس لئے کہ وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہماری طرف خدا کی راہ نمائی آئی ہی نہیں۔ اگر وہ راہ نمائی آتی تو ہم بتاتے کہ اس کے مطابق کیسے زندگی بسر کی جاتی ہے!

وہ کتاب آگئی لیکن انھوں نے اس سے اعراض برتا اور اسطرح دین کی تکذیب کی۔ ایک چیز ہوتی ہے کفر یعنی کسی صداقت کا ماننا ہی نہیں۔ اس کے صادق ہونے سے انکار کر دینا۔ اور دوسری چیز ہوتی ہے تکذیب۔ یعنی زبان سے اسکا اقرار کر لینا لیکن اس کے بعد اپنے اعمال سے اس کے دعاوی کو جھوٹا ثابت کرنا (دیکھئے انڈکس)۔ اس سے وہ قوم شدید عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

خدا کی وہ کتاب ہمارے پاس محفوظ شکل میں موجود ہے۔ لہٰذا ہمارے لئے یہ کہنے کی گنجائش نہیں کہ اگر ہمیں بھی آسمانی راہ نمائی مل جاتی تو ہم راہ ہدایت پر چل کر دکھاتے۔

ہماری حالت ہم نے کتاب سے انکار نہیں کیا۔ لیکن اس کے خلاف زندگی بسر کرنے سے، دُنیا کی نگاہوں میں اس کے دعاوی کو جھوٹا ثابت کر دکھایا۔ اس نے کہا تھا کہ اس کتاب کے ماننے والے (مومن) تمام اقوام پر غالب رہیں گے۔ ہم نے دنیا سے کہا کہ ہم اس کتاب کے ماننے والے ہیں، لیکن اس کے بعد ہماری حالت یہ ہے کہ ہم اقوامِ عالم میں پست ترین درجہ پر ہیں۔ اس سے وہ اقوام کس نتیجہ پر پہنچیں گی؟ اسی نتیجہ پر کہ اس کتاب کا یہ دعویٰ (کہ اس کے ماننے والے تمام اقوامِ عالم پر غالب رہیں گے) (معاذ اللہ) جھوٹا ہے اس طرح ہماری حالت، قرآنِ کریم کے دعویٰ کی تکذیب کر رہی ہے۔ اور اس کا نتیجہ ہے وہ مسلسل عذاب جس میں ہم ماخوذ چلے آرہے ہیں۔

ان تصریحات اور تنبیہات کے بعد کہا:

۶/۱۵۹ هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ رَبُّكَ أَوْ يَأْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ۗ يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا إِيْمَانُهَا لَمْ

تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ؕ قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۝

(اس قدر وضاحت کے ساتھ سمجھا دینے کے بعد بھی، یہ لوگ جو بات نہیں مانتے تو) شاید انہیں اس کا انتظار ہے کہ ان پر فرشتے نازل ہوں ۔ یا خود خدا ان کے پاس چل کر آئے ۔ یا اس کی طرف سے کچھ محسوس نشانیاں ان کے سامنے آ کھڑی ہوں (تو یہ ایمان لائیں)

ان سے کہدو کہ جس دن خدا کی "محسوس نشانیاں" سامنے آیا کرتی ہیں، اُس وقت کسی ایسے شخص کا ایمان لانا اُس کے لئے نفع بخش نہیں ہوتا جو اس سے قبل ایمان نہیں لایا تھا ۔ یا جس نے اپنے ایمان کے ساتھ عملِ خیر نہیں کیا تھا ۔ ان سے کہو کہ تم ان چیزوں کا انتظار کرو ، اور میں اس کا انتظار کرتا ہوں (کہ تم پر تباہی کی گھڑی کس وقت آتی ہے؟)۔

ایمان بلا عملِ خیر

"ایمان لانے" کے معنی ہوتے ہیں کسی دعویٰ کو یقینی طور پر سچا تسلیم کر لینا (مثلاً) قرآنِ کریم نے کہا کہ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ (۲۱/۶) ۔ ظالم کی کھیتی کبھی پنپ نہیں سکتی ۔ ظالم کامیاب نہیں ہو سکتا ۔ اس دعویٰ پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ دل کے پورے یقین کے ساتھ سمجھ لیا جائے کہ ظلم کی روش کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی ۔ یہ ہیں ایمان کے معانی ۔ اور ایمان سے مقصد یہ ہے کہ اس کے بعد اس کے مطابق عمل کیا جائے ۔ اگر ایسا نہیں تو ایمان بے مقصد ہے ۔ اس کی دو صورتیں ہیں ۔ ایک یہ کہ انسان اس صداقت کو اس وقت تسلیم کرے جب اس کے مطابق عمل کرنے کے لئے وقت ہی نہ ہو ۔ اور دوسرے یہ کہ زبان سے تو اس دعوے کی صداقت کو تسلیم کر لیا جائے لیکن عمل اس کے مطابق نہ کیا جائے دونوں صورتوں میں ایمان بے معنی اور بے مقصد ہو گا ۔ ایسے ایمان کو قرآن، ایمان تسلیم ہی نہیں کرتا ۔ اقبالؒ کے الفاظ میں " مردہ آں ایماں کہ ناید در عمل" اس ضمن میں توبہ کا عنوان دیکھئے ۔ نیز "مہلت کا قانون" جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس وقت غلط اعمال کے نتائج سامنے آ جائیں اس وقت توبہ کچھ فائدہ نہیں دے سکتی ۔ فرعون کو، ایمان کا اعلان کرنے پر یہی جواب ملا تھا ۔ (دیکھئے مطالب الفرقان جلد دوم صـ۲۴۹)۔

دین کا مقصود و منتہیٰ، نوعِ انسان کے اختلافات اور تفرقات کو مٹا کر انہیں ایک عالمگیر برادری بنا دینا ہے ۔ اس کے لئے اس نے، آغاز کار کے لئے، ایک اُمّت متشکل کی جس میں کسی قسم کا اختلاف اور تفرقہ

نہ تھا۔ اس امت کو متنبہ کر دیا کہ یاد رکھو! امت کی وحدت کو توڑ کر اس میں فرقے پیدا کر دینا، شرک ہے (۳۰/۳۱)۔

پھر نبی اکرمؐ سے فرمایا کہ:

۶/۱۶۰ إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ۚ
إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝

دین، ایک راستے پر چلنے کا نام ہے۔ مختلف راستوں پر چلنے کا نہیں۔ جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر لیں اور الگ الگ گروہ بن جائیں۔ اے رسولؐ! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان کا معاملہ قانونِ خداوندی کے سپرد کرو۔ وہی بتائے گا کہ ان کی اس روش کا نتیجہ کیا ہوگا؟ (۴۲/۱۰ ؛ ۳۰/۳۱)۔

غور کیجیے کہ فرقہ بندی کے متعلق قرآن نے کیا کہا ہے؟ اس نے کہا یہ ہے کہ اگر یہ امت فرقوں میں بٹ گئی تو اس کا نہ خدا سے کوئی تعلق رہے گا نہ اس کے رسولؐ سے کوئی واسطہ۔ (ان امور کی وضاحت کے لئے انڈکس میں "فرقہ بندی" کا عنوان دیکھئے) قرآنِ کریم میں واضح الفاظ میں یہ تنبیہات موجود ہیں۔ تمام مسلمان بالعموم اور ہمارے مذہبی پیشوا بالخصوص ان آیات کو پڑھتے ہیں، خاموشی سے آگے بڑھ جاتے ہیں، اور فرقہ بندی کی گرہوں کو مستحکم سے مستحکم تر کرنے کے عمل میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

فرقہ بندی سے رسولؐ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہتا

سوچیے کہ فرقوں کی موجودگی میں اسلام باقی بھی رہتا ہے؟

میں چالیس سال سے امت کی توجہ قرآنِ کریم کی ان آیات کی طرف مبذول کراتا چلا آرہا ہوں۔ بجائے اس کے کہ ہمارے علماء حضرات ان پر غور کرتے اور سوچتے کہ فرقوں کو مٹانے کی کوئی صورت کی جائے، الٹا مجھ پر کفر کے فتوے صادر کر دیئے! لیکن اس سے فرقہ بندی کا شرک توحید میں تو نہیں بدل گیا! یہ تو خود خدا کا فیصلہ ہے۔ اس نے جو کہا تھا کہ وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُم بِاللَّهِ إِلَّا وَهُم مُّشْرِكُونَ ۝ (۱۲/۱۰۶)۔ یہ لوگ دعوئے ایمان کے باوجود مشرک ہی رہتے ہیں، تو یہ ہمارے ہی متعلق ہے کہ ہم مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں اور فرقوں میں بھی بٹے ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ پاکستان کے آئین میں فرقوں کے وجود کو آئینی سند عطا کر دی گئی ہے کہ وہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق عمل کریں۔ اس کے باوجود، اس مملکت کو اسلامی کہا جاتا ہے اور ان احکام کو بھی اسلامی!

اس کے بعد قانونِ مکافاتِ عمل کا ایک اصول بیان کیا گیا ہے۔ اور وہ یہ کہ:

۶/۱۶۱ مَن جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا ۖ وَمَن جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا

یُجْزٰۤی اِلَّا مِثْلَهَا وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ۝

ان سے کہہ دو کہ جو شخص (دین کی وحدت کو قائم رکھتے ہوئے) حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتا ہے، اُس کے عمل کے بیج، دس دس گنا پھل لاتے ہیں۔ لیکن اگر کسی سے برائی سرزد ہو جائے تو اس کی سزا، اس کے برابر ہی ہو گی۔ اور اس پر کسی قسم کی زیادتی نہیں ہو گی۔

حُسنِ عمل کے نتائج کی فراوانی کے متعلق مطالب الفرقان جلد سوم (صفحات ۴۱۶ تا ۴۶۳) میں تشریح آ چکی ہے۔ آیت کے دوسرے حصے میں عدل کا بنیادی اصول بیان کیا گیا ہے کہ غلط کام کی پاداش اس کام کے مطابق ہو گی۔ زیادہ نہیں۔ کیونکہ اس میں زیادتی ظلم ہو جائے گا۔ اگر اس کا تعلق جرائم سے سمجھا جائے، تو بھی اس کا

جُرم کی سزا جُرم کے مطابق

مفہوم یہ ہو گا کہ جُرم کی سزا، جُرم کی نوعیت اور شدّت کے مطابق ہونی چاہیئے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ اس سلسلہ میں انڈکس میں "جرم اور سزا" اور "جزا اور سزا" کے عنوانات دیکھئے (نیز ۱۶/۱۲۶ ؛ ۴۲/۴۰)۔

اگرچہ میں فقہ کی بحثوں میں نہیں الجھا کرتا لیکن اس ضمن میں ایک ایسی بات سامنے آگئی ہے جس کی بابت میں نے متعدد بار سوچا کہ اس کا ذکر کر دیا جائے یا نہ، لیکن چونکہ ہمارے ہاں فقہی قوانین کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے اور انہیں قوانینِ مملکت کی حیثیت سے نافذ بھی کیا جا رہا ہے، مناسب سمجھا گیا ہے کہ اس کی ایک آدھ مثال پیش کر دی جائے تاکہ قارئین کو معلوم ہو جائے کہ ہمارے فقہی قوانین کس قسم کے ہیں۔ ان کے سامنے سوال یہ ہے کہ جرم کی سزا کس طرح دی جائے۔ انہوں نے کہا کہ اس کے متعلق قرآن نے خود بتا دیا ہے جب کہا ہے کہ وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا (۴۲/۴۰ ؛ ۱۶/۱۲۶) یعنی "جرم کی سزا اُس جیسی دی جائے"۔ اس سے اصول یہ وضع کیا گیا کہ مجرم نے جس قسم کی ضرب، مضروب کو لگائی ہے اسے اسی قسم کی ضرب لگائی جائے اور اسی آلۂ ضرب سے لگائی جائے۔ اس سے آگے بڑھے تو کہا کہ قاتل نے جس طریق سے مقتول کو قتل کیا تھا اسے اسی طریق اور اسی قسم کے آلۂ قتل سے قتل کیا جائے۔ لیکن یہاں انہیں ایک دشواری پیش آئی۔ اور یہی وہ مقام ہے

فقہ کا شرمناک فیصلہ

جس کے متعلق میں نے کہا تھا کہ میں نے متعدد بار سوچا کہ اس کا ذکر کیا جائے یا نہ۔ (اسے اب، قارئین کے حُسنِ ذوق سے معذرت کے ساتھ، سینے پر پتھر رکھ کر بیان کیا جاتا ہے)۔ ان کے سامنے دشواری یہ آئی کہ اگر کسی کی موت اغلام (SODOMY) سے واقع ہو، تو اصول مماثلت کی رو سے قاتل کو کس طرح موت کی سزا دی جائے۔ اس کے متعلق فیصلہ یہ کیا گیا:

وللشافعیہ قول انہ یقتل بذالک فیتخذ عوداً علیٰ تلک الصفت و یطعن بہ فی دبرہ حتیٰ یموت۔

(تفسیر قرطبی جلد پنجم۔ ص ۳۵۸ بحوالہ ماہنامہ محدث لاہور۔
بابت رجب و شعبان ۱۳۹۹ھ ص ۲۶)

عصمتِ قلم اس کا ترجمہ کرنے سے مانع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کام لکڑی سے لیا جائے (استغفر اللہ)

یہ ہے ایک مثال اس نہج کی جس کے مطابق ہمارے قوانین فقہ مرتب کئے گئے تھے! قرآنی آیات کا مفہوم واضح ہے کہ جرم کی سزا، جرم کی نوعیت کے مطابق دی جائے۔ اس سے زیادہ سزا دینا مجرم پر ظلم ہوگا۔

دین کے یہ احکام اور عدل کا اصول بیان کرنے کے بعد کہا:

۶/۱۶۲ قُلۡ اِنَّنِیۡ ہَدٰىنِیۡ رَبِّیۡۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ۬ۚ دِیۡنًا قِیَمًا مِّلَّۃَ اِبۡرٰہِیۡمَ حَنِیۡفًا ۚ وَ مَا کَانَ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ○

ان سے کہہ دو کہ میرے نشوونما دینے والے نے، میری راہ نمائی، زندگی کی سیدھی اور متوازن راہ کیطرف کر دی ہے یعنی ایک ایسے نظامِ زندگی کی طرف جو خود بھی (اپنے زورِ دروں کی بنا پر) قائم ہے اور انسانیت کے قیام کا باعث بھی ہے۔ یہ وہی نظامِ زندگی ہے جسے ابراہیمؑ نے، ہر طرف سے منہ موڑ کر، اختیار کیا تھا۔ یعنی وہ اس میں، کسی اور روش اور طریقہ کو شریک نہیں کرتا تھا۔

ملّتِ ابراہیمیؑ

انڈکس میں ان مقامات کو بغور دیکھیئے جن میں (حضرت) ابراہیمؑ کا تذکرۂ جلیلہ آیا ہے ان سے واضح ہو جائے گا کہ قرآنِ کریم نے خاص طور پر ملّتِ ابراہیمیؑ کے اتباع کا کیوں حکم دیا ہے۔ ملّت کے معنی روش۔ طریقہ یا مسلک ہوتے ہیں۔ یعنی جس طریق (راستہ یا روش) پر چل کر حضرت ابراہیمؑ، امامتِ نوعِ انسان کے مستحق قرار پائے تھے، اس طریق کو بطور نمونہ (اسوہ) سامنے رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر، ان کے حنیف ہونے کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ حنیف کے معنی ہوتے ہیں، ہر طرف سے منہ موڑ کر، کٹ کر،

حنیف

کسی ایک کا ہو جانا۔ اسی کا نام توحید ہے۔ اور جس کی زندگی ایسی ہو وہی یہ کہہ سکتا ہے کہ مَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ (۶/۸۰) یہی صراطِ مستقیم ہے۔ اصل یہ ہے کہ جس کے سامنے منزل متعین ہو اور اس تک پہنچنے کا راستہ صاف اور واضح، اسے ادھر اُدھر، دیکھنے یا کسی سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی یہی حنیف ہونے کی خصوصیت ہے۔ اس میں، انسان کی ساری زندگی، اس کے خیالات، میلانات، رجحانات،

جذبات، سب کچھ اس مقصد کے حصول کے لئے وقف ہوتا ہے۔ یہی حضرت ابراہیمؑ نے کہا تھا (۶/۸۰) اور اسی کا اعادہ حضور نبی اکرمؐ نے ان الفاظ میں فرمایا کہ:

۶/۱۶۲-۱۶۳ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝

ان سے کہدو کہ (اس دین کو، اس انداز سے اختیار کرنے کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ) میرے تمام فرائض زندگی اور ان کے ادا کرنے کے طور طریقے۔ میرا مرنا اور جینا، خدا کے تجویز کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے وقف ہے۔

اسلام اسے کہتے ہیں

میں اس میں کسی اور مقصد، جذبہ، یا خواہش کو شریک نہیں کرتا۔ اسی کا نام توحید ہے۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور، سب سے پہلے، میں نے خود اس حکم کے سامنے سر تسلیم خم کیا ہے۔ اپنے آپ کو مسلم کہنا سزاوار ہی اس کو ہے جو یہ کہے کہ:

عشق میں ایک تم ہمارے ہو ۔۔۔ باقی جو کچھ ہے سب تمہارا ہے

حضورؐ نے یہاں اپنے آپ کو "اول المسلمین" کہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے اپنے مسلم ہونے کے اعلان کے ساتھ ہی جماعتِ مسلمین کی تشکیل کی بنیاد بھی رکھ دی تھی۔ مذہب میں ہر فرد الگ الگ "خدا پرست" ہوتا ہے۔ دین میں وہ امتِ مسلمہ کا ایک فرد ہوتا ہے۔

(ضمناً) آیت (۶/۱۶۲) کا مطلب تو مذکورہ مفہوم سے واضح ہے۔ لیکن ایک لفظ کی وضاحت ضروری ہے اور وہ ہے "نسکی"۔ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے "قربانی" اور پھر اس ترجمہ کی رو سے اُن قربانیوں کے لئے سند

نسک کے معنی

لائی جاتی ہے جو عید الاضحیٰ کے موقع پر دی جاتی ہیں۔ انڈکس میں قربانی کا عنوان دیکھئے۔ اس سے قربانی کا مفہوم واضح ہو جائے گا۔ اس ضمن میں لفظ نسک کا مفہوم بھی واضح کر دیا گیا ہے۔ (مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ صفحہ ۲۴۷ جہاں یہ آیت بھی درج ہے)۔

اس کے بعد کہا گیا:

۶/۱۶۵ قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ ؕ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَیْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۚ ثُمَّ اِلٰی رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝

ان سے کہو کہ کیا (تم چاہتے ہو) میں خدا کو چھوڑ کر کسی اور نشو و نما دینے والے کو تلاش کروں؟ حالانکہ وہ کائنات کی ہر شے کا نشو و نما دینے والا ہے۔ انسانی صلاحیتوں کے بارے میں اس کا قانونِ نشو و نما یہ ہے کہ انسان اپنے ہر عمل کا ذمہ دار خود ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ اُسے ہی بھگتنا پڑتا ہے۔ (۲/۱۴۱ ؛ ۲/۲۸۶)۔ کوئی بوجھ

خُدا کے سوا کوئی ربّ نہیں

اُٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا۔ ہر ایک کا قدم خود بخود، خدا کے قانونِ مکافات کی طرف اٹھتا ہے ہر ایک کے اعمال کے نتائج اس کے مطابق مرتب ہوتے ہیں۔ اور وہیں سے اُن معاملات کے فیصلے ہوتے ہیں جن میں لوگ اختلاف کرتے ہیں۔

آیت (۶/۱۱۵) میں "اَفَغَیۡرَ اللّٰہِ اَبۡتَغِیۡ حَکَمًا" کہا گیا تھا۔ یعنی کیا میں خدا کے سوا کسی اور کو حاکم تسلیم کروں؟ یہاں "رَبًّا" کہا گیا ہے۔ ان دونوں میں بڑی گہری مماثلت اور مطابقت ہے۔ خدا کو حاکم تسلیم کرنے سے، خدا کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس میں خود انسان ہی کا فائدہ ہے۔ اور وہ یہ کہ احکام و قوانینِ خداوندی کی اطاعت

ربّ اور حاکم کا باہمی تعلق

سے انسان کی نشو و نما ہوتی ہے۔ اگر خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی اطاعت کی جائے تو انسانی ذات مستحکم ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور قانونِ مکافاتِ عمل کی لِم اور بنیاد یہ ہے کہ ہر فرد اپنے ہر عمل کے نتائج کا خود ذمہ دار ہے۔ اور کوئی شخص کسی دوسرے کی ذمہ داریاں اپنے اوپر نہیں لے سکتا۔ یا کوئی شخص اپنی ذمہ داری کسی اور کے سر نہیں تھوپ سکتا۔

یہ نقشہ اس حکومت کا ہو گا جو خدا کے نام پر قائم کی جائے گی ——— کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا۔ نہ ہی ایسا ہو گا کہ جرم کوئی کرے اور اس کی سزا کوئی اور بھگتے۔ ہر شخص اپنے ہر کام کا ذمہ دار آپ ہو گا۔ اور اس کا نتیجہ بھگتے گا۔ منشائے خداوندی یہی ہے کہ اس انداز کی حکومت قائم کی جائے۔ اس میں حکومت کی باگ اسی کے ہاتھ میں ہو گی جو ربوبیتِ عامہ کی ذمہ داری لے گا۔

۶/۱۶۶ وَ هُوَ الَّذِیۡ جَعَلَكُمۡ خَلٰٓئِفَ الۡاَرۡضِ وَ رَفَعَ بَعۡضَكُمۡ فَوۡقَ بَعۡضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبۡلُوَكُمۡ فِیۡ مَاۤ اٰتٰىكُمۡ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِیۡعُ الۡعِقَابِ ۖۚ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ۠

خدا وہ ہے جس نے اپنے قانونِ مشیت کے مطابق، تمہیں (سابقہ اقوام کا) جانشین بنایا ہے۔ اُسی کے قانون کے مطابق مختلف اقوام کے مختلف مدارج متعیّن ہوتے ہیں تاکہ یہ دیکھ لیا جائے کہ جس قوم کو جو کچھ دیا جاتا

اقتدار سے ذمہ داریوں کی پرکھ

ہے، وہ اسے کس مقصد کے لئے کام میں لاتی ہے (۶/۱۶۶) خدا کا قانونِ مکافات، اقوام کے اعمال کے نتائج ساتھ کے ساتھ مرتب کئے جاتا ہے۔ لیکن جو اقوام اس کے قانون کے مطابق، اپنی صلاحیتوں کو کافی مستحکم کر لیتی ہیں، وہ چھوٹی موٹی لغزشوں کے نقصان رساں اثرات سے محفوظ رہتی ہیں، اور ان کی نشوونما میں فرق نہیں آتا (جو ایسا نہیں کرتیں، وہ تباہ ہو جاتی ہیں)۔

جب اُمّتِ مسلمہ کو حکومت عطا ہوئی تھی تو ان سے بھی یہی کہا گیا کہ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿ (۱۰/۱۴) "اقوام سابقہ کے بعد ہم نے تمہیں حکومت اس لئے عطا کی ہے کہ دیکھا جائے کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو"۔ سیکولر حکومت اور اسلامی حکومت میں یہی بنیادی فرق ہے۔ سیکولر حکومت میں جسے بھی اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY) حاصل ہو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس سے اوپر کوئی ایسی اتھارٹی نہیں جو اس سے پوچھ سکے کہ تم اپنے اختیارات کا استعمال کس طرح کرتے ہو۔ لیکن اسلامی حکومت میں اس قسم کا اقتدارِ اعلیٰ کسی شخص کو حاصل نہیں ہوتا۔ اس میں اقتدارِ اعلیٰ خدا (کی کتاب) کو حاصل ہوتا ہے۔ اور مملکت کی اعلیٰ ترین اتھارٹی بھی جوابدہ ہوتی ہے کہ اس کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق ہیں یا نہیں۔ اگر اس کے فیصلے اس کے مطابق نہیں ہوتے تو اس سے اقتدار چھین لیا جاتا ہے اور یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ثُمَّ لَا یَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸) اس کی جگہ کوئی دوسری قوم لے لیتی ہے جو اس جیسی نہیں ہوتی۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان "استبدال و استخلافِ قومی")۔

سُورۃ الانعام ختم شُد

دوسرا باب

سورۂ اعراف آیات ۱ تا ۵۸

قرآنی حقائق کی نقاب کشائی

۱ ——— اتباع اور اطاعت میں فرق۔
۲ ——— اطاعت زندہ اتھارٹی کی کی جاتی ہے۔
۳ ——— ملوکیت میں نہ اطاعت ہوتی ہے نہ اتباع ۔صرف استبداد ہوتا ہے
۴ ——— اعمال کا وزن
۵ ——— متاع کا مفہوم ——— قرآن کے معاشی نظام کا نقطۂ ماسکہ۔
۶ ——— تقلید اور تقدیر (عقیدۂ جبر) دونوں خلاف قرآن ہیں۔
۷ ——— زیب وزینت کو کوئی حرام نہیں قرار دے سکتا۔
مذہبی پیشوائیت کا خدا کو چیلنج۔
۸ ——— قوم کی اجل کا مفہوم۔
۹ ——— بہائیوں کی گمراہی - قرآن ابد تک کے لئے کتاب زندہ ہے۔
۱۰ ——— جہنم میں قوموں کا مکالمہ۔
۱۱ ——— اہل جنت کے سینہ میں غل نہیں ہوگا۔
۱۲ ——— فرانس کے ڈاکٹر مارس بکائی کی قرآنی تحقیق۔
ذوقِ تحقیق وتجسس کی کارفرمائیاں۔
۱۳ ——— تبویب القرآن کی اہمیت۔
۱۴ ——— اذن کے معنی قانونِ خداوندی۔

دُوسرا باب

آغاز سُورۃُ الاعراف

۷/۱-۲ الٓمّٓصٓ ۚ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ○

خدائے علیم و حکیم و بصیر کا ارشاد ہے کہ

ہم نے اس ضابطۂ قوانین کو تیری طرف نازل کیا ہے، تاکہ تو، اس کے ذریعے، غلط راستے پر چلنے والوں کو، اُن کی روش کے تباہ کُن نتائج سے آگاہ کر دے۔ اور جماعتِ مومنین کو اُن کے فرائضِ زندگی کی یاد دلاتا رہے، اور اس طرح یہ اُن کے لئے شرف و عروج کا باعث بن جائے۔

اس فریضۂ تبلیغ کی ادائیگی میں بڑی مشکلات کا سامنا ہوگا، لیکن اس کی وجہ سے تمہیں قطعاً گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ راستے کی مشکلات تو ضرور ہوں گی، لیکن منزل پر پہنچ کر ہر قسم کی آسائشیں اور خوشگواریاں میسر آئیں گی۔ (۶/۲) ، (۲۰/۲)۔

نازل ہونے کی اہمیت قرآنِ کریم کے لئے لفظ نزول آیا ہے۔ اس میں بھی ایک خاص معنوی حقیقت مضمر ہے۔ وحی کے متعلق سابقہ جلدوں میں لکھا جا چکا ہے کہ اس سے مراد وہ علم ہے جو حضراتِ انبیاءؑ کرام کو خدا کی طرف (یعنی خارج) سے ملتا تھا۔ انسانی علم اس کے اپنے فہم و ادراک کا نتیجہ ہوتا ہے۔ عام الفاظ میں یوں سمجھئے کہ وہ علم داخلی (SUBJECTIVE) ہوتا ہے۔ یعنی انسان کے اندر سے باہر آتا ہے۔ اس کے برعکس وحی کا علم خارجی (OBJECTIVE) ہوتا ہے یعنی یہ انسان کے اندر سے باہر نہیں آتا۔ باہر سے اندر جاتا ہے۔ اُوپر سے نیچے آتا ہے۔ اسے عربی زبان میں نزول (نازل ہونا) کہتے ہیں۔ لہذا ایک لفظ (انزل) سے علمِ وحی کی خصوصیت واضح ہو جاتی ہے۔ بنا بریں "كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ" کے معنی ہوئے "یہ وہ کتاب ہے جو، اے رسولؐ! تجھے بذریعہ وحی

ملی ہے۔"

آیت کا اگلا ٹکڑا ہے فَلَا یَكُنْ فِیْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ ۔ حَرَجٌ کے معنی ہوتے ہیں اضطراب، عدمِ اطمینان، کبیدگیٔ خاطر، احساسِ مشقت۔ آیت کے یہ معنی نہیں کہ رسول اللہؐ سے کہا گیا ہے کہ تم قرآن کی وجہ سے اپنے دل میں کبیدگی پیدا نہ ہونے دینا ——— سورہ طٰہٰ میں ہے: مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓی (۲/۲۰) "اے رسولؐ! ہم نے یہ قرآن تیری طرف اس لئے نازل نہیں کیا کہ اس کی وجہ سے زندگی تجھ پر بارِ گراں بن جائے"۔ آیت (۲/۷) کا مطلب یہ ہے کہ جو انقلابی پروگرام اس کتاب میں دیا گیا ہے، اسے بروئے کار لانے کے لئے بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ راستہ بڑا دشوار گزار ہوگا۔ لیکن قرآن تمہارے اندر ایسا انقلاب پیدا کر دے گا کہ تم ان مشکلات اور تصادمات سے قطعاً نہیں گھبراؤ گے۔ تم میں انہیں بطیبِ خاطر برداشت کرنے کی ہمت پیدا ہو جائیگی مشکلات اور تزاحمات کو اس طرح بطیبِ خاطر اور خندہ جبینی سے برداشت کرنے کی صلاحیت کو قرآن نے شرحِ صدر (سینے کی کشاد) کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ جب حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا گیا کہ جاؤ اور فرعون سے ٹکر لو، تو آپ نے دعا کی تھی کہ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ (۲۶/۲۰)۔ "اے میرے نشوونما دینے والے! میرے سینے میں ایسی کشاد پیدا کر دے کہ میں ان مشکلات کا دل کے پورے اطمینان سے مقابلہ کر سکوں اور کسی مقام پر گھبرا نہ جاؤں"۔ اور یہی شرحِ صدر تھی جس سے حضور نبی اکرمؐ کو اس وقت نوازا گیا تھا جب آپ کو ایک عالمگیر انقلاب برپا کرنے کے لئے مامور کیا گیا تھا، اور جس کا تذکرہ اس انقلابی پروگرام کی کامیابی کے بعد ان الفاظ میں کیا گیا تھا کہ

شرحِ صدر

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۙ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۙ الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۙ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۙ (۱-۴/۹۴)

اے رسولؐ! ذرا سوچو کہ اس عظیم پروگرام کے آغاز میں، آنے والی مشکلات کس قدر ہمت شکن تھیں، لیکن تمہیں ایسی کشادِ قلب عطا ہوئی کہ جو مہم پہلے ناقابلِ تسخیر نظر آتی تھی، وہ نہایت آسان ہوگئی، اور ذمہ داریوں کے احساس کے جس بوجھ سے تمہاری کمر ٹوٹ رہی تھی، وہ کس قدر ہلکا ہوگیا! اور تمہارا نام اور تمہارے پروگرام کی عظمت تا بہ ثریا پہنچ گئی۔

اس کے بعد ایک اصول بیان فرمایا کہ:

فَاِنَّ مَعَ الۡعُسۡرِ یُسۡرًا ۙ﴿۵﴾ اِنَّ مَعَ الۡعُسۡرِ یُسۡرًا ؕ﴿۶﴾ ($\frac{94}{5-6}$)

یاد رکھو! کامیابیاں اور کامرانیاں، مشکلات برداشت کرنے کے بعد ہی حاصل ہوا کرتی ہیں۔ یہ ہمارا اٹل قانون ہے۔

اس پروگرام کے راستے میں جن جانگسل مشکلات کا ذکر کیا گیا ہے، وہ تیغ وسنان کے زخم ہی نہیں تھے طنز وطعن کے تیروں کی بوچھاڑ بھی تھی۔

طعن و تشنیع کے نشتر

جھوٹے الزامات، کذب وافترا پر مبنی اتہامات، حتٰی کہ منافقین کی طرف سے سوقیانہ حربے۔ حضور نبی اکرمؐ کے سینے میں بھی ایک انسان کا دل تھا جس کا ان یورشوں سے متاثر ہو جانا بعید نہیں تھا۔ لیکن جگر شگاف طعن وتشنیع سے ملول خاطر ہو جانا اور بات ہے اور ان کی وجہ سے بددل ہو جانا اور ہمت ہار دینا اور بات۔ قرآنی تعلیم پر عمل پیرا ہونے سے جو کشادِ قلب (شرحِ صدر) حاصل ہوتی ہے، وہ انسان کو ہمت نہیں ہارنے دیتی۔ ایسے ہی مقامات تھے جن کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا:

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعۡضَ مَا یُوحٰۤی اِلَیۡكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدۡرُكَ اَنۡ یَّقُوۡلُوۡا لَوۡلَاۤ اُنۡزِلَ عَلَیۡهِ كَنۡزٌ اَوۡ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَاۤ اَنۡتَ نَذِیۡرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ وَّكِیۡلٌ ؕ﴿۱۲﴾ ($\frac{11}{12}$) (نیز $\frac{15}{97}$، $\frac{16}{127}$)

(اس میں شبہ نہیں کہ ان لوگوں سے جو کہا جاتا ہے کہ ان پر تباہی آنے والی ہے، تو یہ بات انہیں سخت ناگوار گزرتی ہے۔ لیکن) یہ تو نہیں ہو سکتا کہ تو، ان کی دلجوئی کے لئے، وحی کے ان مقامات کو چھوڑ دے جن میں اس قسم کی تنذیرات آتی ہیں۔

معجزات طلبی

یہ بھی ٹھیک ہے کہ یہ لوگ جب کہتے ہیں کہ اگر تو خدا کا رسولؐ ہے تو تجھ پر خزانے کیوں نہیں اتارے جاتے۔ یا فرشتے تیرے جلو میں کیوں نہیں چلتے، تو ان کی، طعن آمیز باتوں سے تو افسردہ خاطر ہو جاتا ہے۔ لیکن تو جب فریضۂ رسالت وانذار کے لئے مامور کیا گیا ہے تو یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑے گا۔ (یہ ذمہ داری بڑی سخت اور یہ فریضہ بڑا مشکل ہے۔ لیکن اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں) اللہ کا قانون ہر معاملہ کی کارسازی کا سامان اپنے اندر رکھتا ہے (اس لئے مآلِ کار، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ $\frac{94}{1-3}$) - ($\frac{11}{12}$)

ان آیات میں تخاطب تو حضور نبی اکرمؐ سے ہے، لیکن ان کا اصولی اطلاق جماعتِ مومنین پر بھی

ہوتا ہے۔ (مثلاً) جسطرح حضورؐ سے کہا گیا کہ یہ قرآن اس لئے نازل کیا گیا ہے کہ تصادمات و مزاحمات میں تمہارے دل میں اضطراب اور پست حوصلگی پیدا نہ ہو۔ اسی طرح جماعتِ مومنین سے کہا گیا کہ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ط (۲۲/۷۸) "تمہارے لئے اس دین کا انتخاب اس لئے نہیں کیا گیا کہ تم مصیبتوں میں پھنس جاؤ۔ اس سے تمہیں دنیا اور آخرت کی حفاظت حاصل ہوگی"۔ یہ اس لئے کہا کہ اسلامی انقلاب کے لئے شرحِ صدر لاینفک ہے فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ج (۶/۱۲۶)۔ (نیز ۳۹/۲۲)۔ قرآن کریم کے متعلق جو کہا ہے: شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ (۱۰/۵۷)۔ "یہ جملہ نفسیاتی امراض کے لئے شفا کا ضامن ہے"، تو اس سے مراد اسی قسم کے امراض ہیں۔

قرآنی تعلیم و تربیت سے کشادِ قلب اور وسعتِ نگاہ پیدا ہوتی ہے۔ جس سے انسان کے حوصلے بڑھتے اور ہمتیں جوان ہو جاتی ہیں۔

جیسا کہ سابقہ جلدوں میں بتایا جا چکا ہے۔ (دیکھئے جلد دوم صفحہ ۴۳۴، جلد سوم صفحہ ۲۶) حضورؐ کی "کبیدگیٔ خاطر" کی ایک اور نوعیت کا ذکر بھی قرآنِ کریم میں آیا ہے۔ اسے کبیدگیٔ خاطر نہیں، بلکہ دلسوزی اور رقّتِ قلبی سے تعبیر کیا جائے گا۔ جب حضورؐ دیکھتے کہ ان کے مخالفین، اس قدر تنذیرات و تنبیہات کے باوجود تباہی کے جہنم کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں، تو ان کے انجام کے تصور سے حضورؐ کو دلی صدمہ ہوتا۔ [دیکھئے آیات (۵/۱۸)؛ (۱۸/۴)؛ (۲۶/۳) (۳۵/۸)] غور فرمائیے کہ ایک رسولؐ (اور رسولوںؑ کے اتباع میں ایک مصلحِ مشفق) کی زندگی بھی کیا ہوتی ہے؟ مخالفین گالیاں دیتے اور پتھر مارتے ہیں، اور یہ اُن کی تباہی کے احساس سے خون کے آنسو روتے ہیں!

زیرِ نظر آیت (۷/۲) میں لِتُنْذِرَ بِهٖ آیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ حضورؐ قرآن ہی کی تعلیم دیتے تھے، اور اسی کے ذریعے فریضۂ تنذیر ادا فرماتے تھے۔

قرآن کو ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ کہا گیا ہے (۷/۲)۔ ذکر کا مفہوم سابقہ جلدوں میں آچکا ہے۔ (دیکھئے انڈکس)

اس کے بعد فرمایا:

(۷/۳) اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ط قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ (۷/۳)۔

اے جماعتِ مومنین! تم اس ضابطۂ قوانین (قرآن) کا اتباع کرو جسے تمہارے نشو ونما دینے والے نے تمہاری طرف نازل کیا ہے، اور اس کے سوا کسی کارساز و رفیقِ کار کا اتباع مت کرو۔ (انسانوں کے لئے صحیح روشِ زندگی یہی ہے۔ لیکن) بہت تھوڑے ہیں جو اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ (وہ ہدایتِ خداوندی کے ساتھ انسانوں کے فیصلوں کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ یہ شرک ہے)۔ { (۱۲/۱۰۶) ؛ (۱۷/۴۶) ؛ (۳۹/۴۵) ؛ (۴۰/۱۲) }

اتباع اور اطاعت میں فرق

قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کا مقصد ان کی اطاعت کرنا ہے۔ اس کیلئے اطاعت اور اتباع کے الفاظ آئے ہیں۔ مفہوم تو اتباع کا بھی اطاعت ہی ہے، لیکن ان میں ایک لطیف سا فرق ہے۔ اطاعت: اُن احکام کی کی جاتی ہے جو کسی اتھارٹی کی طرف سے صادر ہوں (مطالب الفرقان جلد چہارم کے انڈکس میں "اللہ اور رسولؐ"، "حکومت" اور "اسلامی نظام" کے عنوانات دیکھئے)۔ اِن سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ الدّین، قرآنی نظام کا نام ہے جس میں اطاعت اُن احکام کی کی جاتی ہے جو اس نظام کی مرکزی اتھارٹی کی طرف سے نافذ ہوتے ہیں۔ اس لئے اَطَعْنَا کے ساتھ سَمِعْنَا کو لازم قرار دیا گیا ہے۔ یعنی "ہم نے سُنا اور اطاعت کی"۔ (۵/۷ ؛ ۲/۲۸۵ ؛ ۲۴/۵۱ ؛ ۶۴/۱۶) اس نظام کی اطاعت کو قرآن نے "اللہ اور رسولؐ" کی اطاعت کہہ کر پکارا ہے۔ جلد چہارم میں اس موضوع پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ { دیکھئے بالخصوص (۳/۳۱ ؛ ۴/۵۹ ؛ ۴/۸۰ ؛ ۵/۷ ؛ ۵/۳۳) کی تشریحات }

اتباع کے معانی

اتباع کا مفہوم سمجھنے کے لئے یہ دیکھئے کہ عرب اِس لفظ کو کس مقام پر استعمال کرتے تھے۔ جس طرح ایک نوزائیدہ بچھڑا اپنی ماں (گائے) کے پیچھے پیچھے چلتا ہے، اسے وہ اتباع سے تعبیر کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ بچھڑا کسی خارجی حکم کی اطاعت کرتا ہُوا اپنی ماں کے پیچھے پیچھے نہیں چلتا۔ یہ اُس کی اندرونی کشش کا تقاضا ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم کے متعیّن کردہ راستے پر اس قسم کی کشش اور اندرونی تقاضا کی رُو سے چلنے کا نام اتباعِ قرآنی ہوگا۔ جس طرح جب آپ کو پیاس لگتی ہے تو آپ اُٹھ کر پانی پیتے ہیں۔ آپ ایسا کسی کے حکم کی اطاعت کی رُو سے نہیں کرتے۔ اپنے اندرونی تقاضے کی رُو سے کرتے ہیں۔ اسے اتباع کہتے ہیں۔ انسان اپنے جذبات کا اتباع کرتا ہے اور حکمرانوں کے حکم کی اطاعت۔ یہ نکتہ بڑا لطیف ہے کہ قرآن کے لئے اطاعت کا لفظ کہیں نہیں آیا۔ اِتباع کا لفظ ہی آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مجرد کتاب کی اطاعت نہیں کی جاسکتی۔ اِس کی اطاعت ایک اتھارٹی کی رُو سے ہی کی جاسکتی ہے۔ اس کے برعکس قرآن ہدایت (یعنی راہ نمائی) عطا کرتا ہے۔ ایک راہرو جو سمجھ سوچ کر کسی راہ نما کے پیچھے چلتا ہے، تو وہ اس کے کسی حکم کی اطاعت نہیں کرتا۔ وہ خود اپنے اندرونی تقاضا

کی رُو سے ایسا کرتا ہے۔ اِس کو اتباع کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے ملّتِ ابراہیمی کے اِتباع کا حکم دیا ہے (۴/۱۲۵)۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس روش پر حضرت ابراہیمؑ گامزن رہے تھے، تم بھی اُس کی پیروی کرو۔ اُنہوں نے اپنے اور بیگانے کا معیار یہ قرار دیا تھا کہ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّہٗ مِنِّیْ ج (۱۴/۳۶)، ''جو میرا اتباع کرتا ہے، وہ میرا ہے''۔ یہی اُمّتِ مسلمہ کی تشکیل کا بنیادی نکتہ ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، اطاعت کسی حکم کی کی جاتی ہے۔ اگرچہ خود لفظِ اطاعت میں بھی، بطیبِ خاطر تعمیل کا پہلو مضمر ہوتا ہے، لیکن حکومت کے احکام کی اطاعت، میکانکی طور پر بھی کی جا سکتی ہے، اور یہ اطاعت قانونی تقاضا پورا کر دیتی ہے۔ لیکن انسانیت کے بیشتر تقاضے ایسے ہیں جو اس قسم کی اطاعت کے دائرے میں آ ہی نہیں سکتے۔ (مثلاً) قرآنِ کریم میں ہے کہ یَعْلَمُ خَآئِنَۃَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ (۴۰/۱۹)۔ ''خدا تمہاری نگاہ کی خیانت اور دل میں پوشیدہ ارادوں اور خواہشات تک کو جانتا ہے''۔ دُنیا کا کون سا قانون ہے جو نگاہ کی خیانت اور دل کے مخفی ارادوں پر لاگو ہو سکے؟ اور کون سا نظام ہے جو ان کی گرفت کر سکے۔ اِس کے لئے تو انسان کے اندر ایک تبدیلی کی ضرورت ہے جس کی رُو سے اس قسم کی خیانت اور تخریبی ارادوں سے باز رہنا اس کا اندرونی تقاضا بن جائے۔ یا (مثلاً) اس قسم کی ہدایات کہ بوڑھے ماں باپ سے درشت کلامی سے پیش نہ آؤ: فَلَا تَقُلْ لَّھُمَآ اُفٍّ (۱۷/۲۳)۔ یا (مثلاً) چلّا کر نہ بولو: وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِکَ (۳۱/۱۹)۔ اور اکڑ کر مت چلو (لَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا (۳۱/۱۸)) اس قسم کی ہدایات پر قانوناً یا حکماً عمل نہیں کرایا جا سکتا۔ ان کا اتباع اندرونی تقاضا ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ قرآنِ کریم نے جو کہا ہے: اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ (۱۳/۱۱)۔ ''خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے اندر تبدیلی نہ پیدا کرے''۔ تو اس ''اندرونی تبدیلی'' کا مظاہرہ اِتباعِ ہدایتِ خداوندی کی شکل میں ہوتا ہے۔ احکام کی اطاعت سے معاشرتی نظم و نسق قائم رہ سکتا ہے لیکن قوم میں حقیقی تبدیلی اِتباع ہی سے ہو سکتی ہے۔ قرآنی نظام میں، اطاعت اور اتباع دونوں لازمی ہیں —— یعنی ایک زندہ اتھارٹی کی طرف سے صادر کردہ احکامِ خداوندی کی اطاعت اور قلبی تقاضا کی رُو سے منشائے خداوندی کی تکمیل۔ اسلام کے صدرِ اوّل میں جو نظام قائم ہوا تھا، اس میں یہ دونوں چیزیں موجود تھیں۔ بعد میں جب اس نظام کی جگہ ملوکیت نے لے لی تو اسلام کا نظام ہی ختم ہو گیا۔

عہد ملوکیت میں اسلام باقی نہ رہا

سلاطین نے اپنے احکام منوانے شروع کر دیئے۔ مذہبی پیشوائیت نے اِطاعتِ ''خدا و رسولؐ'' کا مفہوم

اس طرح بدلا کہ اس میں نظام (یا زندہ اتھارٹی) کی ضرورت ہی نہ رہی۔ انہوں نے کہا کہ "اللہ کی اطاعت" سے مراد ہے کتاب اللہ کی اپنے اپنے طور پر اطاعت، اور "اطاعتِ رسولؐ" سے مراد ہے احادیث کی اطاعت۔ اس میں سمعنا (ہم نے سنا) کی ضرورت ہی نہ رہی۔ اس طرح دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ مذہب پر عمل پیرا ہونے کے لئے فقہ کے قوانین مرتب کئے گئے اور عقیدہ یہ پیدا کیا گیا کہ احکامِ فقہ کی اطاعت، خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے مرادف ہے۔ اس سے تھیاکریسی وجود میں آگئی اور امت فرقوں میں بٹ گئی۔ باقی رہا اتباع تو اس کے لئے بزرگوں کے نقوشِ قدم کی پیروی شروع ہو گئی (یعنی مسلکِ اسلاف اور مرشدانِ طریقت کے منہاج کی پیروی)۔

اور یہی ہے وہ اسلام جو آج تک رائج چلا آرہا ہے۔ قرآن کریم نے اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ کے مثبت حکم سے، اتباع کے لئے، صرف کتاب اللہ میں عطا فرمودہ راستہ بتایا تھا۔ اور وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ کے منفی حکم سے، کتاب اللہ کے سوا، ہر مسلک و مشرب کے اتباع کی مخالفت کی تھی۔ لیکن مروجہ اسلام میں قرآن کریم تو محض تلاوت کے لئے رہ گیا ہے، اور اتباع کے لئے اپنی اپنی پسندیدہ شخصیتیں مقرر کر لی گئیں ("اولیاء" کا مفہوم مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۴۴۴ پر واضح کیا گیا ہے)۔

حضورؐ بھی قرآن کا اتباع کرتے تھے

یاد رکھیئے! اسلام نام ہے اس نظام کی اطاعت کا جو کتاب اللہ کے احکام کو نافذ کرے، اور اس راستے کا اتباع جو قرآن میں متعین کیا گیا ہے۔ حضور نبی اکرمؐ بھی قرآن کریم کا اتباع کرتے تھے۔ ارشاد ہے: اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ (۶/۱۵)۔ "میں صرف اس کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے"۔ اور اس کی خلاف ورزی سے جو عذابِ خداوندی وارد ہوتا ہے، اس سے خائف رہتے تھے (۶/۱۵)۔ حضورؐ کو اسی کا حکم دیا گیا تھا: وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ (۱۰/۱۰۹)۔ "اے رسولؐ! جو تیری طرف وحی کیا جاتا ہے، اس کا اتباع کیا کرو" (نیز ۶/۱۰۶)۔ اسی راستے کے اتباع کو حضورؐ نے صراطِ مستقیم کا اتباع قرار دیا جب فرمایا:

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۶/۱۵۴)۔

(ان سے کہہ دو) یہ ہے تمہارے خدا کی مقرر کردہ، توازن بدوش راہ، جو تمہیں سیدھی منزلِ مقصود تک لے جائے گی۔ میں بھی اسی راہ پر چلتا ہوں۔ تم بھی اسی پر چلو (اسی کا اتباع کرو) اسے چھوڑ کر اور راستوں کو اختیار نہ

کرو۔ وہ تمہیں خدا کی راہ سے الگ کر دیں گے۔ اُس نے تمہیں اس کا اس لئے حکم دیا ہے کہ تم زندگی کے تمام خطرات سے محفوظ رہ کر، امن و سلامتی سے اپنے نصب العین تک پہنچ جاؤ۔

اسی کا نام اتباعِ سنتِ رسول اللہ ہے۔ (اس کی تشریح پہلے باب میں زیرِ آیت (۶/۱۵۴) گزر چکی ہے)۔ باقی رہا اسلاف کے راستے کا اتباع، سو قرآنِ کریم نے اس سے سختی سے منع کیا ہے۔ اس مسلک کے متبعین

اسلاف کے مسلک کا اتباع

کے متعلق فرمایا: وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (۲/۱۷۰) "ان لوگوں کے پاس اپنے غلط نظام کی سند صرف یہ ہے کہ یہ نظام اُن کے اسلاف سے متوارث چلا آرہا ہے۔ سوچئے کہ یہ بھی کوئی سند ہے؟ یاد رکھئے! غلط اور صحیح، حق اور باطل کی سند اور معیار صرف یہ ہے کہ خدا کی کتاب کا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن یہ کبھی اُسے معیار تسلیم نہیں کریں گے۔ چنانچہ جب ان سے کہا جائے گا کہ جو کچھ خدا نے (قرآن میں) نازل کیا ہے، اُس کا اتباع کرو، تو یہ کہیں گے کہ نہیں! ہم اُسی کا اتباع کرینگے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو چلتے دیکھا ہے ——— یعنی خواہ ان کے اسلاف نہ عقل و بصیرت رکھتے ہوں اور نہ ہی وحی کے صحیح راستے پر گامزن ہوں، یہ پھر بھی انہی کے نقشِ قدم پر چلتے رہیں گے! (۵/۱۰۴؛ ۱۰/۷۸؛ ۱۱/۶۲؛ ۱۱/۸۷؛ ۲۱/۵۳؛ ۲۳/۲۴؛ ۳۴/۴۳؛ ۳۸/۷؛ ۴۳/۲۲)"۔ (مزید تفصیل "تقلید" کے عنوان کے تحت دیکھئے)۔

انسان شخصیتوں کا اتباع اُن جذبات کی رُو سے کرتا ہے جو ان شخصیتوں کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ قرآنِ کریم، ان جذبات کے اتباع کو، جو ہدایتِ خداوندی کے خلاف ہوں، انتہائی ضلالت قرار دیتا ہے: وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ (۲۸/۵۰)۔ "اس سے زیادہ راہ گم کردہ کون ہوگا جو ہدایتِ خداوندی کے علی الرغم اپنے جذبات کا اتباع کرتا ہے"۔

"اولیاء" کی تشریح مطالب الفرقان جلد سوم (صفحہ ۴۴) میں آچکی ہے جہاں زیرِ نظر آیت (۷/۳) بھی درج ہے۔ قرآن نے جو کہا ہے کہ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ تو اس سے واضح ہے کہ قرآنِ مجید کے سوا کسی کا اتباع بھی جائز نہیں خواہ وہ کتنی بڑی شخصیت کیوں نہ ہو۔ اس سلسلہ میں آیات (۱۲/۴۰؛ ۱۲/۱۰۶؛ ۱۷/۴۶؛ ۳۹/۴۵ اور ۴۰/۱۲) پر بھی ایک نگاہ ڈال لینی چاہیئے، جس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ اگر قرآنِ کریم کے سوا کسی کا بھی اتباع کیا جائے تو وہ شرک ہو جائے گا۔ دین میں سند اور حجت، اور قولِ فیصل صرف کتاب اللہ

کا ہے۔ اگر کسی انسان کے قول یا فعل کو یہ حیثیت دے دی جائے تو یہ شرک ہو جائے گا۔ قرآن، انسان پرستی کی جڑ کاٹنے کے لئے آیا تھا۔ اُس نے واضح طور پر کہا کہ جو قوم بھی اِس قسم کی روش اختیار کرے گی، تباہ ہو جائے گی۔ اقوامِ سابقہ کی تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے۔

۷/۴-۵ وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ ۝ فَمَا كَانَ دَعْوٰهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝

(ان سے پہلے) کتنی ہی بستیاں تھیں جنہیں (اُن کی غلط روی کی وجہ سے ہمارے قانونِ مکافات نے) ہلاک کر دیا یہ تباہی کسی قوم پر ایسے وقت میں آئی جب وہ لوگ رات کو (اطمینان سے) سو رہے تھے، اور کسی پر اس وقت جب وہ دوپہر کو آرام کر رہے تھے (یعنی وہ خوابِ غفلت میں پڑے تھے اور زندگی کے حقائق کی طرف سے یکسر غافل تھے۔

اقوامِ سابقہ پر تباہی

وہ اپنی دولت اور قوت کے نشے میں اس قدر بدمست تھے کہ اُنہیں اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ ان پر تباہی آئے گی۔ اور جو شخص انہیں اس سے متنبہ کرتا تھا، اس سے کہتے تھے کہ ہم کون سے ایسے بُرے کام کرتے ہیں جن کی وجہ سے ہم پر تباہی آئے گی (۲/۱۱) لیکن جب اُن پر تباہی کا عذاب آیا تو اُن کی آنکھ کھُلی، اور وہ بے ساختہ پکار اُٹھے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم واقعی ظلم اور زیادتی پر اترے ہوئے تھے (۲۱/۱۱-۱۵)

قوموں کی تباہی کے اسباب و علل اور اُن کے عروج و زوال کے ابدی اصولوں کے متعلق سابقہ جلدوں میں تفصیلی بحث آچکی ہے۔ (انڈکس جلد سوم میں دیکھئے عنوانات ”استبدال و استخلافِ قومی“ اور ”قوموں کے عروج و زوال کے ابدی اصول“ اور انڈکس جلد چہارم میں عنوان ”اقوام کے استبدال کا قانون“)۔ ان کے علاوہ مندرجہ ذیل آیات پر بھی ایک نگاہ ڈال لیجئے: (۵/۵۴ و ۹/۳۸-۳۹؛ ۱۱/۵۷؛ ۲۱/۱۱-۱۵؛ ۲۸/۵۸؛ ۲۹/۳۸؛ ۴۰/۸۲؛ ۴۵/۲۳؛ ۴۶/۲۶؛ ۵۹/۲ اور ۷۰/۴۰-۴۲)

ان میں آیات (۲۱/۱۱-۱۵) کا تعلق براہِ راست اس موضوع سے ہے جس کا ذکر آیۂ زیرِ نظر (۷/۴) میں کیا گیا ہے، اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ان آیات اور ان کے مفہوم کو یہاں پیش کر دیا جائے اس سے بات واضح تر ہو جائے گی۔ فرمایا:

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝
فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ۝ؕ لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا
اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْئَلُوْنَ ۝ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ
اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا
خٰمِدِيْنَ ۝ (۲۱/۱۱-۱۵)

تباہی کا عبرت آموز نقشہ

(اگر تم نے اپنی زندگی کا نقشہ نظامِ خداوندی کے مطابق کر لیا، تو تمہیں رفعت و عظمت حاصل ہو جائے گی۔ اگر اس کے خلاف چلے، تو تم بھی اُسی طرح تباہ و برباد ہو جاؤ گے جس طرح) ہم نے (تم سے پہلے) کتنی ایسی قوموں کو تباہ کر دیا جنہوں نے ظلم پر کمر باندھ رکھی تھی۔ اور پھر، اُن کے بعد، ان کی جگہ، دوسری قوموں کو اٹھا کھڑا کیا۔ (۲۱/۱۱)

(اُن کی غلط روش کے نتائج، غیر محسوس طور پر مرتب ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اُنہیں اُن کے انجام سے آگاہ کیا جاتا تھا کہ وہ اُس روش سے باز آ جائیں، لیکن وہ اس تنبیہ پر کان نہیں دھرتے تھے۔ چنانچہ وہ غیر محسوس نتائج، آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے، حتّٰی کہ) جب وہ محسوس طور پر سامنے آ گئے تو وہ لگے بھاگنے (۷/۱۸۲؛ ۱۶/۲۶)۔ (۲۱/۱۲)۔

(لیکن اُس وقت بھاگنے کا کونسا موقع تھا۔ چنانچہ ہمارے قانونِ مکافات نے اُنہیں للکارا اور کہا کہ) اب کہاں بھاگ کر جا سکتے ہو؟ مت بھاگو۔ اب اُلٹے پاؤں اِنہی عیش سامانیوں کی طرف چلو (جن کی سرشاریاں تمہیں اس طرح مدہوش کئے تھیں) اور اپنے اُن محلات کی طرف پلٹو (جن کے اندر تم اپنے آپ کو اس قدر محفوظ سمجھا کرتے تھے)۔ وہاں چلو، تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ یہ کچھ کس کی محنت سے بنا تھا۔ اور تمہارا اس پر کیا حق تھا؟ (۱۰۲/۸) — (۲۱/۱۳)

اُس وقت اُنہیں، اس حقیقت کا اعتراف کئے بغیر چارہ ہی نہ تھا کہ وہ واقعی ظالم تھے، اور اپنے کئے پر سخت متاسف۔ (۲۱/۱۴)

(لیکن اس وقت اس تاسف سے کیا ہو سکتا تھا؟ جب نتائج مرتب ہو کر سامنے آ جائیں تو پھر وہ پلٹا نہیں کرتے)۔ چنانچہ وہ برابر چلّاتے رہے کہ جو زیادتیاں اُنہوں نے کی ہیں، اُن پر وہ بے حد متاسف ہیں، لیکن ہمارے قانونِ مکافات نے اُنہیں ایسے کر دیا جیسے کٹا ہوا کھیت، جس میں بڑھنے، پھولنے، پھلنے

کی صلاحیت باقی نہ رہے۔ (یا بجھا ہوا شعلہ جس میں زندگی کی حرارت ختم ہو جائے۔ ۳۶/۲۸) ..... (۲۱/۱۵)"
یہ ہوتا ہے حشر اُن اقوام کا جو قوانینِ خداوندی سے سرکشی اختیار کرتی ہیں۔

تباہی سے پہلے شرائط

قرآنِ کریم نے متعدد مقامات میں بتایا ہے کہ کسی قوم کی تباہی سے پہلے دو شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے۔ یعنی (۱) اُن تک خدا کا پیغام پہنچ چکا ہو۔ (۲) ان میں اس کے سمجھنے کی صلاحیت ہو۔ تفصیل ان اُمور کی مطالب الفرقان جلد چہارم (آیت ۴/۱۶۵ صفحہ ۱۴۴[1] آیت ۵/۱۹ صفحہ ۴۸۴) میں گزر چکی ہے۔ اِس مقام پر اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

۷/۶ فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝

یقیناً ہم اُن سے بھی پوچھیں گے جن کی طرف ہم نے اپنے پیغامبروں کو بھیجا تھا (کہ تم نے اِس پیغام کو سننے کے بعد کیا کیا تھا)۔ اور خود رسولوں سے بھی پوچھیں گے (کہ تمہاری دعوت کا جواب کیا ملا تھا؟

"جن کی طرف رسولوں کو بھیجا گیا تھا" میں دونوں گروہ آ گئے۔ ایک وہ جنہوں نے اس پیغام کے ماننے سے انکار کر دیا تھا، اور دوسرا گروہ اُن لوگوں کا جنہوں نے اسے تسلیم کر لیا تھا۔ ان کے ذمہ یہ فریضہ بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ اس پیغام کو اُن لوگوں تک پہنچائیں، جن تک یہ پہنچ نہ چکا ہو۔

جماعت مومنین کی ذمہ داری

غور کیجئے کہ جماعتِ مومنین پر یہ کس قدر عظیم ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ختمِ نبوّت کے بعد، وہ تمام ذمہ داریاں جو رسولوں پر عائد ہوتی تھیں، اس اُمت پر عائد ہو گئیں، کیونکہ اسے کتاب اللہ کا وارث قرار دیا گیا ہے۔ (۳۵/۳۲)

اِس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ رسولوں یا لوگوں سے اس طرح دریافت کرنے کے معنی یہ نہیں کہ خدا کو اس کا علم نہیں ہو گا۔ خدا کو تو ایک ایک بات کا علم ہوتا ہے۔ یہ دریافت کرنا کچھ اس طرح سمجھئے، جیسے عدالت میں ملزم سے اعترافِ جرم کرایا جاتا ہے، خواہ جج کو ذاتی طور پر اس کا علم بھی کیوں نہ ہو۔ اور قرآنِ کریم میں اس کے بیان کرنے سے مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو خدا کے قانون کا علم ہو جائے اور اپنی اپنی ذمہ داریوں کا احساس۔ فرمایا:

۷/۷ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ۝

---

[1] انڈکس جلد چہارم میں غلطی سے صفحہ کا نمبر ۱۴۱ لکھا گیا ہے۔ صحیح ۱۴۴ ہے۔ اسے درست کر لیجئے)

(اور یہ پوچھنا کچھ اس قسم کا نہیں ہوگا جیسے کوئی ناواقف کسی بات کو دریافت کر رہا ہو) ۔ یہ سب کچھ ہمارے علم میں ہے، کیونکہ ہم کسی وقت بھی غیر حاضر نہیں ہوتے ۔ ہم سب کچھ خود بتاویں گے (کہ انہوں نے کیا پہنچایا اور اُنہوں نے اِس کا استقبال کیسے کیا) ۔

ظہورِ نتائج کے وقت ہر انسان کے اعمال کے ذرّہ ذرّہ کا وزن ہوگا:

۷/۸-۹ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ○

ثقل و خفتِ موازین

(اس سے ظاہر ہے کہ جس جماعت کے ذمّے پیغام رسانی کا فریضہ عائد ہوتا ہے، اُس سے بھی پوچھا جائے گا کہ اُس نے اپنی ذمہ داریوں کو کس حد تک پورا کیا تھا) حقیقت یہ ہے کہ ظہورِ نتائج کے وقت، ہمارے قانونِ مکافات کی میزان، ہر ایک کے اعمال کا ٹھیک ٹھیک وزن بتا دیتی ہے ۔ جس کے مثبت، تعمیری اور صلاحیت بخش اعمال کا پلڑا بھاری ہوتا ہے۔ وہ کامیاب و کامران ہوتا ہے ۔ (۲۳/۱۰۱) اور جس کا وہ پلڑا ہلکا ہوتا ہے، تو یہی لوگ ہیں جو اپنی ذات کا نقصان کرتے ہیں ۔ اور یہ نتیجہ ہوتا ہے ہمارے قوانین سے سرکشی برتنے کا ۔

قانونِ مکافاتِ عمل کے سلسلہ میں سابقہ جلدوں میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے ۔ (دیکھئے انڈکس جلد سوم ۔ عنوانات "مکافاتِ عمل" اور "قانونِ مکافات" ۔ نیز انڈکس جلد چہارم، عنوان "مکافاتِ عمل") ۔ لیکن اِس آیت میں جو "میزان" کا ذکر آیا ہے تو اس میں ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے ۔

میزان سے مراد

نظامِ کائنات، قانونِ ارتقاء کے تحت جاری و ساری ہے ۔ اس قانون کی رُو سے ایک چیز (یا نوع) اپنے نقطۂ آغاز سے، ارتقاء کی مختلف منازل طے کرتی ہوئی، اپنے منتہیٰ تک پہنچتی ہے ۔ اس راستے کی ہر منزل میں اُس کا ٹکراؤ، تخریبی قوتوں سے ہوتا ہے ۔ اگر اس میں تعمیری قوتوں کا غلبہ ہے تو وہ تخریبی قوتوں کو شکست دے کر باقی بھی رہتی ہے، اور ارتقاء کی اگلی منزل کی طرف بڑھ بھی جاتی ہے (قرآنِ کریم اسے "حق و باطل کی کشمکش" کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے ۔ کشمکش کا یہی سلسلہ انسانی زندگی میں بھی جاری ہے ۔ تخریبی جراثیم ہر آن کروڑوں کی تعداد میں انسانی جسم پر حملہ آور ہوتے رہتے ہیں ۔ اگر اس فرد کی قوتِ مدافعت مستحکم ہے، تو وہ ان تخریبی عناصر کو شکست دے دیتی ہے ۔ اس سے اُس کی صحت قائم

رہتی ہے۔ اگر تخریبی قوتیں غالب آجاتی ہیں، تو وہ بیمار ہوجاتا ہے۔ علاج کے معنی ہوتے ہیں اُس کی مدافعت کی قوت میں اضافہ کرنا۔ اگر ایسا ہوجائے تو وہ تندرست ہوجاتا ہے۔ ورنہ بیماری بڑھتی جاتی ہے، اور آخرالامر اُس کی موت واقعہ ہوجاتی ہے۔

لیکن (جیسا کہ آپ سابقہ جلدوں میں دیکھ چکے ہیں) انسان صرف اُس کے طبیعی جسم سے عبارت نہیں جسم کے علاوہ اس کی ذات (نفس) بھی ہے۔ تعمیری اور تخریبی قوتوں کی کش مکش کا جو سلسلہ اس کے جسم میں جاری رہتا ہے، وہی اس کی ذات میں بھی ہنگامہ خیز رہتا ہے۔ اس کی تعمیری قوتیں، اعمالِ صالحہ (حسنات) سے مستحکم ہوتی ہیں، اور تخریبی قوتیں، اعمالِ سیّئہ (سیّئات) سے پرورش پاتی ہیں۔ اگر اُس کی تعمیری قوتیں غالب رہیں تو اُس کی ذات (جسے اقبالؒ خودی سے تعبیر کرتا ہے) محکم ہوجاتی ہے۔ اور اس قابل کہ وہ سلسلۂ ارتقاء کی اگلی منزل میں پہنچ جائے۔ (اسے جنّت کی زندگی کہا جاتا ہے)، اور اگر تخریبی قوتیں غالب رہیں، تو اُس کے ارتقاء کا سلسلہ رُک جاتا ہے، اور وہ منجمد ہوکر رہ جاتی ہے۔ (اسے جہنم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تفصیل ان امُور کی سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے۔ انڈکس میں متعلقہ عنوانات دیکھئے)۔

قرآنِ کریم اس کش مکش کو میزان کے پلڑوں کی نہایت بلیغ تشبیہ کی رُو سے سمجھاتا ہے۔ اگر تعمیری پلڑا بھاری ہوتا ہے (جھکتا ہے)۔ تو انسانی ذات مستحکم ہوتی ہے۔ اور آگے بڑھنے کے قابل۔ اگر یہ پلڑا ہلکا ہوتا ہے (اوپر اُٹھتا ہے)، تو وہ ناپختہ رہتی ہے۔ اس تشبیہ میں قانونِ ارتقاء کی ساری کارفرمائی آئینے کی طرح سامنے آجاتی ہے۔ اِس قانون کی رُو سے ایسا نہیں ہوتا کہ باقی وہی رہے اور آگے وہی بڑھے جو تخریبی عناصر سے پاک اور صاف ہو۔ تخریبی عناصر اس میں بھی ہوتے ہیں، لیکن وہ تعمیری عناصر کے مقابلہ میں کمزور ہوتے ہیں۔ اس لئے مغلوب رہتے ہیں۔ یہی کیفیت انسان کی ذات کی ہوتی ہے۔ (عام الفاظ میں یوں سمجھئے کہ اِس قانون کی رُو سے) جنت میں جانے کا اہل وہی نہیں ہوتا ہے جو بالکل معصوم ہو، جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ جس کا دامن کسی لغزش سے آلودہ نہ ہو۔ صاحبِ اختیار و ارادہ انسان سے غلطی کا سرزد ہوجانا عین ممکن ہے۔ سوال صرف یہ ہوتا ہے کہ اس کا غلطیوں کا وزن زیادہ ہے یا حُسنِ عمل کا وزن۔ اس لئے وہ مومنین کے متعلق کہتا ہے کہ

سوال معصوم ہونے کا نہیں

اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ط (۵۳/۳۲) "وہ بڑے بڑے گناہوں سے مجتنب رہتے ہیں۔ البتہ اُن سے خفیف سی لغزشیں کبھی کبھی سرزد ہوجاتی ہیں۔ (اُن کے

اعمالِ صالحہ، اُن لغزشوں کے نقصانات کا ازالہ کر دیتے ہیں)" وہ اس کے لئے " پلڑوں کے جھکنے اور اُٹھنے" کو معیار قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (۱۱/۱۱۴)۔ (نیز ۲۱/۱۳ ؛ ۷/۲۵ ؛ ۵۴/۲۸)۔ "حسنات کا جھکا ہوا پلڑا، سیّات کا ازالہ کر دیتا ہے۔"

اس حقیقت کو ایک اور مثال کی رُو سے سمجھئے۔ سکولوں اور کالجوں کے امتحانوں میں (PASS-MARKS) رکھے جاتے ہیں۔ "پاس مارکس" (مثلاً) اگر ساٹھ فی صد ہیں، تو جو طالب علم اتنے نمبر حاصل کر لیتا ہے، اُسے اگلی کلاس میں ترقی دے دی جاتی ہے، حالانکہ اُس کا چالیس نمبر کا پرچہ غلط ہوتا ہے۔ ساٹھ فی صد کی قابلیت، چالیس فی صد کی کمزوری کا ازالہ کر دیتی ہے۔

لیکن اس میں ایک نکتہ مزید غور کا متقاضی ہے۔ ان مضامین میں بعض لازمی (COMPULSORY) ہوتے ہیں جن میں پاس ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اگر کوئی طالب علم لازمی مضمون کے پرچہ میں فیل ہو جاتا ہے، تو اُس کے باقی پرچے دیکھے ہی نہیں جاتے۔ اس کی سب محنت رائیگاں چلی جاتی ہے۔

حبطِ اعمال

دین کی امتحان گاہ میں بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ اس میں جو شخص لازمی مضمون میں فیل ہو جاتا ہے، اُس کے سب اعمال رائیگاں چلے جاتے ہیں۔ قرآنِ کریم اسے حبطِ اعمال کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے (دیکھئے مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۳۰۷۔ آیت ۲/۲۱۷۔ اور جلد چہارم صفحہ ۵۴ آیت ۳/۲۱-۲۰)۔ جلد چہارم میں (ص ۴۶ پر) جو اہم آیت (۱۸/۱۰۵) درج کی گئی ہے، اس میں حبطِ اعمال کے بعد کہا گیا ہے: فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ——— "اُن کے اعمال تولنے کے لئے میزان بھی کھڑی نہیں کی جائے گی۔"

قرآنِ کریم نے مکافاتِ عمل کا اصول یہ بتایا ہے کہ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (۹۹/۷-۸)۔ "جو ذرّہ برابر بھی قانونِ خداوندی کا اتباع کرے گا، اس کے حسنِ عمل کا خوشگوار نتیجہ اُس کے سامنے آجائے گا، اور جو ذرّہ برابر قانون کی خلاف ورزی کرے گا، اس کی سزا پائے گا۔ ہر شخص کے اعمال کا ذرّہ ذرّہ اُس کے سامنے آجائے گا۔" اس اصول کی روشنی میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ وہ کون ہیں جن کے اعمال تولنے کے لئے میزان تک کھڑی کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی؟ یہ وہی ہیں جو لازمی مضمون میں فیل ہوں گے، یا اُنہوں نے ان مضامین میں امتحان ہی نہیں دیا ہوگا۔ دین کے نصاب میں یہ (لازمی) مضامین ہیں ——— توحید اور ایمان بالآخرت

توحید کے معنی یہ ہیں کہ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے ۔ جو کسی انسان کے لئے حقِ حکومت کو جائز سمجھتا ہے وہ اس مضمون میں فیل ہو جاتا ہے ۔ اور ایمان بالآخرت سے مراد یہ ہے کہ انسان کو اپنے ہر عمل کا نتیجہ بھگتنا ہو گا، خواہ وہ اس دنیا میں سامنے آجائے اور خواہ مرنے کے بعد آخرت میں ۔ یہ بھی لازمی مضمون ہے ۔ اور جو اس میں فیل ہو جاتا ہے ۔ اس کے اعمال کے تولنے کی ضرورت نہیں رہتی ۔ چونکہ اس کے نزدیک زندگی اسی دنیا کی زندگی ہے، اس لئے وہ اپنے اچھے کاموں کے ثمرات اسی دنیا میں لے لیتا ہے ۔ بغرضِ تفہیم کہا کہ

کفار کے نیک اعمال کا بدلہ!

یہ لوگ جب جہنم رسید کئے جائیں گے، تو کہیں گے کہ ہم نے دُنیا میں کچھ اچھے کام بھی تو کئے تھے ۔ ان کا بدلہ تو ہمیں ملنا چاہیئے ۔ اُن سے کہا جائے گا کہ اَذۡهَبۡتُمۡ طَيِّبٰتِكُمۡ فِىۡ حَيَاتِكُمُ الدُّنۡيَا وَاسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهَا ج (۴۶/۲۰) " تم دنیاوی زندگی ہی کو منتہیٰ سمجھا کرتے تھے، اس لئے تم نے اپنے اچھے کاموں کے نتائج اُسی زندگی میں دیکھ لئے ۔ تمہاری موت کے ساتھ تمہارے وہ اعمال بھی وہیں رہ گئے ۔ معاملہ ختم ہو گیا "{ آپ جلد چہارم صفحہ ۲۷۴ پر حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ کی تشریح ایک بار پھر دیکھئے ۔ نظر آجائے گا کہ ہمارا انعام کیا ہے ۔ ویسے میزان کا موضوع (۲۱/۴۷) ؛ (۲۳/۱۰۲) اور (۱۰۱/۹-۷) میں بھی آیا ہے }

بغاوت کا نتیجہ

ایک اور مثال اس سے بھی زیادہ نمایاں اور بلیغ ہے ۔ ایک شخص بڑا امن پسند ہے ۔ معاشرہ کے رفاہی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے، جس کی وجہ سے اُس کی بڑی عزت ہوتی ہے ۔ اُس کے خلاف بغاوت کا جُرم ثابت ہو جاتا ہے، جس کی سزا موت ہے ظاہر ہے کہ اس ایک جُرم کی بنا پر اُس کے ماضی کے تمام اچھے کام رائیگاں چلے جاتے ہیں ۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، توحید کے معنی یہ ہیں کہ حقِ حکومت صرف خدا (کی کتاب) کو حاصل ہے ۔ جو شخص اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے، وہ مملکتِ خداوندی کا وفادار شہری ہے ۔ جو اس کے ساتھ کسی انسان کی حکومت کو بھی شریک کرتا ہے اور انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو قوانینِ خداوندی کا درجہ دیتا ہے، وہ اس مملکت کے خلاف جرمِ بغاوت کا مرتکب ہوتا ہے ـــــ وَّلَا يُشۡرِكُ فِىۡ حُكۡمِهٖۤ اَحَدًا ۔ (۱۸/۲۶) " وہ اپنے حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا " انڈکس میں دیکھئے حکم اور حکومت کے عنوانات)

قرآنِ کریم کی اصطلاح میں اسے شرک کہا جاتا ہے، اور یہ ناقابلِ تلافی جُرم ہے ۔ (جلد سوم اور چہارم کے انڈکس میں عنوان " شرک " دیکھئے) ۔ یہ ہے وہ جُرم جس کے مرتکبین کے اعمال تولنے کے لئے میزان

تک کھڑی ہی نہیں کی جائے گی۔ وہ سب رائگاں جائیں گے۔ ہم (مسلمان) صدیوں سے انسانوں کی حکومت کے تابع زندگی بسر کرتے ہوئے، حکومتِ خداوندی کے خلاف جُرمِ بغاوت کے مرتکب ہوتے چلے

ہمارے اعمال

آرہے ہیں جس کی وجہ سے ہمارے وہ اعمال (نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ) جنہیں ہم بزعمِ خویش نیک اعمال سمجھ کرادا کرتے ہیں، نتیجہ خیز نہیں ہوتے۔ رائگاں چلے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ قانونِ خداوندی کی رُو سے اِن کے تولنے کے لئے میزان ہی کھڑی نہیں کی جاتی۔

گناہوں کی بخشش کا سوال ہی نہیں

آخر میں ایک مرتبہ پھر واضح کر دیا جائے کہ خُدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے، گناہوں کی معافی، بخشش، سفارش وغیرہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سوال، اعمال کے وزن کا ہے۔ جس کا اعمالِ حسنہ (قرآن کے مطابق اعمال) کا پلڑا بھاری ہے، وہ جنّت کا مستحق ہے۔ جس کا وہ پلڑا ہلکا ہے، وہ اس سے محروم رہے گا۔

ایک نکتہ اور ــــ آیت زیرِ نظر (۷/۹) میں کہا گیا ہے: فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ــــ نقصان اُن کی ذات (نفس) کا ہو گا۔ اُخروی زندگی میں نفع یا نقصان کا تعلق انسانی ذات سے ہوگا۔

ذات کا نقصان

انسان کی طبیعی زندگی اور اُس کے لوازمات یہیں رہ جائیں گے۔ اسی لئے ہم نے شروع میں کہا ہے کہ "نیک اعمال" وہ ہیں جن سے انسانی ذات کی نشوونما اور استحکام ہوتا ہے۔ "بُرے اعمال" وہ جن سے اس میں ضعف لاحق ہوتا ہے۔ خود لفظ "خسران" کے معنی کسی چیز میں کمی رہ جانے کے ہیں۔

اس کے بعد انسانی زندگی کے کوائف و ماجریات کو قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے لیکن تمہیدًا یہ کہا گیا ہے کہ

۷/۱۰ وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ع

یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم نے تمہیں زمین میں متمکّن کیا، اور اس میں تمہاری روزی کا سامان رکھ دیا۔ (یہ سب کچھ بلامزد

معاوضہ عطا کیا) لیکن تم میں بہت کم ہیں جو اس کے قدر شناس ہیں۔ (یعنی بجائے اس کے کہ اس سامانِ زیست کو عالمگیر انسانیت کی نشوونما کے لئے کھلا رکھیں، اسے فساد یعنی ناہمواریاں پیدا کرنے کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔)

نوعِ انسان کا تمکن فی الارض

اس آیت میں تخاطب تمام نوعِ انسان سے ہے۔ اس اعتبار سے جَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ کی حقیقت بڑی غور طلب ہے۔ ارض (زمین) ـــ تمام نوعِ انسان کے لئے سرچشمۂ رزق ہے۔ خاص افراد کے لئے نہیں۔ کوئی ایسا نظام جس میں کوئی فرد رزق سے محروم رہ جائے، منشائے خداوندی کے خلاف ہوگا۔ (انڈکس میں معاشی نظام کا عنوان دیکھئے)۔

اس کے بعد آیات (۷/۱۱) سے (۷/۲۴) تک ابلیس و آدم کا قصہ مذکور ہے۔ یہ داستان، سورہ بقرہ کی آیات (۲/۳۰) تا (۲/۳۹) میں آچکی ہے، جن کی تشریح مطالب الفرقان جلد دوم۔ صفحات ۷۲-۱۴۶ میں کی گئی ہے۔ اوران میں آیات (۷/۱۱-۲۴) بھی آگئی ہیں۔ لہٰذا ان آیات کی تشریح کی یہاں ضرورت نہیں، ان کا صرف مفہوم درج کر دیا جاتا ہے، اوران کے سامنے مطالب الفرقان جلد دوم کے صفحات کا حوالہ دیدیا گیا ہے، جہاں متعلقہ آیت کی تشریح ملے گی۔ ـــ {مفہوم آیات (۷/۱۱-۲۴)}:

۷/۱۱ یہ فساد کس طرح پیدا ہوتا ہے، اس کے لئے تم اپنی سرگزشت پر غور کرو۔ (جسے ہم قصۂ آدم کے عنوان سے پہلے بھی بیان کر چکے ہیں (۲/۳۰-۳۸) اور جسے مزید تصریحات کے ساتھ پھر دہراتے ہیں۔)

وہ سرگزشت یہ ہے کہ ہم نے تمہاری پیدائش کی ابتدا بے جان مادہ سے کی ہے (۲۳/۱۲)۔ پھر (زندگی کو مختلف ارتقائی مراحل سے گزارتے ہوئے اسے) پیکرِ بشریت میں لے آئے۔ پھر تم میں ایسی صلاحیتیں رکھ دیں جنکے سامنے کائناتی قوتیں جھک جائیں۔ (تم فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لو) لیکن، اس کے ساتھ، تمہارے جذبات بھی ہیں کہ (جن کی اگر صحیح تربیت نہ کی جائے تو وہ) تم سے سرکشی اختیار کر لیتے ہیں، اور تم اتنی بڑی قوتوں کے مالک ہونے کے باوجود، بے بس ہو کر رہ جاتے ہو۔

اسے تمثیلی انداز میں یوں سمجھو کہ ملائکہ سے ہم نے کہا کہ آدم کے سامنے جھک جاؤ، تو وہ جھک گئے، لیکن ابلیس نے جھکنے سے انکار کر دیا۔ (۷/۱۱)۔ {حوالہ۔ جلد دوم صفحہ ۹۸}

۷/۱۲ ہم نے اس سے پوچھا کہ جب ہم نے تجھے آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا، تو وہ کونسی بات تھی جس نے تمہیں اس حکم کی تعمیل سے باز رکھا؟ (۳۸/۷۵)۔ اس نے کہا کہ میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا، اور

اسے مٹی سے۔ (آب و گِل کے پیکرِ انسان پر، اُس کے تند و تیز جذبات غالب رہتے ہیں۔ لیکن جب وہ اپنے اندر، وحی کے اتباع سے شرفِ انسانیت کو بیدار کر لیتا ہے، تو پھر وہ ان جذبات سے مغلوب نہیں ہوتا (۱۵/۴۲-۴۴)

(حوالہ مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۰۰)

(۷/۱۳) ہم نے کہا کہ (یہ تمہاری غلط نگہی ہے)۔ یہ چیز (کہ تم میں تندیٔ سرکشی ہے) تمہاری بڑائی کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ تم اس زعمِ باطل کی وجہ سے اپنے مقام سے گر گئے۔ تم نے اپنے آپ کو ذلیل کر لیا۔ سو تم یہاں سے نکل جاؤ (یہاں انسان کے دو بنیادی غلط تصورات کی تردید کی گئی ہے۔ ایک یہ کہ پیدائشی امتیاز باطل ہے۔ اور دوسرے یہ کہ تعمیری کام کئے بغیر بڑائی کا دعویدار ہونا غلط ہے۔ تکبر بالحق جائز ہے۔ (۷/۱۴۶) ؛ (۴۱/۱۵) ؛ (۴۶/۲۰)۔

{حوالہ۔ مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۰۷}

(۷/۱۴-۱۵) اُس نے کہا کہ (اب اگر میرا اور آدم کا باہمی تصادم رہنا ہے تو) مجھے اُس وقت تک انسان کے ساتھ رہنے کی مہلت دے دے، جب تک یہ اپنے راستے سے اِن موانعات کو دور نہ کرے جو اسے آگے بڑھنے سے روکتے ہیں۔ اُس وقت اِسے ایسی حیاتِ نو مل جائے گی جس میں میرا غلبہ نہیں ہو سکے گا۔ یا جبتک یہ دنیا سے اُٹھا نہ لیا جائے۔ (جذبات کی سرکشی اُسی صورت میں دور ہو سکتی ہے کہ انسانی ذات میں اِس قدر استحکام پیدا ہو جائے کہ وہ انہیں غالب نہ آنے دے۔ یہ، اس دنیا میں، اِنسان کی حیاتِ نو ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر یہ جذبات مرتے دم تک غالب رہتے ہیں۔) (۷/۱۴)

جواب ملا کہ ہاں! تمہیں اُس وقت تک کی مہلت ہو گی (۱۵/۳۵-۳۹) ؛ (۳۸/۷۷-۷۹) (۷/۱۵)

{حوالہ۔ مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۰۸}

(۷/۱۶-۱۷) اُس نے کہا کہ تو نے جو مجھے گمراہ کر کے مجھ پر ہمیشہ کے لئے سعادت کی راہ بند کر دی ہے اور مجھے تباہ و برباد کر دیا ہے، تو میں بھی بنی آدم کی گھات میں بیٹھا رہوں گا کہ وہ اُس توازن بدوش راہ سے بھٹک جائیں جو تیری طرف لے جانے والی ہے۔ (۷/۱۶)

اس کے لئے میں ان پر ہر طرف سے یورش کروں گا ــــــ سامنے سے، پیچھے سے، دائیں سے اور بائیں سے پھر تو ان میں اکثر کو دیکھے گا کہ وہ تیری ان عنایات کے، جو تو نے ان پر ارزاں فرمائی ہیں، قدرشناس نہیں ہوں گے۔ (۱۵/۳۵-۳۸) ؛ (۱۷/۶۱-۶۲) ؛ (۳۸/۷۵)

{حوالہ۔ مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۰۰}

۷/۱۸ خدا نے کہا کہ تو اس حالت سے نکل جا۔ تو ذلیل و دھتکارا ہوا ہے۔ (سرکش جذبات، جو انسان کو شرفِ انسانیت سے محروم کر دیں، ایسے ہی ہوتے ہیں)۔ جو ان میں سے تیرا اتباع کرے گا، تو ایسے لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ (وہ حیوانی سطح پر جئیں گے اور ان کی انسانی صلاحیتیں جھلس کر رہ جائیں گی)۔ (آدم سے بھی معصیت ہوئی اور ابلیس سے بھی۔ جب آدم سے پوچھا گیا کہ تو نے ایسا کیوں کیا، تو اس نے ندامت سے گردن جھکائی اور کہا کہ میں اپنے جرم کا اعتراف کرتا ہوں۔ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ میں خواستگارِ عفو ہوں (۷/۲۳)

جواب ملا کہ تو نے جب اپنی غلطی کا اعتراف اور اپنی ذمہ داری کو قبول کر لیا ہے، تو اس سے نظر آتا ہے کہ تیری اصلاح کا امکان ہے۔

یہی سوال جب ابلیس سے کیا تو اس نے کہا کہ میں کون ہوں انکار اور سرکشی کرنے والا؟ تیرے حکم کے بغیر پتہ نہیں ہل سکتا، اس لئے مجھے تو نے خود گمراہ کیا ہے؛

جواب ملا کہ جب تو اپنی غلطی کی ذمہ داری قبول نہیں کرتا اور اپنے جرم کو عقیدۂ جبر کے نقاب میں چھپاتا ہے تو تیری اصلاح کا کوئی امکان نہیں۔

(یہ ہے ملخص ابلیس و آدم کے تمثیلی قصہ کا)

{حوالہ۔ مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۰۶}

۷/۱۹ انسان (مرد و عورت) کو اس قدر متضاد صلاحیتیں دے کر دنیا میں بسایا گیا۔ (یعنی ایک طرف اس کی قوتوں کا یہ عالم کہ تمام اشیائے فطرت اس کے سامنے جھک جائیں۔ اور دوسری طرف اس کی یہ کیفیت کہ اپنے سرکش جذبات کو اپنے قابو میں نہ رکھے تو ان کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہو جائے)۔

ابتداءً انسانی زندگی کا نقشہ یہ تھا کہ اس کی ضروریات بہت محدود تھیں اور سامانِ نشو و نما کی بڑی فراوانی تھی۔ چنانچہ ان سے کہا گیا کہ تم جہاں سے جی چاہے اپنی ضروریات پوری کرتے رہو۔ یہاں "میری اور تیری" کا کوئی سوال نہیں۔ لیکن اگر تم نے باہمی اختلافات شروع کر دیئے اور وحدتِ انسانیت کے بجائے خاندانوں قبیلوں اور قوموں میں بٹ گئے تو تم پر گروہ بندانہ جذبات غالب آجائیں گے اور اس طرح یہ جنتی زندگی تم سے چھن جائے گی (۲/۳۵)۔ (۷/۱۹)

(حوالہ: مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۱۱)

۷/۲۰-۲۲ یہ زندگی بڑی فراوانی اور خوشگواری کی تھی (۲۰/۱۱۸)۔ لیکن انسان کے سرکش جذبات نے اس کے

دل میں وسوسے پیدا کرنے شروع کر دیئے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ انسان مرنا نہیں چاہتا۔ اس کی انتہائی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہے۔ جہاں تک ایک فرد کی طبیعی زندگی کا تعلق ہے، اسے موت سے مفر نہیں۔ اسے حیاتِ جاوید اُسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ یہ وحی کے اتباع سے اپنی ذات کی نشوونما کرلے۔ لیکن اس کے حیوانی تقاضے اسے اور طرف لے جانا چاہتے ہیں۔

مذکورہ بالا تمثیلی انداز میں یوں سمجھو کہ شیطان نے آدم کے کان میں یہ افسوں پھونکا کہ خدا نے جو تمہیں کہا ہے کہ تمام انسانوں کو ایک عالمگیر برادری کی حیثیت سے رہنا چاہیئے، تو اس سے اُس کا مقصد یہ ہے کہ تم کہیں بے پناہ قوتوں کے مالک نہ بن جاؤ، یا حیاتِ جاوید حاصل نہ کر لو۔ تم ہمیشہ زندہ رہنا چاہتے ہو تو آؤ میں تمہیں اس کا طریق بتاؤں (۲۰/۱۲۱)۔ تم زندہ رہ سکتے ہو اپنی اولاد کے ذریعے۔ مرنے کے بعد، تمہاری اولاد تمہارا نام زندہ رکھے گی۔ اس طرح تم ہمیشہ زندہ رہو گے۔ یوں اُس نے انسان کے جنسی جذبات کی تسکین کو مقصودِ حیات بنا کر، اُس کی زندگی کو حیوانی سطح تک محدود کر دیا، اور بلند انسانی زندگی کے تصوّر کو اس کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا۔ (۷/۲۰)۔

شیطان نے قسمیں کھا کھا کر کہا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، اس میں میرا اپنا کوئی فائدہ نہیں۔ میں یہ سب کچھ تمہاری خیر خواہی کے لئے کر رہا ہوں۔ (۷/۲۱)

چنانچہ اُس نے، اس قسم کی باتوں سے انسان (مرد اور عورت[1]) کو بہکا دیا اور انہیں اُن کے مقامِ بلند سے گرا دیا۔ بجائے اس کے کہ وہ عقل و شعور سے کام لے کر، وحی کی روشنی میں، اپنا نظامِ تمدن و معیشت قائم کرتا جبلی خواہشات اس پر غالب آگئیں، اور یوں اس کے تحت الشعور (UN-CONSCIOUS) میں چھپے ہوئے جذبات بے نقاب ہو کر سامنے آگئے۔

بہر حال، انسان کے سرکش جذبات نے اُس کی توجہ، انسانی ذات کی طرف سے ہٹا کر، محض زندگی کے طبیعی تقاضوں[2] پر مرکوز کر دی۔ اس نے انہی کی تسکین کو مقصودِ حیات سمجھ لیا۔ اس سے انفرادی مفاد پرستی

---

[1] بائیبل میں آدم کی لغزش کا ذمہ دار اُس کی بیوی کو ٹھہرایا گیا ہے۔ اور اس لئے عورت کو تمام گناہوں کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے۔ قرآن، مرد اور عورت دونوں کو ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ صرف عورت کو ہی نہیں۔

[2] BIOLOGICAL URGES.

غالب آگئی۔ انسانوں میں باہمی تشتت وافتراق پیدا ہو گیا، اور عالمگیر انسانیت کا تصوّر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ نسل کو وجۂ یگانگت قرار دینے کا لازمی نتیجہ قبائلی اور قومی زندگی ہے جس سے عالمگیر انسانیت کا تصوّر ختم ہو جاتا ہے۔

چنانچہ خدا نے آدم (مرد وعورت) سے کہا کہ کیا میں نے تمہیں اس نہج زندگی سے روکا نہیں تھا اور یہ نہیں کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے، اس کے فریب میں نہ آجانا؟ (۷/۲۲)۔

(حوالہ: مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۱۶)۔

۷/۲۳ اُنہوں نے (مرد وعورت نے) کہا کہ اے ہمارے نشو ونما دینے والے! ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا (جو تیری بات نہ مانی)۔ اگر تیری طرف سے ہماری حفاظت اور رحمت کا انتظام نہ ہوا، تو ہم تباہ وبرباد ہو جائیں گے۔

(جب خدا نے ابلیس سے کہا تھا کہ تم نے ہمارا حکم کیوں نہ مانا، تو اُس نے اس کا ذمہ دار خدا کو قرار دیا تھا (۷/۱۶)۔ یہ جبر کا عقیدہ ہے جس سے انسان پر ابدی مایوسی طاری ہو جاتی ہے۔ (ابلیس کے بنیادی معانی یہی ہیں) لیکن آدم نے اپنی خطا کا ذمّہ دار، خود اپنے آپ کو قرار دیا۔ اس لئے اس کے لئے اصلاح کے امکانات پیدا ہو گئے)۔

(حوالہ: مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۰۱)

۷/۲۴ خدا نے کہا کہ ایسا ہی ہو جائے گا (۷/۳۵) لیکن اب تمہاری زندگی کا نقشہ کچھ اور ہو گا۔ تم نے اپنے آپ کو اُس مقامِ بلند سے گرا لیا جس میں تم سب ایک برادری کی حیثیت سے رہتے تھے {(۲/۲۱۳)؛ (۱۰/۱۹)} اب تم گروہوں میں بٹ جاؤ گے، اور ایک گروہ دوسرے گروہ کا دشمن ہو جائے گا۔ نسلی یا قومی رشتوں کو تمدّن کی بنیاد قرار دینے کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔ اب تمہیں یہاں ایک مدّت تک رہنا ہے، اور سامانِ زیست سے ہر ایک نے فائدہ اُٹھانا ہے۔ (لہٰذا اب تمہاری معاشی زندگی کی دشواریاں شروع ہو گئیں۔

(۲۰/۱۱۷-۱۱۹) (حوالہ کے لئے دیکھئے مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۲۵)

متاع کا مفہوم

آیت (۷/۲۴) میں ہے: وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ـــــ مُسْتَقَرٌّ کا مفہوم سابقہ باب (آیت ۶/۹۹) میں بیان ہو چکا ہے۔ مَتَاعًا کا لفظ، البتہ، غور طلب ہے۔ سابقہ جلدوں میں، "معاشی نظام" کے عنوان

کے تابع بتایا گیا ہے کہ قرآن کے نظام کا ماحصل یہ ہے کہ کوئی فرد ضروریات زندگی سے محروم نہ رہے۔ اور کسی کے پاس زائد از ضرورت (اندوختہ کرنے کے لئے) نہ رہے۔ قرآن کریم نے سامانِ زیست کو متاع کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور (قرآن کا اعجاز ہے کہ) اس ایک لفظ میں اس کے معاشی نظام کا اصل الاصول سمٹ کر آجاتا ہے۔ عربوں کی زندگی صحرانوردی اور دشت پیمائی کی تھی۔ ظاہر ہے کہ دشت و صحرا میں ضروریاتِ زندگی کا فقدان ہوتا تھا۔ اس لئے ہر مسافر کے لئے ضروری تھا کہ وہ ایسی چیزیں اپنے ساتھ رکھے جو سفر میں لا ینفک ہوں۔ عربوں کے ہاں۔ اَلْمُتْعَۃُ۔ ضروریاتِ سفر۔ مثل ڈول۔ رسّی۔ مشکیزہ۔ توشہ، کو کہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ مسافر ان چیزوں کے بغیر سفر بھی نہیں کر سکتا تھا اور انہیں زائد از ضرورت ساتھ بھی نہیں لے جاتا تھا۔ مثلاً وہ دو چار ڈول یا مشکیزے ساتھ نہیں رکھتا تھا۔ صرف ایک ایک ساتھ رکھتا تھا۔ سامانِ زیست کی اس تشبیہ (متاع) سے آپ غور فرمائیے کہ قرآن کریم نے اپنے معاشی نظام کو کس حسنِ اعجاز، لیکن جامعیت سے بیان کر دیا ہے۔ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ۔ حیاتِ ارضی میں تمہیں متاع کی ضرورت ہے۔ تم یہاں مسافر ہو۔ تمہارے پاس ضروریاتِ سفر کا ہونا ضروری ہے لیکن زائد از ضرورت تمہارے لئے بارِ دوش بن جائے گا۔ اس مسافت کو اس طرح طے کرو۔ ا

س کے بعد ہے:

۷/۲۵ قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ ○

تمہاری زندگی، ارض (زمین) سے وابستہ ہے جو تمہارے رزق کا سرچشمہ ہے۔ اس کے غلط نظام سے تم پر موت طاری ہو جائے گی، اور جب اس نظام کو صحیح خطوط پر لے آؤ گے تو تمہیں حیاتِ نو مل جائیگی اور حیاتِ نو کا سلسلہ موت کے بعد بھی جاری رہے گا۔ انسانی ذات کا ارتقاء، مادی اسباب و ذرائع کو ترک کر دینے سے نہیں ہوگا۔ ان اسبابِ معیشت کو مسافروں کی طرح استعمال میں لایا جائے گا۔ بقدرِ ضرورت۔ تم اس جہانِ آب و گل میں رہو گے اور اس سے اُبھر کر تمہیں حیاتِ نو حاصل ہوگی۔ ارتقائے ذات کی اوّلین شرط تسخیرِ مادہ ہے۔

مرنے اور جینے کا مفہوم

ہمارے ہاں عام طور پر "فِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ" کے معنی لئے جاتے ہیں کہ تم نے مرنے کے بعد اس زمین میں دفن ہونا ہے اور پھر اسی زمین سے دوبارہ اُٹھ کھڑے ہونا ہے۔ یہ مفہوم بوجوہ صحیح نہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ یہاں تخاطب

بنی آدم (تمام نوعِ انسان) سے ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ ایسی بہت سی اقوام (بلکہ مذاہب) ہیں جو اپنے مُردوں کو دفن نہیں کرتے۔ (حیاتِ آخرت کی تشریح اپنے مقام پر آئے گی)۔ ہمارے نزدیک اس سے مراد، انسانی زندگی کا اس محبسِ آب و گِل سے نکل کر، ارتقاء کی اگلی منزل میں چلے جانا ہے۔ (دیکھئے عنوان ارتقاء)۔

اس سلسلہ میں فرمایا:

۷/۲۶ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَ رِيْشًا ؕ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ○

زیب و زینت کی چیزیں حرام نہیں

اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ طبیعی زندگی کے تقاضے یعنی اس دنیا کی زیب و زینت کی چیزیں، قابلِ نفرت ہیں اور صحیح مسلک وہ ہے جس میں ان سے قطعِ تعلق کر لیا جائے۔ بالکل نہیں۔ ہم نے ان چیزوں کو تمہارے لئے وجہِ جاذبیت بنایا ہے۔ (۳/۱۴)۔ انہیں کوئی حرام قرار نہیں دے سکتا (۷/۳۲)۔ ان کے حصول اور استعمال میں قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو تو ان میں سے کوئی چیز بھی شر نہیں رہے گی۔ سب خیر ہی خیر ہو گا۔

یہ امور ضابطۂ خداوندی سے متعلق ہیں اور اس لئے بیان کئے جاتے ہیں تاکہ لوگ انہیں اپنے پیشِ نظر رکھیں۔

اس کے ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی کر دی کہ

۷/۲۷ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ؕ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○

سرکش جذبات کا غلبہ

اے نوعِ انسانی! تم کہیں شیطان (سرکش جذبات) سے مغلوب نہ ہو جانا، اور نہ وہ تمہارے لئے بھی اسی طرح مصیبت کا موجب بن جائیگا جس طرح اس نے تمہارے مورثین کو جنتی زندگی سے نکلوا دیا تھا، اور انہیں شرفِ انسانیت کے لباس سے عریاں کر دیا تھا۔ اس سے کبھی مامون اور غیر محتاط نہ رہنا۔ وہ اور اس کا گروہ، ایسے ایسے مقامات میں تمہاری گھات

میں رہتا ہے جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے۔ (یہ جذبات تمہارے دل کی گہرائیوں اور لاشعور میں چھپے رہتے ہیں)۔
لیکن یہ انہی کے رفیق و دمساز بنتے ہیں جو ہمارے قوانین پر ایمان نہیں رکھتے ——— جو لوگ بلند انسانی زندگی، مستقل اقدار، قانونِ مکافاتِ عمل اور حیاتِ اُخروی پر یقین رکھیں، وہ حیوانی سطح کے جذبات سے مغلوب نہیں ہو سکتے۔ وُہ انہیں ہماری عائد کردہ حدود کے اندر رکھتے ہیں۔

"جنّت" سے یہاں مُراد وہی نظام ہے جس میں معاشرہ اقدارِ خداوندی کا پابند ہوتا ہے، اور کوئی فرد ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ "ابلیس اور شیطان" کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم (باب اوّل) میں بتایا جا چکا ہے کہ یہ انسان کے بے باک جذبات کا نام ہے۔ یہاں جو کہا گیا ہے کہ "وہ تمہیں وہاں سے دیکھتے ہیں جہاں تم انہیں دیکھ نہیں سکتے"۔ تو اس میں علم النفس (سائیکالوجی) کے ایک عمیق نکتہ کی طرف

تحت الشعور کی دنیا

اشارہ کیا گیا ہے۔ ان کی تحقیق یہ ہے کہ یہ جذبات انسان کے "لاشعور" کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہوتے ہیں جہاں انہیں "شعور" کی نگاہ بھانپ نہیں سکتی ——— جب آپ کا غصّہ فوری طور پر بھڑک اُٹھتا ہے اور آپ فریقِ مقابل کو تھپڑ (بلکہ گولی) مار دیتے ہیں، تو آپ کے شعور کو اس کی خبر تک نہیں ہوتی۔ اقدارِ خداوندی کی پابندی اِن جذبات کو ساحل فراموش نہیں ہونے دیتی۔ اِسی لئے کہا ہے کہ ان کا غلبہ "لَا يُؤْمِنُوْنَ" پر ہوتا ہے۔ دیگر متعدد مقامات پر بھی واضح کیا گیا ہے کہ خدا کے مخلص بندوں پر ابلیس کا کوئی بس نہیں چل سکتا۔ قرآن کریم نہ تو (مسلکِ رہبانیت یا تصوّف کی طرح) جذبات کو فنا کرتا ہے، (جذبات فنا ہو نہیں سکتے۔ وہ صرف دب جاتے ہیں جسے SUPPRESSION بلکہ ——— REPRESSION کہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ PERVERSION ہوتا ہے) اور نہ ہی انہیں بے باک ہونے دیتا ہے۔ وہ ان سے، اقدارِ خداوندی کی راہنمائی میں، تعمیری کام لیتا ہے۔

اس کے بعد قرآن، ابلیس کے ایک نہایت فریب انگیز حربہ کا ذکر کرتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہے کہ ابلیس نے اپنی غلط روی اور معصیت کی ذمہ داری قبول نہیں کی تھی، بلکہ کہا تھا کہ یہ سب خدا نے کرایا ہے، وہی اس کا ذمہ دار ہے۔ وہ یہی سبق انسانوں کو پڑھاتا ہے۔ فرمایا:

(رکوع ۲۸) وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○

ابلیس کا خطرناک حربہ جب حیوانی جذبات انسان کو کسی بے حیائی کی بات پر آمادہ کرنا چاہیں، تو شروع شروع میں انہیں، اس کے لئے کچھ زور لگانا پڑتا ہے۔ لیکن جب اس قسم کی باتیں دو ایک نسلوں تک متواتر آگے چلتی جائیں، تو پھر لوگوں میں وہ جھجک باقی نہیں رہتی۔ جب ان سے کہا جائے کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو، تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے اسلاف کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے، اور (چونکہ ہمارے اسلاف خدا کے احکام کو ہم سے بہتر جانتے تھے، اس لئے ظاہر ہے کہ انہیں) اس قسم کا حکم خدا ہی نے دیا ہوگا۔

ان سے کہو کہ خدا بے حیائی کی باتوں کا حکم نہیں دیا کرتا۔ تم جس بات کا علم نہیں رکھتے اسے خدا کی طرف کیوں منسوب کرتے ہو؟ جس بات کے لئے تم کہو کہ وہ شریعت خداوندی ہے، اس کے متعلق تمہیں خود علم ہونا چاہیئے کہ وہ واقعی ایسی ہے۔ یہ کہہ دینا کہ ہمارے اسلاف ہم سے زیادہ علم رکھتے تھے، اس لئے جس بات کو انہوں نے خدا کا حکم کہہ دیا ہے وہ واقعی خدا کا حکم ہوگا، کوئی دلیل اور سند نہیں۔

ابلیس کے حربے۔ تقدیر اور تقلید دونوں یہاں دیکھئے تقلید اور تقدیر دونوں کو ابلیسی حربے بنایا گیا ہے۔ (سابقہ جلدوں میں ان موضوعات پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے)۔ اس کے ان دونوں حربوں سے محفوظ رہنے کا طریق یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ خدا کا اس باب میں ارشاد کیا ہے، اور ظاہر ہے کہ خدا کے ارشادات، اس کی کتاب (قرآن) ہی سے مل سکتے ہیں۔

آپ غور کیجئے کہ ہم (مسلمان) صدیوں سے، ابلیس کے ان دونوں پھندوں (تقدیر اور تقلید) میں جکڑے چلے آرہے ہیں! علاج اس کا کتاب اللہ سے راہنمائی حاصل کرنا تھا۔ اسے ہم نے "ایصالِ ثواب" کے لئے رکھ چھوڑا۔ ارشادِ خداوندی ہے کہ

۷/۲۹ قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ ۣ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ڛ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ۝

ان سے کہو کہ میرا نشوونما دینے والا اعتدال کی زندگی بسر کرنے کا حکم دیتا ہے۔ وہ بے حیائی کی باتوں کا حکم نہیں دے سکتا۔ اس لئے تم، نہ تو اپنے جذبات کا بے باکانہ اتباع کرو۔ نہ اسلاف کی روش کو بطور سند پیش کرو۔ تم اپنی تمام توجہات کو قوانینِ خداوندی پر مرکوز رکھو۔ ان کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کر دو

اور اطاعت کو اُسی کے لئے خاص کر دو۔ اس میں کسی اور کو شریک نہ کرو۔ اس طرح تم پھر اُسی جنتی زندگی کو حاصل کرو گے جس سے انسانیت کا آغاز ہوا تھا۔ (اور جس کا ذکر اوپر قصۂ آدم میں کیا گیا ہے۔

مسجد کے معنی

"سجدہ" کا مفہوم، مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۹۸ پر بتایا جا چکا ہے، اور "مسجد" کے متعلق جلد سوم صفحہ ۱۰ (نیز جلد اوّل صفحہ ۲۱۷) پر گفتگو ہو چکی ہے۔ اس آیت میں "مسجد" کا لفظ اطاعت گاہ کے لئے نہیں استعمال ہوا ہے۔ یہ مصدری معنوں میں آیا ہے جس کے معنی اطاعت کرنا ہیں۔

آیت میں کَمَا بَدَاَکُمۡ تَعُوۡدُوۡنَ آیا ہے۔ یعنی جس قسم کے معاشرہ سے تمہاری ابتدا ہوئی تھی،

پلٹ کر وہیں چلو

وہی معاشرہ پلٹ آئے گا۔ ہم (مسلمانوں کے لئے) اس سے مُراد وُہ معاشرہ ہے جسے قرآنی اقدار کی رُو سے، محمد رسول اللہ والذین معہٗ نے قائم کیا تھا، اور جسے "فرعون۔ ہامان اور قارون" کی سازشوں نے برباد کر دیا تھا۔ حضورؐ نے اپنے اس جنتی معاشرہ کے متعلق فرمایا تھا کہ

"اِن الزمان قد استداء کھیئۃ یوم خلق اللہ السمٰوٰت والارض۔
زمانہ پھر پھرا کر آج پھر اُسی نقطہ پر آ گیا ہے جس پہ اللہ نے اسے آغازِ کائنات کے وقت متعین کیا تھا"

(خطبۂ حجۃ الوداع)

یہ کَمَا بَدَاَکُمۡ تَعُوۡدُوۡنَ کی تفسیر تھی۔ جنت سے نکلے ہوئے آدم کے لئے، جنت کی بازیابی کا اس کے سوا کوئی طریق نہیں کہ یہ حضور خاتم النبیینؐ کے نقوشِ پا کو خضرِ راہ بنائے۔ زمانہ نوعِ انسان سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ

جنہیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تو نے   وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی

یہ وضاحت کرنے کے بعد کہا کہ

۷/۳۰ فَرِيۡقًا هَدٰى وَفَرِيۡقًا حَقَّ عَلَيۡهِمُ الضَّلٰلَةُ ؕ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيۡنَ اَوۡلِيَآءَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَيَحۡسَبُوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّهۡتَدُوۡنَ ۝

لیکن ہم جانتے ہیں کہ تم، سب کے سب، اس طریق کو اختیار نہیں کرو گے۔ تم دو گروہ بن جاؤ گے۔

ایک گروہ ہمارے قوانین کا اتباع کر کے زندگی کی سیدھی راہ پہ گامزن رہے گا۔ دوسرا گروہ، اپنے جذبات یا اسلاف کی اندھی تقلید کی روش پر چلے گا؛ تو اس پر سعادت کی راہیں بند ہو جائیں گی۔ اس لئے کہ انہوں نے، اللہ کے قانون کو چھوڑ کر، دوسری قوتوں کو اپنا کارساز بنا لیا اور بزعم خویش سمجھتے رہے کہ ہم بالکل سیدھی راہ پر چلے جا رہے ہیں۔

اس آیت میں دو بنیادی نکات مجملاً بیان ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ دنیا میں گروہ دو ہی ہیں، ایک وحیٔ خداوندی

دو گروہ

کے مطابق صحیح راستے پر گامزن، اور دوسرا گروہ جو دیگر راہوں پر چلے۔ انسانوں کی یہ تفریق و تمیز دو قومی نظریہ کی بنیاد ہے۔ یہ دونوں (باہمدگر متضاد اور متخالف گروہ) مل کر ایک قوم بن نہیں سکتے۔ (انڈکس میں قوم۔ قومیت اور دو قومی نظریہ کے عنوانات دیکھئے)

دوسرا نکتہ یہ کہ لوگ چلتے تو ہیں غیر خداوندی (شیطنت کے) راستوں پر، اور بزعم خویش سمجھتے ہیں کہ ہم بالکل صحیح راستے پر چل رہے ہیں۔ انڈکس میں "حبطِ اعمال" کا عنوان دیکھئے جس سے واضح ہو جائے گا کہ جو لوگ "بزعم خویش" سمجھتے ہیں کہ وہ بڑے نیک کام کر رہے ہیں، درحقیقت کسی خود فریبی میں مبتلا ہوتے ہیں (سابقہ صفحات میں آیات (۷/۸-۹) کی تشریح بھی دیکھئے)

دنیا میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اعلانیہ، خدا۔ وحی۔ حیاتِ اُخروی کا انکار کرتے ہیں۔ عام طور پر انہیں ملحد یا (ATHEISTS) کہا جاتا ہے۔ یہ گمراہ تو ہوتے ہیں، لیکن خود فریبی میں مبتلا نہیں ہوتے۔ خود فریبی میں مبتلا مذہب پرست طبقہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ سراسر غلط راہوں پر چلتے ہیں، لیکن بزعم خویش سمجھتے ہیں کہ وہ حق و

کھلے ہوئے ملحد

صداقت کے راستے پر گامزن ہیں۔ قرآن کریم نے ان لوگوں کے متعلق کہا ہے کہ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ أَعْمَالَهُمْ (۱۶/۶۳ و دیگر متعدد مقامات) "شیطان ان کے (غلط) کاموں کو مزین (مستحسن) بنا کر دکھاتا ہے"۔ ملحدین سے عقل و بصیرت کی بنا پر (دلائل و براہین کی رُو سے) بات کی جا سکتی ہے، اور اگر وہ مطمئن ہو جائیں تو صحیح راستے پر آ بھی جاتے ہیں، لیکن مذہب پرست طبقہ کو راہِ راست پر لانا، ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہوتا ہے۔ وہ علم و بصیرت کی رُو سے بات کرنا تو ایک

اور فریب خوردہ مذہب پرست

طرف، بات سننے تک کے لئے بھی تیار نہیں ہوتے، اور اسلاف کے راستے سے (جسے انہوں نے بغیر سوچے سمجھے محض تقلیداً اختیار کر رکھا ہوتا ہے) ایک قدم ادھر اُدھر ہٹنے کو کفر و الحاد سمجھتے ہیں۔ یہ میرا مدّت العمر کا

ذاتی تجربہ ہے۔ مغرب کے (ATHEISTS) میرے ہاں آتے ہیں۔ ان سے دلائل و براہین کی رُو سے بات کی جاتی ہے۔ وہ نہایت اطمینان وسکون سے سُنتے ہیں، اور جب وہ مطمئن ہو جائیں، تو کشادہ نگہی سے اس کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ لیکن مذہب پرست طبقہ کے افراد آتے ہی لٹھ لئے ہوتے ہیں۔ مقصد اُن کا تلاشِ حقیقت نہیں ہوتا۔

ان کی اصلاح نہیں ہوسکتی

اپنی بات کو دوسرے پر ٹھونسا ہوتا ہے۔ جب اُن سے حق وصداقت کی کوئی بات کہی جائے، تو اُن کا پہلا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ کیا اس سے پہلے بھی کسی نے ایسا کہا ہے؟ یعنی اس بات کے غلط یا باطل ہونے کی دلیل یا سند یہ ہے کہ اسلاف میں سے کسی نے ایسا نہیں کہا۔ سوچئے کہ اس قسم کی ذہنیت والوں کو حق وصداقت کی کوئی بات بھی سمجھائی جا سکتی ہے؟ وُہ آتے ہی اس ذہنیت کے ساتھ ہیں کہ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْن۔ اور جاتے بھی یہی ذہنیت لئے ہوتے ہیں۔ اور ساری عمر اپنے اس مسلک پر قائم رہتے ہیں۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ (جیسا کہ آیت ۲/۷ کی زیرِ تشریح بتایا جا چکا ہے) قبولیت حق وصداقت کے لئے "سینے کی کشاد" کس قدر ضروری ہے۔

دنیا سے نفرت

مذہب پرست طبقہ میں باہمی اختلافات ہزار ہوں، ایک چیز ان سب میں بطور قدرِ مشترک ملے گی، یعنی مادی دنیا سے نفرت اور زیب وزینت، آرائش وزیبائش کی چیزوں سے خدا واسطے کا بیر۔ اہلِ شریعت میں یہ بُغض ونفرت پھر بھی ایک حد تک ہوتا ہے، لیکن اربابِ طریقت (اہلِ تصوّف) میں یہ انتہا تک پہنچا ہوا ہوتا ہے۔ آرائش وزیبائش ہی نہیں، وہ کھانے پینے کی چیزوں کو بھی (جنہیں اللہ تعالیٰ نے حلال وطیّب قرار دے رکھا ہے) اپنے اوپر حرام قرار دے لیتے ہیں اور اس اجتناب وتنفر کو حصولِ قربِ خداوندی کے لئے لازم سمجھتے ہیں۔ (تفصیل ان امور کی میری کتاب "تصوف کی حقیقت" میں ملے گی)۔ اُس نے ان باطل عقائد کی تردید کے لئے فرمایا:

۷/۳۱ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۧ

ترکِ زینت کا مسلک خلافِ قرآن ہے

"اے نوعِ انسانی! (یہ تصوّر غلط ہے کہ اطاعتِ خداوندی کے لئے ترکِ دُنیا، ترکِ لذّات۔ ترکِ زیبائش وآرائش ضروری ہے۔ دنیاوی زیب وزینت، اطاعتِ خداوندی کی راہ میں حائل نہیں

ہوتی۔ اس کے برعکس) اس اطاعت سے خود زیب و زینت کے پہلو اُبھرتے ہیں، کیونکہ اطاعتِ قوانینِ خداوندی کا لازمی نتیجہ اس دنیا کی خوشگواریاں حاصل ہونا ہے۔ لہٰذا، تم ان چیزوں سے ضرور فائدہ اٹھاؤ۔ کھاؤ۔ پیو۔ لیکن، اُن حدود کا خیال رکھو جو خدا نے مقرر کر رکھی ہیں۔ حدود شکنی، قانونِ خداوندی کی رُو سے پسندیدہ نہیں۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، "مسجد" کے معنی سجدہ (یعنی اطاعت) کرنا ہیں۔ ان معانی کی روشنی میں، یہ نکتہ گہرے غور و فکر کا متقاضی ہے۔ اُس نے یہی نہیں کہا کہ زندگی کے عام معمولات میں بھی حسن و رعنائی (زیب و زینت) کو ملحوظ رکھو، بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ اطاعتِ خداوندی کی ہر روش میں، اسے بالخصوص اپنا معمول قرار دو، یعنی اطاعتِ خداوندی نہایت حُسن کارانہ انداز سے بجا لاؤ۔ بلکہ یوں کہیئے کہ اطاعتِ خداوندی

اطاعت سے زندگی حسین ہو جاتی ہے

خود تمہاری زندگی کو حسین بنا دے گی۔ آپ سوچیئے کہ اُس نے چار لفظوں میں کس طرح، ان باطل عقائد کی تردید کر دی جن کی رو سے ترکِ دُنیا، ترکِ زیب و زینت اور ترکِ لذّات کو قربِ خداوندی کی راہ میں رُکاوٹیں سمجھا جاتا تھا۔

اِن اشیاء کے استعمال کا حکم دینے کے ساتھ، یہ تنبیہ بھی ضروری سمجھی کہ لَا تُسْرِفُوْا۔ اسراف کا ترجمہ عام طور پر فضول خرچی کیا جاتا ہے۔ فضول خرچی (یعنی جتنی ضرورت ہو اُس سے زیادہ خرچ کرنا) بھی اسراف ہے (کیونکہ اس کے بنیادی معنی حد سے تجاوز کرنا ہیں) لیکن اس استعمال کی رُو سے اس لفظ کے معانی اس سے زیادہ وسیع ہیں۔ اس مفہوم کو ایک مثال کی رُو سے سمجھیئے۔ کھیتوں کو پانی دینے کے لئے نالیاں بنائی جاتی ہیں، مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان نالیوں کے اندر بہ کر پانی کھیت تک پہنچ جائے۔ اگر کسی نالی کا کنارہ (حد) راستے میں ٹوٹ جائے۔ تو یہ پانی کھیت تک پہنچنے کے بجائے راستے میں بیکار بہ جاتا ہے۔ اسے بھی اسراف کہا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر کہ سامانِ زیست کو جس مقصد کے لئے عطا کیا گیا ہے، اسے اس مقصد کے حصول کے لئے صرف اور استعمال کرنا، جائز ہی نہیں، ضروری ہے۔ لیکن جسطرح اس سے اجتناب اور نفرت کرنا، خلافِ منشیتِ خداوندی ہے۔ اُسی طرح اُن کے استعمال میں حدود سے بڑھ جانا، یا اُنہیں ضائع کر دینا بھی خلافِ منشائے ایزدی ہے۔

یہاں تک تو ان باطل عقائد کی تردید مقصود تھی۔ لیکن اگلی آیت میں اس قسم کے عقائد رکھنے والے کو چیلنج دیا گیا ۔۔۔ اور جس تحدّی سے یہ چیلنج دیا گیا ہے، اسی سے واضح ہے کہ اس قسم کے عقائد کسطرح غیظ و غضبِ خداوندی کا موجب ہیں۔ فرمایا:

۷/۳۲ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ○

زیب و زینت کو کون حرام قرار دے سکتا ہے؟

(اے رسول! تم ان اربابِ شریعت اور مسلکِ خانقاہیت کے پیروکاروں سے پوچھو کہ) وہ کون ہے جو زیب و زینت کی ان چیزوں کو اور خوشگوار اشیائے خورد و نوش کو حرام ٹھہرا سکتا ہے، جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے استعمال کے لئے پیدا کیا ہے۔ یہ چیزیں، اِس دُنیا کی زندگی میں، مومنین اور دوسروں کے لئے یکساں طور پر کھلی ہیں (اور ہمارے قانونِ طبیعی کے مطابق جس کا جی چاہے اُنہیں حاصل کر سکتا ہے (۱۷/۲۰-۱۸))

لیکن اُخروی زندگی میں یہ مختص ہوں گی اُن کے لئے جنہوں نے ایمان و اعمالِ صالحہ سے اپنے آپ کو ان کا مستحق بنایا ہوگا (یعنی اہلِ جنت کے لئے)۔

اِس طرح ہم، اُن لوگوں کے لئے جو علم و بصیرت سے کام لیں اپنے قوانین واضح طور پر بیان کر دیتے ہیں۔

اِن آیات سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ قرآن کریم نے انسانی زندگی کے جمالیاتی پہلو کو کس قدر اہمیت دی ہے۔ اِس موضوع پر میں نے، (مطالب الفرقان جلد اوّل میں) سورہ فاتحہ کے پہلے لفظ، حمد، کی تشریح کرتے ہوئے، ضمناً روشنی ڈالی تھی، لیکن ہمارے قدامت پسند طبقہ کی طرف سے زیب و زینت کی چیزوں (بلکہ فنونِ لطیفہ) کے خلاف جس شد و مد سے اعتراضات کئے جاتے ہیں، ان کے پیشِ نظر میں سمجھتا ہوں کہ اس موضوع پر ذرا تفصیل سے گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔ میں نے اس موضوع پر ایک تفصیلی مقالہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا "آرٹ اور اسلام"۔ [1] اس کے چند ایک اقتباسات درج ذیل ہیں:

آرٹ اور اسلام

۱۔ گلاب کے پھول کے متعلق کسی طبیب سے پوچھئے۔ وہ بتائے گا کہ اس کا مزاج حار و یابس ہے اور تاثیر کے اعتبار سے مُلیّن اور مُدِر۔ خواص کی طرف آئیے تو یہ مقوی و مفرح قلب ہے اور جگر کی اصلاح میں بھی مدد دیتا ہے۔ اِس کے عرق اور گلقند کا شمار منفعت بخش

---

[1] یہ مقالہ ماہنامہ طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت جولائی ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا تھا۔

ادویات میں ہوتا ہے۔ فطرت نے اس میں بڑے فوائد رکھے ہیں۔

جمالیاتی پہلو

لیکن یہی پھول جب ایک ایسے صاحبِ ذوق کی نگۂ حسن شناس کے سامنے آئے جسے فطرت نے حسِ لطیف سے نوازا ہو، تو اُسے اس کے اندر، دلکش رعنائیوں اور کیف آور زیبائیوں کی ایک دُنیا مسکراتی، مچلتی، کھیلتی، ناچتی دکھائی دے گی۔ اس کی نرم و نازک پنیوں کی لطافت۔ اس کی شفق آمیز رنگینیوں کی نظافت۔ اس کی نکہتِ جاں نواز کی عطر بیزیاں۔ اس کی شگفتگی و شادابی کی مسرت خیزیاں، ہر چشمِ جمال آشنا کو یہ کہہ کر دعوتِ نظارہ دیں گی کہ

مژہ برہم مزن، تا نشکنی رنگِ تماشارا

اور کشش و جذب کا یہ عالم، پھولوں تک ہی محدود نہیں۔ اس نگہ سے دیکھئے تو صحنِ چمنِ کائنات کا ایک ایک گوشہ، دامانِ باغبان وکفِ گل فروش کا آئینہ دار نظر آئے گا۔ یہاں کوئی شے ایسی نہیں دکھائی دے گی جس میں افادی پہلو (UTILITARIAN ASPECT) کے ساتھ جمالیاتی پہلو (AESTHETIC PHASE) موجود نہ ہو۔ سورج کی نور پاشیوں میں، چاند کی ضیا باریوں میں، ستاروں کی مرصع کاری میں، کہکشاں کی روشن نگاری میں، بادلوں کی سبک خرامی میں، نسیمِ سحر کی خوش پیامی میں، سمندر کی تلاطم خیزیوں میں، ندی کی سکوت آمیزیوں میں، سرو قامت درختوں کی پُرشکوہ صف آرائی میں، اور ان کی طرف لپک کر آنے والے پرندوں کی نغمہ سرائی میں، غرضیکہ نگار خانۂ کائنات کی کسی شے کو لیجئے، اس میں منفعت بخشی کے ساتھ ساتھ، جمال آفرینی یوں سموئی ہوئی نظر آئے گی جیسے کسی خوبصورت، محوِ خواب بچے کے خاموش لبوں کی بہار آفریں مسکراہٹ۔

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

حقیقت یہ ہے کہ خدا نے جب انسان کی پروردگاری (نشو و نما۔ ربوبیّت) کا ذمّہ لیا، تو ضروری تھا کہ اس کی زندگی کے ہر گوشے کے لئے سامانِ نشو و نما مہیا کیا جاتا۔ انسان کی ضروریات، طبیعی ہی نہیں، جذباتی بھی ہیں اور اس کے جذباتی تقاضوں کی تسکین کے لئے ضروری تھا کہ اس کے لئے مہیا کردہ سامانِ نشو و نما میں افادی اور جمالیاتی دونوں عناصر موجود ہوتے۔ حیوان اور انسان میں ایک خطِ امتیاز یہ بھی ہے کہ حیوان کے تقاضے صرف طبیعی ہوتے ہیں لیکن انسان کو ذوقِ جمالیات سے بھی نوازا گیا ہے۔ ایک گائے کے نزدیک پھول اور گھاس، یکساں چارہ اور شکم پُری کا سامان ہیں۔ لیکن انسان ان دونوں میں تمیز کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ حیوانی سطح سے اُبھر کر، انسانی سطح پہ آچکا ہو۔

لیکن جس طرح انسان کی طبیعی زندگی کے تقاضوں کی تسکین کے لئے چند قواعد و ضوابط کی ضرورت ہے، اسی طرح اس کی جذباتی زندگی کے تقاضوں کے پورا کرنے کے لئے بھی حدود و قیود لاینفک ہیں۔ خدا کی طرف سے عطا کردہ دین، وہ حدود و قیود متعین کرتا ہے جس کے اندر رہتے ہوئے انسان کی طبیعی اور جذباتی زندگی کے تقاضے پورے کرنے سے، انسان کے جسم اور اس کی ذات، دونوں کی نشوونما ہوتی جاتی ہے اور اس طرح انسان اس دنیا میں بھی جنت بداماں زندگی بسر کرتا ہے، اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی، مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

۲۔ ہمارے ہاں دو اصطلاحیں مروج ہیں ——— جلال اور جمال۔ جلال میں قوت بھی شامل ہے اور ہر شے کا افادی پہلو بھی، کیونکہ افادی پہلو کا صحیح استعمال، قوت پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے۔ اس کا تعلق انسان کی طبیعی زندگی سے ہے۔ اس کے برعکس، جمال، کسی شے کا تحسینی پہلو ہے۔ یعنی اس کی (APPRECIATIVE VALUE)؛ اس کا تعلق انسان کے جذبات سے ہے۔

۳۔ خدا نے اپنے عمل تخلیق کے متعلق کہا ہے:

اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ (۳۲/۷)۔

(خدا وہ ہے جس نے ہر شے کو حسین ترین انداز میں پیدا کیا ہے۔)

خدا کا عمل تخلیق

حسن نام ہے صحیح صحیح توازن اور تناسب کا۔ جہاں کسی شے کے توازن و تناسب (PROPORTION) میں ذرا سا فرق آیا، اس کا حسن جاتا رہا۔ پسکال نے ٹھیک کہا تھا کہ اگر قلوپطرہ کی ناک ذرا چپٹی ہوتی تو دنیا کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ خدا نے اپنے عمل تخلیق کے متعلق بڑی تحدی کے ساتھ کہا ہے کہ تم اس میں کہیں عدم توازن نہیں دیکھو گے۔ کسی شے کو غیر متناسب نہیں پاؤ گے۔ اس کے کہنے کا انداز ملاحظہ کیجئے۔ سورہ الملک میں ہے: مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ "تم خدائے رحمٰن کی تخلیق (اشیائے کائنات) میں کہیں کوئی جھول۔ کوئی سلوٹ۔ کوئی شکن نہیں دیکھو گے، کہیں عدم تناسب نہیں پاؤ گے"——— فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۝ "طائر نگاہ کے پر کھول کر اسے کائنات کی فضائے بسیط میں اذن بال کشائی دو اور پھر اس سے پوچھو کہ کیا اسے کہیں کوئی سقم، کوئی عیب، کوئی شگاف، کوئی بدنمائی دکھائی دی ہے؟"——— ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ کَرَّتَیْنِ "ایک بار نہیں۔ بار بار نگاہ سے کہو کہ وہ اچھی طرح دیکھے۔ خوب تلاش اور تجسس کرے"——— یَنْقَلِبْ اِلَیْکَ الْبَصَرُ

خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ (۶۷/۳-۴) "وہ خاسر اور واماندہ۔ ناکام اور مایوس کاشانۂ چشم میں لوٹ آئے گی۔ نگار خانۂ فطرت میں اسے کہیں کوئی سقم دکھائی نہیں دے گا۔"

۴۔ سورۂ نحل میں، افادی اور جمالیاتی پہلو، بڑے حسین انداز میں سامنے لائے گئے ہیں۔ پہلے کہا:

مویشیوں کی دنیا

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ (۱۶/۵) "تم مویشیوں کو دیکھو۔ ان میں تمہارے لئے کس قدر فائدے کی چیزیں ہیں۔ ان کی اُون سے تم گرم کپڑے بناتے ہو۔ ان کا گوشت تمہارے کھانے کے کام آتا ہے۔" وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ؕ (۱۶/۷) "ان میں جو باربرداری کے کام آتے ہیں، وہ تمہارا سامان اُٹھا کر دُور دراز شہروں میں لے جاتے ہیں۔ اگر تمہیں یہ سامان خود اُٹھانا پڑتا، تو تم کس مصیبت میں پڑ جاتے۔" وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا ؕ "پھر تم گھوڑوں، خچروں اور گدھوں کو دیکھو، وہ تمہاری سواری کے کام آتے ہیں، وَزِيْنَةً (۱۶/۸) اور بعض ان میں سے تمہارے لئے سامانِ زینت بھی بنتے ہیں۔"

یہ سب کچھ گنانے کے بعد کہا کہ ان میں اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ لیکن اُس "کچھ اور" کے دیکھنے کے لئے نگۂ نظارہ جُو کی ضرورت ہے، کہ وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ (۱۶/۶) "ذرا چشمِ تصوّر سے دیکھو کہ علی الصبح، تاروں کی چھاؤں میں، نور کے تڑکے، جب فضا کی آنکھیں ہنوز نیم خوابیدہ، نیم وا ہوتی ہیں، اور چاروں طرف سکوت کا عالم، اُس وقت جب تم ان مویشیوں کو چوپال سے نکال کر، باہر چراگاہوں کی طرف لے جاتے ہو، تو یہ منظر کس قدر جمال آفرین ہوتا ہے۔

اور پھر شام کے وقت، جب سورج تھک کر، پہاڑوں کی اوٹ میں سستانے چلا جاتا ہے۔ فضا پر چاروں طرف دھندلکا چھا جاتا ہے۔ کھیت اُداس اور راستے خاموش ہو جاتے ہیں۔ تو اس وقت جب تم ان مویشیوں کے گلّے کو چراگاہوں سے خراماں خراماں بستی کی طرف واپس لاتے ہو، تو یہ سماں بھی کس قدر کیف بار ہوتا ہے۔ وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ (۱۶/۶) تمہاری نگاہیں ان کے افادی دائروں میں محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ لیکن اگر تمہارے سینے میں برف کی قاش نہیں دھڑکنے والا دل ہے، تو تم محسوس کرو گے کہ ان کے اس جمالیاتی پہلو کی کوئی قیمت ہی نہیں۔ یہ بے بہا ہیں۔

آپ نے مویشیوں کے اس طرح چراگاہوں کی طرف جانے اور واپس آنے کے مناظر، کسی عظیم ترین مصوّر کے نادر شاہکار میں دیکھے ہوں گے اور بار بار قرآن کریم کے ان چند الفاظ میں۔ ذرا چشم تصوّر سے کام لیجئے اور دیکھئے کہ کیا ان الفاظ کے محاکاتی اعجاز کے سامنے ہر نگہ جمال آشنا جھک جھک نہیں جاتی؟

۵۔ جنّت کی نعماء

خدا نے اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نتیجہ جنّت بتایا ہے۔ اس دنیا میں بھی جنّتی معاشرہ اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی جنّت۔ اس جنت کی جو تفاصیل قرآن کریم میں آئی ہیں ——— اس دنیا میں حقیقی معنوں میں اور اُخروی زندگی میں تمثیلی انداز سے جن کا بیان ہوا ہے ' ان پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ حُسن و زیبائش کا کوئی گوشہ بھی ایسا ہے جو اس میں نہ آگیا ہو؟ سب سے پہلے محاکاتی انداز میں اس منظر کو سامنے لائیے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ جَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ۔ آبِ رواں کے کنارے، سبزۂ نورستہ، گھنیرے درختوں کی چھاؤں، بہار کا موسم جس میں نہ زیادہ سردی نہ گرمی۔ لَا یَرَوۡنَ فِیۡہَا شَمۡسًا وَّلَا زَمۡہَرِیۡرًا ۝ (۷۶/۱۳)۔ دوسری طرف، اعلیٰ درجے کے صوفے۔ حریر و اطلس کے پردے۔ نرم و نازک ریشم کے ملبوسات (۱۸/۳۱)۔ چاندی اور سونے کے برتن۔ بلوریں آبخورے سونے کے کنگن۔ موتیوں کے ہار {(۷۶/۱۵-۲۱) و (۴۳/۷۱)}۔ مختصراً یہ کہ مَا تَشۡتَہِیۡہِ الۡاَنۡفُسُ وَ تَلَذُّ الۡاَعۡیُنُ ۚ (۴۳/۷۲)۔ اس میں ہر وہ شئے ہوگی جس کی آرزو انسان کرے اور جس سے نگاہیں لذّت یاب ہوں۔ حتّٰی کہ فَہُمۡ فِیۡ رَوۡضَۃٍ یُّحۡبَرُوۡنَ (۳۰/۱۵)۔ سرسبز و شاداب باغات میں نہایت شُستہ اور اعلیٰ پایہ کی موسیقی کی محفلیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس لفظ (اَلۡحَبۡرَۃُ) میں حُسن و جمال، زیبائی و رعنائی اور انبساط و مسرّت کے تمام مظاہر آجاتے ہیں، خواہ وہ جنتِ نگاہ ہوں یا فردوسِ گوش۔ یہ ہے وہ جنّتی معاشرہ جس کا وعدہ اس دنیا میں کیا گیا ہے اور جس کا تمثیلی بیان جنّتِ اُخروی کے سلسلہ میں قرآن کریم کے متعدد مقامات میں آیا ہے۔ آپ سوچئے کہ زیب و زینت کی جن حسین و جمیل اشیاء کو قرآن نے جماعتِ مومنین کی حسن کارانہ زندگی کا ماحصل بتایا ہے، کیا انہی اشیاء کے استعمال کو خدا حرام قرار دے گا؟

نعمائے جنّت کی جن حسین و جمیل اشیائے زیب و زینت کا ذکر قرآن میں آیا ہے، ہمارے ارباب شریعت انہیں حرام قرار دیتے ہیں۔ ذرا سوچئے کہ خدا کبھی ایسا بھی کرے گا کہ جو چیزیں اس دنیا میں حرام ہوں، اُنہیں جنّتی زندگی میں حلال ہی نہیں، بلکہ اپنی طرف سے نعماء قرار دے دے؟ یہ حُرمت

ہماری وضع کردہ ہے۔

میرے ساقی نے عطا کی ہے مئے دُرد و صاف — رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے

جہاں تک کھانے پینے کی چیزوں کا تعلق ہے، ان کے لئے انڈکس میں "حرام و حلال" کا عنوان دیکھئے اس میں نظر آجائے گا کہ خدا نے تو تین چار چیزوں کو حرام قرار دیا تھا لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت نے حرام و

حرام و حلال کی فہرستیں

حلال کی طول طویل فہرستیں مرتب کر رکھی ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے کہا تھا: مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ط "وہ کون ہے جو خدا کی حلال قرار دادہ اشیائے زیب و زینت اور رزقِ طیب کو حرام ٹھہرا دے؟" خدا پوری تحدی کے ساتھ یہ کہتا ہے، اور ہمارے اربابِ شریعت و طریقت کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہم ایسا کرتے ہیں!

یہ تو اربابِ شریعت کا حال ہے۔ اہلِ تصوف سرے سے اس دُنیا ہی کو قابلِ نفرت قرار دیتے اور اسے ترک کر دینے کی تلقین کرتے ہیں، اور اس کا نام رکھتے ہیں "مغزِ دین"۔ اس کے متعلق انڈکس میں تصوف کا عنوان دیکھئے[1]۔

اس کے بعد کہا کہ یہ لوگ تو خدا کی حلال کردہ اشیاء کو حرام قرار دیتے ہیں۔ آؤ! ہم تمہیں بتائیں کہ خدا نے کن باتوں کو حرام قرار دیا ہے:

۳۳/۷ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ وَ الْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ اَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○

خدا کی حرام کردہ

ان چیزوں کو خدا نے حرام نہیں قرار دیا۔ جن چیزوں کو اُس نے حرام قرار دیا ہے وہ یہ ہیں:-

۱۔ ہر قسم کی بے حیائی کی باتیں، خواہ وہ کھلی ہوئی ہوں یا پوشیدہ (عملاً ہوں یا ان کی آرزوئیں دل میں کروٹیں

---

[1] "تصوف کی حقیقت" کے عنوان سے میری مستقل تصنیف بھی اب شائع ہو گئی ہے۔

لیتی رہیں)۔

۲۔ ایسے امور جن سے انسانی صلاحیتوں میں افسردگی اور اضمحلال پیدا ہو، اور عملی قوتیں مفلوج ہو جائیں۔

۳۔ دوسری طرف، ناحق سرکشی اور زیادتی۔

۴۔ خدا کے ساتھ اوروں کو بھی شریک کرنا (اس کے قوانین کے ساتھ انسانی قوانین کو واجب الاتباع سمجھنا)۔
اس کے لئے خدا نے کوئی سند نازل نہیں کی۔ (سند صرف منزل من اللہ ہو سکتی ہے)

۵۔ اور یہ کہ تم خدا کی طرف ایسی باتوں کو منسوب کرو جن کا تمہیں علم نہ ہو کہ وہ فی الواقع خدا کی ہیں (خدا کی باتیں قرآن کریم کے اندر ہیں۔ خارج از قرآن کہیں نہیں ہے)

فواحش کا مفہوم اس آیت میں "فواحش" کو بھی حرام قرار دیا گیا ہے۔ اس کے متعلق انڈکس، نیز سابقہ باب میں آیت ($\frac{6}{152}$)، کی تشریح دیکھئے۔ فواحش کے عام معانی تو بے حیائی کی باتیں ہیں، لیکن قرآن کریم نے بعض مذموم اور شنیع افعال کو بالتصریح فحش بتایا ہے۔ مثلاً آیت ($\frac{4}{15}$) میں عام بے حیائی کی باتوں کو فحش کہا گیا ہے۔ اور اس سے ملحقہ آیت ($\frac{4}{16}$) میں سحافت کا ذکر ہے۔ اس کے بعد آیت ($\frac{4}{25}$) میں زنا کو فحش کہا گیا ہے[1] (نیز $\frac{17}{32}$ میں)۔ آیت ($\frac{7}{80}$) میں لواطت کے متعلق بھی یہی لفظ آیا ہے۔ سورہ نور کی آیت ($\frac{24}{19}$) میں فاحشات کی نشر و اشاعت سے بھی منع کیا گیا ہے۔ قرآن نہایت سنجیدہ اور پاکیزہ معاشرہ متشکل کرنا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جن امور سے خدا منع کرتا ہے، اُن کا تخریبی اثر افراد تک ہی محدود نہیں رہتا۔ وہ قوموں کو بھی لے ڈوبتے ہیں۔ اسی لئے وہ اگلی آیت میں کہتا ہے کہ

$\frac{7}{34}$ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ○

ہمارا قانون یہ ہے کہ جب تک کوئی قوم صحیح نظام پر کاربند رہتی ہے، اُسے عروج حاصل ہوتا ہے۔ جب وہ اس روش کو چھوڑ دیتی ہے، تو آہستہ آہستہ تنزل کی طرف چل جاتی ہے تاآنکہ وہ وقت آجاتا ہے جب اس کا شمار زندہ قوموں میں رہتا نہیں۔ یہ اس قوم کی میعادِ زندگی کہلاتی ہے ($\frac{13}{38}$)۔ جب یہ وقت آجاتا ہے تو اس قوم کی تدبیریں اور اسکیمیں اسے ذرا بھی آگے پیچھے نہیں کر سکتیں۔ ($\frac{15}{4-5}$)۔

---

[1] یہ آیات مطالب الفرقان جلد چہارم میں آ چکی ہیں۔

(ہمارا وہ قانون جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے یہ ہے کہ فلاح وبقا اسی نظام کے لئے ہے جس میں تمام نوعِ انسان کی بہبود اور منفعت پیشِ نظر رہے۔ ۱۳/۱۷)

قوموں کے عروج و زوال سے متعلق اصول و قوانین کا ذکر سابقہ جلدوں میں متعدد مقامات پر آچکا ہے۔ اس کے لئے انڈکس دیکھئے۔ (جن آیات کا حوالہ انڈکس میں دیا گیا ہے، ان کے علاوہ یہ آیات بھی اس موضوع سے متعلق ہیں (۹/۱۴؛ ۲۹/۳۸؛ ۴۰/۸۲؛ ۴۵/۲۳-۲۴؛ ۴۶/۲۶؛ ۵۹/۲)۔ "اور" استبدال واستخلاف" کے سلسلہ میں، جو اسی موضوع کا دوسرا عنوان ہے۔ (۲/۷؛ ۲/۲۰۹؛ ۵/۵۴؛ ۹/۳۸؛ ۱۱/۵۷؛ ۲۱/۱۱؛ ۲۸/۵۸؛ ۴۷/۳۸؛ ۷۰/۴۱-۴۲)۔

قوموں کی اجل

اجل کا مفہوم مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۲۵۳ (زیرِ آیت ۳/۱۴۴) آچکا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ اجل کے معنی "موت کی گھڑی" نہیں، بلکہ وہ مدت ہے جس میں ایک قوم زندہ رہتی ہے، اور یہ مدت قوانینِ خداوندی کی رو سے متعین ہوتی ہے۔ اور یہ ہر قوم کے اپنے بس کی بات ہے کہ وہ اپنی زندگی کی مدت متعین کرے۔ جب تک کوئی قوم قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتی رہے گی، زندہ رہے گی جب ان سے سرکشی برتے گی، زوال پذیر اور بالآخر ختم ہو جائے گی۔ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ (۱۳/۳۸؛ ۱۵/۴-۵)۔ "ہر مدت کے لئے قانون مقرر ہے۔"

بہائیوں کی غلط نگہی

لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ سے نگاہ بہائیوں کی غلط نگہی یا کوتاہ فہمی کی طرف اٹھ جاتی ہے۔ ہمارے زمانے میں دو (کاذب) مدعیانِ نبوت پیدا ہوئے۔ ایک مرزا غلام احمد (قادیانی) اور دوسرا بہاء اللہ (ایرانی)۔ مرزا غلام احمد نے کہا کہ وہ نبی تو ہے، لیکن کوئی کتاب نہیں لایا۔ (انڈکس میں مرزا غلام احمد۔ احمدی۔ کتاب کے عنوانات دیکھئے)۔ اس کے برعکس، بہاء اللہ نے کہا کہ قرآن ایک خاص مدت تک نافذ العمل رہنے کے لئے دیا گیا تھا۔ وہ مدت ختم ہوگئی ہے۔ میں اس کی جگہ ایک نئی کتاب لایا ہوں۔ اور اس کے لئے سند، اس آیت سے پیش کی۔ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ——— اور اس کا ترجمہ یہ کیا کہ ہر کتاب کے لئے ایک اجل (میعاد) مقرر ہوتی ہے۔ علاوہ دیگر امور، خود اس آیت کے الفاظ، اس ترجمہ (یا مفہوم) کی تردید کرتے ہیں۔ آیت کے الفاظ یہ نہیں کہ وَلِكُلِّ

قرآن ابدی ضابطہ خداوندی ہے

كِتَابٍ اَجَلٌ۔ یعنی ہر کتاب کے لئے میعاد مقرر ہے بلکہ الفاظ ہیں ——— وَلِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ——— "ہر میعاد کے لئے قانون مقرر ہے"۔ قرآن تمام نوعِ انسان کے لئے ضابطۂ ہدایت ہے۔ (۴/۱۷۵

و دیگر آیات) - اس لئے جب تک نوعِ انسان کا ایک فرد بھی کرۂ ارض پر زندہ رہے گا، قرآن زندہ و پائندہ رہے گا - اس لئے اس کے لئے کوئی مدّت مقرر نہیں کی گئی، اور یہ بات "بنی آدم" سے شروع ہی میں کہہ دی گئی تھی -

۳۵/۷ یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ اِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ رُسُلٌ مِّنۡکُمۡ یَقُصُّوۡنَ عَلَیۡکُمۡ اٰیٰتِیۡ ۙ فَمَنِ اتَّقٰی وَ اَصۡلَحَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ۝

اس کے متعلق ہم نے، انسان کی تمدنی زندگی کی ابتداء ہی میں، بذریعہ وحی کہہ دیا تھا کہ تمہاری طرف ہمارے پیغامبر آئیں گے جو ہمارے قوانین تم تک پہنچائیں گے - سو جو لوگ بھی ان قوانین کی نگہداشت کریں گے، اور زندگی اور کائنات کو سنوارنے والے کام کریں گے، اُن کے لئے کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہو گا -

اس کی تشریح مطالبُ الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۳۴ (زیر آیت ۳۸/۲) آ چکی ہے - علاوہ ازیں انڈکس میں "خوف و حزن" کا عنوان بھی دیکھئے - ان کے برعکس:

۳۶/۷ وَ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَ اسۡتَکۡبَرُوۡا عَنۡہَاۤ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ۝

ان کے برعکس، جو قوم ان قوانین کو جھٹلائے گی اور ان سے سرکشی برتے گی، وہ تباہ و برباد ہو جائے گی اور ہمیشہ کے لئے زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جائے گی -

تکذیب کا مفہوم سابقہ جلدوں میں بیان ہو چکا ہے (دیکھئے انڈکس) ہم نے اُوپر جھوٹے مدعیانِ نبوّت کا اشارۃً ذکر کیا ہے - ان کے متعلق کہا -

۳۷/۷ فَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَوۡ کَذَّبَ بِاٰیٰتِہٖ ؕ اُولٰٓئِکَ یَنَالُہُمۡ نَصِیۡبُہُمۡ مِّنَ الۡکِتٰبِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَتۡہُمۡ رُسُلُنَا یَتَوَفَّوۡنَہُمۡ ۙ قَالُوۡۤا اَیۡنَ مَا کُنۡتُمۡ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ ؕ قَالُوۡا ضَلُّوۡا عَنَّا وَ شَہِدُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ اَنَّہُمۡ کَانُوۡا کٰفِرِیۡنَ ۝

یہ ہے وہ اصول جس کے مطابق قوموں کی موت و حیات کے فیصلے ہوں گے - اور یہ قوانین ہماری

طرف سے بذریعہ وحی ملیں گے۔ انسانوں کے خود ساختہ نہیں ہوں گے۔

مفتری علی اللہ اب یہ سوچو اس سے بڑا مجرم اور کون ہوگا جو اپنے جی سے باتیں گھڑے، اور انہیں قوانینِ خداوندی کہہ کر پیش کر دے۔ (اس طرح وہ نہ معلوم کتنے لوگوں کو تباہ کر دیگا)

دوسری طرف، اس سے زیادہ بدنصیب کون ہوگا جس کے پاس ہمارے صحیح قوانین پہنچیں اور وہ انہیں

مکذبین جھٹلا دے۔ ایسے مجرمین کی گرفت یقیناً ہوگی، لیکن ہمارا قانونِ مہلت ایسا ہے کہ اس کی رُو سے اعمال کے نتائج کا ظہور، کچھ وقت کے بعد جا کر ہوتا ہے۔ اس دوران میں مجرمین بھی، باقی لوگوں کی طرح، قانونِ طبیعی کے مطابق، سامانِ زندگی سے بہرہ مند ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد ان کی گرفت ہوتی ہے (۲۰/۴۶)۔

جب ان کی گرفت ہوگی تو اُن سے پوچھا جائے گا کہ اب بتاؤ! وہ ہستیاں کہاں ہیں جنہیں تم خدا کو چھوڑ کر پکارا کرتے تھے۔ وہ کہیں گے وہ تو اب کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ وہ ہمارا ساتھ چھوڑ گئے۔ اسکے بعد، اُن کی حالت پکار پکار کر کہے گی کہ قوانینِ خداوندی سے انکار اور سرکشی کرنے والوں کا انجام یہ ہوا کرتا ہے۔

قرآن کریم نے محاکاتی انداز میں بتایا ہے کہ جب جہنم میں لیڈر اور اُن کے متبعین (عوام) یا مذہبی رہنما اور اُن کے معتقدین اکٹھے ہوں گے، تو وہ ایک دوسرے کو مطعون کریں گے کہ وہ ان کی وجہ سے

جہنم میں بازپرس عذابِ جہنم میں ماخوذ ہوئے ہیں۔ اس کا اجمالی ذکر مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۵۴۹ (زیرِ آیت ۵/۴۶) کیا گیا ہے[1]۔ اس مقام پر قرآن نے کہا کہ یہ صورت افراد ہی کی نہیں کہ وہ اپنے مقتداؤں اور لیڈروں کی اندھی تقلید سے تباہ ہو جاتے ہیں۔ قوموں کی بھی یہی حالت ہے۔ جو قوم ترقی یافتہ ہو، کمزور اور پس ماندہ قومیں اُس کی ہر روش کی تقلید کو اپنے لئے مایۂ ناز سمجھتی ہیں، اور آخر الامر اسی جہنم میں جا گرتی ہیں، جس میں وہ ترقی یافتہ اقوام گر کر تباہ ہوتی ہیں۔ اگلی آیات میں ان کے مکالمہ کا ذکر ہے:

---

[1] کتابت کی غلطی سے وہاں مکالمہ کو مقالہ، اور مکالمات کو مقالمات لکھا گیا ہے۔ قارئین اپنی کتاب میں تصحیح فرمالیں۔

ع ۳۹-۳۸ قَالَ ادْخُلُوْا فِیْۤ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ فِی النَّارِؕ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَاؕ حَتّٰۤى اِذَا ادَّارَكُوْا فِیْهَا جَمِیْعًاۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ۬ؕ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَ قَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ۠ ۝

ایسی قوموں سے کہا جائے گا کہ اب تم بھی، اِن مہذب اور غیر مہذب قوموں کے زمرے میں شامل ہو جاؤ، جو اس سے پہلے، قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کر کے، تباہ و برباد ہو چکی ہیں۔

جہنم میں قوموں کا مکالمہ

قوموں کی حالت بھی عجیب ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کی تقلید کرتی ہے لیکن، جب، کچھ عرصہ بعد، یہ بھی اسی گڑھے میں جا گرتی ہے جس میں پہلی قوم گری تھی، تو یہ (بعد میں آنے والی قوم) پہلی قوم کو ملعون کرنے لگ جاتی ہے کہ اُس کی وجہ سے اس کا بھی ایسا حشر ہوا۔ اِس طرح قومیں تباہی کے جہنم میں اکٹھی ہوتی رہتی ہیں (تاریخ اقوام اس کی شاہد ہے)۔ بعد میں آنے والی قومیں، ہمیشہ پیش رو قوموں کو موردِ الزام قرار دیتی ہیں اور کہتی ہیں کہ، اے ہمارے نشو و نما دینے والے! ان قوموں نے ہمیں بھی گمراہ کر دیا تھا۔ اِس لئے اُنہیں دُگنا عذاب دینا۔ (ایک عذاب، اُن کی اپنی گمراہی کی وجہ سے، اور دوسرا، اس لئے کہ انہوں نے دوسروں کو بھی گمراہ کیا) اُنہیں جواب ملتا ہے، تم سب کو دُگنا ملے گا — گمراہ کرنیوالوں کو گمراہ کرنے کی وجہ سے، اور گمراہ ہونے والوں کو اس لئے کہ انہوں نے، اپنی عقل و بصیرت سے کام لینے کی بجائے، اُن کی اندھی تقلید کیوں کی۔ نیز اس لئے بھی کہ یہ بھی تو بعد میں آنے والی قوموں کے لئے گمراہی کا موجب بنی تھیں)

سب کو دُگنا عذاب

اور پہلی قومیں، بعد میں آنے والی قوموں سے کہتی ہیں کہ، محض اس بنا پر کہ تم نے از خود کوئی غلط نظام وضع نہیں کیا تھا، بلکہ ہمارے قائم کردہ نظام پر چلتی رہی تھیں، تمہیں ہم پر کوئی فوقیت نہیں مل سکتی۔ اس لئے تم اپنے جرائم کی سزا بھگتو۔ یہ کیوں کہتی ہو کہ تمہارے جرائم کی سزا بھی ہم ہی بھگتیں؟

تاریخ انسانیت، اقوامِ عالم کی انہی کیفیات کی داستان ہے۔ مختلف قوموں کی طرح، ایک قوم میں

لیڈروں اور اُن کے متبعین کی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ دیکھئے (۳۳/۶۸)؛ (۳۴/۳۱-۳۴)؛ (۳۷/۲۷-۳۳)؛ (۳۸/۵۹-۶۱) اور (۴۰/۴۷-۴۸)۔

یہاں جو کہا گیا ہے کہ پسماندہ (مقلد) قوم کہے گی کہ ان کی پیش رو قوم کو دوہرا عذاب دیا جائے، تو یہی بات لیڈروں اور عوام کے مکالمہ کے سلسلہ میں کہی گئی ہے۔ (۳۳/۶۸)۔ مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۵۴۹ پر ہم نے اُن کی اس استدعا اور خدا کی طرف سے اُس کے جواب کا ذکر کیا ہے۔ انڈکس میں تقلید اور مکافاتِ عمل کے عنوانات دیکھئے اور سوچئے کہ قرآن کریم کس طرح ہر فرد اور ہر قوم کو اس کا مکلف ٹھہراتا ہے کہ وہ وحی کی روشنی میں اپنی عقل و بصیرت سے کام لے کر صحیح اور غلط میں خود تمیز کرے۔ اُن کا یہ عذر کہ ہم نے فلاں (بزرگ، لیڈر یا قوم) کا اتباع کرتے ہوئے غلط راستہ اختیار کیا تھا، قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو عقل و فکر کی روشنی عطا کی ہے، اور سے صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا ہے۔ اگر کوئی فرد یا قوم وحی کی روشنی اور اپنی عقل و فکر سے کام نہیں لیتی، اور آنکھیں بند کرکے دوسروں کے پیچھے چلی جاتی ہے، تو وہ بھی قابلِ مؤاخذہ ہے۔ عقل و فکر سے کام نہ لینا انسان کو خود موردِ جہنم بنا دیتا ہے (۷/۱۷۹)۔ اُنہیں دوہرا عذاب اس بنا پر ہے کہ ایک تو وہ غلط راستے پر چلے اور دوسرے اُنہوں نے اپنی عقل و فکر سے کام نہیں لیا۔ اُن کا انجام کیا ہوتا ہے، فرمایا:

(۷/۴۰-۴۱) إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ ۝ لَهُم مِّن جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَمِن فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ۝

حقیقت یہ ہے کہ جو قوم بھی قوانینِ خداوندی کی تکذیب کرے گی اور ان سے سرکشی برتے گی (خواہ وہ از خود ایسا کرے، یا دوسری قوموں کی دیکھا دیکھی، یہ روش اختیار کرلے)، وہ کبھی زندگی کی ان خوشگواریوں سے بہرہ یاب نہیں ہو سکے گی جو خدا کے متعین کردہ آسمانی نظام کے اتباع کا فطری نتیجہ ہیں (۵/۶۶؛ ۷/۹۶)۔ ان کا معاشرہ کبھی جنتی معاشرہ نہیں بن سکے گا۔ یہ ایسا ہی ناممکن ہے جیسا (محاورہ کے الفاظ میں) کسی موٹے رسّہ کا سوئی کے ناکے میں سے گزر جانا۔ مجرمین کی غلط روش کے نتائج ایسے ہی ہوتے ہیں۔ (۴۰)

ایسی قوموں کا اوڑھنا بچھونا، جہنم کا عذاب ہوتا ہے۔ ظلم و سرکشی کا نتیجہ یہی کچھ ہوا کرتا ہے۔ (۴۱)

تکبر و تکذیب

یہاں تکذیبِ آیات اور استکبار، دو جرائم بتائے گئے ہیں۔ استکبار تو کھلے بندوں اقدارِ خداوندی سے انکار کر کے، علی الرغم ان کے خلاف نظام قائم کرنا ہے۔ جیسے اقوامِ مغرب کی سیکولرازم۔ تکذیب یہ ہے کہ زبان سے اِن اقدار کی صداقت کا اعتراف کیا جائے، اور عملاً اُن کی خلاف ورزی کی جائے۔ جیسے ہمارے ہاں کی سیکولرازم۔ (اس کی تشریح، مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۳۶ اور جلد سوم صفحہ ۴۳۳ پر کی جا چکی ہے)۔

یہاں کہا گیا ہے کہ "اُن کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے"۔ اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر کہا گیا ہے؛ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۷/۹۶)۔

"اگر یہ بستیوں والے ایمان و تقویٰ کا شعار اختیار کرتے تو اِن پر آسمان اور زمین کی برکات کے دروازے کھل جاتے۔ لیکن انہوں نے قوانینِ خداوندی کی تکذیب کی، تو اپنے غلط اعمال کی پاداش میں پکڑے گئے"۔ مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۵۲۹ پر آیت (۵/۶۶) کی تشریح میں بتایا گیا ہے کہ زمینی دروازوں کا

زمین اور آسمان کے دروازے

کھل جانا، رزق کی فراوانی ہے، اور آسمانی دروازوں کے کھل جانے سے مراد ہے ہدایتِ خداوندی کا مل جانا، سابقہ جلدوں میں "معاشی نظام" کا عنوان دیکھئے۔ زمین و آسمان کے ربطِ باہمی کا نام اسلام ہے۔ یعنی ارضی معاملات (انسانی زندگی) کو وحیٔ خداوندی کے تابع رکھنا۔ اقبالؒ اسے "عشق اور زیرکی کا آمیزہ" کہہ کر پکارتا ہے۔ جاوید نامہ میں ہے؛

غربیاں را زیرکی سازِ حیات　　شرقیاں را عشق رازِ کائنات

خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ　　عشق را با زیرکی آمیز دہ　(صفحہ ۱۷)

اِن کے برعکس؛

۷/۴۲ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

جو قوم ہمارے قوانین کی صداقت کو تسلیم کرے گی اور ہمارے مقرر کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوگی، تو ان کا معاشرہ، جنتی معاشرہ ہوگا —— اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ——

وہ اسی میں رہیں گے۔ انہیں ہمارے قوانین کی اطاعت میں، اپنے اوپر کچھ پابندیاں عائد کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن ان پابندیوں سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ ان کی ذات کی وسعتیں بڑھ جائیں ——— صحیح نظام قائم کرنے کے لئے یہ بنیادی شرط ہے۔ (۲/۲۸۶؛ ۶/۱۵۲؛ ۲۳/۶۲)۔

"لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا" کی وضاحت، مطالب الفرقان جلد سوم میں کی جا چکی ہے علاوہ ازیں سابقہ باب میں زیر آیت (۶/۱۵۲) بھی یہ موضوع آچکا ہے۔ اگلی آیت میں، ان اہل جنت کی ایک خصوصیت بتائی گئی ہے جس میں انسانی نفسیات کی وسعتیں سمٹ کر آ گئی ہیں۔ فرمایا:

۷/۴۳ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۗ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۗ وَنُوْدُوْا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ٥ (نیز ۱۵/۴۷)

اس جنتی معاشرہ کی خصوصیت یہ ہوگی کہ ان افراد کے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے بغض، کینہ، عداوت، سازش، مکر و فریب، غرضیکہ کوئی ایسی بات نہ ہوگی جسے انسان دوسرے سے چھپا کر رکھنا چاہے (۱۵/۴۷)۔ اس معاشرہ کی شادابیاں سدا بہار ہوں گی، جنہیں دیکھ کر وہ بے ساختہ پکار اٹھیں گے کہ کس قدر درخور حمد و ستائش ہے وہ ذات جس نے ہماری راہنمائی اس حسین منزل کی طرف کر دی۔ اگر ہمیں یہ راہنمائی نہ ملتی، اور اسے اختیار نہ کرتے، تو کبھی اس مقام تک نہ پہنچ سکتے۔ خدا کے جو پیغامبر ہماری طرف آئے تھے، وہ حقیقی تعلیم لے کر آئے تھے، اور انہوں نے جو کچھ کہا تھا، بالکل سچ کہا تھا۔ وہ واقعہ ہو کر رہا۔

انہیں آواز دی جائے گی کہ (پہلی "جنت" انسان کو بے مزدو معاوضہ ملی تھی، اس لئے اس نے اس کی قدر نہ کی، اور وہ اس سے چھن گئی۔ لیکن) یہ جنت، تمہارے اعمال کا نتیجہ ہے، اس لئے یہ تم سے نہیں چھینی جائیگی اس کا ہم نے تمہیں وارث بنا دیا ہے۔ اسے تم نے اپنے خونِ جگر کے عوض خریدا ہے۔

ان کے دلوں سے غِلٌّ کو نکال دیا جائے گا۔ مادہ (غ۔ل۔ل) کی رُو سے اس کے معنی ہوتے ہیں وہ چیز جس سے جکڑ کر کسی کو قید کر دیا جائے۔ مَغْلُوْلٌ۔ قیدی یا جکڑے اور بندھے ہوئے کو کہتے ہیں۔

غِلّ کے معنی اَلْغِلُّ ۔ دل میں چھپی ہوئی دشمنی کو کہتے ہیں ۔ اِس مادہ میں چھپا کر رکھنے کا پہلو غالب ہوتا ہے ۔ اس مقام پر جس مفہوم کے لئے یہ لفظ آیا ہے، اس کے متعلق یوں سمجھئے کہ ہمارے ہاں اکثر کہا جاتا ہے کہ اُس کے دل میں میرے خلاف گرہ بیٹھ گئی ہے جو نکلنے میں ہی نہیں آتی ۔

جنّتی زندگی غِلّ کے بنیادی معنی اسی قسم کی گرہ سمجھ لیجئے ۔ اور اس گرہ سے ایک دوسرے کے خلاف کینہ، کدورت، حسد، انتقام، عداوت کی جو زہر آلود خباثتیں پیدا ہوتی ہیں، ان سب کو اس میں شامل کر لیجئے ۔ یہ ہے مفہوم غِلّ سے ۔ جنّتی معاشرہ کی اوّلیں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شامل ہونے والے افراد کے دلوں میں کوئی غِلّ نہیں ہوگا ۔ اسے جنّت میں داخل ہونے سے پہلے ہی دُور کر دیا جائے گا یہ گرہیں کھول دی جائیں گی ——— اسی کیفیت کو دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ (۱۵/۴۷) ۔

اس کا عام ترجمہ تو یہی ہے کہ "وہ تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے بھائیوں کی طرح بیٹھیں گے"۔ لیکن لفظ سُرُرٍ کا مادہ (س ۔ ر ۔ ر) ہے، جس کے بنیادی معنی راز کے ہیں ۔ ایک دوسرے کے سامنے (FACE TO FACE) وہی بیٹھ سکتے ہیں جن کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف کوئی راز کی بات نہ ہو ۔

يُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا (۲۵/۷۵)

"وہ جب ایک دوسرے کو ملیں گے تو زندگی بخش سلامتی کی آرزوؤں کے ساتھ ایک دوسرے کو خوش آمدید کہیں گے"۔ یہ وہ جنّتی معاشرہ ہوگا جو قرآنی رفقاء پر مشتمل ہوگا ۔ اس کے برعکس جہنمی معاشرہ میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ لَا مَرْحَبًا بِهِمْ (۳۸/۵۹) "وہ منافقت اور ریاکاری سے ایک دوسرے سے (بظاہر نہایت خندہ پیشانی سے) پیش آتے ہیں، لیکن دل سے کبھی خوش آمدید نہیں کہتے ۔ وہ ایک دوسرے سے مل کر کبھی خوش نہیں ہوتے، اس لئے کہ اُن کے دلوں میں غِلّ بھرا ہوتا ہے"۔

انتزاعِ غِلّ اس غِلّ کے نکالنے میں ایک اور بھی عمیق نکتہ مضمر ہے ۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، غِلّ کے معنی ہیں دل میں پڑی ہوئی گرہ ۔ اور انتزاع کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو اکھیڑ کر یا کھینچ کر نکالنا ۔ جیسے پھانس نکال دی جائے ۔ دورِ حاضر کے جہنمی معاشرہ میں اعصابی بیماریاں عام ہیں ۔ ان سے جو اضطرابی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ ہمارا شب و روز کا تجربہ اور مشاہدہ ہے ۔ ان کیفیات کو جسمانی امراض سمجھ کر ان کے بیسیوں علاج سوچے گئے ۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی کارگر ثابت نہ ہوا ۔ اب ماہرینِ علم النفس

(PSYCHOLOGISTS) اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ جسمانی امراض ہیں ہی نہیں۔ انسان کے تحت الشعور میں کوئی ایسا راز گرہ گیر ہو جاتا ہے جسے اس کا شعور فراموش کر چکا ہوتا ہے۔ گہرائی میں جا چھپا ہوا یہ راز، پھانس کی شکل اختیار کر لیتا ہے ——— پھانس یوں تو کچھ بھی نہیں ہوتی، لیکن اس کی پیدا کردہ بے چینی اس قدر شدید ہوتی ہے کہ انسان کو لمحہ بھر کے لئے چین نہیں لینے دیتی۔ اب ان، تحت الشعور میں پیوست، پھانسوں کا علاج تجزیۂ نفس کی رُو سے کیا جاتا ہے۔ اس فن کا ماہر کرتا یہ ہے کہ مریض کے تحت الشعور میں چھپے ہوئے راز کو کسی نہ کسی طرح "کھینچکر" باہر لے آتا ہے اور مریض اچھا ہو جاتا ہے۔ یورپ اور امریکہ (بالخصوص امریکہ) میں اب یہ طریقِ علاج زیادہ مقبول ہو رہا ہے۔ اعصابی مریض ہیں بھی زیادہ وہیں۔ ایسا کس کس طریق سے کیا جاتا ہے، میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ لیکن ان سب میں ایک قدرِ مشترک ہوتی ہے، اور وہ یہ کہ مریض کا اپنے معالج پر کلی اعتماد ہونا چاہئے۔ یہی اعتماد ہے جس کی بنا پر، یہ معالج اس پھانس کو باہر نکال لیتا ہے۔

اس کے بعد پھر آئیے قرآن کریم کی اس آیۂ جلیلہ کی طرف جس میں کہا گیا ہے؛ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ (۴۳/۷)۔ "ان کے تحت الشعور میں پیوست پھانسوں کو نکال باہر کیا جائیگا"۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس جنّتی معاشرہ کے افراد میں باہمی اعتماد کی کیفیت یہ ہوگی کہ شعوری راز تو ایک طرف، تحت الشعور میں جاگزیں سرِّ مستور بھی ایک دوسرے سے پوشیدہ نہیں ہوں گے۔ یہ کیفیت ہوگی اُنکے شرحِ صدر کی۔

ہدایتِ خداوندی

دوسری بات (۴۳/۷) میں یہ کہی گئی ہے کہ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ "اگر ہمیں خدا کی طرف سے راہنمائی نہ ملتی تو ہم اس مقام تک کبھی نہ پہنچ سکتے"۔ اس سے واضح ہے کہ ہدایت (راہنمائی) صرف وہ ہے جو اللہ کی طرف سے ملے، اور جواب اُس کی کتاب قرآن مجید میں محفوظ ہے۔

وراثتِ جنّت

اور تیسری بات یہ کہ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔ "یہ وہ جنّت ہے جس کا تمہیں، تمہارے اعمال کے نتائج میں مالک بنایا گیا ہے"۔ یعنی جنّت صرف انسان کے اپنے اعمال کے بدلے میں مل سکتی ہے۔ اس اعلانِ خداوندی نے، سفارشوں اور شفاعتوں کے تمام غیر قرآنی معتقدات کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی، جہنّم بھی　　　یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

بلکہ اس سے بھی زیادہ معنی خیز کہ ـــــ جنّت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

✻

اِس کے بعد اہلِ جنّت اور اہلِ جہنّم کے مابین ایک مکالمہ کا ذکر ہے[1]۔ جیسا کہ متعدد مقامات پر واضح کیا جا چکا ہے، ہم اس زندگی میں، یعنی اپنے شعور کی موجودہ سطح پر، اُخروی زندگی کی کنہ و حقیقت کو سمجھ نہیں سکتے اس لئے قرآنِ کریم میں اُن کیفیات کو تمثیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ان مثالوں کی رُو سے، ہم اپنے اپنے فہم و ادراک کے مطابق اُس زندگی کا کچھ تصوّر اپنے ذہن میں قائم کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ ہمارے فہم و ادراک کا تخلیق کردہ تصوّر ہوگا، حقیقت نہیں ہوگی۔ جہاں تک اس دنیا کی جنّت اور جہنّم کا تعلق ہے، اسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ جنّتی معاشرہ دیکھنے کی، تو ہمیں سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ جہنّم میں ہم خود رہتے ہیں۔ اس وضاحت کے بعد اگلی آیت دیکھئے:

۷/۴۵-۴۴　وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ؕ قَالُوْا نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ۘ

اور یہ (اہلِ جنّت)، جہنّم والوں کو پکار کر کہیں گے کہ ہمارے نشوونما دینے والے نے ہم سے جو وعدے کئے تھے، ہم نے اُنہیں اپنے سامنے ٹھیک ٹھیک دیکھ لیا ہے۔ وہ سب پورے ہو گئے ہیں۔ کہو! کہ جو کچھ خدا تم سے کہا کرتا تھا (کہ تمہاری غلط روش کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا) وہ بھی ٹھیک نکلا یا نہیں؟ وہ کہیں گے کہ ہاں! بالکل ٹھیک نکلا۔ وہ سب نتائج، ایک ایک کر کے، ہمارے سامنے آگئے۔

اِن کے درمیان ایک پکارنے والا پکارے گا کہ یہ بات پہلے ہی کہہ دی گئی تھی کہ جو قوم قوانینِ

---

[1] ان کے مکالمات کا ذکر دیگر مقامات پر بھی آیا ہے۔ دیکھئے: (۷/۵۰؛ ۳۷/۵۱-۵۰؛ ۵۷/۱۴-۱۳؛ ۷۴/۴۶-۴۰)

خداوندی سے سرکشی اختیار کرے گی، وہ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جائے گی۔ سو وہ ہو کر رہا۔

یعنی وہ قوم جو خدا کی طرف لے جانے والی راہ ——— خدا کے نظامِ ربوبیت کے راستے ——— میں روک بن کر کھڑی ہو گی اور انسانیت کو اس کی طرف آنے نہیں دے گی ——— اور ایسے سیدھی راہ میں پیچ و خم پیدا کرے گی۔ یہ لوگ درحقیقت نہ خدا کے قانونِ مکافات پر ایمان رکھتے تھے، اور نہ ہی انہیں حیاتِ اُخروی پر یقین تھا۔

دونوں کے درمیان پردہ

اگلی آیت میں کہا ہے: بَيْنَهُمَا حِجَابٌ "ان دونوں کے درمیان ایک حجاب (پردہ) ہوگا۔ سورہ بنی اسرائیل میں اسے حِجَابًا مَّسْتُوْرًا کہا گیا ہے (۴۵/۱۷)۔ یعنی وہ پردہ جو آنکھوں سے نہاں ہوگا، اسے دیکھا نہیں جا سکے گا اس پردے کا تجربہ تو ہم یہاں ہر روز کرتے ہیں۔

حیوانات میں آپ دیکھئے۔ کسی ایک نوع کی شکل و صورت دوسری نوع سے نہیں ملتی۔ اس لئے وہ ایک دوسرے سے دھوکا نہیں کھاتے۔ بکری کو پتہ ہوتا ہے کہ وہ جو سامنے سے آرہا ہے، ہرن ہے، اس لئے وہ مجھے کچھ نہیں کہے گا۔ اور وہ بھیڑیا ہے جو مجھے کھا جائے گا۔ لیکن نوعِ انسان کی صورت یہ ہے کہ اس میں ہر فرد، انسانی شکل لئے ہوتا ہے، اس لئے ہم انسانی ہرن اور بھیڑیا میں تمیز نہیں کر سکتے، اور ہر شاطر اور چالاک" درندہ انسان" سے مار کھاتے ہیں۔ اس طرح انسان اور انسان کے درمیان ایک "حجاب مستور" ہوتا ہے جو نظر نہیں آتا۔ لیکن ایسا کچھ جہنمی معاشرہ میں ہوتا ہے۔ جنتی معاشرہ میں ایسا کوئی حجاب نہیں ہوگا (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) ان کے سینے سے غلؔ نکال دیا جاتا ہے، جس سے ان کا ظاہر و باطن یکساں ہو جاتا ہے۔ کیا اطمینان بخش ہوگا وہ معاشرہ جس میں بھیڑیا اور ہرن دُور سے پہچانے جائیں، اور کوئی کسی سے دھوکا نہ کھائے۔ وہاں مجرم، شریف انسانوں سے الگ کھڑے ہوں گے (۵۹/۳۶)۔ مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے (۴۱/۵۵)۔

ان (اہلِ جہنم، ظالمین) میں دونوں گروہ شامل ہیں۔ ایک وہ جو کھلے بندوں لوگوں کو خدا کی طرف

مذہبی پیشوا

لے جانے والے راستے سے روکتے ہیں۔ اور دوسرے وہ جو اس راہ میں پیچ و خم پیدا کر دیتے ہیں۔ راستہ بظاہر وہی ہوتا ہے، لیکن وہ صراطِ مستقیم نہیں ہوتا۔

اس میں ہزار پیچ و خم ہوتے ہیں جو راہ رو کو کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں۔ پہلا گروہ، غیر مسلموں کا ہے اور دوسرا گروہ مذہبی پیشواؤں کا جو کہ اوّل الذکر سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ وہ بھیڑیا ہوتا ہے تو بھیڑیئے کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ یہ بھیڑیا، بکری کی کھال اوڑھے ہوتا ہے۔

ضمناً۔ اَلْعَوَجُ ("ع" کے زبر کے ساتھ) اس ٹیڑھ پن کو کہتے ہیں جو آنکھوں سے نظر آجائے اور اَلْعِوَجُ (عین کے زیر کے ساتھ) اس ٹیڑھ پن کو جو آنکھوں سے دیکھا نہ جا سکے، عقل و بصیرت کی رو ہی سے نظر آسکے۔ قرآن کریم نے عِوَجًا کہا ہے (عین کے زیر کے ساتھ)۔ اس سے واضح ہے کہ مذہبی پیشوائیت،

اَلْعَوَجُ اور اَلْعِوَجُ میں فرق

دین کے راستے میں کس قسم کا پیچ و خم پیدا کرتی ہے۔ ہم اسی پیچ و خم میں الجھائے ہوئے راہرو راہ وجہات ہیں۔

سورہ حدید میں منافقین اور اہلِ ایمان کے درمیان حائل شدہ دیوار کا ذکر ہے جس کے باطن میں رحمت ہے اور ظاہر میں عذاب (۵۷/۱۳)۔ (اس کی تشریح اپنے مقام پر آئے گی)۔ اس کے بعد ہے:

۷/۴۶ وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمَاهُمْ ۚ وَنَادَوْا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ۚ لَمْ يَدْخُلُوهَا وَهُمْ يَطْمَعُونَ ○

جنّت اور دوزخ کی زندگی کا فرق تو اس قدر نمایاں ہے، لیکن کفر اور ایمان کے درمیان ایک اوٹ سی ہی ہوتی ہے ذرا نگاہ میں تبدیلی ہو جائے تو انسان اِدھر سے اُدھر چلا جاتا ہے (۵۷/۱۴-۱۳)؛ (۱۷/۴۵)۔

جنّتی معاشرہ کے اربابِ نظم و نسق جو اپنے کردار اور ذمہ داریوں کے اعتبار سے بلند مقامات پر ہوں گے (۲/۱۴۳ و ۴/۴۱ و ۵۶/۱۰-۱۱)۔ مختلف لوگوں کے انداز و رجحان سے جانچ لیں گے کہ ان کا رخ کس سمت کو ہے۔ وہ ان لوگوں سے، جو ہنوز اس معاشرہ میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے لیکن جو اس کی آرزو دل میں رکھتے ہوں گے، آگے بڑھ کر کہیں گے کہ (تمہیں انتظار کس بات کا ہے!) آگے بڑھو اور اس معاشرہ میں داخل ہو جاؤ تاکہ تمہیں بھی ہر طرح کی سلامتی حاصل ہو جائے۔

اہلِ اعراف

حجاب کے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے۔ اس آیت میں تشریح طلب مقام اہلِ اعراف کا ہے۔ عرف (معرفت) کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کی علامات و آثار پر غور و فکر سے اس کا ادراک کر لینا۔ یہ اربابِ علم و بصیرت کی اہم خصوصیت ہے" کہ خارِ دیدہ احوالِ چمن گفت،"

اسی اعتبار سے یہ لفظ رفعت و بلندی کے لئے بھی آتا ہے۔

ہمارے ہاں عام تصوّر یہ ہے کہ جنّت اور دوزخ کے بین بین ایک مقام ہوگا جس میں وہ لوگ ہونگے جن کی قسمت کا ہنوز فیصلہ نہیں ہوا ہوگا۔ کہ انہیں جنّت میں بھیجا جائے گا یا دوزخ میں یعنی یہ وہ لوگ ہونگے جن کے مقدمہ کا فیصلہ التوا میں رکھا جائے گا اور اس کا انہیں انتظار ہوگا۔

لیکن یہ مفہوم درست نہیں۔ قرآن کریم نے دو ہی گروہوں کا ذکر کیا ہے۔ فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ (۴۲/۷)۔ "ایک گروہ جنّت میں، اور ایک جہنّم میں"۔ اس میں کسی تیسرے گروہ کا ذکر نہیں۔ ویسے بھی، قانونِ مکافات کی رُو سے یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ عدالتِ خداوندی کسی کا حتمی فیصلہ نہ کرسکے، اور اسے انتظار (SUSPENSION) میں رکھے۔

اس لفظ کے جو معانی اوپر بتائے گئے ہیں، ان کی رُو سے تو یہ لوگ اہل جنت میں بھی بلند اور ممتاز مقام کے حامل نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ سورۃ الواقعہ میں ان کے متعلق کہا گیا ہے: وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝ (۵۶/ ۱۰-۱۲)۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اُخروی زندگی کی کیفیات کو ہم اپنی موجودہ زندگی کی سطح پر سمجھ نہیں سکتے۔ انہیں مثالوں کے ذریعے سمجھایا گیا ہے۔ اس اعتبار سے (کم از کم) میں یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ اہلِ اعراف سے کون لوگ مراد ہیں۔ البتہ جہاں تک اس دُنیا کی جنّتی زندگی (قرآنی معاشرہ) کا تعلق ہے، بات واضح ہے۔ قرآن کریم نے جماعتِ مومنین کو، باقی نوعِ انسان کے مقابلے میں، بڑا بلند مقام عطا فرمایا ہے۔ اُنہیں شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (۲/۱۴۳) کہہ کر پکارا ہے، اور رسول اللہؐ کو تمام اقوامِ عالم کے نمائندوں پر نگران (۴/۴۱) تفصیل کے لئے مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۹۰ آیت (۲/۱۴۳) اور جلد چہارم صفحہ ۳۲۳ دیکھئے۔ یہ کہ اہلِ اعراف سے مُراد "اُمّتِ محمّدیہ کے اربابِ علم و بصیرت ہیں" اس سے بھی واضح ہے، جو اُنکے متعلق کہا گیا ہے کہ يَعْرِفُوْنَ كُلًّاۢ بِسِيْمٰهُمْ (۷/۴۶)۔ "وہ سب کو اُن کے آثار و کوائف سے پہچان لیں گے"۔ میں نے انہی معانی کی رُو سے آیات (۷/ ۴۶-۴۹) کا مفہوم متعین کیا ہے۔ اس لیے ان کے صرف مفہوم پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ارشاد ہے:

۷/۴۷ وَاِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝

یہ لوگ (جو ہنوز انتظار میں تھے) جب اُن لوگوں کی حالت پر نظر ڈالیں گے جو جہنمی معاشرہ میں گرفتار ہونگے تو وہ (فوری فیصلہ کریں گے اور) پکار اُٹھیں گے کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم اِن لوگوں کے ساتھی نہیں بننا چاہتے جنہوں نے تیرے قوانین سے سرکشی اختیار کر رکھی ہے۔

اِس کے بعد ہے:

۷/۴۹-۴۸ وَنَادَىٰ أَصْحَابُ الْأَعْرَافِ رِجَالًا يَعْرِفُونَهُمْ بِسِيمَاهُمْ
قَالُوا مَا أَغْنَىٰ عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ ○
أَهَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللَّهُ بِرَحْمَةٍ ۚ ادْخُلُوا
الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُونَ ○

پھر وہ اربابِ نظم ونسق (اعراف والے) دوسری روش کے حامل لوگوں سے کہیں گے، جنہیں وہ انکے انداز و رُجحان سے پہچان لیں گے، کہ دیکھو! تمہاری سرمایہ داری تمہارے کسی کام نہ آسکی، نہ ہی وہ قوّت واقتدار جس کی بنا پر تم قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتا کرتے تھے۔

(وہ جنّت میں جانے والوں کی طرف اشارہ کر کے، اِن جہنّم والوں سے کہیں گے کہ) کیا یہ وہی لوگ نہیں جن کے متعلق تم قسمیں کھا کھا کر کہا کرتے تھے کہ اُنہیں کبھی خدا کی رحمت نصیب نہیں ہو سکے گی۔ دیکھو آج اِنہی لوگوں سے کہا جا رہا ہے کہ تم پر جنّت کے دروازے کھلے ہیں، تمہیں اِس میں نہ کسی کا خوف ہوگا نہ حزن۔

اہلِ جنّت اور اہلِ جہنّم کے مکالمات کا ذکر پہلے آچکا ہے، اِسی میں ایک اور اضافہ ہے:

۷/۵۰ وَنَادَىٰ أَصْحَابُ النَّارِ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ أَفِيضُوا عَلَيْنَا مِنَ الْمَاءِ
أَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ ۚ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكَافِرِينَ ○

اور جہنمی معاشرہ والے، جنّتی معاشرہ والوں سے کہیں گے کہ یا تو ان زندگی بخش ذرائع نشوونما میں سے، جو تمہیں میسّر ہیں، ہمیں بھی دے دو تاکہ ہماری کھیتیاں بھی سیراب ہو جائیں۔ یا جو سامانِ زیست تمہیں خدا کی طرف سے ملا ہے اُس میں سے تھوڑا سا ہمیں عطا کر دو (۵۷/۱۳) وہ کہیں گے کہ یہ چیزیں تو قوانینِ خداوندی پر ایمان لانے اور ان کے مطابق عمل کرنے کا فطری نتیجہ ہیں۔ اُنہیں ان کی طرف منتقل کیا ہی نہیں جا سکتا جو ان قوانین سے انکار کرتے اور سرکشی برتتے ہوں۔ (جو اپنی آنکھیں بند کر رکھے، اُسے دوسرے کی بینائی کچھ فائدہ

نہیں دے سکتی۔ نہ ہی کوئی شخص اپنی بصارت دوسرے کی طرف منتقل کرسکتا ہے)۔

یہ وہ لوگ ہیں:

۷/۵۱ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَهُمْ لَهْوًا وَّ لَعِبًا وَّ غَرَّتْهُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا ۚ فَالْیَوْمَ نَنْسٰهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ یَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَ مَا كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یَجْحَدُوْنَ ○

یہ لوگ (جو ان نعمائے خداوندی سے یوں محروم رہ گئے ہیں) وہ ہیں جنہیں طبیعی زندگی کی نگاہ فریب جاذبیتوں نے ایسا دھوکا دیا کہ اُنہوں نے اس حقیقت پر کبھی سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا کہ نظریۂ حیات

اپنے دین سے مذاق کرنے والے

اور اس نظام کو، جس کے مطابق انسان زندگی بسر کرتا ہے، کس قدر اہمیت حاصل ہے (۶/۷۰)۔ اُنہوں نے یہ سوچا ہی نہیں کہ انسانی زندگی کا منتہیٰ یہی دنیوی زندگی نہیں جو موت کے ساتھ ختم ہو جائے گی۔ سو یہ لوگ، بلند انسانی زندگی کے شرف و اعزاز سے اسی طرح محروم رہ جائیں گے جس طرح یہ اُس زندگی کے وجود سے منکر تھے، اور ہمارے قوانین سے، محض ضد اور تعصب کی بنا پر، انکار کیا کرتے تھے۔

اپنے یا دوسرے کے دین کا مذاق اُڑانے والوں کے متعلق تفصیلی طور پر مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۵۳۲ آیات (۵/۵۷-۵۸)، نیز سابقہ باب میں زیر آیات (۶/۶۸-۷۰) دیکھئے۔

سابقہ باب میں بتایا جا چکا ہے کہ کسی قوم کی تباہی سے پہلے دو شرائط پوری کی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ قوم عقل و بصیرت کی رُو سے بات سمجھنے کے قابل ہو، اور دوسری یہ کہ اس تک صحیح بات (قوانینِ خداوندی) پہنچ چکی ہو۔ یہاں اُن اہلِ جہنم سے یہی کہا گیا ہے:

۷/۵۲-۵۳ وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰی عِلْمٍ هُدًی وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ○ هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِیْلَهٗ ؕ یَوْمَ یَاْتِیْ تَاْوِیْلُهٗ یَقُوْلُ الَّذِیْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَیَشْفَعُوْا لَنَاۤ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَیْرَ الَّذِیْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ قَدْ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ○ ع

ان تک ہدایت پہنچ چکی تھی

(اے رسولؐ! ان مخاطبین سے کہہ دو کہ) ہم نے انہیں ایک ایسا ضابطۂ حیات دیا ہے جو ہر بات کو، علم و حقیقت کی بنیادوں پر، کھول کھول کر بیان کر دیتا ہے۔ اور ان لوگوں کے لئے جو اس کی صداقت پر یقین رکھیں، سامانِ ہدایت و رحمت اپنے اندر رکھتا ہے۔

یہ لوگ (جو اس قدر واضح حقائق پر بھی ایمان نہیں لاتے) کیا اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کی غلط روشِ زندگی کے جس تباہ کن انجام کی انہیں خبر دی جا رہی ہے، وہ اُن کے سامنے آجائے (تو پھر اُس پر ایمان لائیں؟) — (۹/۳)

ان سے کہہ دو کہ جب غلط روش کا انجام سامنے آ کھڑا ہو گا، تو وہ لوگ جنہوں نے اُسے آج یوں فراموش کر رکھا ہے، پکار اُٹھیں گے کہ ہمارے پاس ہمارے نشوونما دینے والے کی طرف سے، جو پیغامبر آئے تھے وہ واقعی حق پر تھے۔ اُس وقت وہ تلاش کریں گے اور کہیں گے کہ کوئی سفارشی ایسا مل جائے جو ہمیں اس عذاب سے چھڑا دے۔ یا ہم پیچھے لوٹا دیئے جائیں تو ہم جو کچھ (غلط) کام کیا کرتے تھے، اُن کے برعکس کام کر کے دکھا دیں۔ لیکن اُس وقت یہ باتیں قطعاً فائدہ نہیں دیں گی۔ اُنہوں نے اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو تباہ کر لیا اور اُن کا ساختہ پرداختہ اُن کے کسی کام نہ آیا۔

یہاں پہلی بات تو قرآن کریم کی یہ خصوصیت بتائی ہے کہ نہایت واضح کتاب ہے۔ اس میں کوئی ابہام نہیں۔ دوسری بات یہ کہ انہیں کوئی شفاعت کرنے والا نہیں ملے گا۔ (انڈکس میں شفاعت کا عنوان دیکھئے)۔ اور تیسری بات یہ کہ وہ کہیں گے کہ ہمیں دنیاوی زندگی کی طرف لوٹا دیا جائے تاکہ ہم اچھے کام کر سکیں۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، مرنے کے بعد پھر کسی کو اس دُنیا کی طرف لوٹایا نہیں جائے گا۔ (مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۱۳۴۔ آیت (۲/۱۶۷)۔ نیز نظریۂ تناسخ کے ابطال کے لئے جلد اوّل صفحہ ۴۴ آیت (۱/۵))

اس امر کی شہادت اور ثبوت کے لئے کہ قانونِ خداوندی کی کارفرمائی میں کوئی دخیل نہیں ہو سکتا۔ (سفارش یا شفاعت سے یہی مُراد ہوتی ہے)۔ قرآن نے حسبِ معمول، خارجی کائنات کے نظام کو پیش کر دیا۔ فرمایا:

۷/۵۴ إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا ۙ وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَ النُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ؕ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

نظامِ فطرت

ان سے کہہ دو کہ تمہارا نشو و نما دینے والا وہ خدا ہے جس نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو چھ مراحل[1] میں پیدا کیا اور اس کے بعد، اس کا مرکزی کنٹرول خود اپنے دستِ قدرت میں رکھا۔ (۷/۵۴)۔ اُس کے قانون کے مطابق آسمانی کُرّے اس طرح گردش کرتے ہیں کہ رات کی تاریکیاں دن کی روشنی کو ڈھانپ لیتی ہیں اور پھر (یوں نظر آتا ہے جیسے) دن، رات کے پیچھے لپکے چلا آ رہا ہے، اور سورج اور چاند اور ستارے، سب اُس کے قانون کے مطابق اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ یاد رکھو! یہ عالمِ محسوسات، اور اس کے ماوراء وہ عالم، جہاں سے اس کائنات کی تدابیر امور ہوتی ہے۔ سب خدا کے متعین فرمودہ پروگرام کی تکمیل میں مصروفِ کار ہیں۔

کس قدر بابرکت ہے وہ ذات جس نے کائنات کی نشو و نما کیلئے ایسا محیر العقول انتظام کر رکھا ہے!

اس میں جو الفاظ، یا اصطلاحات آئی ہیں، ان کے معانی پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ "عالمِ امر و خلق" کے متعلق دیکھئے مطالب الفرقان جلد اوّل (صفحہ ۲۷۲ ؛ صفحہ ۲۸۳)۔ تخلیقِ ارض و سمٰوات کے لئے جلد اوّل (صفحہ ۳۵۲) ایام (واحد یوم) کے لئے جلد اوّل (صفحہ ۲۹) عرش کے لئے، جلد دوم (صفحہ ۶۷) اور جلد چہارم (آیت ۳/۶ صفحہ ۲۱)۔ مبارک کا مفہوم سابقہ صفحات میں زیر آیات (۶/۹۲) و (۶/۱۵۶) بیان ہو چکا ہے۔

کائنات کا تخلیقی آغاز کیسے ہوا۔ چھ ایام (STAGES) سے کیا مراد ہے۔ یہ اور اسی قسم کے دیگر نکات، جو قرآن کریم کے متعدد مقامات میں پھیلے ہوئے ہیں، کا تعلق علومِ سائنس سے ہے اور ان کی تشریح بڑی ادق اور ٹیکنیکل ہے۔ ظاہر ہے کہ ان موضوعات کے متعلق میری معلومات مطالعاتی ہیں، براہ راست میری اپنی تحقیق کا نتیجہ نہیں، کیونکہ یہ میرا میدان نہیں۔ میں نے اپنی مطالعاتی معلومات کو اپنی تالیف "انسان نے کیا سوچا" میں قلمبند کیا ہے جو متعدد موضوعات پر مشتمل ہے۔ جس چیز کا تعلق قرآن کے طالبعلم

سائنس کے انکشافات اور قرآنی آیات

---

[1] STAGES ـــــ OR ـــــ PERIODS

بلکہ ایک مسلمان سے ہے، وہ سائنٹفک معلومات نہیں۔ وہ یہ اہم نکتہ ہے کہ قرآن نے خارجی کائنات کے متعلق جو کچھ کہا ہے، سائنس کے انکشافات اس کی تائید کرتے ہیں یا اس کے خلاف جاتے ہیں۔ ہمارے حلقۂ احباب میں سے ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب نے، قرآن کریم کی بیشتر (متعلقہ) آیات کے متعلق ثابت کیا ہے کہ عصرِ حاضر کے سائنٹفک انکشافات کس طرح ان کی تائید کرتے ہیں[1]۔ لیکن غیر مسلم سائنسدانوں میں سے جس محقق کا نام سرفہرست آتا ہے، وہ پیرس کے ایک نامور ڈاکٹر (سرجن) (MAURICE BUCCAILLE) ہیں جن کی کتاب کا نام ہے (THE BIBLE, THE QURAN AND SCIENCE)[2]۔ ہمارے پیشِ نظر

ڈاکٹر مارس بکائے

موضوع کے سلسلہ میں تو اتنا کہہ دینا کافی تھا کہ اس نے قرآن کریم کی متعدد آیات کے متعلق ثابت کیا ہے کہ سائنس کی تحقیقات کس طرح ان کی تائید کرتی ہیں، لیکن میں اس کا ذرا تفصیلی تعارف مناسب سمجھتا ہوں۔ میں ایسا کیوں سمجھتا ہوں، اس کی وجہ آپ کو اس کے تعارف سے سمجھ میں آجائے گی۔ اس نے لکھا ہے کہ "میں نے اس نگاہ سے بائیبل کا گہرا مطالعہ کیا کہ اس میں مظاہر فطرت کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ سائنس کے انکشافات کے مطابق ہے یا اس کے خلاف، یہ دیکھ کر مجھے بڑی مایوسی ہوئی کہ اس میں جو کچھ اس باب میں کہا گیا ہے، جہالت اور توہم پرستی پر مبنی ہے۔ اس سے لامحالہ میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر، (جیسا کہ ہم سے منوایا جاتا ہے) یہ خدا کی کتاب ہے، تو پھر وہ خدا (معاذ اللہ) بڑا ہی جاہل ہے۔ اور اگر خدا علیم و بصیر ہے تو پھر یہ کتاب خدا کی نہیں ہو سکتی۔ زمانۂ قبل از تہذیب کے انسانوں کی پریشان خیالیوں کا مجموعہ کہلا سکتی ہے۔

اس کے بعد اس نے کہا ہے کہ "میں نے سوچا کہ یہودیت اور عیسائیت کے بعد دنیا کا ایک بہت بڑا مذہب اسلام بھی ہے۔ دیکھنا چاہیئے کہ جس کتاب کو اس مذہب کے پیرو منزل من اللہ کہتے ہیں، اس باب میں اس کی کیا کیفیت ہے۔ اس نے کہا ہے کہ "میں اسلام کا معتقد نہیں"۔ میں نے ایک سائنسدان

---

[1] ان کی کتاب کا نام ہے (PHENOMENA OF NATURE AND QURAN)۔ ان سطور کی تحریر کے وقت ان کی دوسری کتاب زیرِ طبع ہے۔

[2] اسے (AMERICAN TRUST PUBLICATIONS, INDIANAPOLIS, U.S.A.) نے شائع کیا ہے۔

کی حیثیت سے خالصتہً علمی نکتہ نگاہ سے اس کتاب کا جائزہ لینے کا ارادہ کیا تھا، اور وہ بھی علوم سائنس کی حد تک۔ سائنس میں بھی میں نے اُن مسائل کو نہیں لیا جو ہنوز نظریات میں شمار ہوتے ہیں۔ صرف اُن انکشافات کو لیا جو حقائق (FACTS) کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

اُس نے کہا ہے کہ "میں عربی زبان نہیں جانتا تھا۔ اس لئے لامحالہ مجھے قرآن کے تراجم کی طرف رجوع کرنا پڑا۔

قدیم عربی زبان سیکھی

لیکن یہ دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی کہ جہاں تک اہم حقائق کا تعلق ہے کوئی ایک ترجمہ دوسرے سے نہیں ملتا اور جہاں تک سائنس کے انکشافات کا تعلق ہے، تفاسیر بیشتر رطب و یابس کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے میں نے سوچا کہ اگر ریسرچ کا شوق ہے تو پھر اس کتاب کا براہِ راست مطالعہ کرنا چاہیئے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ عربی سیکھی جائے، اور عربی بھی جدید نہیں، بلکہ وہ قدیم عربی جس میں قرآن نازل ہوا تھا"

آگے بڑھنے سے پیشتر آپ سوچیئے کہ اس شخص کی نگاہ کتنی دُور تک پہنچی اور اُس نے کس طرح اس حقیقت کو پا لیا کہ قرآن مجید محاورۂ عرب کی رُو ہی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ عربی سیکھنے کے لئے خود عرب پہنچا۔ اُس نے لکھا ہے کہ اس سلسلے میں اُس کی شاہ فیصل (مرحوم) سے بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

قرآن غیر محرف صحیفہ ہے

عربی زبان پر اس قدر دسترس حاصل کرنے کے بعد اُس نے سوچا کہ اُسے اس کا بھی اطمینان حاصل کرنا چاہیئے کہ جو کتاب آج ہمارے ہاتھ میں ہے وہ بعینہٖ وہی ہے جسے پیغمبرِ اسلامؐ نے اپنی اُمت کو دیا تھا۔ اُس نے اپنی کتاب کا ایک پورا باب اس تحقیق کی نظر کیا ہے اور اس کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ یہ کتاب بالکل غیر مُحرف ہے اور بلا شائبہ تشکیک اپنی اصلی شکل میں دنیا میں موجود۔ اس تحقیق کے دوران وہ اس نتیجے پر بھی پہنچا کہ یہ خدا کی کتاب ہے، اس لئے نہ اس کتاب کو محمدؐ کی کتاب کہنا چاہیئے، نہ اسلام کو محمدؐ کا دین۔

اُس نے لکھا ہے کہ "یہ مغربی مستشرقین کی سازش تھی جو اُنہوں نے مسلمانوں کو (MOHAMMADANS) اور اسلام کو (MOHAMMADANISM) کہنا شروع کر دیا۔ اور حیرت ہے کہ خود مسلمان بھی اس فریب میں آگئے محمدؐ نے کہیں دعوٰی نہیں کیا کہ اسلام اُن کا وضع کردہ دین ہے"

اس کے بعد اُس نے لکھا ہے کہ "میں نے سائنس کے ان ثابت شدہ حقائق کو لیا جن کا تعلق تخلیق کائنات، فلکیات ارضیات، نباتات، حیاتیات اور خود انسانی تخلیق اور جنین کی پیدائش سے ہے، اور ان موضوعات کے متعلق قرآن کی

ورق گردانی شروع کی میں نے دیکھا کہ قرآن کا یہ انداز نہیں کہ وہ ایک موضوع پر، ایک ہی مقام پر، سب کچھ کہہ دے

تبویب القرآن

وہ اس کے متعلق مختلف مقامات پر بیان کرتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہوا کہ میرے پیشِ نظر موضوعات کے متعلق قرآن میں جہاں جہاں کچھ آیا ہے اسے الگ مدوّن کیا جائے۔ چنانچہ اس طرح اُس نے قرآن کے اِن حصّوں کی تبویب کی۔

آپ نے غور فرمایا کہ محاورۂ عرب کے بعد یہ وہ دوسرا بنیادی طریق ہے جسے قرآن کریم نے قرآن فہمی کیلئے خود تجویز کیا ہے اور جس پر میں پچاس سال سے کاربند چلا آرہا ہوں۔ یہ ریسرچ سکالر آج تک مجھ سے نہیں ملا اور جہاں تک میرا خیال ہے، میری کوئی کتاب بھی اس کی نظر سے نہیں گزری ہوگی۔ اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اُس نے قرآن فہمی کا یہ انداز مجھ سے مستعار لیا ہے۔ یہ انداز خود قرآن نے تجویز کیا ہے اور جو شخص بھی آزادانہ قرآن پر غور کریگا اُس کے سامنے یہ طریق خود بخود آجائے گا۔

اس کوہ کنی کے بعد وہ قرآنی سرچشمہ سے جوئے شیر لانے کی طرف گامزن ہوتا ہے۔ وہ سائنس کی کسی ایک ثابت شدہ حقیقت کو لے کر اس سے متعلقہ آیات کو سامنے رکھتا ہے اور پھر آیت کے الفاظ کے معانی بنیادی عربی زبان کی رُو سے متعین کرتا اور ثابت کرتا ہے کہ ان معانی کی رُو سے قرآن میں پیش کردہ حقیقت کس طرح سائنس کے انکشافات کے عین مطابق ہے۔ وہ ایسے مقامات پر یہ کہتا ہے کہ مسلمانوں کے قدیم مفسّرین تو معذور تھے کہ وہ قرآن کا صحیح مفہوم نہ سمجھ سکے کیونکہ ان کے زمانے میں علمِ انسانی نے اتنی ترقی نہیں کی تھی، لیکن مجھے افسوس آتا ہے دورِ جدید کے مترجمین اور مفسرین پر کہ وہ بھی آنکھیں بند کئے اُسی ڈگر پر چلے جارہے ہیں۔ وہ موجودہ دَور کے تراجم کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے:

قرآن کے ترجموں کی کیفیت

ان تراجم میں اس قسم کی فاش غلطیاں کیوں پائی جاتی ہیں؟ اس کی وجہ یہی نظر آتی ہے کہ قدیم زمانہ کے مفسّرین نے جو کچھ کہہ دیا یہ لوگ بلاتحقیق اسی کو سند تسلیم کئے چلے جارہے ہیں۔ ان لوگوں کے متعلق تو یہ عذر تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایک لفظ کے متعدد مفاہیم میں سے، اُس خاص مفہوم کا انتخاب نہیں کرسکتے تھے جو قرآن میں بیان کردہ سائنٹفک حقیقت کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ لیکن اب سائنس کے انکشافات نے اس مسئلے کو بالکل صاف کردیا ہے۔ لہٰذا اب ضرورت ہے کہ انسانی علوم کی روشنی میں ان تراجم اور تفاسیر پر نظرِ ثانی کی جائے۔ (صفحہ ۱۱۸)

وہ ایک ایک آیت کو لیتا ہے۔ اس طریق سے اُس کا مفہوم متعین کرتا ہے۔ اس کے بعد بتاتا ہے کہ سائنس کے جدید ترین انکشافات کس طرح اس مفہوم کی تائید کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد وجد و کیف کے عالم میں جھوم کر کہتا ہے کہ اے دنیا کے دانشورو! خدارا مجھے بتاؤ کہ کیا آج سے چودہ سو سال پہلے انسانی فکر کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ اس قسم کی حقیقت بیان کر سکتا؟ ہمیں اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ اُس زمانے میں کوئی انسان یہ کچھ نہ سمجھ سکتا تھا نہ کہہ سکتا۔ اس حقیقت کے بعد ہمارے لئے یہ تسلیم کرنے میں کونسا امر مانع ہو سکتا ہے کہ اس علم کا سرچشمہ ماوراءِ عقلِ انسانی ہے؟ وہ ایک مقام پر بائیبل اور قرآن کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

قرآن انسانی فکر کی تخلیق نہیں ہو سکتا

ان موضوعات کے متعلق جہاں بائیبل میں بے شمار غلطیاں پائی جاتی ہیں، قرآن میں مجھے اس قسم کی کوئی ایک غلطی بھی نہیں ملی۔ ایسے مقامات پر کھڑے ہو کر مجھے سوچنا اور اپنے آپ سے یہ سوال کرنا پڑا کہ اگر قرآن کا مصنف کوئی انسان تھا تو اس کے لئے کیسے ممکن تھا کہ وہ سائنس کے ان حقائق کو ساتویں صدی عیسوی میں پیش کر سکتا جن کا انکشاف اس دور میں آ کر ہوا ہے۔ جو قرآن آج ہمارے ہاتھ میں ہے وہ بلا شک و شبہ وہی ہے جسے پیغمبر اسلامؐ نے دنیا کو دیا تھا۔ لہٰذا اس میں بعد کے کسی ردّ و بدل، اضافہ یا آمیزش کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ان حقائق کی روشنی میں کیا عقلِ انسانی اس کی کوئی توجیہہ پیش کر سکتی ہے کہ اُس زمانے میں ایک انسان نے یہ کچھ کیسے معلوم کر لیا؟ میں تو اس کی کوئی توجیہہ پیش نہیں کر سکتا .... (صفحہ ۱۲۰)

اس سے ذرا آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ:

جو کچھ میں نے تحقیق کیا ہے وہ لامحالہ انسان کو اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ یہ بات ناقابلِ تصوّر ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کا ایک انسان، متنوع حقائقِ کائنات کے متعلق، جو اُس زمانے میں انسانوں کے سامنے آئے ہی نہیں تھے، ایسی باتیں کہہ دے جو چودہ سو سال کے بعد کہیں جا کر بے نقاب ہوئی ہوں۔ بنابریں میں تو قرآن کے متعلق یہ تصوّر بھی نہیں کر سکتا کہ یہ انسانی فکر کی تخلیق ہو سکتا ہے۔ (صفحہ ۱۲۵)

ایک مقام پر وہ کہتا ہے کہ:

اس میں شبہ نہیں کہ دنیا کے بڑے بڑے مفکرین نے بعض ایسی باتیں کہی ہیں جو اُن کے زمانے سے آگے تھیں لیکن ان کی کیفیت یہ ہے کہ اُن کے ہاں رطب و یابس کا ملغوبہ ہے۔ جہاں

ایک بات صحیح ملتی ہے تو ننانوے باتیں اُس دور کی اوہام پرستی پر مبنی ہوتی ہیں۔ لیکن قرآن کی یہ حالت نہیں۔ اس میں بے شمار ایسے حقائق کا ذکر ملتا ہے جن کا تعلق عصرِ حاضر کے علوم سے ہے۔ لیکن اِن میں کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں جس کی تردید دورِ حاضرہ کے سائنٹیفک انکشافات نے کی ہو۔ یہ ہے فرق انسانی مفکرین کی دُور نگہی اور قرآن کے تبیانِ حقیقت میں! ..... (صفحہ ۱۶۳)۔

اِس سے بھی واضح ہے کہ قرآن کسی انسان کی فکر کی تخلیق نہیں خواہ وہ کتنا ہی بڑا نابغہ کیوں نہ ہو۔

اِس سے آپ نے اندازہ لگایا ہو گا کہ میں نے اِس کتاب اور اس کے مصنف کا اس قدر تفصیلی تعارف کیوں ضروری سمجھا ہے! ضمناً۔ جب میں نے (اس کتاب کی اشاعت کے تھوڑا عرصہ بعد، ۱۹۷۸ء میں) اسکا تعارف کرایا، تو بعض احباب نے کہا کہ جب یہ شخص قرآن کی عظمت کا اس قدر قائل ہے، تو پھر یہ مسلمان کیوں نہیں ہو جاتا؟ میں نے کہا کہ بابا! اسے کچھ دن اور آزادانہ ریسرچ کر لینے دو۔ مسلمان ہو گیا تو پہلے ہی دن شور مچا دیا جائے گا کہ یہ شخص "سلف صالحین کی تفاسیر کے خلاف کہہ رہا ہے۔ پکڑو۔ یہ جانے نہ پائے ——— اور پھر اس کے خلاف کفر کے فتووں کی بوچھاڑ ہو جائے گی۔ سرسید (بیچارے) نے اتنا ہی کہا تھا کہ مسلمانوں کو فطرت (نیچر) کی قوتوں کو مسخر کرنا چاہیئے، تو اسے "نیچری" قرار دے کر اس کے خلاف، مکہ۔ مدینہ سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر کفر کے فتوے لے آئے تھے۔ قرآن پر، کسی "مسلمان نام رکھنے والی" قوم کی اجارہ داری نہیں۔ اس کا خطاب تمام عالمِ انسانیت سے ہے۔ لہٰذا، اگر کوئی غیر مسلم دانشور اس کے دعاوی کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے، تو وہ مستحقِ تحسین و تبریک ہے۔ ڈاکٹر (BUCCAILLE) قرآن کی صداقت کا تو قائل ہے، لیکن وہ (غالباً) مسلمان اس لئے نہیں ہوتا کہ (ہم) مسلمانوں کی حالت اس کے سامنے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم (مسلمان) اُن کے راستے میں حائل نہ ہوتے، تو اقوامِ عالم میں سے کئی ایک حلقۂ بگوشِ اسلام ہو چکی ہوتیں۔

خارجی کائنات کی شہادت کے بعد، قرآن پھر اقدارِ خداوندی کی اطاعت کی طرف آ گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کا مرکزی موضوع تو انسانی راہنمائی ہے۔ اس کے ساتھ وہ جو کچھ پیش کرتا ہے وہ اس کے اس مرکزی موضوع کی تائید و توثیق کے لئے ہوتا ہے۔ فرمایا:

۷/۵۵ ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۝

جب حقیقت یہ ہے کہ ربوبیت اسی کے قانون اور نظام کے مطابق حاصل ہو سکتی ہے، تو تم بھی اپنی نشو و نما کے لئے اُسی نظام و قانون کو آواز دو ـــــ اپنے دل کے ایسے کامل جھکاؤ کے ساتھ جو تمہارے تحت الشعور کی گہرائیوں سے اُبھرے۔ اس لئے کہ سرکش ذہنیت کبھی پسندیدہ قرار نہیں پا سکتی۔ (تم اس کی طرف اس طرح لپک کر جاؤ جس طرح بچہ، اپنی پرورش کے ذرائع ـــــ ماں کے تھنوں ـــــ کی طرف لپک کر جاتا ہے)

اُدْعُوْا (خدا کو پکارنے کا مفہوم سمجھنے کے لئے) انڈکس میں دُعا کا عنوان دیکھئے۔

تضرع کا مفہوم تَضَرُّعًا (مادہ۔ ض۔ ر۔ ع) کا مفہوم قابلِ غور ہے۔ ہمارے ہاں اس کا ترجمہ گڑگڑانا اور خوف کھانا کیا جاتا ہے۔ ہم (متعدد مقامات پر) خوف اور خشیت خداوندی کے سلسلے میں بتا چکے ہیں کہ ان الفاظ کا مفہوم (ہمارے ہاں کے تصور کے مطابق) "خدا سے ڈرنا" نہیں۔ ان کا مفہوم یہ ہے کہ اس احساس سے کہ قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کا نتیجہ کس قدر مضرت رساں ہوگا، ان کی خلاف ورزی سے اجتناب کیا جائے۔ اس میں خوف (ڈر) ہوتا ہے اُن قوانین کی خلاف ورزی کے تباہ کُن عواقب سے۔ یہ اطاعتِ قوانینِ خداوندی کا ایک جذبۂ محرکہ ہے۔ دوسرا جذبۂ محرکہ یہ ہے کہ ان قوانین کی اطاعت سے کس قدر فائدہ ہوگا۔ اس سورۃ کی آیت (۳/۷) میں اتباع کا مفہوم دیکھئے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اتباع اس جذبۂ محرکہ کو کہتے ہیں جس کی رُو سے ایک گائے کا نوزائیدہ بچہ اپنی ماں کے پیچھے پیچھے چلا جاتا ہے۔ یہی مفہوم تَضَرُّعًا کا ہے۔ اس مادہ کے بنیادی معنی تو نرمی کے ہیں۔ لیکن عربوں کے ہاں ضَرَعَ الْبَهْمُ کے معنی تھے ـــــ "مویشی کے بچے نے اپنی ماں کے تھن کو منہ میں لے لیا"۔ اس میں حصولِ نشو و نما کے لئے قوانینِ خداوندی کی اطاعت (یا اتباع) کا پہلو نمایاں ہے۔ چنانچہ آیت کے اخیر میں "اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ" اور اگلی آیت کے شروع میں وَلَا تُفْسِدُوْا اسی مفہوم کی تائید کرتے ہیں۔

باقی رہا "خُفْيَةً" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان قوانین کی اطاعت نمائشی طور پر نہیں کی جائیگی اس کا تقاضا انسان کے تحت الشعور کی گہرائیوں سے ابھرنا چاہیئے۔ اس کے بعد ہے:

۷/۵۶ وَلَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ؕ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ○

جب اس طرح قانونِ خداوندی کے مطابق، معاشرہ میں ہمواریاں پیدا ہو جائیں، تو پھر اُس میں ناہمواریاں مت پیدا کرو۔ (تمہاری عقلِ خود بین، کبھی تم سے کہے گی کہ تم دوسروں کی مدد کرتے کرتے خود تنگدست ہو جاؤ گے اور کبھی تمہیں یہ لالچ دلائے گی کہ ذرا سی بددیانتی سے، مفت میں، اتنا کچھ حاصل ہو جائے گا۔ اسے کیوں چھوڑا جائے۔ تم اس کی باتوں میں نہ آنا بلکہ) ہر ایسے مقام پر اپنی راہنمائی کے لئے، قانونِ خداوندی کو آواز دینا۔ یاد رکھو! جو شخص بھی خدا کے قانون کے مطابق، حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتا ہے، خدا کا عطا کردہ سامانِ نشوونما اُس کے ہر وقت قریب رہتا ہے۔ (اس لئے اُسے نہ افلاس کا خطرہ ہوتا ہے، نہ زیادہ سمیٹنے کا لالچ۔

رفعِ مضرت اور جلبِ منفعت، دو ہی جذبات ہیں جو انسان کو آمادہ بر عمل کرتے ہیں۔ قرآن نے نہ رفعِ مضرت کی مذمت کی ہے نہ جلبِ منفعت کی۔ اُس نے کہا ہے کہ ان دونوں صورتوں میں قوانینِ خداوندی کو ملحوظ رکھو۔ اس سے تمہارے عمل میں توازن برقرار رہے گا۔ نہ تو رفعِ مضرت میں تم کسی اور کو نقصان پہنچاؤ گے، نہ ہی جلبِ منفعت میں کسی کا حق چھینو گے۔ اسی اعتدال کا نام حسنِ عمل ہے اور ایسے لوگوں کو محسن کہا جاتا ہے۔ انہی کو سامانِ نشوونما حاصل ہوتا ہے ——— طبیعی زندگی کے لئے بھی اور انسانی ذات کی نشوونما کے لئے بھی۔

اس کی تائید میں پھر قوانینِ طبعی کی شہادت پیش کر دی۔ فرمایا:

۵۷/۷ وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَنزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ ۚ كَذَٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ○

نظامِ فطرت

تم ذرا نظامِ کائنات پر غور کرو اور دیکھو کہ اُس میں خدا نے نشوونما کا کیا عجیب انتظام کر رکھا ہے۔ وہ بارانِ رحمت سے پہلے، خوشگوار ہوائیں بھیجتا ہے جو بارش کی خوشخبری لاتی ہیں۔ پھر جب وہ ہوائیں پانی سے بھرے ہوئے بادلوں کو لے کر اُڑتی ہیں تو اُس کا قانون، انہیں زمینِ مُردہ کی طرف کھینچ کر لے جاتا ہے، جہاں روئیدگی کا نشان تک نہیں ہوتا۔ وہاں ان بادلوں سے پانی برستا ہے جس سے اُسی زمینِ مُردہ سے) ہر قسم کے پھول اور پھل پیدا ہو جاتے ہیں، اور ہر طرف زندگی کی نمود ہو جاتی ہے۔

ہم اس طرح خارجی کائنات میں، موت کو زندگی سے بدل دیتے ہیں۔ ہم ان حقائق کو بیان اس لئے کر رہے ہیں کہ تم انہیں اپنی دنیا میں بھی پیش نظر رکھو۔

وحی کی راہ نمائی اور انسانی محنت

ثمر باری (پھل پیدا کرنے) کے لئے دو شرائط ضروری ہیں۔ ایک تو زمین کی روئیدگی کی صلاحیت، اور دوسرے اس کی آبیاری۔ صلاحیت تو اس کے اندر ہوتی ہے، اور پانی خارج سے ملتا ہے۔ انسانی زندگی میں یہ خارج سے ملنے والا سامانِ سیرابی، وحیٔ خداوندی ہے۔ لیکن وحیٔ خداوندی اسی صورت میں نتیجہ خیز ہوتی ہے جب اس کے ساتھ انسانی صلاحیت اور محنت شامل ہو۔ وحیٔ خداوندی تو صرف راہ نمائی دیتی ہے۔ چلنا تو انسان نے خود ہوتا ہے۔ اگر مسافر آمادہ بہ سفر نہ ہو تو خالی راہ نمائی کچھ فائدہ نہیں دیتی۔ اگر مسافر کو صحیح راستے کا علم نہ ہو تو وہ منزلِ مقصود تک پہنچ نہیں سکے گا۔

بارش سے پہلے خوشخبری دینے والی ہوائیں وہ عرصہ ہے جس میں نظامِ خداوندی ہنوز قائم نہ ہوا ہو اور جماعتِ مومنین اس کے قیام کے لئے سرگرمِ عمل ہو۔ اس کے قیام کے بعد بارانِ رحمت کا نزول ہوتا ہے کَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى کا اوّلین تعلق تو زمینِ مُردہ کو حیاتِ تازہ مل جانے سے ہے، لیکن ثانیاً اس میں انسانوں کی حیات بعد الممات کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے، جس کے متعلق ضمنی طور پر کچھ کہنا مفید نہیں ہوگا۔ اس لئے اسے ہم مناسب موقع تک ملتوی رکھتے ہیں۔ مسئلہ اہم بھی ہے اور نازک بھی۔

زمین کی صلاحیت کے متعلق فرمایا:

۷/۵۸ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ۭ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ ۝

پھر اس حقیقت پر بھی غور کرو کہ زمین سے فصل پیدا ہونے کے لئے دو بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک بارش، اور دوسرے اس زمین کا اچھا ہونا جس پر وہ بارش برسے۔ اس قانون کے مطابق اچھی زمین سے عمدہ فصل پیدا ہوتی ہے۔ لیکن زمین خراب ہو تو اس پر محنت اور مشقت بھی زیادہ کرنی پڑتی ہے، اور اس کے بعد اس میں فصل بھی کم پیدا ہوتی ہے۔ اور جو پیدا ہوتی ہے وہ بھی ناقص!

دیکھو! اس طرح ہم اپنے قوانین کو، مختلف پہلوؤں سے سامنے لاکر واضح کرتے چلے جاتے ہیں تاکہ

جو لوگ چاہتے ہیں کہ اُن کی کوششیں بھرپُور نتائج پیدا کریں وہ اِن سے راہ نمائی حاصل کریں۔

(اُوپر کی مثال میں بارش ہمارا قانون ہے۔ اور زمین، تمہاری کوششیں۔ دونوں کی ہم آہنگی سے عمدہ نتائج مُرتب ہو سکتے ہیں)۔

طیّب اور خبیث قرآن کی دو اصطلاحیں ہیں جو متعدد مقامات پر آئی ہیں۔ ان کے مفہوم کے لئے دیکھئے (۲/۲۶۷ ; ۳/۱۷۸ ; ۴/۲ ; ۵/۱۰۰)۔ اِن کا مفہوم سابقہ جلدوں میں بیان ہو چکا ہے۔ کلمۂ طیّب اور کلمۂ خبیث کا ذکر (۱۴/۲۶) میں آیا ہے۔

اذن کا مفہوم

ضمناً آیت (۷/۵۷) میں زمین سے کھیتی اُگنے کے متعلق کہا بِاِذْنِ رَبِّهٖ ــــ (خُدا کے اِذن کے مطابق) ــــ ظاہر ہے کہ اِس سے مُراد زراعت سے متعلق قانونِ خداوندی ہے۔ اس قانون کا ذکر خود انہی آیات (۷/۵۷ ; ۷/۵۸) میں کیا گیا ہے۔ زمین کا کاشت کے قابل ہونا اور پھر اس کی سیرابی۔

تیسرا باب

سورۂ اعراف - آیات ۵۹ تا ۱۰۲

انبیاءِ سابقہ و اقوامِ گزشتہ

۱ ——— داستانِ حضرت نوحؑ۔

۲ ——— طوفانِ نوحؑ۔

۳ ——— دوقومی نظریہ کا آغاز۔

۴ ——— کشتئ حضرت نوحؑ کی افسانوی تفصیلات۔

۵ ——— حضرت نوحؑ کی عمر۔

۶ ——— قوم عاد ——— حضرت ہودؑ

۷ ——— وہ قوم قوت اور علم و بصیرت دونوں کی حامل تھی۔

۸ ——— قوم ثمود ——— حضرت صالحؑ

۹ ——— خداوندی نظامِ معیشت کا بنیادی نقطہ - ناقۃ اللہ کا مفہوم۔
خدا کی زمین خدا کے بندوں کے لیے۔

۱۰ ——— قوم لوط اور حضرت لوطؑ

۱۱ ——— خلاف وضع فطری جنسی اختلاط

۱۲ ——— قوم مدین ——— حضرت شعیبؑ

۱۳ ——— مذہب اور سیاست

۱۴ ——— صلوٰۃ کا دائرہ عمل

۱۵ ——— سیکولرازم کا باطل تصوّر

۱۶ ——— دین و دنیا کا ارتباط

۱۷ ——— دل مانتا ہے لیکن جھوٹی عزّت کا خیال اس کا اعتراف نہیں کرنے دیتا۔

تیسرا باب

اقوامِ سابقہ کی داستانیں

(آیات ۷/۵۹ تا ۷/۹۳)

قرآن کریم اپنے دعاوی کی صداقت کی تائید میں خارجی کائنات سے متعلق قوانین کی عمل پیرائی بھی پیش کرتا ہے اور تاریخی شواہد بھی۔ وہ تاریخ کو کس قدر اہمیت دیتا ہے، اس کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم (صفحہ ۱۰۵) میں تفصیل سے لکھا جاچکا ہے۔ یہاں اس نے پہلے خارجی کائنات سے متعلق قوانینِ فطرت کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد انبیاءِ سابقہ (اور ان کی اقوام) کی سرگزشت سامنے لایا ہے۔ اور اس کی ابتدا حضرتِ نوحؑ کے تذکارِ جلیلہ سے کرتا ہے۔

میں نے انبیاءِ سابقہ کی داستانیں متفرق مقامات پر بیان کی ہیں، لیکن (میری تصانیف) جوئے نور، برقِ طور اور شعلۂ مستور میں یہ بہ تسلسل مذکور ہیں۔ انہیں ان کتابوں میں بھی دیکھا جاسکتا ہے، لیکن چونکہ میں سلسلۂ مطالب الفرقان کو خود مکتفی (SELF-CONTAINED) بنانا چاہتا ہوں، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس میں تفصیلاً بیان کر دیا جائے۔ یہاں حضرتِ نوحؑ اور ان کی قوم کا ذکر مختصراً پانچ آیات (۷/۵۹-۶۴) میں آیا ہے۔ لیکن (قرآن کریم کے) دیگر مقامات میں ان واقعات کو جس طرح بیان کیا گیا ہے، انہیں یکجا کر دیا جائے تو اس سے یہ ایک مسلسل داستان بن کر سامنے آجاتی ہے۔ ہم ان تمام واقعات کو اسی انداز سے پیش کرتے ہیں۔ ان کی بنیاد جوئے نور میں مذکور داستان ہے

داستانِ حضرت نوحؑ و قومِ نوحؑ:

آج دنیا کے گوشے گوشے میں انسانوں کی آبادی نظر آتی ہے لیکن دنیا شروع سے اسی طرح آباد نہیں چلی آئی۔ علمائے تاریخ الامم رفتہ رفتہ اثری انکشافات سے اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ نسل انسانی کا اوّلیں سرچشمہ کسی ایک مقام پر تھا جہاں سے

اس کی سوتیں پھوٹیں اور ندیوں اور دریاؤں کی شکل میں اطراف عالم میں بہ نکلیں۔

انسانی آبادی کا اوّلیں سرچشمہ قیاس کیا جاتا ہے کہ انسانی آبادی کا یہ اوّلیں سرچشمہ جھیل کیسپین (CASPIAN SEA) کے اطراف وجوانب میں واقع تھا۔ اس قیاس کے تحت علم الاقوام والسنہ کے محققین نے اقوام عالم کو، مختلف مماثلت ومشابہت کی بناء پر تین شاخوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ آریائی (ایرین) مثلاً ہندی، ایرانی اور فرنگستانی اقوام۔

۲۔ تورانی (منگولین) مثلاً ترکستانی، چینی۔

۳۔ سامی (سمیٹک) مثلاً عرب، آرامی، عبرانی، سریانی، کلدانی وغیرہ۔

بعض علمائے انساب، اقوام عالم کی تقسیم اختلافِ رنگ کی بناء پر کرتے ہیں۔ یعنی سفید فام (مثلاً امم سامیہ اور فرنگی) سیاہ فام یا سرخ فام (باشندگانِ افریقہ) اور زرد فام (جاپانی اور چینی وغیرہ) ان کے برعکس تورات کا بیان ہے کہ طوفانِ نوح کے بعد جب انسانوں کی نئی زندگی شروع ہوئی تو نسلِ انسانی حضرت نوحؑ کے تین بیٹوں یافث (JAPHETH) حام (HAM) اور سام (SHEM) سے آگے بڑھی اور موجودہ اقوامِ عالم انہی کی یادگار ہیں۔ ان تینوں نسلوں میں سے تورات کو صرف سامی نسل (SEMITIC RACE) سے تعلق ہے کیونکہ انبیائے کرامؑ کا وہ سلسلہ جس کا ذکر تورات میں ہے اسی نسل سے متعلق تھا۔

بنی سام کی اس قوم کا مولد ومسکن کون سا علاقہ تھا، یہ مسئلہ علمائے تاریخ کے نزدیک اہم مباحث کا مرکز رہا ہے۔ اگرچہ تاریخ کی قدیم ترین کتابوں میں اس موضوع پر بہت کچھ ملتا ہے لیکن اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے اثری انکشافات نے بحث ونظر کا رُخ اسطرح بدل دیا ہے کہ اب بیسویں صدی میں یہ مسئلہ گویا متحقق ہوچکا ہے کہ امم سامیہ کا اوّلیں وطن، ملکِ عرب تھا، جہاں سے نکل کر وہ بابل، سیریا، مصر اور فنیشیا تک پھیل گئے۔ ان تحقیقات سے یہ اہم حقیقت بے نقاب ہوکر سامنے آرہی ہے کہ اُممِ سابقہ اور مللِ قدیمہ کی تاریخ وتمدن میں عرب کو کیا اہمیت حاصل رہی ہے۔ یعنی مصر وشام، فلسطین وعراق وغیرہ کی تمام قومیں جنہیں الگ الگ سلسلہ کہا جاتا ہے، درحقیقت ایک ہی درخت کی مختلف شاخیں ہیں جو سرزمین عرب سے اُبھرا۔ اس اعتبار سے ان تمام اقوام کی زبانوں کی اصل بھی عربی زبان کی قدیم شکل قرار پائے گی۔ یہ امور ہنوز اُن انکشافات کا نتیجہ ہیں جو معرضِ شہود میں آچکے ہیں۔ کیا معلوم آگے چل کر ان میں کیا کیا اضافے ہوتے چلے جائیں گے جن سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ قرآنِ کریم نے بالتخصیص انہی اقوام اور انہی انبیائے کرامؑ کا ذکر کیوں کیا ہے؟ ہوسکتا ہے (اور قرائن اس پر شاہد ہیں) کہ مزید انکشافات سے انسانی آبادی کی موجودہ تقسیم (جس کا ذکر اُوپر

آچکا ہے، سمٹ سمٹا کر اس نقطہ پر مرکوز ہو جائے کہ ان تمام اقوامِ عالم کی ابتداء ریگستانِ عرب ہی سے ہوئی جہاں کے شہر مکہ کو قرآنِ کریم اُمّ القریٰ (آبادیوں کی ماں) قرار دیتا ہے۔ بہر حال آج یہ قریب قریب متحقق ہو چکا ہے کہ سامی اقوام کا مولدِ اوّل عرب تھا جہاں سے وہ اطراف و حوالی میں پھیلیں۔ ان اقوام کے مورثِ اعلیٰ سام، حضرت نوحؑ کے بیٹے تھے

قومِ نوحؑ کا مولد

اس لئے قومِ نوحؑ کا وطن بھی انہی علاقوں میں تھا۔ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ حضرت نوحؑ کی کشتی جودی پہاڑ پر جا کر ٹھہری۔ تورات نے اس کا نام "ارارات" بتایا ہے۔ جس کے متعلق خیال ہے کہ وہ آرمینیہ کے سلسلۂ کوہ میں واقع ہے۔ اس سلسلۂ کوہ سے دجلہ و فرات (TIGRIS AND EUPHRATES) بہتے ہوئے جنوب کی طرف آتے ہیں اور خلیج فارس کے کچھ اوپر آپس میں مل کر اس میں گر جاتے ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ قومِ نوح کا وطن دجلہ و فرات ہی کا درمیانی علاقہ تھا۔

اور زمانہ

اب رہا یہ کہ اس قوم کا زمانہ کون سا تھا؟ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ قومِ عاد، قومِ نوح کی جانشین (SUCCESSOR) تھی۔ (دیکھئے ۷/۶۹)۔

قومِ عاد کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ وہ اُممِ سامیہ اولیٰ کا سب سے وسیع قبیلہ تھا جس کی شوکت و عظمت کی داستانوں کا نشان قدیم تاریخوں سے ملتا ہے۔ اس قبیلہ نے عرب، بابل اور مصر میں بڑی بڑی سلطنتیں قائم کیں۔ عاد کا زمانہ تین ہزار سال ق۔م سے پیشتر کا متعین کیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے یوں سمجھئے کہ قومِ نوح کا زمانہ کوئی چار پانچ ہزار سال قبل مسیح (یا آج سے چھ سات ہزار سال پیشتر) کا تھا۔ اس لئے کہ ایک شخص (سام) کی اولاد کو قوم بننے اور پھر اپنی شوکت و عظمت حاصل کرنے کے لئے اُس زمانہ میں ہزار پندرہ سو سال کی مدّت تو درکار ہو گی۔ بہر حال یہ قیاس و تخمین ہے جس کی بنیاد علمائے تاریخ و اثریات کی تحقیقات پر ہے۔ قرآنِ کریم تاریخ اور جغرافیہ کی کتاب نہیں۔ یہ نوعِ انسان کے لئے ضابطۂ ہدایت ہے اور قوموں کے عروج و زوال اور زندگی اور موت کے اصول پیش کرتا ہے۔ چنانچہ اس میں اقوام و ملل کا تذکرہ بھی اسی ضمن میں آیا ہے۔

بایں ہمہ، یہ بھی حقیقت ہے کہ ان تمام اقوامِ قدیمہ کے متعلق (جن کی بابت، اور تو اور خود عربوں کے پاس بھی عمومی اور سطحی تعارف کے سوا معلومات کا کوئی ذخیرہ نہ تھا) تاریخی و اثری انکشافات سے جو کچھ اُبھر کر سامنے آ رہا ہے وہ ان خطوط و نقوش کے خلاف نہیں جن کا اجمالی تذکرہ قرآنِ کریم میں ہے۔ وہ بلکہ ان کی تائید و تصدیق کرتا چلا جا رہا ہے۔ اور اصل یہ ہے کہ جہاں کہیں حقیقت

قرآنی حقائق اور تاریخی شواہد

کی نمود ہو گی، ہو نہیں سکتا کہ وہ قرآن کے کسی اجمالی یا تفصیلی بیان سے مختلف ہو۔ اس لئے کہ قرآن یکسر حقیقتِ ثابتہ ہے۔ اس میں ظن و تخمین اور ریب و تشکیک کا شائبہ تک نہیں۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ علمی تحقیقات کی روشنی میں جہاں دیگر مذاہب کے عام "مسلّمات" افسانوں میں

تبدیل ہوتے چلے جا رہے ہیں، قرآنی اجمالات کی توضیح وتصدیق ہوتی چلی جاتی ہے۔ دنیا کو ابھی اور علمی ترقی کرنے دیجئے وہ خود بخود دیکھ لے گی کہ قرآن کا یہ دعویٰ کس قدر حقیقت پر مبنی ہے کہ

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ (۴۱/۵۳)

ہم انہیں خارجی کائنات اور خود ان کی داخلی دنیا (یا عربوں کے اپنے اندر اور ان کے باہر کی اقوام میں) اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے" تا آنکہ یہ بات نکھر کر سامنے آجائے کہ قرآن ایک حقیقت ثابتہ ہے۔

حضرت نوحؑ کی بعثت اپنی قوم کی طرف

یہ تھی وہ قوم جس کی طرف حضرت نوحؑ مبعوث ہوئے۔ انسان کے عہد طفولیت میں سلسلۂ آمد و رفت اور ذرائع رسل و رسائل ایسے محدود تھے کہ جو قبیلہ جہاں آباد تھا ایک مستغنی عن الغیر وحدت (SELF CONTAINED UNIT) تھا جسے باہر کی دنیا کے ساتھ بہت کم واسطہ پڑتا تھا۔ اس لئے حضرات انبیاء کرامؑ کی تعلیم کا دائرہ بھی اس خاص قبیلہ یا قوم تک محدود ہوتا تھا، جس میں وہ تشریف لاتے تھے۔ چنانچہ حضرت نوحؑ کے متعلق فرمایا:

۷/۵۹ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ (نیز ۱۱/۲۵ و ۲۳/۲۳ و ۲۹/۱۴ و ۷۱/۱)

یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا۔ اس نے کہا "اے میری قوم صرف قانونِ خداوندی کی اطاعت کرو۔ اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر تم نے ایسا نہ کیا (اور اپنی موجودہ روش پر اڑے رہے) تو تم پر سخت تباہی آجائے گی۔

حضرت نوحؑ بھی اسی قوم کے ایک فرد تھے۔ اس لئے انہیں ان لوگوں کا بھائی کہا گیا ہے۔

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ (۲۶/۱۰۶)

جب ان کے بھائی نوحؑ نے ان سے کہا "کیا تم قوانین خداوندی کی نگہداشت نہیں کرو گے"؟

نوحؑ اپنی قوم میں پہلے رسول نہیں تھے

ویسے بھی، قبائل کی تقسیم نسلی امتیاز پر ہوتی تھی اور ایک قبیلہ (یا تھوڑی سی وسعت کے بعد قوم) ایک ہی مورثِ اعلیٰ کی اولاد پر مشتمل ہوتا تھا اس لئے قبائل کے نام بھی یا تو ان کے جدِ اولیٰ کے نام پر ہوتے تھے۔ یا اس قبیلہ کی کسی عظیم شخصیت کی طرف منسوب۔ قرآن کریم سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ اپنی قوم میں پہلے رسول نہیں تھے بلکہ آپ کی قوم آپ سے پہلے بہت سے رسولوں کی تکذیب کر چکی تھی، اور حضرت نوحؑ کا زمانہ وہ تھا جس میں خدا کے قانونِ مکافات کے لئے

مطابق اس قوم کے جرائم کے ظہور نتائج کا وقت قریب آچکا تھا۔ سورۃ شعراء میں ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِينَ ۝ (۲۶/۱۰۵)

قوم نوح نے رسولوں کی تکذیب کی۔

اسی طرح سورۃ فرقان میں ہے۔

وَ قَوْمَ نُوحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ وَ جَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ (۲۵/۳۷)

اور جب قوم نوحؑ نے رسولوںؑ کی تکذیب کی تو ہم نے انکو غرق کر دیا۔ اور (آنے والے) انسانوں کے لئے آیۂ عبرت بنا دیا حقیقت یہ ہے کہ قانونِ مکافات کی رو سے ظالموں کے لئے دردناک تباہی کا عذاب تیار رہتا ہے۔

اس سے یہ بھی واضح ہے کہ اس قوم کی طرف سے تکذیب رُسل ان کی غرقابی سے پہلے ہو چکی تھی۔ (یعنی یہ نہیں کہ قوم نوحؑ کے بقیہ افراد کی آئندہ نسلوں نے تکذیب رسل کی تھی جسکی طرف مندرجہ صدر آیات میں اشارہ کیا گیا ہے) یہ بھی ممکن ہے کہ خود حضرت نوحؑ کے زمانہ میں اس قوم کے مختلف حصوں میں بیک وقت بہت سے حضرات مرسلین تشریف لائے ہوں (جیسے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ ایک ہی وقت میں مبعوث ہوئے تھے) بہرحال یہ رسول حضرت نوحؑ سے پیشتر مبعوث ہوئے ہوں یا آپکے ہمعصر ہوں قرآن کریم سے یہ ظاہر ہے کہ غرقابیٔ قوم نوحؑ کے وقت ان کی قوم کی حالت یہ تھی کہ وہ اللہ کے قوانین کے خلاف زندگی بسر کرتی تھی۔

وَ قَوْمَ نُوحٍ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝ (۵۱/۴۶) نیز (۵۳/۵۲)

اور ان سے قبل نوح کی قوم تھی۔ وہ بھی اس لئے تباہ ہوگئی کہ وہ قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کرتی تھی۔

ان لوگوں نے خدائے واحد کی عبودیت کو چھوڑ کر کھلی ہوئی بُت پرستی اختیار کر رکھی تھی۔ چنانچہ جب حضرت نوحؑ نے انہیں خدائے واحد کی محکومیت کی دعوت دی تو ان کی قوم کے سرغنوں نے قوم سے کہا کہ:

وَ قَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَ لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّ لَا سُوَاعًا ۙ۬ وَّ لَا يَغُوْثَ وَ يَعُوْقَ وَ نَسْرًا ۝ۚ (۷۱/۲۳)

انہوں نے کہا کہ اپنے معبودوں کو مت چھوڑو۔ اور وَدّ اور سواع اور یغوث اور یعوق اور نسر دیوتاؤں کو مت ترک کرو۔

دعوت حضرت نوحؑ۔ اور توحید

یہ تھے وہ حالات جن میں حضرت نوحؑ تشریف لائے۔ آپ نے ان لوگوں کو سب سے پہلے خدائے واحد کی عبودیت اختیار کرنے کی دعوت دی کہ یہی پیغام حضرات انبیاء کرامؑ کی دعوت کا سنگِ بنیاد ہے۔

۷/۵۹ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ (۷/۵۹)

یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نوحؑ کو انکی قوم کی طرف (تبلیغ حق کے لئے) بھیجا تھا۔ اس نے کہا "اے میری قوم اللہ تعالیٰ ہی کی محکومیت اختیار کرو۔ اس کے سوائے کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔

سورۂ ہود میں ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اِنِّىْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۙ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ○ فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۭ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ○ (۱۱/۲۵-۲۷)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا۔ اس نے کہا (لوگو!) "میں تمہیں (قوانین خداوندی سے سرکشی برتنے کے نتائج سے) کھلے کھلے الفاظ میں آگاہ کرتا ہوں۔ اللہ کے سوا اور کسی کی اطاعت و محکومیت اختیار نہ کرو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو میں ڈرتا ہوں کہ تم پر عذاب کا ایک دردناک دن نہ آجائے۔ اس پر قوم کے سرداروں نے جن کے ہاں مال و دولت کی افراط تھی اور اس وجہ سے انہوں نے قوانین خداوندی سے سرکشی کی راہ اختیار کر رکھی تھی کہا۔ ہم تم میں اس کے سوا کوئی بات نہیں دیکھتے کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو اور جو لوگ تمہارے پیچھے چلے ہیں وہ پست درجے کے لوگ ہیں اور بے سوچے سمجھے تمہارے پیچھے ہو لئے ہیں۔ ہم تو تم لوگوں میں اپنے مقابلے میں کوئی برتری نہیں پاتے۔ ہمیں یقین ہے کہ تم اپنے اس دعوے میں جھوٹے ہو۔

خدا کی محکومیت

یہ دعوتِ نوحی کا اولین اور اساسی مطالبہ تھا۔ یعنی خدا کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کریں۔ حکومت خداوندی کے قیام کی عملی شکل یہ ہے کہ اسے قائم کرنے والے کی اطاعت کی جائے۔ اس لئے حضرت نوحؑ نے فرمایا کہ

اِنِّىْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ○ (۲۶/۱۰۷-۱۰۸) (۱۰/۲۵-۲۶)

مجھے خدا نے تمہاری طرف امن و سلامتی کا پیامبر بنا کر بھیجا ہے۔ اگر تم تباہی سے بچنا چاہتے ہو تو قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اور اس کا عملی طریق یہ ہے کہ تم میری اطاعت کرو کیونکہ میں انہی قوانین کو نافذ کرنے پر مامور ہوں۔

انقلابی دعوت

دعوتِ نوحؑ کی تعلیم کے ان عناصر پر غور فرمائیے۔ یہ تعلیم کیا تھی؟ اس مسلک کے خلاف ایک کھلا ہوا چیلنج جو اس قوم کے آباء واجداد (اسلاف) سے متوارث چلا آرہا تھا اور ان کے سرداران یعنی، اربابِ ثروت و اقتدار کے تغلّب و تسلّط کے خلاف بغاوت! تاریخِ انسانیت کے اوراق کو الٹتے جائیے۔ حق و باطل کی کشمکش میں یہی دو مقام ہیں جو ہمیشہ قبولیتِ حق و صداقت کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل ہوتے ہیں۔ معتقدات خواہ کس قدر غلط کیوں نہ ہوں، جب آباء واجداد سے منتقل ہو کر آئیں تو انسان کے نزدیک

تقلید آباء

ایسے گراں بہا متاع بن جاتے ہیں جنہیں وہ اپنے قلب کی انتہائی گہرائیوں میں چھپائے رکھتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ ان کے چھننے سے اس کی ساری کائنات لُٹ رہی ہے لیکن کسی عقیدہ کے صحیح ہونے کا یہ معیار کس قدر غلط ہے کہ وہ اسلاف سے وراثتاً منتقل ہو کر آیا ہے! (انڈکس میں تقلید کا عنوان دیکھئے)۔

دوسری رکاوٹ

اعترافِ حق و صداقت کی راہ میں دوسرا سنگِ گراں نشۂ حکومت و سطوت ہے۔ یوں تو انسان ہر شکار میں لذت محسوس کرتا ہے لیکن اس کی لذت کی انتہا اس مقام پر پہنچ کر ہوتی ہے جہاں اس کا شکار خود دوسرا انسان ہو۔ تاریخِ عالم پر نگاہ ڈالئے۔ یہ صید و صیاد کی ایک مسلسل داستان نظر آئے گی جس میں ہر زمانہ اور ہر مقام میں کمزور اور ناتوان انسان، زبردست اور قوی انسانوں کے پنجۂ تغلّب و تسلّط میں تڑپتے پھڑکتے، سسکتے، بلبلاتے، سکراتِ موت کی ہچکیاں لیتے دکھائی دینگے۔ حضرات انبیائے کرامؑ کی بعثت کی سب سے اہم غرض یہ ہوتی تھی کہ وہ ان کمزور اور ناتوان انسانوں کو جابر و ظالم انسانوں کے پنجۂ استبداد سے چھڑا کر آزادی کی فضائے بسیط میں اذنِ پرکشائی دیں جہاں وہ پوری سرفرازی و سربلندی سے "انسانوں" کی طرح چل پھر سکیں اور انسان

صحیح آزادی کی دعوت

اور خدا کے درمیان کوئی طاقت حائل نہ ہو۔ اور اس طرح وہ اپنے آپ کو ایک اللہ کے قانون کے سوائے کسی اور کا محکوم نہ پائیں۔ ظاہر ہے کہ اربابِ حکومت و تسلّط اپنے شکار کو آسانی سے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ وہ پوری کوشش کرینگے کہ اس قسم کی انقلاب انگیز آواز کا گلا اپنے آہنی ہاتھوں سے گھونٹ دیں۔ وہ اپنی ابلیسانہ سیاست کا ہر حربہ استعمال کریں گے کہ ان کے دامِ تغلّب کے حلقے کمزور نہ ہونے پائیں۔ داعیانِ حق و صداقت کی راہ میں یہ دوسرا مرحلہ ہے جس سے تصادم و تزاحم ضروری ہے۔ قرآنِ کریم نے دعوتِ نوحؑ کے ضمن میں اس تصادم کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے۔ فرمایا:

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ

اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۚۖ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ۚۖ (۲۳/۲۴)

اس قوم کے اکابرین نے جنہیں سامانِ زندگی کی فراوانیاں حاصل تھیں، اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور لوگوں سے کہنے لگے کہ یہ شخص اس کے سوا کیا ہے کہ تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہے، مگر چاہتا ہے، اپنا مسلک مسلط کر دے۔ اگر اللہ کو کوئی ایسی ہی بات منظور ہوتی تو کیا وہ فرشتے نہ اتار دیتا؟ (وہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی کو اپنا پیامبر کیوں بنانے لگا؟) ہم نے اپنے آباء و اجداد سے تو کوئی ایسی بات سنی نہیں۔

اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ یہ تصادم اس سلسلۂ آسمانی کے ساتھ ہر مقام پر رہے گا، کہ بقول اقبالؒ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

سرمایہ دار گروہ کی طرف سے مخالفت

آگے بڑھنے سے پیشتر، ایک اہم نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ قرآن نے ان مخالفین کے لئے اَلْمَلَاُ کا لفظ استعمال کیا ہے اس کے لفظی معنی ہیں وہ لوگ جن کے گھروں میں برتن بھرے ہوئے ہوں۔ یعنی وہ جنہیں سامانِ زیست کی فراوانیاں حاصل ہوں۔ جن کے پاس کثرت سے مال و دولت ہو۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنی دولت کے بل بوتے پر اقتدار کی کرسیاں سنبھال لیتے ہیں۔ اور پھر غریب انسانوں سے اپنا حکم منواتے ہیں۔ اسی کا نام (دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں) نظامِ سرمایہ داری ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ آسمانی انقلاب جس کے داعی حضرات انبیائے کرامؑ تھے، اس غیر خداوندی نظام کو مٹانے کے لئے آتا تھا جس میں رزق کے سرچشمے انسانوں کے قبضے میں رہتے ہیں۔ وہ ان ذرائع رزق کو انسانوں کے ہاتھوں سے چھین کر، قانونِ خداوندی کے سپرد کر دیتا ہے۔ تاکہ اس سے تمام نوعِ انسانی کی پرورش ہو سکے۔ اس انقلاب کی مخالفت سب سے پہلے ان لوگوں کی طرف سے ہوتی ہے جو رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضہ میں لئے ہوتے ہیں۔ یہی وہ تصادم ہے جس کا ذکر سب سے پہلی دعوتِ انقلاب کے سلسلہ میں سامنے آرہا ہے۔ سورۂ اعراف کی آیات ۶۴، ۵۹ میں اس کا اجمالی سا ذکر ہے۔ تفصیل دیگر مقامات میں مذکور ہے۔ مثلاً سورۂ ہود میں بیان کردہ ــــ

اس مخالفت کی وجہ بھی سن لیجئے۔

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا

...... اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَ اَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ○ (۱۱/۲۸-۲۷)

اس پر قوم کے سرداروں نے جنہیں مال و دولت کی فراوانی حاصل تھی اور جنہوں نے سرکشی کی راہ اختیار کی تھی کہا کہ ہم تم میں اس کے سوا کوئی بات نہیں دیکھتے کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو۔ اور جو لوگ تمہارے پیچھے چلے ہیں وہ ہم ہی نچلے درجے کے ہیں۔ اور بے سوچے سمجھے تمہارے پیچھے ہو لئے ہیں۔ ہم تو تم لوگوں میں اپنے سے کوئی برتری نہیں پاتے بلکہ سمجھتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو۔

نوح نے کہا۔ اے میری قوم کے لوگو! تم نے اس بات پر بھی غور کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے دلیلِ روشن لئے ہوں اور اس نے اپنے ہاں سے مجھے وحی کی رحمت بھی عطا کر دی ہو۔ مگر وہ تمہیں دکھائی نہ دے، تو میں اس کے سوا کیا کر سکتا ہوں جو کر رہا ہوں؟ یہ تو ہم کر نہیں سکتے کہ اسے زبردستی تمہارے گلے منڈھ دیں۔

سورۂ شعراء میں ہے۔

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَ اتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ○ (۲۶/۱۱۱)

(قوم کے سرداروں نے کہا) کیا ہم تمہاری دعوت قبول کر لیں، حالانکہ (ہم دیکھ رہے ہیں کہ صرف کمینے (نچلے درجے کے لوگ) تمہارے پیچھے ہو لئے ہیں؟

ان آیات پر غور فرمایئے۔ مخالفت اس طبقہ کی طرف سے ہوئی جو صاحب دولت و ثروت تھا۔ اور وجوہات مخالفت میں ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کیا ہم اس جماعت کے ساتھ ہو جائیں جو رذیل لوگوں پر مشتمل ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ حق و صداقت کی

طبقاتی تقسیم

دعوت پر لبیک، سب سے پہلے غریب طبقہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وہ ارباب ثروت و حکومت کے جور و استبداد سے تنگ آ چکے ہوتے ہیں اور ہر اس آواز کا بطیب خاطر استقبال کرتے ہیں جو انہیں حقیقی آزادی کی طرف دعوت دے اور زندگی کی خوشگواریوں سے ہمکنار کر دے۔ نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ زمانہ حضرت نوحؑ میں طبقات کی تقسیم وجود میں آ چکی تھی۔ یعنی وہ قبائلی زندگی کا ایسا ابتدائی زمانہ نہیں تھا جس میں انسانی عزت و تکریم، دولت و ثروت کے معیار سے نہ ماپی جائے۔

قَالَ وَ مَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ (۲۶/۱۱۲)

(حضرت نوحؑ نے) کہا کہ مجھے اس سے غرض نہیں کہ ان لوگوں کا پیشہ کیا ہے۔ نہ ہی مجھے یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ کیا کام کرتے ہیں۔

اس سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ اس وقت انسانوں کی تقسیم پیشوں کے اعتبار سے وجود میں آ چکی تھی جو ذات پات کی تقسیم کا

بنیادی پتھر ہے اور جو انسانی مساوات کی جڑ پر ایسی کاری ضرب ہے، کہ یہ لعنت آج تک دور نہیں ہوسکی۔ حضرات انبیائے کرامؑ کا منصب، مساواتِ انسانی کو قائم کرکے عزّت و عظمت کا معیار حسنِ سیرت و کردار قرار دینا تھا۔ یعنی یہ معیار کہ جو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرے اور بسطحِ نوعِ انسانی کی منفعت کے لئے سب سے زیادہ مفید ثابت ہو، وہی معاشرہ میں سب سے زیادہ عزّت و توقیر کا مستحق ہے۔ چنانچہ حضرت نوحؑ کا جواب اس پر شاہد ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے اس سے غرض نہیں کہ یہ لوگ کیا کام کرتے ہیں۔ میرے اور ان کے درمیان وجۂ جامعیت ایمان ہے اور میں محض تمہاری خاطر مؤمنین کی جماعت کو دھتکار نہیں سکتا۔ یعنی اس جماعت کو جو اس کا اقرار اور تہیہ کرچکی ہے کہ وہ خود بھی قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے گی اور ان قوانین کو معاشرہ میں رائج بھی کرے گی۔

قَالَ وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۚ اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّيْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ۚ
وَمَا اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۚ (۲۶/۱۱۲-۱۱۵)

نوحؑ نے کہا ان کے پیشہ اور کام سے مجھے کوئی غرض نہیں۔ ہمارے ہاں عزت و تکریم کے پیمانے اور ہیں جن کا حساب ہمارا خدا رکھتا ہے۔ اے کاش! تم اس حقیقت کو سمجھ سکتے! اسے بہرحال اچھی طرح سمجھ لو کہ میں یہ کبھی نہیں کروں گا تمہاری خاطر اس جماعت کو دھتکار دوں۔ میرا مقصد تو یہ ہے کہ تمہیں غلط زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرتا رہوں۔

(نیز ۱۱/۲۹ ؛ ۱۰/۷۲ ؛ ۲۶/۱۰۹-۱۰۷)

اگر میں انہیں اس لئے دھتکار دوں کہ ان کے پاس مال و دولت نہیں تو میں اپنے اللہ کے ہاں مجرم ٹھیرایا جاؤں گا۔ کہیئے! اس وقت مجھے اللہ کی گرفت سے کون بچا سکے گا؟ (۱۱/۳۰)

یہ لوگ جو بظاہر تمہیں بے کس و بے بس، مفلس و نادار نظر آتے ہیں تمہیں کیا علم ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں کن نعمتوں اور عظمتوں سے نوازنے والا ہے؟ (۱۱/۳۱)

اربابِ استبداد کا جواب

اس کے جواب میں قوم نے کیا کہا؟ وہی جو سرکش و متکبّر کہا کرتے ہیں!

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (۱۱/۳۲)

اس پر ان لوگوں نے کہا! اے نوحؑ تو نے ہم سے مفت میں جھگڑا شروع کر رکھا ہے اور اس میں بڑھتے ہی چلے جا رہے ہو، (ان باتوں سے کچھ حاصل نہیں) اگر تو سچا ہے تو جس تباہی کی تم دھمکیاں دیتے ہو اسے لے آؤ!

یعنی تو جو ہمیں بار بار کہتا ہے کہ ہماری غلط روش زندگی کا نتیجہ تباہی و بربادی ہوگی، درآنحالیکہ ہم نہایت خوش حالی و فارغ البالی

کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ تو تو اس تباہی کو ہمارے سامنے لے آ۔ بات صاف ہو جائے گی!

اس کے جواب میں حضرت نوحؑ نے کہا۔

قَالَ اِنَّمَا یَاْتِیْکُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَ مَا اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ ○ .... وَ اَنَا بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ○ (۱۱/۳۵-۳۳)

نوحؑ نے کہا۔ تباہی اور بربادی خدا کے قانون مکافات کے مطابق آیا کرتی ہے تم اسے روک نہیں سکتے۔ اگر اس قانون کے مطابق تم اس مقام تک پہنچ چکے ہو جہاں تباہی آکر رہتی ہے تو پھر میری غمخواری تمہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ تمہارے فیصلے تمہارے نشو ونما دینے والے کے قانون کے مطابق ہو کر رہیں گے۔ تمہیں کشاں کشاں اس کی طرف جانا ہے۔

(حکم الٰہی ہوا۔ اے نوحؑ) کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ تو نے اپنے جی سے یہ بات گھڑ لی ہے؟ تو کہہ دے۔ اگر میں نے یہ بات گھڑ لی ہے تو میرا جرم مجھ پر، اور تم جو جرم کر رہے ہو (اس کی پاداش تمہارے لئے) میں اس سے بری الذمہ ہوں۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ حضرت نوحؑ خود اسی قوم میں سے تھے۔ زندگی انہی میں گزاری تھی۔ قوم نے اس سے پیشتر ان سے اس قسم کی باتیں کبھی نہیں سنی تھیں۔ جب انہوں نے اپنی دعوت کی تبلیغ شروع کی تو قوم نے سمجھا کہ یہ (معاذ اللہ) پاگل ہو گیا ہے جو اس قسم کی بہکی بہکی باتیں کرنے لگ گیا ہے جو نہ ہماری دید میں ہیں نہ شنید میں۔ انہوں نے کہا

اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِیْنٍ ○ (۲۳/۲۵ ؛ ۵۴/۹)

(اس کے سوا کچھ نہیں کہ) یہ پاگل ہو گیا ہے۔ بس (اس کی باتوں پر کان نہ دھرو) کچھ دنوں تک انتظار کر کے دیکھ لو کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔

تخویف و ترہیب لیکن جب دیکھا کہ اسے جنون نہیں، اپنے مشن سے عشق ہے اور وہ پاگلوں کی طرح بے ربط و بلا مقصد باتیں نہیں کرتا، بلکہ اس کی ہر جنبش اور حرکت ایک خاص قبلۂ مقصود کی طرف منتج ہوتی ہے تو وہ ان اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئے جو قوت کے نشہ کا آخری حربہ ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ یٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِیْنَ ○ (۲۶/۱۱۶)

اے نوحؑ (تم ان اونی لوگوں کو مساوات کا سبق پڑھا کر معاشرہ میں فساد برپا کر رہے ہو) اگر تم اس روش سے باز نہ آئے تو تمہیں سنگسار کر دیا جائے گا۔

یہ دھمکی انفرادی طور پر نہیں تھی بلکہ قبیلہ کے سب سے بڑے سردار کی قیادت میں ایک بڑی سازش کے تحت اس کا اعلان ہوا تھا۔

قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِیْ وَ اتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ یَزِدْهُ مَالُهٗ وَ وَلَدُهٗۤ اِلَّا خَسَارًا ۝ وَ مَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ۝ (۷۱/۲۲-۲۱)

نوحؑ نے کہا کہ اے میرے پروردگار تو دیکھ رہا ہے کہ یہ لوگ برابر میری مخالفت کئے جا رہے ہیں اور اس شخص کے پیچھے لگ رہے ہیں جس کی اس کے سوا کوئی خصوصیت نہیں کہ اس کے پاس بہت سی دولت ہے اور افرادِ خاندان کی کثرت۔ حالانکہ یہی چیز اس کی تباہی کا موجب ہے۔ یہ میری دعوت کے خلاف بہت بڑی سازش کر رہے ہیں۔

دھمکیوں کے جواب میں ...... لیکن کیا ان دھمکیوں سے خائف ہو کر حضرت نوحؑ نے اپنی دعوت چھوڑ دی؟ ایسا کسطرح ہو سکتا تھا! خدا کے بندوں کو کسی طرح کی تخویف و ترہیب ان کے مقصد سے باز نہیں رکھ سکتی۔ ان دھمکیوں کے جواب میں حضرت نوحؑ نے فرمایا۔

اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَیْكُمْ مَّقَامِیْ وَ تَذْكِیْرِیْ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْۤا اَمْرَكُمْ وَ شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا یَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَیْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْۤا اِلَیَّ وَ لَا تُنْظِرُوْنِ ۝ (۱۰/۷۱)

اگر تم پر بات شاق گزرتی ہے کہ میں تم میں (دعوت و ہدایت کے لئے) مقیم ہوں اور قوانین خداوندی کے مطابق تمہیں پند و نصیحت کرتا ہوں، تو میرا بھروسہ صرف اللہ پر ہے۔ تم میرے خلاف جو کچھ کرنا چاہتے ہو اس میں اپنا پورا زور لگا لو اور اپنے حمائیتوں کو بھی ساتھ لے لو۔ پھر جو کچھ تمہارا منصوبہ ہو اسے اچھی طرح سمجھ بوجھ لو کہ کوئی گوشہ نگاہوں سے اوجھل نہ رہ جائے۔ پھر جو کچھ میرے خلاف کرنا ہے کر گزرو اور مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو۔ (اور دیکھو آخر کار کیا نتیجہ نکلتا ہے)

مخالفت کی انتہا چنانچہ ان کی مخالفت دن بدن بڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ حضرت نوحؑ ان کی طرف سے مایوس ہو گئے اور انہوں نے اپنے رب کو پکارا۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِیْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ۝ (۳۹/۲۳) ؛ (۱۰/۵۴)

(اور کہا) خدایا انہوں نے مجھے جھٹلایا ہے۔ پس تو میری مدد کر۔

حضرت نوحؑ کی پکار وہ قوم مخالفت اور سرکشی میں اس قدر بڑھ چکی تھی اور ان کے جرائم اس قدر متعدی ہوتے جاتے رہے تھے کہ دوسرے انسانوں کو ان کے اثرات سے بچانا نہایت ضروری تھا۔

اس لئے حضرت نوحؑ نے اپنے رب سے فریاد کی کہ۔

قَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ○ (۷۱/۲۶)

اے میرے پروردگار! ان سرکشوں میں سے کسی ایک گھرانے کو بھی ملک میں بسنے کے لئے باقی نہ چھوڑ۔

اس لئے کہ

اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَ لَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ○ (۷۱/۲۷)

اگر تو نے ان سرکش لوگوں، کو چھوڑ دیا تو وہ تیرے بندوں کو بری طرح گمراہ کریں گے! اور ان کی اولاد بھی (موروثی اور تربیتی اثرات کی وجہ سے انہی جیسی) بدکردار اور سرکش ہوگی۔ (اس لئے ان کا سلسلہ ختم کر دیا جائے تو اچھا ہے)

کشتی کی تیاری

ابتداء میں اس دعوت کا جمالی پہلو نمایاں تھا۔ آخر میں اللہ کے قانونِ مکافات کے ماتحت اس کا جلالی پہلو سامنے آ گیا۔ ادھر سرکشی و تمرد انتہا کو پہنچ گئی۔ ادھر قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق مہلت کا زمانہ گذر کر نتیجہ برآمد ہونے کا وقت آ گیا۔ حضرت نوحؑ سے ارشاد ہوا کہ ایک کشتی تیار کر لو۔

وَ اُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ○ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا وَ لَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ○ (۱۱/۳۶-۳۷)؛ (۲۳/۲۷-۳۰)

اور نوحؑ پر وحی کی گئی کہ تیری قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے ہیں ان کے سوا اب کوئی ایمان لانے والا نہیں۔ پس جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اس پر (بیکار کو) غم نہ کھاؤ۔

اور (کہا گیا کہ) ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بنانا شروع کر دو اور ان ظالموں کے بارے میں اب ہم سے کچھ عرض معروض نہ کرنا۔ یقیناً یہ لوگ غرق ہو جانے والے ہیں۔

قوم کا تمسخر

یہ کشتی بنا رہے تھے اور قوم کے سرکش سردار، ان کا مضحکہ اڑا رہے تھے۔ حالانکہ ان کا یہ مضحکہ خود انکی اپنی حالت پر تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اللہ کی گرفت انہیں کس سختی سے پکڑنے والی ہے۔

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ ۗ وَ كُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ۭ...... وَ يَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ○ (۱۱/۳۸-۳۹)

چنانچہ نوحؑ کشتی بنانے لگا۔

اور جب کبھی ایسا ہوتا کہ ان کی قوم کے سردار ادھر سے گزرتے اور انہیں کشتی بنانے میں مشغول دیکھتے تو تمسخر کرنے لگتے۔

نوحؑ کی طرف سے انہیں جواب ملتا کہ اگر تم ہماری ہنسی اڑاتے ہو تو اڑا لو، جسطرح تم آج ہماری ہنسی اڑاتے ہو، ایک وقت آئے گا کہ ہم اسی طرح تمہاری حماقتوں پر ہنسیں گے۔ وہ وقت دور نہیں جب تمہیں معلوم ہو جائے گا کون ہے جس پر ایسا عذاب آتا ہے کہ اسے رسوا کر دے۔ وہ عذاب وقتی نہیں ہوگا بلکہ ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دینے والا ہوگا

ظہورِ نتائج کا وقت

کشتی تیار ہوگئی اور تباہی کا وقت آ پہنچا۔ حکم ہوا۔

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوْرُ ...... وَ مَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝ (۱۱/۴۰)

(یہ سب کچھ ہوتا رہا) یہاں تک کہ قانونِ خداوندی کے مطابق ان کی تباہی کا وقت آگیا تو اردگرد کی پہاڑیوں سے بارش کا پانی جوش مارتا ہوا وادی میں آنا شروع ہوگیا (۱۱/۴۴) اور اس نے سیلاب کی شکل اختیار کر لی تو ہم نے (نوحؑ سے) کہا کہ ہر ضرورت کی شے کے دو دو جوڑے کشتی میں رکھ لو۔ اور اپنے "اہل" کو بھی ساتھ لے لو، مگر اہل میں وہ لوگ داخل نہیں جن کی روش ثابت کر چکی ہے کہ وہ اہلِ ایمان میں سے نہیں۔ نیز ان لوگوں کو بھی ساتھ لے لو جو ایمان لا چکے ہیں۔ ان کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تھی۔

اور اس کے بعد۔

فَفَتَحْنَاۤ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ۝ ...... جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ۝ (۵۴/۱۱-۱۴)

پس ہم نے موسلا دھار بارش کے لئے بادلوں کے دروازے کھول دیئے۔ اور زمین سے چشمے ابلنے لگے۔ تو اس طرح زمین و آسمان کا پانی اس مقصد کے لئے جس کا قانونِ مکافات کے مطابق اندازہ ہو چکا تھا ایک جگہ جمع ہوگیا۔ اور ہم نے اُسے (نوحؑ کو) میخوں اور تختوں سے بنی ہوئی کشتی پر سوار کرا دیا۔ وہ ہماری زیرِ نگرانی چل رہی تھی۔ (اسطرح نوحؑ اور اس کے ساتھی اس تباہی سے بچ گئے اور) جنہوں نے نوحؑ کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا غرق ہوگئے۔

زمین سے پانی۔ آسمان سے پانی۔ پوری کی پوری وادی لبریز۔ اس کے بعد

وَ قِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِىْ مَآءَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقْلِعِىْ وَ غِيْضَ الْمَآءُ وَ قُضِىَ الْاَمْرُ وَ اسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِىِّ وَ قِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (۱۱/۴۴)

اور (پھر اللہ کا) حکم ہوا کہ اے زمین! تو اپنا پانی پی لے! اور اے بادلو! تم تھم جاؤ۔ سو چنانچہ پانی کا چڑھاؤ اتر گیا اور جو ہونا تھا ہوگیا۔ پھر وہ کشتی، جودی پر ٹھہر گئی۔ اور جماعت مومنین کو بتایا گیا کہ وہ لوگ تباہ ہوگئے ہیں جو تم پر ظلم کیا کرتے تھے۔

اس طوفانِ بلا کے سامنے سرکش و مغرور قوم اور اس کے وہ تمام ساز و سامان جس کے بل بوتے پر انہوں نے ظلم و استبداد کی روش اختیار

کر رکھی تھی خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے اور اس تباہی سے وہی محفوظ رہے جو کل تک بے یار و مددگار اور بے ساز و سامان سمجھے جاتے تھے اور جن کا مضحکہ اڑایا جاتا تھا۔ طوفان تھما، کشتی جودی پر جا کر رکی اور ارشاد ہوا۔

قِيلَ يٰنُوحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰىٓ أُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ۚ وَأُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُم مِّنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ ○ (۱۱/۴۸)

اور ہم نے نوحؑ سے کہا کہ اب خطرہ کوئی نہیں رہا لہٰذا کشتی سے اُتر پڑو۔ یہاں تمہیں اور تمہارے رفقا کو سامانِ زیست بڑی فراوانی سے ملے گا۔ باقی رہیں وہ جماعتیں جو تمہارا ساتھ نہیں دینگی تو ہمارے قانونِ طبیعی کے مطابق رزق تو وہ بھی حاصل کر لیں گی لیکن ان کا مستقبل تاریک ہوگا اور انجام کار وہ الم انگیز تباہی کا شکار ہوں گی (۲/۲۰۰ ؛ ۱۱/۱۵-۱۶ ؛ ۱۷/۱۵-۱۶ ؛ ۴۲/۲۰ ؛ ۴۶/۲۰)

یوں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ اور ان کے "اہل" کو عذابِ الیم سے محفوظ رکھا اور مخالفین کو نیست و نابود کر دیا۔ (۲۱/۷۶-۷۷ ؛ ۳۷/۷۵-۷۶)

اہل کا مفہوم

ان آیات میں "اہل" کا لفظ غور طلب ہے۔ یہ اپنے اندر ایک عظیم الشان حقیقت پوشیدہ رکھتا ہے جو تاریخ انسانیت میں امہات اصول میں سے ہے۔ ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ حضرت نوحؑ اور ان کے "اہل" کو اس عذاب سے محفوظ رکھا گیا۔ عام اصطلاح میں "اہل" سے مراد کنبہ اور خاندان کے افراد ہوتے ہیں۔ لیکن آسمانی لغت میں اس کا مفہوم کچھ اور ہے۔ سورۂ مومنین میں "اہل" میں ایک استثناء (EXCEPTION) بتائی گئی ہے۔ ارشاد ہے۔

فَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ أَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا ...... إِنَّهُم مُّغْرَقُونَ ○ (۲۳/۲۷)

پس ہم نے نوحؑ کی طرف وحی بھیجی کہ ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بناؤ۔ جب ایسا ہو کہ ہمارے قانون مکافات کے مطابق تباہی کا وقت آ جائے اور زمین کے چشمے پھوٹ نکلیں تو کشتی میں (ہر ضرورت کی چیزوں کے) دو دو جوڑے ساتھ رکھ لو۔ اور اپنے اہل کو بھی۔ مگر اہل کے ایسے لوگوں کو نہیں جن کے کفر و عدوان نے بتا رکھا ہے کہ وہ تمہارے متبعین میں شامل نہیں ہونگے۔ اور دیکھو جن لوگوں نے سرکشی پر کمر باندھ رکھی ہے ان کے بارے میں کچھ ہم سے عرض معروض نہ کیجیو۔ وہ ڈوب کر رہیں گے۔

اس کی تفسیر سورۂ نوحؑ میں ان الفاظ سے کر دی گئی ہے۔

رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَن دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۖ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِينَ إِلَّا تَبَارًا ○ (۷۱/۲۸)

(نوحؑ نے کہا) اے میرے رب! تو ان سرکشوں کی دراز دستی سے میری اور میرے ماں باپ کی حفاظت فرما اور میرے اہل خانہ میں سے اس کی بھی جو ایمان لائے۔ ان کے علاوہ دوسرے مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کی بھی اور (ظالموں کو) جو (ایمان نہیں لاتے) تباہی اور بربادی میں اضافہ کئے جا۔

اپنوں اور غیروں کا قرآنی معیار

اس سے واضح ہو گیا کہ نظام خداوندی میں "اہل" سے مراد کیا ہے۔ یہاں اپنوں اور غیروں کی تقسیم، نسب اور قرابت داری کی رو سے نہیں ہوتی بلکہ کفر اور ایمان کی رو سے ہوتی ہے۔ دعوتِ نوحی میں یہ مقام ایسا بلند ہے جسے قرآن کریم نے کھلے کھلے الفاظ میں بیان فرمایا ہے تاکہ یہ اصولی اور اساسی معیارِ تقسیم واضح طور پر سامنے آ جائے کیونکہ انسانی تمدن اور عمرانیت کی صحیح اور غلط تعمیر اسی معیار کے صحت اور سقم پر مبنی ہے۔ ذرا غور کیجئے، چاروں طرف طوفانِ بلا انگیز موجزن ہے۔

وَهِيَ تَجْرِي بِهِمْ فِي مَوْجٍ كَالْجِبَالِ (۱۱/۴۲)

اور (دیکھو) ایسی موجوں میں کہ پہاڑوں کی طرح اٹھتی ہیں کشتی انہیں لئے جا رہی ہے۔

بیٹا سامنے آ جاتا ہے۔ محبتِ پدری جوش میں آتی ہے۔ آواز دیتے ہیں۔

وَنَادَىٰ نُوحٌ ابْنَهُ وَكَانَ فِي مَعْزِلٍ يَا بُنَيَّ ارْكَب مَّعَنَا وَلَا تَكُن مَّعَ الْكَافِرِينَ ○ (۱۱/۴۲)

اور نوحؑ نے اپنے بیٹے کو پکارا۔ وہ کنارہ پر (کھڑا) تھا۔ اے میرے بیٹے! ہمارے ساتھ کشتی میں سوار ہو جا۔ کافروں کے ساتھ نہ رہ۔

بیٹا انکار کرتا ہے اور کہتا ہے۔

قَالَ سَآوِي إِلَىٰ جَبَلٍ يَعْصِمُنِي مِنَ الْمَاءِ ۚ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ إِلَّا مَن رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِينَ ○ (۱۱/۴۳)

اس نے کہا، "میں کسی پہاڑ پر پناہ لے لوں گا، وہ مجھے پانی کی زد سے بچا لے گا۔ تمہارے ساتھ کشتی میں سوار نہیں ہوں گا۔ نوحؑ نے کہا (تو کس خیال خام میں پڑا ہے) اس طوفان سے جو قانون خداوندی کے مطابق آیا ہے بچانے والا کوئی نہیں۔ اس سے وہی بچ سکے گا جو ایمان لا کر اس کے آغوشِ رحمت میں پناہ لے لے۔ اتنی بات ہوئی تھی ان دونوں کے درمیان ایک موج حائل ہو گئی۔ اور وہ بھی دوسروں کے ساتھ ڈوب گیا۔

جب کشتی سے اتر کر حضرت نوحؑ کو اطمینان نصیب ہوا تو

وَنَادَىٰ نُوحٌ رَّبَّهُ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَأَنتَ

اَحۡكَمُ الۡحٰكِمِيۡنَ ۝ (۱۱/۴۵)

اور نوحؑ نے اپنے رب سے عرض کیا کہ بار الٰہا! تیرا وعدہ تھا کہ تو میرے "اہل"[1] کو بچالے گا۔ اور ظاہر ہے کہ میرا بیٹا میرے اہل میں سے تھا۔ تو پھر وہ کیوں نہ محفوظ رہا اور تیرے وعدے تو ہمیشہ سچے ہوا کرتے ہیں اور تیرا فیصلہ آخری فیصلہ۔ اس درخواست کے جواب پر غور فرمائیے کہ یہی جواب تاریخ انسانیت میں ایک عظیم انقلاب پیدا کرنے والا تھا۔ ارشاد ہوا۔

قَالَ يٰنُوۡحُ اِنَّهٗ لَيۡسَ مِنۡ اَهۡلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيۡرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسۡـَٔلۡنِ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ ؕ اِنِّىۡۤ اَعِظُكَ اَنۡ تَكُوۡنَ مِنَ الۡجٰهِلِيۡنَ ۝ (۱۱/۴۶)

(خدا نے) کہا اے نوحؑ تو نے "اہل" کا صحیح مفہوم نہیں سمجھا۔ بے شک وہ تیرا بیٹا تھا۔ لیکن وہ تیرے "اہل" میں سے نہیں تھا (تیرے اہل وہی ہو سکتے ہیں جن کی روش زندگی ہمارے قوانین کے مطابق ہو۔ یعنی ان کے اعمال صالح ہوں۔ اور اس کے اعمال غیر صالح تھے۔ تو نے ہم سے یہ سوال اس لئے کر دیا کہ تو اس حقیقت سے واقف نہ تھا۔ آئندہ ایسا نہ کرنا۔

نسلی امتیاز اور قوموں کی تقسیم

واقعہ تو اتنا سا ہے لیکن اس کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ آپ یونہی آگے نہ بڑھ جائیں بلکہ اس پر مزید غور کریں کہ اس کے اندر کس قدر عدیم النظیر حقیقت مضمر ہے۔ تاریخ انسانیت پر غور کیجئے۔ جب انسانوں نے غاروں اور درختوں کی ابتدائی انفرادی زندگی سے آگے بڑھ کر قبائل کی اجتماعی زندگی شروع کی تو ان میں وجہ جامعیت اشتراک نسل تھی۔ یعنی ایک مورث اعلیٰ کی اولاد مل جل کر اکٹھی رہتی تھی۔ اس کا نام قبیلہ تھا۔ یہاں ایک قبیلہ، وہاں دوسرا قبیلہ۔ باہمی مفاد کے تصادم پر ان قبائل میں جنگ و پیکار کے مظاہرے بھی رونما ہوتے رہتے تھے۔ اس جنگ میں حریف و حلیف ہونے کا معیار حق و باطل کا معیار نہ تھا۔ بلکہ اپنے قبیلہ اور غیر قبیلہ کا معیار تھا۔ یعنی قبیلہ کا ہر فرد اپنے قبیلہ کے ساتھ ہوتا تھا۔ اور دوسرے قبیلہ کا مخالف۔ یہ تھی انسان کی ابتدائی زندگی۔ اب ہزاروں سال کی تاریخ کے اوراق کو اُلٹ کر اپنے زمانہ میں پہنچ جائیے جو علم و تمدن کے اعتبار سے اپنے آپ کو ابتدائی دورِ جہالت سے اتنا مختلف سمجھتا ہے۔ جتنا انسان اپنے آپ کو حیوان سے مختلف قرار دیتا ہے۔

آج کی تقسیم

لیکن ذرا غور کیجئے کہ جہاں تک تقسیمِ انسانی کا تعلق ہے اس دورِ تہذیب و تمدن کا انسان اُس دورِ جہالت و ظلمت کے انسان سے کچھ بھی مختلف ہے، وہاں انسانوں کی تقسیم، قبائل کی

---

[1] سورۂ نوحؑ کی آیت (۷۱/۲۸) جو پہلے درج کی جاچکی ہے اور جس میں حضرت نوحؑ نے صرف انہی "اہل خانہ" کی مغفرت کی دعا کی ہے جو صاحب ایمان ہوں۔ زیر نظر واقعہ کے بعد کی معلوم ہوتی ہے۔

رُو سے ہوتی تھی۔یہاں وہ تقسیم اقوام کی رو سے ہوتی ہے۔اور قوم کیا ہے؟ قبیلہ کی پھیلی ہوئی شکل۔یعنی جب ایک قبیلہ بڑا ہو جائے تو اسے قوم کہا جاتا ہے۔قوموں کی ابتدائی تقسیم اختلافِ نسب کی رُو سے ہوئی۔(مثلاً ایرانی، تورانی، سامی) یا اختلافِ رنگ کی بناء پر (مثلاً سفید، سیاہ اور زرد اقوام) اس بنیادی تقسیم سے آگے بڑھئیے تو چھوٹی چھوٹی تقسیمیں جغرافیائی حدود کی رو سے طے پاتی ہیں۔یعنی کسی دریا یا پہاڑ کی حدود کے اندر بسنے والے لوگ دوسری قوم۔غور فرمائیے! بایں ہمہ ادعائے تہذیب و تمدّن انسان ابھی تک اسی چکر میں گرفتار ہے جہاں سے اس نے اپنی تمدّنی زندگی کی ابتدا کی تھی۔ذرا یورپ کی تقسیمِ اقوام پر نگاہ ڈالیئے اور پھر ان کی سبعیت و بہیمیت اور وحشت و درندگی پر غور کیجئے۔کیا آپ کو آلاتِ حرب و ضرب کی نوعیت اور سامان و ذرائع تباہی و بربادی کی ساخت و پرداخت کے علاوہ اُس دورِ جہالت اور اِس دورِ تمدّن میں کچھ فرق بھی نظر آتا ہے؟ کچھ بھی نہیں! اس لئے کہ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ سے متعلق مسائل کا صحیح حل صرف وحی کی روشنی میں مل سکتا ہے اور یورپ اس روشنی سے محروم ہے۔وَفِیْ طُغْیَانِہِمْ یَعْمَہُوْنَ۔

اس کے برعکس اس مسلکِ حیات کو دیکھئے جو وحی کی روشنی میں متعین کیا گیا۔حضرت نوحؑ اپنی قوم کے ایک فرد ہیں لیکن جونہی ان کی دعوت کی ابتدا ہوتی ہے قوم دو حصّوں میں بٹ جاتی ہے۔ایک وہ جو اس دعوتِ آسمانی پر ایمان لاتا ہے۔دوسرا وہ جو اس کی تکذیب و مخالفت کرتا ہے۔اس دوسرے طبقے میں صاحبانِ دولت و ثروت ہیں۔اونچے گھرانے کے افراد ہیں۔دوسری طرف مفلس و نادار انسانوں کی جماعت ہے جنہیں اوّل الذکر طبقہ "اراذل" شمار کرتا ہے۔لیکن یہ جماعتِ مؤمنین (حزب اللہ) اللہ کے قانون کی حفاظت اور رسول کی تربیت و شفقت کے سائے میں بڑھتی ہے۔جماعتِ مخالفین خود انہی کی قوم کے افراد ہیں۔یقیناً ان کے رشتہ دار بھی ہونگے۔لیکن اُن کے ساتھ اب ان کا کوئی تعلق نہیں۔ان کے تعلقات کی بنیاد اب ایک اور ہی جذبہ ہے، اور وہ جذبہ ایمان کا ہے۔حتّٰی کہ حضرت نوحؑ کا بیٹا بھی چونکہ مکذّبین کی جماعت میں ہے، اس لئے اس قدر قریبی رشتے کے باوجود اُن کے "اہل" میں سے قرار نہیں پاتا۔اب "اہل" اور "غیر" کی تقسیم کا معیار کچھ اور قرار پاچکا ہے۔اب ان کے "اہل" وہ "غیر" ہیں جن سے اس سے پیشتر قرابت داری کا کوئی تعلق نہ تھا۔دعوتِ نوحی سے اس حقیقتِ عظمٰی کی ابتدا ہوئی۔اس سے آگے آپ دیکھیں گے کہ ہر رسول کے زمانہ میں اس تقسیم کے مظاہرے سامنے آتے جائیں گے۔حضرت لوطؑ کی بیوی اس تقسیم کی رو سے کفار کی جماعت میں شامل تھی، نبیؑ کے اہل میں سے نہیں تھی۔حضرت ابراہیمؑ کے باپ اس تقسیم کی رُو سے "غیروں" میں شامل تھے۔اپنوں میں سے نہیں تھے۔حضرت موسیٰؑ کی قوم، باوجود اشتراکِ وطن، قومِ فرعون سے الگ تھی لیکن قومِ فرعون میں سے جو لوگ اشتراکِ ایمانی میں حضرت موسیٰؑ کے ساتھ تھے وہ قومِ موسیٰؑ میں سے قرار دیئے گئے۔یہ سلسلہ اسی طرح

وسیع ہوتا چلا گیا۔ تا آنکہ رسول کافۃ للناس کے عہد مبارک میں تمام نوع انسانی کی تقسیم اسی اصول کے تحت قرار پاگئی۔ قرآن کریم نے جہاں "قوم الکافرین" کہا ہے تو اس میں دنیا میں ہر گوشے میں بسنے والے کفار آگئے۔ جب "قوم الظّٰلمین" اور "قوم الفاسقین" اور "قوم المجرمین" کہا گیا تو تمام صفحۂ ارض کے ظالمین و فاسقین و مجرمین اس جدید "قومیت" کے حلقے میں آگئے۔ اس کے برعکس جب ارشاد ہوا کہ "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ" تو اس قوم کی عالمگیریت و آفاقیت بھی حدود نا آشنا اور قیود فراموش قرار پائی۔ لہٰذا اس اصول کی رو سے ساری دنیا کے مومن، باوجود اختلافِ رنگ و زبان، وطن، نسب ایک قوم کے فرد اور اس کے برعکس دنیا بھر کے منکرین، جماعت مخالف کے افراد۔ ان دونوں جماعتوں میں دنیا بھر کے اشتراک وجوہات کے باوجود کوئی اشتراک نہیں تا آنکہ وہ آسمانی وجۂ اشتراک یعنی ایمان کے رشتہ سے اس قومیتِ حقہ کے رکن نہ بن جائیں کہ

اندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

یہ ہے وحی کی روشنی میں معیارِ قومیت۔ یورپ تو اس حقیقت کو سمجھ نہیں سکتا کہ اس کے پاس وحی کی قندیل آسمانی نہ تھی لیکن اس شوریدہ بختی کا کیا علاج کہ خود مسلمانوں کا بھی آج یہ عالم ہے کہ یورپ کی تقلید میں اشتراک وطن یا نسل کو وجہ جامعیت قرار دے کر قومیت پرستی کو شعار ملّی بتایا جا رہا ہے، حالانکہ اب یورپ اس غلط معیار تقسیم انسانی کے ہاتھوں خود تنگ آچکا ہے۔ اور اس کے ارباب فکر و نظر، قرآنی تعلیم سے غیر شعوری طور پر متاثر ہو کر یا خود زمانہ کے تقاضوں سے مجبور ہو کر (کہ فطرت کے مطالبات اور زمانہ کے تقاضے بھی انسان کو آہستہ آہستہ قرآن کی طرف آنے کے لئے مجبور کر رہے ہیں) اس حقیقت کو محسوس کر رہے ہیں کہ قومیت کی بنیاد وحدتِ افکار (ایمان و مذہب) پر ہی رکھی جانی چاہیئے نہ کہ جغرافیائی حدود اور رنگ و نسل پر۔ اس موضوع پر سابقہ جلدوں میں شرح و بسط سے لکھا جا چکا ہے اس لئے اس مقام پر مزید تفصیل کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی (انڈکس میں "قومیت پرستی"، "دو قومی نظریہ"، "اسوۂ حضرتِ ابراہیمؑ" جیسے عنوانات دیکھئے۔)

داستانِ حضرت نوحؑ تو ختم ہو گئی لیکن اس میں دو ایک نکات ایسے ہیں جن کی مزید تشریح ضروری ہے۔

۱۔ حضرت نوحؑ نے دعا کی تھی کہ

وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِينَ دَيَّارًا ۝ (۷۱/۲۶)

اور نوحؑ نے دعا کی۔ اے اللہ ان نہ ماننے والوں میں سے ایک کو بھی زمین پر باقی نہ چھوڑیو۔

کیا طوفان نوح عالمگیر تھا؟

بعض لوگ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یہ طوفان عالمگیر تھا اور تمام صفحۂ ارض

اس کی پیٹ میں آ گیا تھا۔ اور روئے زمین پر کوئی ذی روح باقی نہیں رہا تھا سوائے حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کے جو کشتی میں سوار تھے۔ یہ خیال صحیح نہیں اور دانستہ یا غیر شعوری طور پر تورات سے مستعار لیا گیا ہے۔ (تورات۔ کتاب پیدائش) میں لکھا ہے کہ خداوند خدا نے کہا کہ میں چالیس دن اور رات متواتر مینہ برساؤں گا اور ہر ذی روح کو جسے میں نے پیدا کیا ہے روئے زمین سے فنا کر دوں گا۔ (پیدائش ۷/۴) چنانچہ چالیس شب و روز کی بارش کے بعد ایک سو پچاس دن تک طوفان کا پانی موجیں مارتا رہا۔ اور ساتویں مہینے سفینۂ نوحؑ ارارات کی پہاڑیوں پر جا کر رکا۔ اور دسویں مہینے میں جا کر پہاڑ کی چوٹیاں دکھائی دیں۔ (پیدائش ۸/۴-۵) اور جب زمین نئے سرے سے خشک ہوئی تو جو جاندار کشتی نوحؑ میں تھے ان کے علاوہ اور کہیں کوئی متنفس باقی نہ تھا (پیدائش ۸/۲۱-۲۲) لیکن قرآن کریم نے کہیں ایسا نہیں کہا۔ برعکس اس کے یہ ظاہر ہے کہ حضرت نوحؑ کا تخاطب اپنی قوم سے تھا۔ ان کی دعوت انہی کے لئے تھی اور اس دعوت کی تکذیب بھی انہی کی طرف سے ہوئی۔ لہذا یہ تباہی بھی انہی پر وارد ہوئی۔ باقی دنیا کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا؟ طوفانِ نوحؑ کی آماجگاہ وہی وادی تھی جہاں یہ قوم آباد تھی۔ باقی رہا یہ کہ حضرت نوحؑ نے اپنی دعاء میں یہ کہا تھا کہ

رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ (۷۱/۲۶)

اے میرے رب ان نہ ماننے والوں میں سے کسی کو بھی ارض پر باقی نہ چھوڑ۔

تو اس میں (اَلْاَرْضُ) سے مراد تمام صفحۂ ارض نہیں بلکہ وہ ملک ہے جس میں وہ قوم بستی تھی، قرآنِ کریم میں متعدد شواہد موجود ہیں جن میں "اَلْاَرْض" سے مراد ایک خاص علاقہ ہے۔ مثلاً قصۂ حضرت موسیٰؑ میں فرمایا ہے کہ

وَ اِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ ۚ (۱۰/۸۳)

اور اس میں شک نہیں کہ فرعون ملک (مصر) میں بڑا ہی سرکش تھا۔

یہاں الارض ملک مصر کے لئے آیا ہے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ فرعون کی سرکشی اور تمرد اور غلبہ و تسلط تمام روئے زمین پر نہیں تھا، بلکہ ایک خاص ملک کے اندر محدود تھا۔ اسی طرح حضرت داؤدؑ کے متعلق فرمایا۔

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ … (۳۸/۲۶)

اے داؤدؑ ہم نے تجھے ملک (ارض) میں حاکم بنایا ہے۔ سو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو۔

یہاں بھی ظاہر ہے کہ حضرت داؤدؑ کی سلطنت تمام صفحۂ ارض پر نہیں تھی۔ بلکہ ایک خاص خطۂ ملک میں تھی۔ لہذا ان مقامات میں الارض سے مراد تمام روئے زمین نہیں، بلکہ وہ خاص علاقہ ہے جس سے واقعۂ زیرِ نظر کا تعلق ہے۔ یہی مفہوم قصۂ حضرت نوحؑ میں "الارض" سے ہے۔

۲۔ حضرت نوحؑ کے متعلق قرآن کریم میں ہے ۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا (۲۹/۱۴)

اس کا عام ترجمہ یہ ہے :-

اور ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ ان میں پچاس برس کم ہزار سال رہا ۔

عمر نوحؑ

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت نوحؑ کی عمر ساڑھے نوسو سال کی تھی ؟ اگر تورات کی طرف جائیے تو حضرت نوحؑ آدم سے دسویں پشت میں آتے ہیں اور ان تمام کی عمریں آٹھ آٹھ نو نو سو سال کی لکھی ہیں چین کے مذہب (TAOISM) کا ایک بہت بڑا مبلغ (KWANG) چوتھی صدی قبل مسیح میں گزرا ہے ۔ وہ یہ بتانے کے بعد کہ عمر بڑھانے کا کیا طریقہ ہے ، لکھتا ہے کہ

میں بارہ سو سال سے اسی طریق کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہوں اور اس پر بھی میرا جسم رو بہ انحطاط نہیں ہوا ۔

لیکن قدیم زمانہ کی تاریخ میں بادشاہوں کی عمریں عام طور پر بہت لمبی لمبی لکھی گئی ہیں ۔ اب ان روایات سے یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں کسی مورثِ اعلیٰ کی عمر سے مقصود یہ ہوتا تھا کہ اس کے خاندان میں حکومت کتنے عرصہ تک رہی ۔ یہ عرصۂ حکومت اس مورثِ اعلیٰ کی عمر لکھا جاتا تھا ۔ یعنی خاندان کے بجائے خاندان کے مورثِ اعلیٰ کا نام ہی کافی سمجھا جاتا تھا ۔ اس اعتبار سے قیاس یہی ہے کہ حضرت نوحؑ کی عمر سے مراد وہ زمانہ ہے جس میں ان کی تعلیم جاری رہی ۔ زیر نظر آیت میں ہے ۔

فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ؕ (۲۹/۱۴)

اس میں ایک ہزار سال کے ساتھ سَنَةٍ کا لفظ آیا ہے اور خَمْسِيْنَ کے ساتھ عَامًا کا ۔ سَنَةٍ اور عَامًا دونوں کے معنی سال ہیں اس فرق کے ساتھ کہ سَنَةٌ بالعموم اس سال کو کہتے ہیں جس میں سختیاں آئیں ۔ اور عَامًا خوشحالی کے سال کو کہتے ہیں ۔ اس اعتبار سے اس آیت کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی تعلیم پہلے پچاس سال تو نہایت عمدگی سے جاری رہی لیکن اس کے بعد ان کے متبعین پر سختیوں کا دور شروع ہو گیا ۔ جو نوسو سال تک رہا ۔

اس ساڑھے نوسو برس کی مدت کو حضرت نوحؑ کے زمانۂ شریعت پر اس لئے بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مندرجۂ صدر آیت کے بعد ہی حضرت ابراہیمؑ کا ذکر شروع ہو جاتا ہے اور تورات کی رُو سے حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں نوسو باون سال کا فرق ہے ۔ اگرچہ خود تورات اور تاریخ کے دیگر شواہد کی روشنی میں دیکھا جائے تو حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ قریب اڑھائی ہزار سال قبل مسیح کے لگ بھگ متعین ہوتا ہے ۔

اس سلسلہ میں ایک اور چیز بھی غور طلب ہے ۔ عربی لغت میں سَنَةٌ کا اطلاق فصل پر بھی ہوتا ہے جو سال میں

چار ہوتی ہیں۔ یعنی چار فصلوں کا ایک سال ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے اَلْفَ سَنَۃٍ کے معنی ہوں گے اڑھائی سو سال۔ اور عامٌ پورے سال کو کہتے ہیں۔ اس لئے اگر خَمْسِیْنَ عَامًا (پچاس سال) کو اس میں سے منہا کر دیا جائے تو باقی دو سو سال رہ جاتے ہیں اور اتنی عمر کچھ ایسی مستبعد نہیں۔

بہرحال یہ ہنوز تاریخ کے قیاسات ہیں اور چونکہ قرآن نے ان حضراتؑ کے زمانہ کے متعلق بحث نہیں کی اس لئے ان قیاسات میں سے جو بھی حقیقت کے قریب ہوں (یا بعد کے انکشافات انہیں ایسا ثابت کر دیں) انہیں درست سمجھا جائے گا۔

جماعتِ مؤمنین کی حفاظت

ہم نے دیکھا ہے کہ جب حضرت نوحؑ کو آنے والے طوفان کی خبر دی گئی تو ان سے کشتی بنانے کے لئے کہا۔ اور اسی کشتی کے ذریعے انہیں اور ان کی جماعت کو غرقابی سے محفوظ رکھا گیا۔ اس سے واضح ہے کہ اس طبیعی دنیا میں حفاظت اور ہلاکت، طبیعی اسباب کے ذریعے ہوتی ہے۔ فوق الفطرت اسباب سے نہیں۔ حضرت نوحؑ کے مخالفین انہیں کشتی بناتے دیکھتے اور ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ اگر وہ ذرا بھی سوجھ بوجھ سے کام لیتے اور انہیں دیکھ کر اپنی کشتی بنا لیتے تو وہ بھی غرق ہونے سے بچ جاتے۔ حتیٰ کہ جب حضرت نوحؑ نے اپنے بیٹے کو آواز دی تھی، تو اگر وہ باپ کا کہنا مان کر کشتی میں سوار ہو جاتا، تو وہ بھی غرقابی سے محفوظ رہ جاتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ جہاں تک طبیعی اسباب اور طبیعی قوانینِ فطرت کا تعلق ہے، کافر اور مومن میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ان کا اطلاق سب پر یکساں ہوتا ہے (اس نکتہ کی وضاحت مختلف مقامات پر سامنے آتی جائے گی)۔

اس کے ساتھ یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ انسان اپنی زندگی کے ابتدائی ادوار میں، عام طبیعی اسباب کے لئے بھی وحی کی راہنمائی کا محتاج ہوتا تھا۔ حضرت نوحؑ کے زمانے میں لوگ کشتی بنانا بھی نہیں جانتے تھے۔ اس کے لئے وحی نے راہنمائی کی۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ زندگی کے اسباب و عوامل جو آج پیش پا افتادہ اور عام ہیں، ان کی ابتدا وحی کی راہنمائی سے ہوتی ہوگی۔ جوں جوں انسانی علم و بصیرت نے ترقی کی، ان گوشوں میں وحی کی راہنمائی کی ضرورت نہ رہی۔ اس کا دائرہ اقدار و اصولِ حیات تک محدود ہو گیا۔ یہ وہ وحی ہے انسان جس کا ابد تک محتاج رہے گا۔ اسی لئے اسے مکمل شکل میں قرآن کے اندر محفوظ کر کے، وحی کا دروازہ بند کر دیا۔

یہ ہے قومِ نوحؑ کی داستانِ عبرت انگیز جسے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ پر وحی فرمایا:۔

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ○ (۱۱/۴۹)

(اے رسولؐ!) یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جسے ہم وحی کے ذریعے تجھے بتلا رہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ تو یہ باتیں تو خود جانتا تھا اور نہ تیری قوم۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ ان تاریخی شواہد سے یہ حقیقت تجھ پر واضح ہو جائے کہ دعوتِ خداوندی کو کن صبر آزما مراحل میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ لیکن آخرالامر کامیابی اسی کے لئے ہوتی ہے۔

عیسائی معترضین اکثر کہا کرتے ہیں کہ حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کے قصے نبی اکرمؐ کے زمانہ میں عام طور پر مشہور تھے اور یہود اور عیسائی علماء اکثر ان کا تذکرہ کرتے رہتے تھے' اس لئے حضورؐ اور اہلِ عرب ان سے واقف تھے۔ پھر یہ کہنا کس طرح درست ہے کہ یہ وہ امورِ غیب ہیں جن سے نہ نبی اکرمؐ آگاہ تھے نہ ان کی قوم۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس زمانے کے لوگ ان قصص کی عمومی حیثیت سے متعارف تھے لیکن جو تفاصیل قرآنِ کریم نے بیان فرمائی ہیں، نہ صرف یہ کہ وہ زبان زدِ خلائق ہی نہ تھیں بلکہ یہودیوں اور عیسائیوں کے لٹریچر میں بھی موجود نہ تھیں۔ قصۂ قومِ نوحؑ کا ماخذ تورات ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن ذرا تورات کے

تورات کی تفاصیل

بیان کردہ قصے اور قرآنِ کریم کا مقابلہ کر کے دیکھیئے حقیقت واضح طور پر سامنے آجائیگی کہ (اس) تورات میں ذہنِ انسانی کی فسانہ طرازی کا کس قدر دخل ہے اور قرآنِ کریم کے بیان میں کس قدر صداقت اور پاکیزگی ہے۔ قصصِ قرآن کا ایک خاص اسلوب یہ ہے کہ ان سے مؤرخانہ وقائع نگاری مقصود نہیں ہوتی۔ بلکہ قصہ کی صرف وہی کڑیاں بیان کی جاتی ہیں جن سے کوئی نہ کوئی اہم نتیجہ اخذ کیا جانا مطلوب ہو۔ قصۂ قومِ نوحؑ میں اہم نقاط یہ ہیں کہ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو خدائے واحد کی اطاعت کی دعوت دی۔ قوم کے سرکش اور متمرد طبقہ نے اس دعوت کی تکذیب و مخالفت کی اور جب پانی سر سے گزر گیا تو وہ قوم طوفان کے ذریعے ہلاک ہو گئی۔ اب دیکھیئے کہ بائبل طوفان کی وجہ کیا بیان کرتی ہے۔ تورات کی کتاب پیدائش میں ہے۔

> اور خداوند خدا نے دیکھا کہ زمین پر انسان کی بدی بہت بڑھ گئی اور اس کے دل کے تصوّر اور خیال روز بروز صرف بدی ہوتے ہیں ۞ تب خداوند زمین پر انسان پیدا کرنے سے پچھتایا اور نہایت دل گیر ہوا ۞ اور خداوند نے کہا میں انسان کو جسے میں نے پیدا کیا زمین پر سے مٹا ڈالوں گا۔ انسان اور حیوان کو بھی۔ اور کیڑے مکوڑے اور آسمان کے پرندوں تک، کیونکہ میں ان کے بنانے سے پچھتاتا ہوں ۞ مگر نوحؑ پر خداوند نے مہربانی سے نظر کی۔ (پیدائش $\frac{5}{5-8}$)

ذرا غور فرمایئے۔ تورات کا بیان یہ ہے کہ (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) خالقِ ارض و سمٰوٰت نے بنانے کو یہ مخلوق بنا دی لیکن بنانے کے بعد اس پر سخت پشیمان اور متاسف ہوا اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ میں اپنی مخلوق کو صفحۂ ارض سے نابود کر دوں گا۔ یہ تھا وہ "مقصدِ عظیم" جس کے لئے طوفانِ نوحؑ برپا کیا گیا۔

۲۔ کتاب پیدائش کے مذکورہ صدر بیان نیز اس کے دیگر بیانات سے ظاہر ہے کہ تورات کی رو سے طوفانِ نوحؑ

عالمگیر حیثیت رکھتا تھا کیونکہ خدا نے یہ کہا تھا کہ صفحۂ ارض پر جس قدر ذی روح موجود ہیں وہ ان سب کو تباہ کرنا چاہتا ہے اس طوفان کی عالمگیریت کا نظریہ تاریخی تحقیقات کے سامنے نہیں ٹھہر سکا۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجنز اینڈ ایتھکس کا مضمون نگار عنوان "طوفان" (DELUGE) کے تحت لکھتا ہے کہ

ایک عالمگیر طوفان کا عقیدہ ارباب تحقیق و خبر کے نزدیک بالکل مرفوع القلم ہے۔

اس کے برعکس (جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں) قرآن کریم کی رو سے یہ طوفان صرف قوم نوحؑ کے علاقے میں آیا تھا نہ کہ ساری دنیا پر اور یہ وہ حقیقت ہے جس کی تائید تاریخی شواہد اور اثری انکشافات سے ہوتی جا رہی ہے۔

۳۔ تیسرا اہم نقطہ پسرِ حضرت نوحؑ کا واقعہ ہے جس کے متعلق قرآن کریم میں بتایا گیا ہے کہ اس کے "غیر صالح اعمال" اسے کسطرح لے ڈوبے اور نبی کا نسبتی تعلق بھی اسے مکافاتِ عمل سے نہ بچا سکا اور وہ "اپنا" ہوتے ہوئے کیسے غیر بن گیا۔ لیکن اب دیکھئے کہ بائیبل میں پسر نوح کا واقعہ کن الفاظ میں مذکور ہے۔ کتاب پیدائش کے نویں باب میں ہے:۔

اور نوح کھیتی باڑی کرنے لگا اور اس نے ایک انگور کا باغ لگایا ۝ اور اس کی مے پی کر نشے میں آیا اور اپنے ڈیرے کے اندر آپ کو ننگا کیا۔ اور کنعان کے باپ حام نے اپنے باپ کو ننگا دیکھا اور اپنے دو بھائیوں کو جو باہر تھے خبر دی ۝ تب سم اور یافت نے ایک کپڑا لیا اور اپنے دونوں کاندھوں پر دھرا اور پچھلے پاؤں جا کے اپنے باپ کی برہنگی کو چھپایا پران کی پیٹھ اس کی طرف تھی کہ انہوں نے اپنے باپ کی برہنگی کو نہ دیکھا ۝ جب نوح اپنے نشے سے ہوش میں آیا تو جو اس کے چھوٹے بیٹے نے اس کے ساتھ کیا تھا معلوم کیا ۝ تب وہ بولا کہ کنعان ملعون ہو۔ وہ اپنے بھائیوں کے غلاموں کا غلام ہوگا ۝ پھر بولا خداوند سم کا خدا مبارک اور کنعان اس کا غلام ہوگا ۝ خدا یافت کو پھیلائے اور وہ سم کے ڈیروں میں رہے اور کنعان اس کا غلام ہو۔ (کتاب پیدائش $\frac{9}{20-27}$)

یہاں تین چیزیں قابلِ غور ہیں۔ اوّل حام کا قصور یہ بتایا گیا ہے کہ اس نے اپنے باپ کا ستر دیکھ لیا۔ لیکن اس کی سزا کا کچھ ذکر نہیں دوسرے یہ کہ قصور حام کا ہے لیکن لعنت اور پھٹکار کا سزاوار اس کا بیٹا قرار دیا جاتا ہے۔ اور تیسری (اور سب سے اہم) شق یہ کہ (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) خدا کے ایک برگزیدہ رسولؑ کو ایک ایسی ہیئت میں پیش کیا گیا ہے جس سے سعید فطرت کا تصور بھی کانپ اٹھے اس کے برعکس قرآن کریم نے حضرت نوحؑ کی جس مقدس سیرت کو پیش کیا ہے اس سے ان کی رفعت مرتبت اور علوِّ مدارج درخشندہ و تابناک صورت میں سامنے آجاتے ہیں۔ قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ حضرت نوحؑ خدا کے برگزیدہ بندے تھے۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىٓ اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ ($\frac{3}{33}$)

بلاشبہ (یہ واقعہ ہے کہ) اللہ نے آدم اور نوح کو اور ابراہیم اور عمران کے گھرانوں کو تمام دنیا میں برگزیدگی عطا فرمائی۔

وہ عبد شاکر تھے۔

ذُرِّيَّةَ مَنۡ حَمَلۡنَا مَعَ نُوۡحٍ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَبۡدًا شَكُوۡرًا ○ (۱۷/۳)

تم ان لوگوں کی نسل ہو جنہیں ہم نے (طوفان کی ہلاکت سے نجات دی تھی اور) نوحؑ کے ساتھ کشتی میں سوار کرایا تھا۔ اور وہ ہمارا ایسا بندہ تھا جس کی سعی و عمل حسن نتائج سے بھر پور ہوئے تھے۔

خدا کے مومنین کی جماعت میں سے تھے۔

وَلَقَدۡ نَادٰىنَا نُوۡحٌ فَلَنِعۡمَ الۡمُجِيۡبُوۡنَ ○ .... اِنَّهٗ مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ○

(۳۷/۷۵-۸۱)

اور یقیناً نوحؑ نے ہمیں پکارا۔ سو ہم کیسے اچھے پکار کا جواب دینے والے ہیں۔ اور ہم نے اسے اور اس کے پیروؤں کو کرب عظیم سے نجات دی۔ اور اس کی نسل کو باقی رہنے والوں میں رکھا۔ اور آنے والوں میں اس کا (نیک نام) باقی رکھا نوحؑ پر اقوام عالم میں سلام ہو۔ اس طرح ہم مخلص بندوں کو جزا دیا کرتے ہیں۔ وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔

وہ حضرت ابراہیمؑ کی طرح خدا کے رسول تھے۔

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا وَّ اِبۡرٰهِيۡمَ وَجَعَلۡنَا فِيۡ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالۡكِتٰبَ فَمِنۡهُمۡ مُّهۡتَدٍ ۚ وَكَثِيۡرٌ مِّنۡهُمۡ فٰسِقُوۡنَ ○ (۵۷/۲۶)

اور ہم نے نوحؑ اور ابراہیمؑ کو رسول بنا کر بھیجا۔ اور ان کی نسل میں نبوت اور کتاب کو جاری رکھا۔ سو ان (کی ذریت) میں سے ہدایت پر بھی ہیں اور اکثر ان میں سے فاسق ہیں۔

خدا نے ان کی پکار کو سنا اور اسے شرف قبولیت سے نوازا۔

وَنُوۡحًا اِذۡ نَادٰى مِنۡ قَبۡلُ فَاسۡتَجَبۡنَا لَهٗ فَنَجَّيۡنٰهُ وَاَهۡلَهٗ مِنَ الۡكَرۡبِ الۡعَظِيۡمِ ○ (۲۱/۷۶) و (۳۷/۷۵-۷۶)

اور (اسی طرح) نوحؑ کا معاملہ (بھی یاد کرو) جو ان (نبیوںؑ) سے پیشتر کا ہے، جب اس نے ہمیں پکارا تھا (تو دیکھو) ہم نے اس کی پکار سن لی اور اسے اور اس کے گھرانے کو ایک بڑی ہی سختی سے نجات دے دی۔

اور یہ اس لئے کہ آپ احکامات الٰہیہ کے سچے فرمانبردار، پیکر تسلیم و رضا اور مظہر اطاعت و انقیاد تھے۔ (۱۰/۷۲-۷۱)

مُسلم آیت (۱۰/۷۲) میں وَاُمِرۡتُ اَنۡ اَكُوۡنَ مِنَ الۡمُسۡلِمِيۡنَ کے ٹکڑے پر غور کیجئے۔ اس چھوٹے سے نگینے کے اندر بڑے بڑے حقائق جھلکتے نظر آئیں گے۔ سب سے پہلے یہ کہ مقام نبوت وہ مقام ہوتا ہے جہاں خدا

کے قوانین و احکام کی کامل اطاعت ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ قرآن کریم نے جس سب سے پہلے رسولؑ کا ذکر کیا ہے اس کا نام بھی مسلم قرار دیا ہے۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اس سلسلۂ زریں میں ہر مقام پر اللہ کے برگزیدہ بندے اسی گرامی نسبت خطاب سے پکارے جائیں گے کہ اسی میں تکمیل شرفِ انسانیت کا راز ہے۔ اور اس کے بعد یہ کہ جو پیغام حضرت نوحؑ سے شروع ہوا وہ بھی اسلام ہی تھا اور جس کی تکمیل حضورِ ختمی مرتبت کے عہد ہمایوں میں ہوئی وہ بھی اسلام ہی تھا۔ گویا سلسلۂ رسالت و نبوت کی داستانِ قدسی، اسلام اور امتِ مسلمہ کی ہی داستان ہے۔

لہٰذا، تورات کے بیان اور قرآن کے بیان میں جو فرق ہے وہ واضح ہے۔ بنا بریں یہ کہنا کہ قرآن میں مذکور واقعہ تورات سے اخذ کیا گیا ہے، جہالت پر مبنی ہے۔

یہ ہے تذکرہ حضرت نوحؑ کا جن کی ذریت میں تمام انبیائے امم سامیہ مبعوث ہوئے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ مِن ذُرِّيَّةِ آدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ (۱۹/۵۸)

یہ انبیاء ہیں سے وہ ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا۔ آدمؑ[له] کی نسل سے اور ان سے جنہیں ہم نے نوحؑ کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا تھا۔

یہی بنی اسرائیل کے مورثِ اعلیٰ تھے۔

ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ ۚ إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا ٥ (۱۷/۳)

تم (اے بنی اسرائیل) ان لوگوں کی نسل ہو جنہیں ہم نے (طوفان کی ہلاکت سے نجات دی تھی اور) نوحؑ کے ساتھ (کشتی میں) سوار کرایا تھا۔ وہ ایک عبد شکور تھا۔

تاریخ کے پارینہ اور منتشر اوراق اور اثری انکشافات کے منقوش خط و خال کا رخ اسی موسس اولیٰ کی طرف ہے۔ معلوم نہیں جب یہ تحقیقات اپنی تکمیل تک پہنچیں گی تو اس عہد کہن کے متعلق کیا کیا امور منصۂ شہود پر آئیں گے۔ سر دست اربابِ نظر کیلئے یہ حقیقت بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی کہ طوفان (DELUGE) کی داستانیں دنیا کی قریب قریب تمام اقوام کے ہاں پائی جاتی ہیں۔ بابل کے کھنڈرات میں آج سے قریب چار ہزار سال پیشتر کی ایک نظم ملی ہے جو ایک عظیم الشان طوفان کا ذکر

له آدم کا مفہوم مطالب الفرقان جلد دوم میں بیان ہو چکا ہے۔

کرتی ہے۔ یونان۔ ایران۔ ہندوستان۔ چین حتّٰی کہ امریکہ کے باشندوں کے ہاں، اساطیر الاولین میں طوفان کا تذکرہ موجود ہے۔ ہندوؤں کی پرانی کتابوں میں یہ قصّہ بڑے دلچسپ انداز میں مذکور ہے۔ ست پت برہمن میں ہے کہ ایک دن منوجی کے لئے غسل کا پانی لایا گیا تو اس میں سے ایک مچھلی ان کے ہاتھ میں آگئی۔ مچھلی نے کہا کہ اگر آپ آزادانہ طور پر میری پرورش کریں تو میں آپ کو ایک طوفانِ عظیم سے نجات دلا دوں گی۔ منوجی نے اس کی خواہش کے مطابق اسے آزاد کر کے سمندر تک پہنچا دیا۔ اور اس کی ہدایت کے بموجب ایک کشتی بنائی۔ جب طوفان آیا تو سمندر سے وہی مچھلی برآمد ہوئی اور منوجی نے اپنا جہاز اس کے سینگوں سے باندھ دیا۔ جو اسے شمالی پہاڑوں کی چوٹی پر لے گئی۔ بھگوت پران میں ہے کہ ایک دفعہ جب برہما (یعنی خدا) سو رہے تھے تو ایک دیو وید وں کو چرا کر لے گیا۔ ہری جی نے مچھلی کا بھیس بدل کر یہ راز ستیہ ورت کو بتا دیا جو پانیوں کا بادشاہ تھا۔ ہری جی اور اس دیو کی لڑائی ہوئی۔ اس میں ہری جی نے ایک عظیم الشان طوفان بلا انگیز برپا کر کے اس دیو کو شکست دی۔

اسی طرح باقی اقوام و ملل میں بھی طوفان کے قصّے افسانوں کے رنگ میں باقی رہ گئے ہیں۔ کیا معلوم آنیوالے انکشافات، ان مختلف ممالک و متنوع مقامات کے اندر پھیلے ہوئے قصّوں کی قدرِ مشترک کے متعلق کیا کچھ ظاہر کریں۔ بہرحال قرآن کریم میں جس طوفان کا قصّہ مذکور ہے اُسے ہم اوپر دیکھ چکے ہیں وہ ایک "پرانا قصّہ" نہیں۔ اقوام و ملل کی حیات و موت کی زندہ کہانی ہے جس کے آئینے میں تقدیر اُمم کے خطوط اُبھر کر سامنے آجاتے ہیں۔

جن افسانوں کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے ہمارے مناظر انہیں غیر مذاہب کے سامنے پیش کر کے ان کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ ایسا کرنے میں وہ بھول جاتے ہیں کہ خود ہمارے ہاں بھی اسی قسم کے افسانوں کی کمی نہیں۔ قرآن مجید میں کشتی حضرت نوحؑ کی کوئی تفصیل بیان نہیں ہوئی۔ لیکن ہمارے ہاں تفسیر ابن کثیر بڑی "قابلِ اعتماد" سمجھی جاتی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ "اس کشتی کے لئے ایک سو سال لکڑیاں کاٹ کر تختے بنانے میں لگ گئے۔ پھر ایک سو سال کے عرصہ میں یہ تیار ہوئی۔"

اُس کا طول اسی (۸۰) ہاتھ تھا اور عرض پچاس ہاتھ کا تھا۔ اندر باہر سے روغن کیا گیا تھا۔ پانی کاٹنے کے پر پرزے بھی تھے قتادہؓ کا قول ہے کہ لمبائی تین سو ہاتھ کی تھی۔ ابن عباسؓ کا فرمان ہے کہ طول بارہ سو ہاتھ کا تھا اور چوڑائی چھ سو ہاتھ کی تھی۔ کہا گیا ہے کہ طول دو ہزار ہاتھ اور چوڑائی ایک سو ہاتھ کی تھی واللہ اعلم۔ اس کی اندرونی اونچائی تیس ہاتھ کی تھی۔ اس میں تین درجے

تھے ہر درجہ دس ہاتھ اونچا تھا۔ سب سے نیچے کے حصے میں چوپائے اور جنگلی جانور تھے۔ درمیان کے حصے میں انسان تھے، اوپر کے حصے میں پرندے تھے۔ دروازہ چوڑان میں تھا اوپر سے بالکل بند تھی۔ ابن جریر نے ایک غریب اثر عبداللہ بن عباسؓ سے ذکر کیا ہے کہ حواریوں نے حضرت عیسیٰؑ بن مریم سے درخواست کی کہ اگر آپ بحکم خدا کسی ایسے مردے کو جلاتے جس نے کشتی نوحؑ دیکھی ہو تو ہمیں اس سے معلومات حاصل ہوتیں ـــــ آپ انہیں لے کر چلے، ایک ٹیلے پر پہنچکر وہاں کی مٹی اٹھائی اور فرمایا جانتے ہو یہ کون ہے؟ انہوں نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسول کو ہی علم ہے۔ آپؑ نے فرمایا۔ یہ پنڈلی ہے حام بن نوحؑ کی۔ پھر آپؑ نے اپنی لکڑی اس ٹیلے پر مار کر فرمایا۔ اللہ کے حکم سے اُٹھ کھڑا ہو۔ اُسی وقت ایک بڈھا سا آدمی اپنے سر سے مٹی جھاڑتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ آپؑ نے اس سے پوچھا کہ کیا تو بڑھاپے میں مرا تھا؟ اس نے کہا نہیں مرا تو جوانی میں تھا لیکن اب دل پر دہشت بیٹھی کہ قیامت قائم ہو گئی۔ اس دہشت نے بوڑھا کر دیا۔ آپ نے فرمایا۔ اچھا! حضرت نوحؑ کی کشتی کی بابت اپنی معلومات بیان کرو۔ اس نے کہا کہ وہ بارہ سو ہاتھ لمبی اور چھ سو ہاتھ چوڑی تھی۔ تین درجوں کی تھی۔ ایک میں جانور اور چوپائے تھے، دوسرے میں انسان، تیسرے میں پرند۔ جب جانوروں کا گوبر پھیل گیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کی طرف وحی بھیجی کہ ہاتھی کی دُم ہلاؤ۔ اس کے ہلاتے ہی اس سے خنزیر نر مادہ نکل آئے اور وہ میلا کھانے لگے۔ چوہوں نے جب اس کے تختے کترنے شروع کئے تو حکم ہوا کہ شیر کی پیشانی پہ انگلی لگا۔ اس سے بلّی کا جوڑا نکلا اور چوہوں کی طرف لپکا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سوال کیا کہ حضرت نوح علیہ السلام کو شہروں کے غرقاب ہونے کا علم کیسے ہو گیا؟ آپ نے فرمایا کہ انہوں نے کوّے کو خبر لینے کے لئے بھیجا لیکن وہ ایک لاش پر بیٹھ گیا دیر تک نہ آیا آپ نے اس کے لئے ہمیشہ ڈرتے رہنے کی بددعا کی۔ اس لئے وہ گھروں سے مانوس نہیں ہوتا۔ پھر آپ نے کبوتر کو بھیجا وہ اپنی چونچ میں زیتون کے درخت کا پتہ لے کر آیا اور اپنے پنجوں میں خشک مٹی لایا۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ شہر ڈوب چکے ہیں۔ آپ نے اس کی گردن میں خضرہ کا طوق ڈال دیا اور اس کے لئے امن وانس کی دعا کی۔ پس وہ گھروں میں رہتا سہتا ہے۔ حواریوں نے کہا کہ اے رسول اللہؑ! آپ انہیں ہمارے ہاں لے چلئے کہ ہم میں بیٹھ کر اور بھی باتیں ہمیں سنائیں۔ آپ نے فرمایا۔ یہ تمہارے ساتھ کیسے آسکتا ہے جبکہ اس کی روزی نہیں۔ پھر فرمایا اللہ کے حکم سے جیسا تھا ویسا ہی ہو جا وہ اسی وقت مٹی ہو گیا۔ (حوالہ۔ تفسیر ابن کثیر بارھواں پارہ۔ صـــ ۱)

کشتی میں جو مخلوق سوار ہوئی تھی، اس کے متعلق بھی تفصیل دی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

نوح علیہ السلام کو حکم خدا ہوا کہ اپنے ساتھ کشتی میں جاندار مخلوق کی ہر قسم کا ایک ایک جوڑا نر مادہ سوار کرلو۔ کہا گیا ہے کہ غیر جاندار کے لئے بھی یہی حکم تھا۔ جیسے نباتات ـــــ کہا گیا ہے کہ پرندوں میں سب سے پہلے درہ کشتی میں آیا اور سب

آخر گدھا سوار ہونے لگا۔ ابلیس اس کی دُم میں ٹنک گیا۔ جب اس کے دو اگلے پاؤں کشتی میں آ گئے اور اس نے اپنا پچھلا دھڑ اٹھانا چاہا تو نہ اُٹھ سکا کیونکہ دُم پر اس ملعون کا بوجھ تھا۔ حضرت نوحؑ جلدی کر رہے تھے۔ یہ بہتیرا چاہتا تھا مگر پچھلے پاؤں چڑھ نہیں سکتے تھے۔ آخر آپ نے فرمایا آجا گو تیرے ساتھ ابلیس بھی ہو۔ تب وہ چڑھ گیا اور ابلیس بھی اس کے ساتھ آیا۔ بعض سلف کہتے ہیں کہ شیر کو اپنے ساتھ لے جانا مشکل ہو پڑا۔ آخر اسے بخار چڑھ آیا تب اسے سوار کر لیا۔ ابن ابی حاتم کی حدیث میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام نے جب تمام مویشی اپنی کشتی میں سوار کر لئے تو لوگوں نے کہا شیر کی موجودگی میں یہ مویشی کیسے آرام سے رہ سکیں گے؟ پس اللہ تعالیٰ نے اس پر بخار ڈال دیا۔ اس سے پہلے زمین پر یہ بیماری نہ تھی۔ پھر لوگوں نے چوہے کی شکایت کی کہ یہ ہمارا کھانا اور دیگر سب چیزیں خراب کر رہے ہیں تو خدا کے حکم سے شیر کی چھینک میں سے ایک بلی نکلی جس سے چوہے دبک کر کونے کھدرے میں بیٹھ رہے۔ (ایضاً۔ ص۱۱)

یہ ہے اس تحقیق کا ماحصل جسے ہمارے مفسرین نے پیش کیا ہے۔ افسوس اس کا تو نہیں کہ انہوں نے اس قسم کی افسانہ تراشیاں کیوں کیں۔ رنج اور صدمہ اس بات کا ہے کہ یہ حضرات ان چیزوں کو منسوب کر دیتے ہیں حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی کی طرف۔ اس سے دنیا کی نگاہوں میں حضورؐ کا جس قسم کا تصور قائم ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔

سورۃ الاعراف میں جو ہمارے زیر نظر ہے آیات (۷ — ۵۹-۶۴) داستانِ قوم نوح سے متعلق ہیں۔ یہ داستان سابقہ صفحات میں سامنے آ چکی ہے۔ بایں ہمہ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ یہ آیات اور ان کا مفہوم بھی یہاں پیش کر دیا جائے تاکہ اس تفسیر میں تسلسل قائم رہے۔

(۷ — ۵۹) لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝

(خارجی کائنات پر غور و خوض کے بعد، تم تاریخی شواہد کی طرف آؤ اور دیکھو کہ خود عالم انسانیت میں ہمارا یہی قانون کس طرح کارفرما چلا آ رہا ہے)۔

ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف (یہی قانون دے کر) بھیجا۔ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم خدا کے قانون کی محکومی اختیار کرو۔ اس کے سوا کوئی ایسی قوت نہیں جس کی محکومیت اختیار کی جائے۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا (اور اپنی موجودہ

روش پر قائم رہے) تو مجھے نظر آتا ہے کہ تم پر سخت تباہی آجائے گی۔

۷/۶۰ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝

جب اُس کی قوم کے اُن سرداروں نے جن کے ہاں فراوانی تھی، اس بات کو سُنا تو انہوں نے کہا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ تم عجیب اُلٹے راستے پر چل رہے ہو (ہمیں اس روش پر چلنے سے اس قدر مال و دولت اور قوّت و اقتدار حاصل ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ اس سے ہم پر تباہی آجائے گی!)۔

۷/۶۱ قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ ضَلٰلَةٌ وَّ لٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

نوحؑ نے کہا کہ میں، نہ خود غلط راستے پر ہوں، نہ ہی تمہیں غلط راستے کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ میں اُس خدا کی طرف سے پیغامبر ہوں جو تمام کائنات کا نشو و نما دینے والا ہے۔ (تمہیں یہ پیغام اس لئے انوکھا سا نظر آتا ہے کہ تم صرف اپنی نشو و نما کی فکر کرتے ہو اور خدا کا قانون، عالمگیر انسانیت کی نشو و نما کا ذمہ دار ہے)۔

۷/۶۲ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَ اَنْصَحُ لَكُمْ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

یہ وہ پیغامات ہیں جو تمہیں اپنے رب کی طرف سے تم تک پہنچا رہا ہوں۔ میں تمہارا خیر خواہ ہوں، بدخواہ نہیں ہوں میں تمہارے چاکِ گریبان کی رفوگری کرنا چاہتا ہوں اور خدا کے عطا کردہ علم کی بنا پر تم سے وہ کچھ کہتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ (تم یہی سمجھے بیٹھے ہو کہ تمہاری روش، فلاح و کامرانی کی راہ ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ یہ تباہی اور بربادی کی طرف لے جانے والا راستہ ہے)۔

۷/۶۳ اَوَ عَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰی رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِیُنْذِرَكُمْ
وَ لِتَتَّقُوْا وَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝

تمہیں اس بات پر تعجب ہو رہا ہے کہ خدا اپنے پیغام کو تم تک ایک ایسے آدمی کے ذریعے کیوں پہنچا رہا ہے جو تم میں سے ہی ہے، اور تمہارے جیسا ہی ہے: تاکہ وہ تمہیں اس کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرے، اور تم تباہیوں سے بچ جاؤ، اور تمہاری نشو و نما کا سامان بہم پہنچ جائے۔ (تمہارے ذہن میں یہ ہے کہ خدا کے پیغامبر کو عجیب الخلقت سا ہونا چاہیئے!)

۷/۶۴ فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَیْنٰهُ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗ فِی الْفُلْكِ وَ اَغْرَقْنَا الَّذِیْنَ
كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِیْنَ ۝۠

غرضیکہ نوحؑ نے انہیں ہر ممکن طریق سے سمجھایا لیکن انہوں نے نوحؑ کی ہر بات کو جھٹلایا۔ آخر الامر ہم نے اُسے، اور

اس کے ساتھیوں کو کشتی میں سوار کر کے بچا لیا، اور جن لوگوں نے ہمارے قوانین کو جھٹلایا تھا، انہیں غرق کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ عقل و خرد کو کھو کر بالکل اندھے ہو گئے تھے۔ (ورنہ نوحؑ ان کے سامنے کشتی بنا رہا تھا اور آنیوالے سیلاب سے انہیں آگاہ کر رہا تھا۔ وہ ذرا بھی عقل و فکر سے کام لیتے تو اس کی بات ان کی سمجھ میں آجاتی)۔

اس کے بعد آیات (۷/ ۶۵-۷۲) میں قوم عاد کی داستان ہے جس کی طرف حضرت ھودؑ مبعوث ہوئے تھے۔ اس داستان کو بھی ہم اسی انداز اور ترتیب سے پیش کرتے ہیں جسطرح داستان قوم نوحؑ پیش کی جا چکی ہے۔ یعنی قرآن کریم میں جہاں جہاں اس کا ذکر آیا ہے ان تمام مقامات کو مسلسل سامنے لایا جائے۔

قوم عاد ——— حضرت ھودؑ

جیسا کہ سابقہ عنوان میں لکھا جا چکا ہے۔ تورات کی رُو سے اقوام عالم کی تقسیم حضرت نوحؑ کے تین بیٹوں (یافث، حام اور سام) کی نسل کے اعتبار سے کی جاتی ہے۔ تورات کی اس تقسیم کی تاریخی حیثیت کچھ ہی ہو، لیکن تحقیقات جدیدہ اس نتیجہ تک ضرور پہنچ چکی ہیں کہ عرب اور اس کے گرد و پیش (شام عراق وغیرہ میں) اُممِ سامیہ پھیلی ہوئی تھیں۔ ان میں سب سے اہم اور مقتدر قبیلہ عاؔد کا تھا۔ قبیلہ کیا! یہ تو ایک عظیم الشان قوم تھی جو ایک طرف حضر موت اور یمن کے علاقے سے شروع ہو کر خلیج فارس کے ساتھ ساتھ عراق تک جا پہنچی تھی۔ اور دوسری طرف عرب سے نکل کر مصر اور شام پر حکمران تھی۔ قریب دو اڑھائی ہزار سال [ق۔م] تک ان تمام علاقوں پر اسی قوم کا تسلّط و اقتدار نظر آتا ہے۔ سامؔ کے بیٹے اؔرم کی نسبت سے انہیں عاد ارم بھی کہا جاتا ہے۔ جب دو اڑھائی ہزار سال (ق۔م) اس قوم کا ستارۂ اقبال اوج پر تھا تو اس زمانہ میں قوموں کے عروج و زوال کی رفتار کے اعتبار سے سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کی ابتدا کب سے ہوئی ہوگی؟ یوں سمجھیئے کہ قوم نوحؑ کی بربادی کے بعد جب یہ علاقہ دوبارہ آباد ہوا ہے تو بنی سام کی پہلی ترقی اسی قوم عاد سے ہوئی ہے۔ یہی قوم عاد ہے جس کی طرف حضرت **ھودؑ** مبعوث ہوئے۔ ان کا مقام بعثت و تبلیغ احقاف کا علاقہ تھا۔ احقاف صحرا کو کہتے ہیں۔ جزیرہ نمائے عرب کا وہ طویل و عریض ریگستان جسے اب رُبع خالی کہا جاتا ہے، احقاف کا علاقہ تھا۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں کوہ تمثال ریت کے ٹیلے، خوف و دہشت کے بھیانک عفاریت کی طرح سر اٹھائے کھڑے رہتے ہیں۔ لیکن جب وہاں آندھی کا طوفان آتا ہے تو یہ ٹیلے ایک مقام سے اُڑ کر دوسرے مقام پہ جا مسلط ہوتے ہیں اور جو کچھ وہاں موجود ہو اُسے اس طرح نیچے دبا لیتے

ہیں کہ پھر محکمۂ آثارِ قدیمہ والے ہی اُن کا سراغ لگائیں تو کچھ پتہ چلے۔ کیا معلوم ان ٹیلوں کے نیچے کتنی آبادیاں، قبرستانوں میں منتقل ہو چکی ہیں۔ کم از کم ایک کا ذکر تو سُن لیجئے۔ یہ شوریدہ بخت قوم وہ ہے جس نے حضرت ہودؑ کی دعوت کی تکذیب کی اور پھر جس کے فقط افسانے دنیا میں باقی رہ گئے۔ اِلّا اُن کے جو حضرت ہودؑ کے ساتھ بچا لئے گئے اور جو پھر عادِ ثانیہ کہلائے۔ کیونکہ عادِ اولیٰ وہ تھے جو اپنی غلط روش زندگی کی وجہ سے تباہ ہو گئے تھے۔

قومِ نوحؑ کی جانشین قرآن کریم میں ہے کہ حضرت نوحؑ کی قوم کے بعد قومِ عاد کو ان کا جانشین بنایا گیا۔ اور انہیں دُنیا میں بڑا اقتدار و تسلط اور وسعت و قوت عطا فرمائی۔

۷/۶۹ وَاذْكُرُوٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ زَادَكُمْ فِى الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

تم سوچو کہ قومِ نوحؑ کیوں تباہ ہوئی؟ اس لئے کہ اُس نے غلط روش اختیار کر رکھی تھی۔ اس کے بعد خدا نے تمہیں ان کا جانشین بنایا۔ تمہیں بڑی قوتیں اور فراخیاں عطا کیں۔ تم خدا کی ان قوتوں اور نعمتوں کو پیشِ نظر رکھو (اور اس کے قوانین کی خلاف ورزی مت کرو) تاکہ تم کامیاب ہو۔

فارغ البال و مرفہ الحال آب پاشی و سیرابی کے لئے قدم قدم پر چشمے اور پھلوں سے لدے ہوئے باغات افراد اور مواشی کی کثرت۔ یہی کچھ اُس زمانہ میں قوت و سطوت کے حصول و استحکام کے ذرائع تھے۔ حضرت ہودؑ نے انہیں قوانینِ الٰہیہ کی دعوت دیتے ہوئے انہی انعاماتِ خداوندی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

وَاتَّقُوا الَّذِىٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ۚ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّ بَنِيْنَ ۙ وَجَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ۝ (۲۶/۱۳۲-۱۳۴)۔

تم اُس خدا کے قوانین کی نگہداشت کرو جس نے، جیسا کہ تم خود جانتے ہو، تمہیں سامانِ زیست کی اس قدر فراوانیاں عطا کر رکھی ہیں۔

مال مویشی کی کثرت۔ قبیلے کے افراد کی بہتات۔ لہلہاتے باغات۔ ان کی سیرابی کے لئے آبِ رواں کے چشمے۔ (یہ سب خدا نے دے رکھے ہیں۔ ان میں کوئی چیز ایسی نہیں جو بنیادی طور پر تمہاری پیدا کردہ ہو۔ لیکن تم اس سامانِ زیست سے حاصل کردہ قوت کو، دوسروں پر ظلم و استبداد کے لئے استعمال کرتے ہو۔ (۲۶/۱۳۰)۔

وہ ایسے ایسے محکم قلعے اور سنگین حصار بناتے تھے گویا انہیں اس سرزمین پر ہمیشہ کے لئے حکومت کرنی ہے۔

وَ تَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ۝ (۲۶/۱۲۹)

اور تم طرح طرح کے سازوسامان (اور اسلحہ وغیرہ) بناتے رہتے ہو (اس لئے نہیں کہ اس سے ظلم کی روک تھام کرو، بلکہ) اس لئے کہ کمزوروں پر تمہارے آہنی پنجے کی گرفت ڈھیلی نہ ہونے پائے اور تمہارا غلبہ واقتدار اور جوروا ستبداد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قائم رہے۔

ستونوں والے

اسی بناء پر قرآنِ کریم نے انہیں "ستونوں والے" کہا ہے۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ الَّتِیْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِی الْبِلَادِ ۝ (۸۹/۶-۸)

(ان لوگوں کا انجام بھی ویسا ہی ہونے والا ہے، جیسا انجام، انہی جیسی اقوامِ سابقہ کا ہوا تھا مثلاً) قومِ عاد کا جوارم کی اولاد میں سے تھے۔ انہیں قابلِ اعتماد سامانِ زیست بڑی فراوانی سے حاصل تھا۔ (۲۶/۱۳۲-۱۳۴)۔ وہ بڑی عمارات بنانے اور بلند یادگاریں تعمیر کرتے تھے (۲۶/۱۲۸)۔ انہیں، اپنی ہم عصر اقوام میں، بے نظیر مقام حاصل تھا۔ جیسا کہ دنیا کی بڑی بڑی صاحبِ قوت وسطوت اقوام کا شیوہ ہوتا ہے، وہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر اپنی یادگاریں قائم کرتے تھے۔ اس قسم کی یادگاروں کی افادی حیثیت کچھ نہیں ہوتی۔ یہ محض اس قوم کے جذبۂ تکبّر وتعلّی کی تسکین کا سامان فراہم کرتی ہیں قرآنِ کریم کے الفاظ میں، حضرت ہودؑ نے ان سے کہا کہ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ۝ (۲۶/۱۲۸) "تم پہاڑوں کی چوٹیوں پر ایسی عمارات بطور یادگار بناتے ہو جن کا کوئی مصرف نہیں"۔

علم وبصیرت بھی

غرضیکہ انہیں ایسا تمکن عطا ہوا تھا کہ شاید ہی کسی اور کے حصہ میں آیا ہو اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ یہ تمام قوّت وحشمت، جہالت کو لئے ہوئے نہ تھی۔ بلکہ انہیں ذرائع علم (سماعت و بصارت قلب) بھی عطا ہوئے تھے۔

وَ لَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَاۤ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْئِدَةً ۖ (۴۶/۲۶)

(اور، وہ کوئی ایسی ویسی قوم نہیں تھی) جس قدر جاہ وجلال اور غلبہ واقتدار انہیں حاصل تھا، ویسا تمہیں بھی حاصل نہیں۔ نیز، وہ غیر مہذب اور وحشی قوم بھی نہیں تھی۔ انہیں علم ودانش کے تمام ذرائع —— سماعت، بصارت اور قلب —— حاصل تھے۔

قرآنِ کریم نے سمع و بصر کے الفاظ اس علم کے لئے استعمال کئے ہیں جو مظاہرِ فطرت پر غور و تدبّر کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ یعنی (PERCEPTUAL KNOWLEDGE) جو حواس کے ذریعے مشاہدات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ سمع و بصر، حواس کے ترجمان ہیں اور ان کے ساتھ تیسرا لفظ افئدۃ ہے۔ اس کے معنی (MIND) کے ہیں یعنی مشاہداتِ فطرت سے معلومات حاصل کر لینے کے بعد، قلب اور دماغ کے ذریعے استنباطِ نتائج کرنا۔ اسی قسم کا علم تھا جو قوم عاد کو حاصل تھا یہ سب کچھ تھا لیکن اس علم کے ماحصل (دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ سائنس کی ایجادات وغیرہ) کو قوانین خداوندی کے مطابق صرف نہیں کیا جاتا تھا۔ قوانینِ خداوندی کا تقاضا ہے کہ علم کے ماحصل کو نوعِ انسانی کی منفعت کے لئے صرف کیا جائے لیکن جو قومیں غلط روشِ زندگی پر چلتی ہیں وہ ان قوتوں کو باقی انسانوں کی غلامی کا ذریعہ بنا لیتی ہیں اور ان کی محنت کی کمائی کے سلب و نہب (EXPLOITATION) کو اپنی کاریگری قرار دے لیتی ہیں۔ یہی کچھ قوم عاد کرتی تھی۔ چنانچہ قرآن میں ہے کہ ہر مستبد قوم کی طرح ان کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ جن قوموں پر ہاتھ ڈالا، آہنی شکنجے میں جکڑ لیا کہ ان کی غلامی کے جال کا کوئی حلقہ ڈھیلا نہ ہونے پائے۔

وَ اِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِیْنَ ۚ (۲۶/۱۳۰)

اور تم، کمزوروں پر اپنے آہنی پنجے کی گرفت ڈھیلی نہیں ہونے دیتے تاکہ تمہارا غلبہ و اقتدار اور جور و استبداد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قائم رہے۔

تکذیبِ رُسُلؑ

اللہ تعالیٰ نے اپنے قانونِ ہدایت کے مطابق رسولؑ بھیجے لیکن نشۂ حکومت و قوت میں بدمست قومیں پیغاماتِ خداوندی پر کان کب دھرتی ہیں؟ انہوں نے ان رسولوںؑ کی تکذیب کی اور اپنے ظلم و استبداد میں بڑھتے چلے گئے۔

كَذَّبَتْ عَادُ ۨالْمُرْسَلِیْنَ ۚ (۲۶/۱۲۳)

قوم عاد نے بہت سے رسولوں کو جھٹلایا۔

قوانینِ خداوندی سے بغاوت، اور اپنے سرکش و جابر اربابِ حکومت کا اتباع۔ یہ تھا شیوہ اس قوم کا۔

وَ تِلْكَ عَادٌ جَحَدُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ وَ عَصَوْا رُسُلَهٗ وَ اتَّبَعُوْۤا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ ۝ (۱۱/۵۹)

یہ ہے سرگزشت قوم عاد کی، جس نے اپنے پروردگار کے قوانین سے انکار کیا اور اس کے رسولوںؑ (کی دعوت) سے سرکشی برتی، اور اس کے برعکس اپنے ان سرکش اور مستبد حکام کی اطاعت کرتے رہے جو جان بوجھ کر حق کی مخالفت کرتے تھے۔

حضرت ہودؑ بالآخر جب جور و استبداد اور سرکشی و عصیان کی انتہا ہوگئی اور سنت اللہ (قانون مکافات) مطابق ان کی غلط روش زندگی کے ظہور نتائج کا وقت قریب آپہنچا تو آخری کوشش کے طور پر اُن کی طرف اُنہی میں سے ایک رسول (حضرت ہودؑ) کو بھیجا گیا۔

۷/۶۵ وَ اِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ (۷/۶۵) نیز (۱۱/۵۰ ؛ ۲۶/۱۲۴ ؛ ۴۶/۲۱)۔

اسی طرح، ہم نے قوم عاد کی طرف، ان کے بھائی بندوں میں سے ہودؑ کو بھیجا۔ اس نے بھی اپنی قوم سے یہی کہا کہ تم قوانین خداوندی کی اطاعت کرو۔ اس کے سوا کوئی قوت ایسی نہیں جس کی محکومیت اختیار کی جائے۔ کیا تم غلط روش کی تباہ کاریوں سے بچنا نہیں چاہتے؟ (نیز ۱۱/۵۰ ؛ ۲۶/۱۲۴ ؛ ۴۶/۲۱)

خدا کی حکمرانی کی طرف دعوت آپ آئے اور اس سرکش و متمرد قوم کو اسی پیغام ازلی کی دعوت دی جو ہدایت آسمانی کی اصل و اساس ہے یعنی کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ حکومت کی سزاوار فقط ایک ذات باری تعالیٰ ہے۔ (۷/۶۵ ؛ ۱۱/۵۰ ؛ ۴۶/۲۱)۔

قوانینِ الٰہیہ اور دنیاوی برکات قوم کو قوت و سطوت حاصل تھی۔ انہوں نے سمجھا کہ ہدایت آسمانی کے اتباع سے مفہوم یہ ہوگا کہ ہم حکومت و دولت کو چھوڑ کر دنیا تیاگ دیں اور زاویوں اور خانقاہوں یا پہاڑوں اور جنگلوں میں جا کر رہبانیت کی زندگی بسر کرنے لگ جائیں۔ لیکن حضرت ہودؑ نے اس باب میں ایک ایسی حقیقت کو واضح کر دیا جو اتباع قوانین الٰہیہ کا فطری نتیجہ ہے۔ آپ نے فرمایا۔

وَ یٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا
وَّ یَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰی قُوَّتِكُمْ وَ لَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِیْنَ ۝ (۱۱/۵۲)

میں تم سے کہتا ہوں کہ تم اپنی غلط روش کی وجہ سے، آنے والی تباہی سے بچنے کے لئے قوانین خداوندی سے حفاظت طلب کرو۔ اور اپنے باطل عقائد چھوڑ کر، اس کی طرف لوٹ آؤ۔ تم اس کی شان ربوبیت کو نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح تمہاری خشک زمینوں کو بارش سے سیراب کرتا ہے جس سے تمہاری قوتیں دن بدن بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ تم اُس کے قوانین کی اطاعت کر کے اپنی شکر گزاری کا ثبوت دو۔ نہ یہ کہ اُلٹا ظلم و ستم پر اُتر آؤ اور مجرمین کی طرح اُس کے قوانین سے منہ موڑ لو۔

یہ ہے عظیم فرق آسمانی ہدایت اور ذہنِ انسانی کے پیدا کردہ تصورِ مذہبیت میں۔ ذہنِ انسانی نے سمجھ یہ رکھا ہے کہ

دین اور دنیا دو الگ الگ شعبے ہیں اور دونوں یک جا نہیں ہو سکتے۔ دُنیا سے مراد ہے قوّت و سطوت۔ دولت و حشمت، حکومت و سلطنت کی زندگی اور دینداری سے مفہوم ہے بے کسی و بے چارگی۔ عاجزی و ناتوانی، مفلسی و ناداری کی زندگی یعنی وہ زندگی جس میں دنیا اور اس کی خوشگواریوں سے نفرت کی جائے اور ترکِ لذائذ سے "پرہیزگاری" کو مقصدِ حیات قرار دیا جائے لیکن یہ تصوّر یکسر غیر اسلامی ہے۔ اسلام میں دین کا تصوّر یہ ہے کہ سرکش و متمرّد انسانوں سے قوّت و حکومت اور رزق کے سرچشمے چھین کر جماعتِ مومنین (حزب اللہ) کے ہاتھ میں دیدیئے جائیں جو اپنی مرضی کے مطابق اس کا استعمال نہ کرے بلکہ قوانینِ خداوندی کے تحت نظم و ضبطِ عالم کو ترتیب دے اور تمام نعمائے دنیا کو نوعِ انسانی کی پرورش اور ان کی صلاحیتوں کی

نظامِ حکومتِ خداوندی کی عملی تشکیل

نشو و نما کے لئے عام کر دے (اس کی تفصیل سابقہ جلدوں میں بیان کی جا چکی ہے) حضرت ہودؑ نے یہی فرمایا کہ میں جس تعلیم کی طرف دعوت دیتا ہوں اُس کا نتیجہ کمزوری اور ناداری نہیں، بلکہ اس سے تمہاری قوتیں اور بڑھ جائیں گی۔ فقط نظامِ معاشرہ میں ایسی تبدیلی ہو جائے گی جس سے ایک انسان دوسرے انسان کی غلامی سے آزاد ہو جائے۔ اس نظام کی عملی تشکیل یوں ہو گی کہ:

اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ۝ (۲۶/۱۲۵-۱۲۶ ؛ ۲۶/۱۳۱)

میں تمہاری طرف، خدا کے ہاں سے، امن و سلامتی کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ لہذا، تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرنے کے لئے، میری اطاعت کرو۔ (نیز ۲۶/۱۳۱)

غور کیجئے۔ منصبِ رسالت کی صحیح حقیقت کس طرح واضح طور پر سامنے آگئی ہے۔ اللہ کی حفاظت میں آجاؤ۔ اس کے قوانین کا اتباع کرو۔ اپنی اپنی جگہ، الگ الگ نہیں۔ بلکہ اس حکومتِ خداوندی کے مرکزِ اولیں (یعنی رسول) کی اطاعت کرو۔ اس اطاعت میں، میں تم سے اپنے لئے کچھ نہیں چاہتا۔

وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (۲۶/۱۲۷ ؛ ۱۱/۵۱)

یہ بھی سن لو کہ میں، اس کے بدلے میں، تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔ میرا معاوضہ مجھے خدا کی ربوبیتِ عالمینی کی طرف سے مل جائے گا۔ (نیز ۱۱/۵۱)

تکذیب۔ اربابِ اقتدار کی طرف سے

یہ تھا وہ معاشرہ جس کی طرف حضرت ہودؑ نے قوم کو دعوت دی۔ لیکن جابر و مستبد انسان جن کے منہ کو انسانوں کا خون لگ گیا ہو، بھلا کسطرح اس نظام کو قبول کریں؟ اسکی سب سے پہلی تکذیب حسبِ معمول۔ قوم کے سرداروں کی طرف سے ہوئی۔ انہی سرداروں کی طرف سے

جن کے گھروں میں "برتن بھرے ہوئے تھے"۔

۷/۶۶ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّ اِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝

(قوم نوحؑ کی طرح) اُس کی قوم کے بڑے بڑے سرغنوں نے جنہیں مال و دولت کی فراوانی حاصل تھی اور جو اس دعوت کی مخالفت کرتے تھے، کہا کہ ہمیں تو ایسا نظر آتا ہے کہ تم عقل اور ہوش کھو بیٹھے ہو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ تم جو کہتے ہو کہ ہماری روش ہمیں تباہیوں کی طرف لے جائے گی، اور یہ پیغام تمہیں خدا کی طرف سے ملا ہے، یہ جھوٹ ہے۔

۷/۶۷-۶۹ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ۝ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ؕ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

ہودؑ نے ان سے کہا کہ میں عقل و ہوش نہیں کھو بیٹھا۔ (میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، ٹھیک کہہ رہا ہوں) میں اُس خدا کی طرف سے پیغامبر ہوں جو تمام کائنات اور عالمگیر انسانیت کا نشوونما دینے والا ہے۔ (چونکہ یہ تصور تمہاری انفرادی مفاد پرستیوں کے خلاف جاتا ہے، اس لئے تم اس کی مخالفت کرتے ہو)۔

میں تمہاری طرف، اپنے نشوونما دینے والے کے پیغامات پہنچاتا ہوں۔ میں تمہارا خیرخواہ ہوں مجھ پر بھروسہ کرو۔ میں تم کو امن و سلامتی کی راہ دکھا رہا ہوں۔

کیا تمہیں اس بات پر اچنبھا ہو رہا ہے کہ خدا نے تمہاری طرف، اپنا قانونِ ہدایت، ایک ایسے انسان کے ذریعے کیوں بھیجا جو تمہارے جیسا ہے، اور تم میں سے ہی ایک ہے تاکہ وہ تمہیں اس کی خلاف ورزی کے تباہ کُن نتائج سے آگاہ کرے؟ (تم سمجھتے تھے کہ خدا کا پیغامبر کوئی عجیب الخلقت انسان ہونا چاہیئے!) تم سوچو کہ قوم نوحؑ کیوں تباہ ہوئی؟ اسی لئے کہ اس نے غلط روش اختیار کر رکھی تھی۔ اس کے بعد خدا نے تمہیں اُن کا جانشین بنایا۔ تمہیں بڑی قوتیں اور فراخیاں عطا کیں۔ تم خدا کی ان قوتوں اور نعمتوں کو پیشِ نظر رکھو اور اُس کے قوانین کی خلاف ورزی مت کرو، تاکہ تم کامیاب ہو۔

ان آیاتِ جلیلہ میں دو تین باتیں خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ پہلے تو یہ کہ نشۂ حکومت و دولت میں سرمست انسان، دعوتِ الی الحق کو کس طرح نفرت و استہزاء سے ٹھکراتا ہے؟ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ اور لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ پر غور کیجئے۔ تمرّد و سرکشی کی بدمستیاں کس طرح جھلکتی ہوئی نظر آرہی ہیں۔ اس کے برعکس جواب دیکھئے! کس قدر متانت اور سنجیدگی کا مظہر ہے۔ شکن بجبیں نہیں۔ کف بدہاں نہیں۔ نعل برآتش نہیں۔ گالی کا جواب (معاذ اللہ) گالی نہیں۔ کوئی اوچھاپن نہیں۔ سفاہت نہیں۔ اپنے مقام بزرگ و بلند پر پہاڑ کی طرح محکم کھڑے ہیں۔ اس لئے کہ اپنی دعوت کی صداقت پر غیر متزلزل یقین ہے۔

محکم چوں کوہسار

قرآنِ کریم نے حضرات انبیاء کرام ؑ کی مخالفت کا اکثر و بیشتر ذکر کیا ہے۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ قومِ مخالف کے جدال و قتال کی بہ نسبت ان کی طرف سے تکذیب و استہزا کا ذکر بڑا نمایاں طور پر کیا گیا ہے۔ جدال و قتال بھی اپنے مقام پر آزمائش کی گھاٹیاں ہیں۔ لیکن ایک داعی و مصلح کی راہ میں تکذیب و تحقیر کی منزل بڑی سخت ہوتی ہے۔ عام انسانوں پر نگاہ ڈالیئے۔ وہ بالعموم بڑی بڑی کٹھن مشکلات کا سامنا کرلیں گے لیکن جونہی اُن پر کسی نے تنقید (CRITICISM) کی یا اُن کا استہزاء (RIDICULE) کیا۔ ان کی بات کو جھوٹا بتایا۔ ان کی دعوت کا مذاق اڑایا تو وہ فوراً آپے سے باہر ہو گئے۔ اور اس کے بعد ایسی چوکڑی بھولے کہ حصولِ مقصد و نصب العین کے لئے تگ و تاز کے بجائے، اسی تنقید و تنقیص کی خار دار جھاڑیوں میں الجھ کر رہ گئے۔ استہزاء و تنقیص کے مرحلہ میں دامن ضبط و استقامت کو ہاتھ سے نہ جانے دینا، فی الواقعہ من عزم الامور ہے اور آسمانی انقلابِ ربوبیت کی طرف دعوت دینے والوں کی یہ ایک اہم خصوصیت ہے۔ سردارانِ قوم کی اشتعال انگیز تنقیص پر نگہ ڈالئے اور اس کے بعد حضرت ہود ؑ کے متین و سنجیدہ جواب پر ___ حقیقت واضح ہو جائے گی۔

دوسری چیز، وہی ذہنِ انسانی کی اعجوبہ پسندی! یعنی قوم کو حیرت و استعجاب اس امر پر ہے کہ اُنہی جیسا ایک انسان (رَجُلٌ مِّنْكُمْ) اور دعوائے رسالت! قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (۱۴/۱۰) (انہوں نے کہا کہ تم تو ہمارے ہی جیسے ایک انسان ہو) اور کوئی فوق الفطرت نشانی بھی تمہارے پاس نہیں۔ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ (۱۱/۵۳)۔ اس لئے

مَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ○ (۱۱/۵۳)

تم نے اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی ایسی دلیل پیش نہیں کی جسے ہم واقعی محکم دلیل سمجھیں۔ ہم اپنے معبودوں کو محض تمہارے کہنے کی وجہ سے نہیں چھوڑ سکتے۔ اس لئے ہم تمہاری بات نہیں مانیں گے۔

اس کے بعد اس سے ایک قدم اور آگے بڑھے اور کہا کہ تم جو (معاذ اللہ) اس قسم کی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو تو اس کی وجہ ہماری سمجھ

ہیں سوائے اس کے اور کچھ نہیں آتی کہ تم نے جو ہمارے دیوی دیوتاؤں کی اہانت کی ہے تو تم پر ان میں سے کسی کی مار پڑ گئی ہے۔

اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ (۱۱/۵۴)

ہمیں کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ (تم نے جو ہمارے معبودوں کی گستاخی کی ہے تو) تم پر، ان میں سے کسی کی مار پڑ گئی ہے (جو تم اس قسم کی بہکی بہکی باتیں کرنے لگ گئے ہو۔ ورنہ اس سے پہلے تم اچھے بھلے تھے)

یہ جگر سوز طعن و تشنیع دیکھئے اور پیغمبرانہ جواب ملاحظہ فرمائیے کہ:

قَالَ اِنِّیْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ (۱۱/۵۴)

اس کے جواب میں ہودؑ نے صرف اتنا کہا ——— اور اس قسم کی ذہنیت رکھنے والوں سے اور کہا بھی کیا جاتا! ——— کہ میں اس پر خدا کو گواہ ٹھہراتا ہوں، اور تم بھی گواہ رہنا کہ تم غیر اللہ میں سے جس جس کو اس کا شریک قرار دیتے ہو، میں ان سے یکسر بیزار ہوں۔

اسلاف پرستی

یہاں تک تو نشۂ قوت و دولت کی سرمستیوں کے مظاہرے تھے۔ اب دنیائے معتقدات اور اس کی جذبات پرستی کی طرف آئیے! یعنی وہی ساز کہن کہ چونکہ تمہاری دعوت اس مسلک کے خلاف ہے جو ہم میں آباؤ اجداد سے متوارث چلا آرہا ہے اس لئے ہم اس کی تکذیب کرتے ہیں! وہی اسلاف پرستی اور وہی قدامت پسندی۔

(۷/۷) قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ؕ

انہوں نے کہا کہ کیا تم ہمیں یہ کہنے کے لئے آئے ہو کہ جن ہستیوں اور قوتوں کو ہمارے آباؤ اجداد اپنا معبود مانتے چلے آئے ہیں، ہم انہیں چھوڑ دیں اور صرف ایک خدا کی محکومیت اختیار کر لیں؟

اسلاف پرستی اور کورانہ تقلید کے اس ادعا کے جواب میں حضرت ہودؑ نے جو کچھ ارشاد فرمایا، اس میں ارباب فکر و نظر کے لئے حکم و بصائر اور معارف و حقائق کی ہزار داستانیں مستور ہیں۔ فرمایا۔

(۷/۷۱) اَتُجَادِلُوْنَنِیْ فِیْٓ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ

وہ قوتیں جنہیں تمہارے اسلاف نے اپنا معبود بنا رکھا تھا، ان کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ چند اصطلاحی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے اسلاف نے وضع کر رکھے ہیں۔ خدا کی طرف سے ان کے اقتدار و اختیار کی کوئی سند

تمہارے پاس نہیں۔ اُس نے ان کی معبودیت کی کوئی سند نازل ہی نہیں کی (۵۳/۲۳) ؛ (۱۲/۴۰)۔

تبیانِ حقیقت

اس چھوٹے سے ٹکڑے پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ کتنی عظیم حقیقت اس کے اندر منعکس ہے۔ یہ روایتی عظمت اور موروثی تقدیس کیا ہے؟ فقط اس قدر کہ ابتداً میں جہالت اور توہم پرستی سے کوئی عقیدہ قائم ہو گیا جس کا کچھ نام رکھ لیا گیا۔ جب وہ دو چار نسلیں متوارث چلا آیا، تو اُس کی کہنگی، وجہ تقدس ہو گئی اور وہ نام، دل کی گہرائیوں میں اس طرح جاگزیں ہو گیا کہ عقل و بصیرت کی کوئی دلیل اسے اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتی۔ ایک پتھر، پہاڑ کے کسی گوشے میں پڑا ہے، تو فقط پتھر ہے۔ لیکن اُسے کسی چبوترہ پر الگ نصب کر کے اس کا کچھ نام رکھ دیجئے۔ اس نام کی ترویج دو تین نسلوں تک مسلسل ہو جائے تو پھر دیکھئے کہ یہ پتھر کیا سے کیا بن جاتا ہے؟ اس کی روایتی عظمت دلوں میں اس طرح نقش ہو جاتی ہے کہ اس کے تحفظ کے لئے انسانی خون کی بھی کوئی قیمت نہیں سمجھی جاتی! اور اس طرح وہی پتھر جو "گمنامی" کے گوشے میں پڑا تھا، قلوب و نگاہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ حالانکہ چشمِ حقیقت بیں کے نزدیک محض نام رکھ دینے سے اس کی ماہیت اور حقیقی قدر و قیمت (INTRINSIC VALUE) میں کچھ فرق نہیں آجاتا۔ اب اس خارجی دنیا سے ہٹ کر ذرا اپنے دماغ کے بتکدہ کو ٹٹولئے اور دیکھئے کہ اس میں کتنے "پتھر" ایسے رکھے ہیں جن کی قدر و قیمت کے متعلق آپ کے پاس سوائے اس کے کوئی دلیل و شہادت نہیں کہ ان کے نام کی عظمت نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلی آرہی ہے اور محض قدامت کی بناء پر ان ناموں میں شانِ تقدس پیدا ہو چکی ہے۔ دیکھئے کہ یہ نام آپ کے نزدیک اتنے مقدس بن چکے ہیں کہ اُن کے خلاف آپ ایک لفظ تک سننا نہیں چاہتے! اس کے بعد یہ دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے قدر و قیمت کے پرکھنے کے لئے کیا معیار مقرر فرمایا ہے۔ حضرت ہودؑ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ مَا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ۔ یعنی ان ...... چیزوں کی عظمت و تقدس کے لئے اللہ کی طرف سے کوئی سند تمہارے پاس نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ قدر و منزلت کے پرکھنے کا صحیح معیار وہ سند ہے جو مُنَزَّلٌ مِنَ اللّٰهِ ہو۔ ہر شے کو میزانِ خداوندی میں رکھئے۔ یہ "دھرم کانٹا" جو وزن بتائے وہی درست اور صحیح ہے، خواہ آپ کا ذہن یا اسلاف پرستی کے معتقدات کچھ ہی کیوں نہ کہیں۔ محض اسماء کو دلیل اور حجت سمجھ لینا، حقیقت فراموشی اور خود فریبی ہے۔ دلیل اور حجت اس آسمان کے نیچے فقط ایک ہی ہے۔ یعنی مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ۔ "جو اللہ نے نازل کیا ہے"۔

تکذیب میں شدّت

حضرت ہودؑ کی دعوت اور قوم کی طرف سے تکذیب برابر آگے بڑھتی گئی۔ طبیب کی شفقت اور مریض کی ضد متوازی چلتی گئی۔ حضرت ہودؑ ان سے بار بار کہتے کہ دیکھو!

قوانینِ الٰہیہ سے سرکشی کا مسلک چھوڑ دو، ورنہ اس کا نتیجہ ہلاکت اور تباہی ہوگا۔ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ آسمان کی فضا میں کسطرح اس وبا کے جراثیم پھیلتے جا رہے ہیں جو قانونِ مکافاتِ عمل کے تحت تم پر عذاب بن کر مسلّط ہو جائیں گے اور پھر کوئی راہِ فرار باقی نہیں رہے گی۔ لیکن قوّت اور دولت کا نشہ ان باتوں کی طرف کب کان دھرنے دیتا ہے؟ سرکش و متمرّد انسان دیکھتے تھے کہ جسطرف ان کا قدم اٹھتا ہے عروج اور ترقی آگے بڑھ کر رکاب چومتی ہے۔ ان بڑھتی ہوئی کامیابیوں اور چڑھتی ہوئی کامرانیوں میں ہلاکت و بربادی کا تصوّر تک بھی نہیں آسکتا تھا۔ لیکن وہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ بادۂ رنگین کے اثرات سے جو سرخی چہرے پر نمودار ہوتی ہے، وہ خون کی تازگی اور صحت کی شگفتگی کی سُرخی نہیں ہوتی بلکہ محض فریب نگاہ ہوتی ہے۔

وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيۡطٰنُ اَعۡمَالَهُمۡ فَصَدَّهُمۡ عَنِ السَّبِيۡلِ وَ كَانُوۡا مُسۡتَبۡصِرِيۡنَ ۙ (۲۹/۳۸)

اُن کے سرکش جذبات، اُن کی غلط روش کو نہایت خوش نما بنا کر دکھاتے تھے، اور اس طرح اُنہیں صحیح راستے کی طرف آنے سے روکتے تھے۔ وہ لوگ، یہ کچھ بربنائے جہالت نہیں کرتے تھے۔ وہ سب کچھ سمجھتے سوچتے اور دیکھتے بھالتے تھے لیکن مشکل یہ ہوتی ہے کہ جب انسان کے جذبات اس پر غالب آجاتے ہیں، تو اس کی عقل و فکر ماؤف ہو جاتی ہے۔ یہ صرف وحی کی حد بندیاں ہیں جو انسانی جذبات کو بے راہرو نہیں ہونے دیتیں۔ تنہا عقل کے بس کی یہ بات نہیں۔ کتنی قومیں ہیں جو علم و عقل کی بلندیوں پر ہونے کے باوجود، خود بھی تباہی کے جہنم کی طرف بڑھی چلی جاتی ہیں۔ اور باقی دنیا کو بھی اس میں جھونک دیتی ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں وحی کی ضرورت پڑتی ہے[1]۔ —— نیز (۴۶/۲۶)۔ قرآنِ کریم نے علم کو بڑی اہمیت دی ہے۔ لیکن یہ کہیں نہیں کہا کہ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا يَعۡلَمُوۡنَ —— یعنی تنہا علم نتیجہ خیز نہیں ہوتا۔ ہر جگہ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ کہا ہے[2] —— یعنی جب علم کو کام میں لایا جائے تو پھر نتیجہ مرتّب ہوتا ہے۔ جزاء عمل کی ہے، تنہا علم کی نہیں۔

وہ مستبصرین تھے غور فرمائیے کہ قرآنِ کریم کے الفاظ کس قدر جامع ہیں۔ شیطانِ حق و صداقت کی راہ روکے کھڑا تھا۔ اور جس راستہ پر وہ چل رہے تھے اُسے اُس نے جذبات کی گلکاریوں سے ایسا فریب نظر بنا دیا تھا کہ وہ دیکھ ہی نہیں سکتے تھے کہ ان حسین و دلفریب پھولوں کی کیاریوں کے پیچھے ہلاکت و بربادی کے کتنے بڑے

---

[1] خود ہمارے زمانے میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ یورپ اور امریکہ کی قومیں تہذیب و تمدّن اور علم و حکمت میں کس قدر آگے نکل گئی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اُنہوں نے اپنے معاشرہ کو کس قدر غلط خطوط پر متشکل کر رکھا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ خود بھی جہنم کے عذاب میں مبتلا ہیں، اور ان کے ساتھ باقی دنیا بھی تباہ ہو رہی ہے۔ یہ صرف اس لئے کہ یہ قومیں وحی کی روشنی سے کام نہیں لیتیں۔ [2] (۳۲/۱۷ - ۴۶/۱۴ - ۵۶/۲۴)

ہولناک غار ہیں۔ حالانکہ وہ مستبصرین تھے۔ آنکھیں رکھتے تھے۔ صاحبِ دانش و بینش تھے۔ قرآن کریم نے اس مقام پر عقل و بصیرت اور "شیطنت" کے تقابل سے نگاہ کا رُخ ایک عظیم حقیقت کی طرف پھیر دیا ہے۔ "شیطنت" کے معنی ہیں ان جذبات کی غلامی جو وحی کے تابع نہ چلیں۔ اگر انسان پر یہ جذبات غالب آجائیں تو اس کی عقل اسے کبھی صحیح راستہ پر نہیں لا سکتی۔ بلکہ عقل تو ان جذبات کی لونڈی بن جاتی ہے اور جو کچھ وہ چاہتے ہیں اس کے لئے اسباب و ذرائع بھی بہم پہنچاتی ہے اور اس کے جواز میں دلائل بھی تراشتی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ وہ قومیں جو وحی کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں زندگی کا سفر طے نہیں کرتیں "مستبصرین" ہونے کے باوجود، بربادی کے جہنم میں جا گرتی ہیں۔ یہ ہے وہ حقیقت جس کی طرف قرآن نے قوم ہودؑ کے "مستبصرین" کے انجام کو سامنے لاکر نگاہ کا رُخ پھیرا ہے۔ سورۂ احقاف میں انہی "مستبصرین" کے متعلق ارشاد ہے۔

وَ لَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْـِٕدَةً ۖ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَ لَآ اَبْصَارُهُمْ وَ لَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ (۴۶/۲۶)

(اور، وہ کوئی ایسی ویسی قوم نہیں تھی) جس قدر رجاہ و جلال اور غلبہ و اقتدار انہیں حاصل تھا، ویسا تمہیں بھی حاصل نہیں۔ نیز، وہ غیر مہذب اور وحشی قوم بھی نہیں تھی۔ انہیں علم و دانش کے تمام ذرائع ——— سماعت، بصارت اور قلب ——— حاصل تھے۔ لیکن چونکہ اُن پر مفاد پرستی کے جذبات غالب تھے جس کی وجہ سے وہ قوانینِ خداوندی کی مخالفت کرتے تھے، اس لئے اُن کی عقل و دانش اور فہم و فراست، اُن کے کسی کام نہ آئے (۴۵/۲۳)۔ اور جن نتائج کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے اُنہوں نے اُنہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ (جب عقلِ انسانی، وحی کی روشنی میں کام کرے، تو اس کے نتائج بڑے خوشگوار ہوتے ہیں۔ لیکن جب انسان اپنے جذبات سے مغلوب ہو جائے، تو وہ اندھا ہو جاتا ہے اور اس کی عقل و دانش ماؤف ہو جاتی ہے، جس طرح نشے کی حالت میں وہ ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے)۔

غور کیجئے۔ سمع و بصر و قلب علم و عقل کے ذرائع سب موجود ہیں لیکن وحی کی روشنی سے منہ موڑنے کی وجہ سے وہی کیفیت ہو چکی ہے جو آج مستبصرینِ مغرب کی ہے، جن کی دوربینیں مریخ تک کے احوال و کیفیات کا پتہ تو لے آتی ہیں اور چاند پر اُتر کر اس کا عینی مشاہدہ کر لیتی ہیں لیکن تباہی و بربادی کا جو سیلاب اُن کے دروازوں سے ٹکرا رہا ہوتا ہے وہ کسی کو نظر نہیں آتا اور جب کوئی "دیدہ ور" ان سے کہتا ہے کہ ؎

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہگذرِ سیلِ بے پناہ میں ہے (اقبال)

تو یہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں کہ اس روشنی کے زمانہ میں یہ "دقیانوسی خیالات" کا پیامبر کہاں سے آگیا؟ جب حضرت ہودؑ نے ان مکذبین سے کہا کہ:

اِنِّیٓ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ؕ (۲۶/۱۳۵)

مجھے ڈر ہے کہ تمہاری اس روش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم پر سخت تباہی آجائے گی۔

تو اس کا جواب کیا ملا؟

قَالُوۡا سَوَآءٌ عَلَیۡنَاۤ اَوَعَظۡتَ اَمۡ لَمۡ تَکُنۡ مِّنَ الۡوٰعِظِیۡنَ ۙ﴿﴾ اِنۡ ہٰذَاۤ اِلَّا خُلُقُ الۡاَوَّلِیۡنَ ۙ﴿﴾ وَ مَا نَحۡنُ بِمُعَذَّبِیۡنَ ﴿﴾ (۲۶/۱۳۶-۱۳۸)

(انہوں نے یہ سب کچھ سنا، اور نہایت طنز و حقارت سے کہا کہ آپ کے اس وعظ کا شکریہ! لیکن ہمیں اس کی ضرورت نہیں) ہمارے لئے تمہارا وعظ و نصیحت کرنا یا نہ کرنا، برابر ہے۔

(خدا، اس کا قانونِ مکافات، تباہیوں اور بربادیوں کا عذاب جس سے تم ہمیں ڈراتے دھمکاتے ہو۔ یہ سب) پرانے زمانے کے لوگوں کے من گھڑت افسانے ہیں۔ (نیز ۳۸/۷)

(آپ ہمارے غم میں یونہی بیکار نہ گھلے جائیے) مطمئن رہیئے کہ ہم پر کوئی تباہی نہیں آئے گی۔

تنذیر وہ بار بار ایک ناصح امین کی طرح انہیں ان کے اعمال کے عواقب و انجام سے آگاہ کرتے لیکن وہ ہر بار یہی کہتے کہ:

۷/۷۰ فَاۡتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ ﴿﴾ (نیز ۴۶/۲۲)

(تم کہتے ہو کہ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو ہم پر تباہی کا عذاب آجائے گا)۔ سو اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو اس تباہی کو لا کر دکھاؤ۔

اس کے جواب میں حضرت ہودؑ فرماتے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں ع

حقیقت ہے، نہیں میرے تخیل کی یہ خلّاقی

۷/۷۱ قَالَ قَدۡ وَقَعَ عَلَیۡکُمۡ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ رِجۡسٌ وَّ غَضَبٌ ؕ

اُس نے کہا تم اس تباہی کا انتظار کر رہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ وہ تباہی تمہارے سروں پر منڈلا رہی ہے (تمہاری آنکھیں کھلی ہوتیں تو اس کے آثار سامنے نظر آجاتے) جس اضطراب اور ہیجان میں تم مبتلا ہو، یہ خدا کے عذاب کی علامات نہیں تو اور کیا ہیں؟

وہ پوچھتے کہ یہ عذاب کب آئے گا؟ ارشاد ہوتا کہ:

قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اُبَلِّغُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَ لٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۝ (۴۶/۲۳)

اس کا علم میرے خدا ہی کو ہے کہ وہ عذاب کب اور کس شکل میں آئے گا۔ میرا فریضہ تو اتنا ہی ہے کہ مجھے، جو پیغامات دے کر، تمہاری طرف بھیجا گیا ہے، انہیں تم تک پہنچا دوں۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تم بڑی احمق قوم ہو (کہ میں تم سے جو کچھ کہتا ہوں، تم اس پر غور و فکر کرتے نہیں۔ اور اس پر اصرار کئے جا رہے ہو کہ جس تباہی سے تمہیں آگاہ کیا جاتا ہے، وہ جلدی کیوں نہیں آتی)۔

اوچھے ہتھیار جب مجادلہ و مباحثہ سے کام نہ چلا تو قوم ان حربوں کو لے کر مقابلہ میں آگئی جو اربابِ قوت و استبداد کا آخری جواب ہوتا ہے۔ لیکن جو پیغاماتِ الٰہیہ کا پیامبر اور حقیقت کا مبصّر ہو، وہ بھلا اس تخویف و ترہیب سے کس طرح گھبرا جائے؟ حضرت ہودؑ نے فرمایا:

مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ۝ اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ۭ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ ۭ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَـيْـــًٔا ۭ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ۝ (۱۱/۵۵-۵۷)

تم جو کچھ میرے خلاف کرنا چاہتے ہو، سب کے سب مل کر کر لو، اور مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو (اس کے بعد دیکھو کہ نتیجہ کیا نکلتا ہے!)۔

میرا بھروسہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ہے جو بڑا ہی محکم گیر اور قابلِ اعتماد ہے۔ اُس خدا کا قانون جو میرا اور تمہارا سب کا نشوونما دینے والا ہے۔ تم تو ایک طرف رہے، کائنات میں کوئی ذی حیات ایسا نہیں جو اُس کے قانونِ مکافات کی گرفت سے باہر ہو۔ میرا خدا، (حق و عدل کی) سیدھی اور توازن بدوش راہ پر ہے۔ (لہٰذا، تم بھی، اُس کے پیچھے پیچھے، اسی راہ پر چلو (۵/۱)؛ (۱۵۳-۵۴/۶)؛ (۵۳/۴۲))

اگر تم اس سے روگردانی کرو گے تو اس کے نتائج کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں ہو گی۔ میرے ذمے فقط اتنا تھا کہ میں تم تک خدا کا پیغام پہنچا دوں۔ سو وہ میں نے پہنچا دیا۔ اب تم دیکھ لو گے کہ خدا کا قانونِ مکافات (تمہیں کس طرح تباہ و برباد کر کے) تمہاری جگہ ایسی قوم کو لے آتا ہے جو تمہارے جیسی نہیں ہو گی۔ تم سے بہتر ہو گی (۳۸-۴۴/۹؛ ۳۸/۴۷)۔

تم خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے - وہ ہر چیز کا نگران ہے -

ظہورِ نتائج کا وقت

حجت کا اتمام ہوگیا - قانونِ مکافات کے مطابق وہ وقت آپہنچا جب اعمال کی کھیتی پک جاتی اور اس کے نتائج نمودار ہو جاتے ہیں -

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ...... كَذٰلِكَ نَجْزِى الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ۝

(۴۶/۲۴-۲۵) و (۴۱/۱۵-۱۶)

(اس وقت طویل خشک سالی کی وجہ سے اُنہیں بارش کی بہت ضرورت تھی) اُنہوں نے دیکھا کہ کالی گھٹا اُٹھی ہے جو اُن کی وادیوں کی طرف بڑھے چلی آرہی ہے - وہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ یہ گھٹا ایسی بارش برسائے گی جس سے ہماری زمینیں سیراب ہو جائیں گی - لیکن وہ بارش برسانے والا بادل نہیں تھا - وہ اس آندھی کا جھکڑ تھا جو اُن کی اس تباہی کے لئے بڑھے چلے آرہا تھا جس کے لئے وہ جلدی مچا رہے تھے [جب کوئی قوم اقدارِ خداوندی کو پامال کر دیتی ہے تو وہ حوادثِ فطرت کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہتی - یہ ہوتا ہے تعلق اخلاقی بدکرداری اور حوادثِ ارضی و سماوی کے ذریعے تباہی (عذاب) آنے میں - نیز انسان تنہا عقل کی رو سے خیر و شر میں تمیز نہیں کر سکتا - (۲/۲۱۶)]

چنانچہ وہ جھکڑ آیا اور اس نے قانونِ خداوندی کے مطابق، ہر شے اُکھاڑ پھینکی، اور چاروں طرف تباہی مچا دی - اس سے اُس بستی کی حالت یہ ہوگئی کہ اُس کے مکانوں کے کھنڈرات باقی رہ گئے، اور مکین سب ہلاک ہوگئے -

اِس طرح ہم مجرمین کو اُن کے غلط اعمال کا بدلہ دیا کرتے ہیں - (ان سے کہدو کہ اگر تم نے بھی اپنی غلط روش کو نہ چھوڑا، تو تمہارا انجام بھی وہی ہوگا) - (۴۶/۲۵) (نیز ۴۱/۱۵-۱۶)

بربادی

وہی بادِ تند و تیز (آندھی اور جھکڑ) جس سے ریت کے تودے بستیوں اور آبادیوں کو قبرستانوں میں تبدیل کر دیتے ہیں؛ اسی کو دوسری جگہ اَلرِّيْحَ الْعَقِيْمَ کہا گیا ہے - (۵۱/۴۱-۴۲)

آندھی کا یہ طوفان مسلسل آٹھ دن اور سات راتوں تک جاری رہا - (۶۹/۶-۸) - اور اس طرح وہ قوم، جو پہاڑوں کی چوٹیوں پر نشانات نصب کرتی، بڑے بڑے ستونوں پر عمارات تعمیر کرتی اور اپنے سے بڑھ کر کسی کو طاقتور نہ سمجھتی تھی - ایک جھکڑ کا مقابلہ نہ کر سکی اور ہلاک ہوگئی - (۲۶/۱۳۹-۱۴۰) - اس طرح ہلاک کہ ان کی جڑ تک کٹ گئی -

۷/۷۲ وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ع

(سو جب ظہورِ نتائج کا وقت آیا، تو ہم نے ہُود اور اُس کے رفقاء کو (۱۱/۵۸) تباہی سے بچا لیا اور) جن لوگوں نے

ہمارے قوانین کو تسلیم نہیں کیا تھا اور انہیں جھٹلایا تھا، اُن کی جڑ کاٹ ڈالی۔
وہ حال اور مستقبل دونوں میں زندگی کی خوشگواریوں سے محروم ہو گئے۔

وَ تِلْكَ عَادٌ ۖ جَحَدُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ وَ عَصَوْا رُسُلَهٗ وَ اتَّبَعُوْۤا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ ۝
وَ اُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا لَعْنَةً وَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا
بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ۠ (۱۱/۵۹-۶۰)

یہ ہے سرگزشت قومِ عاد کی جس نے اپنے پروردگار کے قوانین سے انکار کیا اور اس کے رسولوںؑ (کی دعوت) سے سرکشی برتی۔ اور اپنے اُن سرکش اور مستبد حکام کی اطاعت کرتے رہے جو جان بوجھ کر حق کی مخالفت کرتے تھے۔ (۱۱/۵۹)

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ، حال اور مستقبل، دونوں کی زندگی میں، نوازشاتِ خداوندی سے محروم رہ گئے ——
یاد رکھو! یہ سب اس لئے ہوا کہ انہوں نے اپنے نشوونما دینے والے کے قوانین سے انکار کیا تھا ——
دیکھو! قومِ عاد کس طرح زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ گئی! (۱۱/۶۰)

یہ قوم دنیا سے نیست و نابود ہو گئی، اور جس طرح حضرت ہودؑ نے انہیں پہلے سے آگاہ کر رکھا تھا، اُن کی جگہ دوسری قوم نے لے لی کہ مکافاتِ عمل کی رُو سے استبدال و استخلافِ قومی (ایک قوم کی جگہ دوسری قوم کا آجانا) خدا کا اٹل قانون ہے[1]۔ (۱۱/۵۷)

جماعتِ مومنین بچالی گئی

حضرت ہودؑ کو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے اس کا علم دیدیا تھا (جس طرح حضرت نوحؑ کو طوفان کا پیشتر علم دیدیا گیا تھا) اور وہ اس سے بار بار قوم کو آگاہ کرتے تھے۔ لیکن انہوں نے تو فیصلہ ہی یہ کر رکھا تھا کہ جو کچھ حضرت ہودؑ کہیں اسے جھوٹا سمجھا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس کا یقین نہ کیا اور تباہ و برباد ہو گئے۔ اور حضرت ہودؑ اور اُن کے متبعین اس تباہی سے محفوظ رہے۔ (۱۱/۵۸ نیز ۷/۷۲)۔ ان باقیاتِ صالحات سے جو قوم آگے بڑھی اسے عادِ ثانیہ کہا گیا ہے اور جو تباہ ہو گئی اسے عادِ اولیٰ۔

وَ اَنَّهٗۤ اَهْلَكَ عَادَا ِۨالْاُوْلٰی ۙ (۵۳/۵۰)

اور (دیکھو) بلاشبہ (تمہارا پروردگار) وہی تو ہے جس کے قانونِ مکافات کے مطابق عادِ اولیٰ ہلاک ہو گئے۔

---

[1] انڈکس میں تفصیل دیکھئے۔

نگہِ بازگشت

قومِ عاد کے اس سانحۂ عبرت آموز پر نگہِ بازگشت ڈالیئے اور دیکھیئے کہ اس میں بعض خصوصیتیں کس قدر نمایاں طور پر اُبھر کر سطح پر نظر آرہی ہیں۔ قوم، قوت و دولت اور حکومت وسلطنت کی مالک ہے اور اسے اللہ کا فضل واحسان قرار دیا گیا ہے۔ وہ عدل وانصاف کو چھوڑ کر سرکشی وتمرّد پر اُتر آتی ہے تو اُن سے کہا جاتا ہے کہ یاد رکھو! اس روش کا نتیجہ سوائے ہلاکت کے کچھ نہیں۔ لیکن اگر تم اپنی روش کی اصلاح کر لو اور اپنے آپ کو قوانینِ خداوندی کے تابع لے آؤ تو وہ تمہاری قوتوں کو اور بڑھاتا جائے گا۔ (یَزِدْکُمْ قُوَّۃً اِلٰی قُوَّتِکُمْ ۱۱/۵۲) وہ نہیں مانتی تو وہ ایک رسوا کن عذاب کا شکار ہو جاتی ہے۔ (لِنُذِیْقَھُمْ عَذَابَ الْخِزْیِ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَۃِ اَخْزٰی ۱۶/۴۱) اس سے ظاہر ہے کہ قوانینِ خداوندی کے تحت عزت وشوکت حکومت وسطوت، قوت وثروت

محکومی و رسوائی خدا کا عذاب ہے

اللہ کے انعامات ہیں اور ذلت ورسوائی کی زندگی عذابِ خداوندی ہے۔

پھر اس قوم کو یہ احسان بھی یاد دلایا گیا کہ اسے قومِ نوحؑ کا جانشین بنایا گیا تھا۔ (۷/۶۹)۔ اور جب اس نے پیغاماتِ خداوندی سے سرکشی اختیار کی تو اس سے کہہ دیا گیا کہ یاد رکھو، اللہ تمہاری جگہ ایک دوسری قوم کو لے آئے گا۔ (۱۱/۵۷)۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ یہ بھی اللہ کا عذاب ہے کہ کسی قوم کی شوکت وحشمت کی وارث کسی دوسری قوم کو بنا دیا جائے۔

سعد و نحس

قرآنِ کریم نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ دن بڑا "منحوس" تھا جب ان پر اللہ کا عذاب طاری ہوا۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَیْھِمْ رِیْحًا صَرْصَرًا فِیْٓ اَیَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِیْقَھُمْ عَذَابَ الْخِزْیِ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَۃِ اَخْزٰی وَھُمْ لَا یُنْصَرُوْنَ ○

(۴۱/۱۶) نیز (۵۴/۱۹)

سو جب ان کی تباہی کا وقت آیا ——— جو ظاہر ہے کہ اُن کے لئے بڑا ہی نامبارک تھا ——— تو ہم نے اُن پر ایسے زور کی آندھی چلائی جس نے اُنہیں آتشِ خاموش کی طرح ختم کر کے رکھ دیا (۵۴/۱۹)۔ اس طرح اُنہیں اس دنیا کی زندگی ہی میں ذلت آمیز عذاب مل گیا۔ اور آخرت کی زندگی کا عذاب اس سے بھی زیادہ رسوا کُن ہو گا۔ اُنہیں اُس عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں ہو گا۔ (نیز ۵۴/۱۹)

اسے قرآنِ کریم نے ایک "عظیم یوم" (عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ) بھی کہا ہے۔ (۴۶/۲۱ ؛ ۲۶/۱۳۵)۔ اس سے معلوم ہوا کہ سعد ونحس کا تعلق آسمان کے ستاروں سے نہیں بلکہ جب کسی کے غلط اعمال کے نتائج مرتب ہونے کا وقت آجاتا ہے تو

وہ گھڑی اس کے لئے نحس ہے۔ لہذا سعادت و نحوست خود انسان کے اپنے اعمال کے نتائج کا نام ہے ستارو کی گردش کا نام نہیں۔ ستارے تو انسان کے لئے مسخر کر دیئے گئے ہیں ۱۶/۴۵ سو جو خود محکوم و مسخر ہو وہ دوسرے کے تقدّرات کی تبدیلیوں پر کیا اختیار رکھ سکتا ہے[1]۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ ہیں۔

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے

کہ خاکِ زندہ ہے تو تابع ستارہ نہیں

یہ ہے اس قوم عاد کی عبرت انگیز داستان جس کے متعلق کہا کہ جاؤ دیکھو۔ ان کے اجڑے ہوئے کاشانوں میں تمہارے لئے کون کون سے سامان موعظت مدفون ہیں۔

وَ عَادًا وَّ ثَمُوْدَا وَّ قَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ (۳۸/۲۹)

اسی طرح عاد و ثمود کے ساتھ بھی ہوا جن کی تباہی کی داستانیں ان کے مکانات کے کھنڈرات سے ظاہر ہیں۔ جوں جوں زمانہ آگے بڑھ رہا ہے، اثری انکشافات ان زمین دوز بستیوں سے نقاب اٹھاتے چلے جا رہے ہیں جن کے نیچے سے مٹی ہوئی عظمتوں اور لٹی ہوئی سلطنتوں کے نقوش یوں نمودار ہو رہے ہیں جیسے کوئی آنکھیں ملتا ہوا نیند سے اٹھ بیٹھے۔ جس قوم کے سینے میں دل اور نگاہوں میں بصیرت ہے اس کے لئے ان ویرانوں کی ٹھیکریاں، عروج و زوالِ امم کی ہزاروں خاموش داستانیں اپنے اندر رکھتی ہیں۔ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ! "کوئی ہے جو ان سے عبرت حاصل کرے؟"

سورۃ الاعراف میں قوم ثمود کا بھی ذکر آتا ہے جس کی طرف حضرت صالحؑ مبعوث ہوئے تھے۔ اس سورت میں ان سے متعلق چند ایک آیات (۷۹-۷۳) آئی ہیں لیکن ان کی داستان قرآن مجید کے متفرق اوراق میں پھیلی ہوئی ہے اسے ہم حسبِ سابق مسلسل انداز سے پیش کرتے ہیں۔ اس قوم کا جرمِ عظیم ایسا تھا جس کا تعلق براہِ راست ہمارے زمانے سے ہے جسے عہدِ اقتصادیات (AGE OF ECONOMICS) کہا جاتا ہے۔ اس میں قرآن کریم کے معاشی نظام کا اساسی نکتہ سامنے آجاتا ہے (اس معاشی نظام کی تفاصیل سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہیں۔ جن کی نشاندہی انڈکس کرتا ہے)۔

---

[1] انڈکس میں 'تقدیر' کا عنوان دیکھئے۔

قومِ ثمود ـــــــــ حضرت صالحؑ

امم سامیہ میں سے جن قبائل نے اندرونِ عرب حکومتیں قائم کیں ان میں سب سے زیادہ مشہور قبیلہ (بلکہ قوم) ثمود کا تھا۔ ان کے عروج کا زمانہ عادِ اولیٰ کے بعد کا ہے۔ یہ قوم، عرب کے شمال مغربی حصہ پر حکمران تھی جسے وادیٔ قریٰ کہتے تھے۔ حِجرؔ ان کا دارالحکومت تھا جو اس قدیم راستہ پر واقع تھا جو حجاز سے شام کی طرف جاتا ہے۔ وادیٔ قریٰ کے گرد و پیش کا میدان سرسبز و شاداب ہے لیکن آتش فشاں مادہ سے لبریز۔ قرآنِ کریم نے اس قوم کو عادؔ کا جانشین بتایا ہے۔

(۷/۷۴) وَاذۡكُرُوۡۤا اِذۡ جَعَلَكُمۡ خُلَفَآءَ مِنۡۢ بَعۡدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمۡ فِى الۡاَرۡضِ تَتَّخِذُوۡنَ مِنۡ سُهُوۡلِهَا قُصُوۡرًا وَّتَـنۡحِتُوۡنَ الۡجِبَالَ بُيُوۡتًا‌ ۚ فَاذۡكُرُوۡۤا اٰلَۤاءَ اللّٰهِ وَلَا تَعۡثَوۡا فِى الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِيۡنَ ○

تم قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کا نتیجہ دیکھ چکے ہو۔ تم سے پہلے، قومِ عادؔ نے ان قوانین سے سرکشی برتی تو وہ تباہ و برباد ہو گئی۔ تم اسی قوم کے جانشین ہو۔ ان کے بعد، خدا نے تمہیں اس ملک میں اس طرح متمکن کر دیا کہ تم اس کے میدانوں میں محلات تعمیر کرتے ہو، اور پہاڑوں کو تراش کر، ان میں مکانات بناتے ہو۔ تم خدا کی ان نعمتوں اور اس کے قانون کی قوتوں کو اپنے پیشِ نظر رکھو، اور ملک میں فساد مت برپا کرو۔

حضرت موسیٰؑ کے زمانہ سے پہلے ان کی تباہی ہو چکی تھی کیونکہ دربارِ فرعون کا مردِ مومن اپنی قوم سے کہتا ہے کہ اگر تم اپنی بدکرداریوں سے باز نہ آئے تو تمہارا حشر بھی وہی ہو گا جو قومِ نوحؑ و عاد و ثمود کا ہوا تھا۔ (۴۰/۳۰-۳۲) اس سے معلوم ہوا کہ اس قوم کا زمانہ قریب اڑھائی ہزار ق۔م سے لے کر (۱۶۰۰) ق۔م تک کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر اپنی نوازشات کی گھر باری فرما رکھی تھی۔ انہیں متمکن فی الارض کیا تھا۔ (۷/۷۴)۔ قومِ عاد کی طرح یہ بھی میدانوں میں رفیع و وسیع محلات تعمیر کرتے اور پہاڑوں کے گوشوں میں مستحکم قلعے بناتے جو فنِ سنگ تراشی کے نمونے تھے (۷/۷۴؛ ۱۵/۸۲)۔ پُرفضا باغات۔ لہلہاتی کھیتیاں۔ صاف و شفاف اُبلتے ہوئے چشمے۔ (۲۶/۱۴۶-۱۴۹)

دولت و سطوت

وادیٔ قریٰ میں سنگین عمارات۔

وَثَمُوۡدَ الَّذِيۡنَ جَابُوا الصَّخۡرَ بِالۡوَادِ ۙ○ (۸۹/۹)

اور قوم ثمود کا انجام)، جو پہاڑوں کے دامن میں مستحکم قلعے بنا لی تھی (نیز ۷/۷۴ و ۱۵/۸۲)
اور جنود و عساکر، کی اکثریت۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ۝ فِرْعَوْنَ وَ ثَمُوْدَ ۝ (۸۵/۱۸-۱۷)

(اُسی کا قانون انسانی دنیا میں، مکافاتِ عمل کی شکل میں کارفرما ہے۔ اس کی شہادت کے لئے قرآن میں) ان لوگوں کے واقعات بیان کئے گئے ہیں جو بڑے بڑے لشکروں کے ساتھ، قوانین خداوندی کی مخالفت کے لئے ہجوم کرکے آئے تھے۔

یعنی قوم فرعون، اور قوم ثمود کے لوگ ——— (ان کا جو انجام ہوا وہ تاریخ کے اوراق پر ثبت ہے)۔

یہ تھی وہ قوم جن کی طرف خدا کے پیغمبر آتے رہے۔ لیکن انہوں نے اپنی دولت و حشمت، حکومت و قوت کے نشے میں قوانینِ الٰہیہ کی تکذیب کی۔

وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ (۱۵/۸۰)

اور (دیکھو) حجر کے لوگوں نے بھی رسولوں کی بات جھٹلائی۔

یہاں ان کے دارالحکومت کی نسبت سے انہیں اصحٰب الحجر کہا گیا ہے۔ دوسری جگہ ان کا نام مذکور ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ (۲۶/۱۴۱)۔ (نیز ۵۴/۲۳)

اور (دیکھو) قوم ثمود نے بھی رسولوں کی بات جھٹلائی۔

بعثتِ حضرت صالحؑ

تا آنکہ جب ان کی سرکشی و عدوان حد سے بڑھ گئی اور قانونِ مشیت کے مطابق مہلت کا زمانہ ختم ہونے کو آیا تو اُن کی طرف، اسی قبیلہ سے حضرت صالحؑ مبعوث ہوئے۔

۷/۷۳ وَ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا م (۷/۷۳) (نیز ۱۱/۶۱ و ۲۶/۱۴۲ و ۲۷/۴۵)۔

اور (دیکھو) ہم نے قوم ثمود کی طرف اُنہی کے بھائی بندہ صالحؑ کو مبعوث کیا۔

اس وقت ہر جابر و مستبد قوم کی طرح، اس قوم کی بھی یہ حالت ہو چکی تھی کہ وہ ملک میں فساد برپا[1] کرتے تھے اس لئے

---

[1] فساد برپا کرنے سے ہمارا ذہن ڈاکہ زنی۔ قزاقی۔ بدامنی وغیرہ کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ لیکن فساد کا قرآنی مفہوم اس سے کہیں وسیع ہے۔ اس کے نزدیک ہر وہ نظام جو غیر خداوندی قوانین پر مشتمل ہو، فساد ہے (خواہ اس میں بظاہر کیسا ہی امن کیوں نہ ہو) اور اس کے مقابلہ میں اصلاح صرف اس نظام کا نام ہے جو قوانین خداوندی پر قائم ہو۔ اس مفہوم کو سامنے رکھنے سے فساد اور مفسد کی قرآنی اصطلاحات کے صحیح معنی سمجھ میں آسکیں گے۔ (مزید تفصیل کے لئے انڈکس دیکھئے)۔ نیز (۲۶/۱۵۲، ۲۷/۴۸)

ان سے کہا گیا کہ:

۷/۷۴ وَ لَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ○

(تم خدا کی نعمتوں اور اس کے قانون کی قوتوں کو اپنے پیش نظر رکھو) اور ملک میں فسادمت برپا کرو۔

مفسدین کی قوم

وَ لَا تُطِیْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِیْنَ ۙ الَّذِیْنَ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ وَ لَا یُصْلِحُوْنَ ○ (۲۶/۱۵۱-۱۵۲)

اور اپنے اُن لیڈروں کا کہا مت مانو جو عدل و انصاف کی حدود سے تجاوز کرکے، ملک میں ناہمواریاں پھیلاتے ہیں اور کبھی اس کی اصلاح کی فکر نہیں کرتے۔

جب رزق کی تقسیم قوانین خداوندی کے مطابق نہیں ہوتی تو انسانی معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کو فساد فِی الْاَرْض کہا جاتا ہے۔ یعنی انسانی معاشرہ کی ناہمواریاں۔ جب یہ ناہمواریاں (قوانین خداوندی کے مطابق) ہمواریوں میں بدل جاتی ہیں تو اسے اصلاح کہا جاتا ہے۔ قوم ثمود کے معاشرہ میں اسی قسم کی ناہمواریاں پیدا ہو چکی تھیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ دارالحکومت میں نو ناظم الامور تھے جن کے سپرد علاقہ کا انتظام تھا۔ اور چونکہ پورے کا پورا نظام حکومت بگڑ چکا تھا اس لئے یہ سب کے سب مفسد و مستبد تھے۔

وَ كَانَ فِی الْمَدِیْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ یُّفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ وَ لَا یُصْلِحُوْنَ ○ (۲۷/۴۸)

اس قوم کے دارالسلطنت میں نو بڑے بڑے منتخب سردار تھے جن کے ذمے معاشرے کا نظم و نسق تھا۔ وہی ان تمام فسادات کی جڑ تھے۔ وہ ملک میں ناہمواریاں پیدا کرتے رہتے تھے، اور قوم کو کبھی اصلاح کی طرف آنے نہیں دیتے تھے (حقیقت یہ ہے کہ قوم کا دارومدار ان لوگوں پر ہوتا ہے جن کے ہاتھ میں اقتدار و اختیار اور نظم و نسق ہو۔ وہی قوم کو بگاڑتے ہیں اور انہی کے سنوارنے سے معاشرہ سنورتا ہے)

ان کا سرغنہ ان سب سے بڑھ کر شقی و بدبخت تھا۔

اِذِ انۢبَعَثَ اَشۡقٰىهَا ۝ فَقَالَ لَهُمۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ...... (۹۱/۱۳-۱۲)

(اور یاد کرو) جب اُس (قوم) کا بدبخت ترین شخص اٹھا تو اللہ کے رسول (صالح) نے ان لوگوں سے کہا.....

ان حالات کے ماتحت بھلا احکامِ الٰہیہ کی طرف کون توجہ دیتا؟

وَ اٰتَيۡنٰهُمۡ اٰيٰتِنَا فَكَانُوۡا عَنۡهَا مُعۡرِضِيۡنَ ۝ (۱۵/۸۱)

اُنہیں ہم نے واضح قوانین دیئے تھے، لیکن وہ ان سے روگرداں رہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہاں ایک نکتہ پر غور کیجئے۔ قرآنِ کریم بتاتا ہے کہ اس قوم میں فساد عام ہو چکا تھا۔ لیکن اسکے ساتھ ہی وہ کہتا ہے کہ ان کے مرکزی مقام (دار الحکومت) میں نو سربرآوردہ ایسے تھے جو درحقیقت اس فساد کے سرچشمہ تھے۔ یہ چیز ایک عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ قوموں میں فساد کا ذمہ دار دراصل اوپر کا طبقہ ہی ہوتا ہے۔

اُوپر کا طبقہ

عوام تو ان کے پیچھے چلنے والے ہوتے ہیں۔ جس قسم کا اوپر کا طبقہ اسی قسم کے عوام۔ اگر اوپر کے طبقہ کی اصلاح ہو جائے تو قوم خود بخود اصلاح یافتہ ہو جاتی ہے۔

وہی دعوتِ انقلاب

یہ تھے وہ حالات جن میں حضرت صالحؑ کی بعثت ہوئی۔ آپ تشریف لائے اور قوم کو اسی اساسی اور اصولی پیغام خداوندی کی طرف دعوت دی جو آسمانی سلسلۂ رشد و ہدایت کی اوّلین کڑی ہے۔ فرمایا:

۷/۷۳ قَالَ يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ ؕ (نیز ۲۷/۴۵ و ۱۱/۶۱)

(اس طرح، ہم نے قوم ثمود کی طرف، اُن کے بھائی بندوں میں سے صالحؑ کو بھیجا)۔ اُس نے بھی اُن سے یہی کہا کہ تم صرف قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرو۔ اُس کے سوا کوئی قوت ایسی نہیں جس کی محکومیت اختیار کی جائے۔

حکومت صرف ایک خدا کی۔ کسی انسان کی نہیں۔ اور اس حکومت کی عملی تشکیل اس طرح کہ دلوں میں تقویٰ اور مرکز کی اطاعت۔

اِذۡ قَالَ لَهُمۡ اَخُوۡهُمۡ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوۡنَ ۝ اِنِّیۡ لَكُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِيۡنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيۡعُوۡنِ ۝ (۲۶/۱۴۲-۱۴۴)

(آخر کار) اُن کے بھائی بندوں میں سے صالحؑ اُن کی طرف آیا اور اُن سے کہا کہ مجھے یہ بتاؤ کہ تم اپنی غلط روش کی تباہیوں سے بچنا چاہتے ہو یا نہیں؟

اگر بچنا چاہتے ہو تو سن لو کہ میں تمہاری طرف، خدا کے ہاں سے، امن و سلامتی کا پیغام لے کر آ گیا ہوں۔

اس لئے تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اور اس کا عملی طریق یہ ہے کہ جو نظام میں متشکل کرتا ہوں اس کی اطاعت کرو۔ یعنی مفسدین کی حکومت کی اطاعت مت کرو۔ بلکہ اطاعت فقط حکومتِ خداوندی کی کرو۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ۝ وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ۝ (۲۶/۱۵۲-۱۵۰)

اگر تم تباہیوں سے بچنا چاہتے ہو تو قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کے لئے میری اطاعت کرو۔ اور اپنے ان لیڈروں کا کہا مت مانو جو عدل و انصاف کی رُو سے تجاوز کر کے، ملک میں ناہمواریاں پھیلاتے ہیں اور کبھی اس کی اصلاح کی فکر نہیں کرتے۔

کتنا بڑا اعلانِ بغاوت اور کیسا نعرۂ انقلاب ہے! حقیقت یہ ہے علمبردارانِ حکومتِ خداوندی دُنیا میں سب سے بڑا انقلاب برپا کرنے کے لئے آتے ہیں۔ دوسرے انقلابات کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ایک انسان کی حکومت کی جگہ کسی دوسرے کی حکومت قائم کر دی جائے۔ لیکن آسمانی انقلاب کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ حکومت و اقتدار کی کنجیاں انسانوں کے ہاتھ سے چھین کر اقتدار و اختیار کے حقیقی مالک۔ خدائے ارض و سمٰوٰت کے سپرد کر دی جائیں۔ اس سے بڑا انقلاب اور کیا ہو سکتا ہے جس میں کسی انسان کو کسی شکل میں، دوسرے انسان پر، حکومت کا حق ہی حاصل نہ ہو۔ اور رزق کے معاملہ میں کوئی انسان کسی کا محتاج نہ ہو۔ سب انسان برابر اور ایک خدا کے قانون کے محکوم جو رب العلمین ہے۔ جس کی حکومت میں ظلم و استبداد، سلب و نہب اور غصبِ حقوق کا امکان ہی نہیں۔ یہ تھی وہ حکومت جو حضرت صالحؑ قائم کرنا چاہتے تھے! وہ اربابِ قوت و سلطنت جن کے چہرے کی سُرخیاں اور حریمِ ناز کی رنگینیاں انسانی خون کی رہینِ منت تھیں، کس طرح اپنے اقتدار و اختیار سے دستکش ہو کر مخلوقِ خدا کے خدام کی صف میں کھڑے ہو جاتے؟ لہٰذا وہی ہُوا جو ہوتا چلا آیا ہے اور جو ہوتا چلا جائے گا

اربابِ قوت کی طرف سے مخالفت

کمزور و ناتواں اور مظلوم و مقہور انسانوں نے جو انسانی چیرہ دستیوں سے تنگ آ چکے تھے، اس دعوتِ ربّانی پر آگے بڑھ کر لبیک کہا۔ اور اربابِ دولت و قوت اس کی مخالفت میں صف آرا ہو گئے!

(۷/۷۶-۷۵) قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝

اس پر اُس قوم کے سرکش اکابرین نے جنہیں مال و دولت کی فراوانی نے بدمست کر رکھا تھا جماعتِ مومنین سے

کہا ——— اور یہ وہ لوگ تھے جنہیں وہ اکابرین، اُن کے افلاس وغیرہ کی وجہ سے، بہت کمزور اور حقیر سمجھتے تھے ——— کہ کیا تم واقعی یہ سمجھتے ہو کہ صالحؑ اپنے نشوونما دینے والے کی طرف سے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے ؟

اُنہوں نے کہا کہ اس میں کیا شک ہے ؟ جو پیغامات اسے خدا کی طرف سے دیئے جاتے ہیں، ہم ان پر پورا پورا یقین رکھتے ہیں۔

(یہ حقیقت غور طلب ہے کہ نظامِ خداوندی کی مخالفت، بالعموم، اربابِ قوت و دولت کی طرف سے ہوئی اور قوم کے مظلوم اور کمزور طبقہ نے اس پر لبیک کہا۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس انقلاب کی غرض وغایت کیا ہوتی تھی)۔

ان سرکش اور متکبّر سردارانِ قوم نے کہا کہ تم جس بات کو سچا مانتے ہو، ہم اسے تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔

وہ آمادۂ پیکار تھے۔ لیکن حضرت صالحؑ ایک ناصح مشفق کی طرح انہیں برابر سمجھاتے چلے جاتے تھے کہ اپنے ہاتھ سے اپنی قبریں نہ کھودو۔ لیکن نشۂ حکومت میں ان نصائح کو سنتا کون ہے ؟

قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۚ لَوْ لَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ○ قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَ بِمَنْ مَّعَكَ ؕ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ○ (۲۷/۴۶-۴۷)

(صالحؑ نے انہیں بتیرا سمجھایا لیکن وہ یہی کہتے رہے کہ تم جس تباہی کی دھمکی دیتے ہو، اسے لے کیوں نہیں آتے ؟)۔ اس پر صالحؑ اُن سے کہتا کہ تم کس قدر اپنے آپ سے دشمنی کر رہے ہو کہ زندگی کی خوشگواریوں سے پہلے ہی، تباہیوں اور بربادیوں کے لئے جلدی مچا رہے ہو ! تم ان تباہیوں کو آوازیں دے دے کر بلانے کی بجائے خدا سے ان سے محفوظ رہنے کا سامان کیوں نہیں طلب کرتے ! اس سے، نہ صرف یہ کہ تم ان تباہیوں سے محفوظ رہ جاؤ گے بلکہ تمہیں نشوونما کا سامان بھی با فراط مل جائے گا۔

اس کے جواب میں وہ کہتے کہ جب سے تم اور تمہارے ساتھی نمودار ہوئے ہیں، ہمارے کانوں میں مسلسل تباہی اور بربادی کی آوازیں پڑنی شروع ہو گئی ہیں۔ ورنہ اس سے پہلے، ہم ان الفاظ سے ناآشنا تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ تم لوگ بڑے منحوس ہو۔

اس پر صالحؑ اُن سے کہتے کہ تم پر یہ "نحوست" (تباہی اور بربادی) ہماری وجہ سے نہیں آ رہی۔ یہ تو تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے جو خدا کے "قانونِ مکافات" کے مطابق مرتب ہو رہا ہے۔ (لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ یہ

باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی جب تک (تمہیں عذاب کی کٹھالی میں تپایا نہیں جائے گا۔

وہی دیوانگی کی تہمت

یہ انہیں نتائج وعواقب سے آگاہ کرتے، اور وہ (معاذاللہ) اُن کا مذاق اڑاتے۔ وہ کہتے کہ (خاکم بدہن) تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے جو اس طرح کی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو۔

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ؁ (۲۶/۱۵۳)

(اُنہوں نے یہ سب کچھ سُنا اور اس کے بعد، نہایت حقارت سے کہا کہ ہمیں اس کا اندازہ ہو گیا ہے کہ) تو بھی ان لوگوں میں سے ہے جو اس فریب میں مبتلا ہو جاتے ہیں (کہ خدا ان سے ہمکلام ہوتا ہے اور انہیں دُنیا کی اصلاح کے لئے مامور کرتا ہے!)۔

انہیں تعجب اس بات پر تھا کہ یہ ہمارے ہی جیسا انسان دعوئے رسالت میں سچا کیسے ہو سکتا ہے؟

مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۚ فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ؁ (۲۶/۱۵۴)

تم تو ہمارے ہی جیسے ایک انسان ہو (اس لئے تم خدا کے رسول کس طرح ہو سکتے ہو؟) بہر حال، اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ ہم پر تباہی آنے والی ہے، تو اس کے لئے کوئی نشانی پیش کرو۔

ایک انسان رسُول!

اُسی سازِ کہن کی صدائے بازگشت جسے ہم اُمم سابقہ کے احوال وکیفیات میں دیکھ چکے ہیں۔ یعنی ان سے کہا جاتا تھا کہ میں جس نظام کی طرف دعوت دیتا ہوں اسے عقل اور فکر کے معیار پر پرکھ کر دیکھو کہ اس میں بھلائیاں ہی بھلائیاں نظر آتی ہیں یا نہیں۔ اور وہ اس کے جواب میں کہتے کہ ہم بھلا اپنے جیسے انسان کو خدا کا رسول کیسے مان لیں۔ اگر تم خدا کے رسول ہو تو ہمیں کوئی محیر العقول بات کر کے دکھاؤ۔

فَقَالُوْٓا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ؁ (۵۴/۲۴)

اور کہا کہ کیا ہم ایسے آدمی کے پیچھے لگ جائیں جو بالکل تنہا ہے اور کوئی جتھہ اس کے ساتھ نہیں؟ اگر ہم نے ایسا کیا (اور اپنا جتھہ چھوڑ کر اس کے پیچھے لگ گئے تو یہ خواہ مخواہ تباہی اور بربادی کا مول لینا ہو گا) ایسا کچھ تو وہی کریگا جسے سلامتی کی کوئی راہ سجھائی نہ دیتی ہو اور وہ اندھا بن کر کنوئیں میں جا گرے۔ یا وہ بالکل پاگل ہو) اور اپنا نفع نقصان ہی نہ پہچانے!

بشر کے ساتھ واحد کے ٹکڑے پر بھی غور کیجئے۔ چونکہ وہ نشۂ قوت میں بدمست تھے اس لئے یہ کہتے تھے کہ اگر

کوئی ایسا شخص ہوتا جس کے ساتھ کوئی بہت بڑی جماعت ہوتی تو اس جماعت کی قوت سے دب کر ہم اس کی بات

سفاہت

مان بھی لیتے۔ لیکن اب ہم اس کی بات کیوں مانیں جب یہ بالکل اکیلا ہے۔ اور پھر، جیسا کہ شریر النفس لوگوں کی افتاد طبع ہے، وہ اصول سے ہٹ کر ذاتیات پر اتر آتے اور دعوتِ حق و صداقت کی دعوت کا جواب گالیوں سے دیتے۔

ءَ اُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ○ (۵۴/۲۵)

بھلا سوچو، کہ ہم سب، اتنے اتنے بڑے آدمی بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے اور خدا نے اپنی وحی کے لئے اِسے (حضرت صالحؑ کو) چن لیا! یہ تو ہمیں بالکل جھوٹا اور خودپسند نظر آتا ہے (جو بڑا بننے کے لئے، اپنے آپ کو، خدا کا رسول کہتا ہے)

اُدھر سے یہ دریدہ دہنی اور ادھر سے فقط اتنا جواب کہ:

سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ○ (۵۴/۲۶)

(ہم نے صالحؑ سے کہا کہ تو ان کی جگہ پاش باتوں سے افسردہ خاطر نہ ہو) کل ہی انہیں معلوم ہو جائے گا کہ جھوٹا اور خودپسند کون ہے!

(د) اسلاف پرستی

یہ ارباب قوت و ثروت کا رویہ تھا۔ ان کے ساتھ مذہبی پیشوا آگے بڑھے اور انہوں نے یہ کہہ کر عوام کے جذبات کو مشتعل کرنا چاہا کہ یہ شخص تمہیں تمہارے بزرگوں کے مذہب سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا
وَ اِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ○ (۱۱/۶۲)

اُنہوں نے کہا کہ اے صالحؑ! تم سے تو ہماری بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ (کہ تم اپنے بزرگوں کے سچے جانشین بنو گے، ہمارے معبودوں کا بول بالا کرو گے۔ اور اپنی قابلیت سے اِس مذہب کو دُور دُور تک پھیلاؤ گے لیکن تم نے اب ایسی باتیں شروع کر دیں جن سے ہماری تمام اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔ تم ذرا سوچو تو سہی کہ تم ہم سے کیا کہہ رہے ہو؟) تم ہم سے یہ کہتے ہو کہ ہم انہیں اپنا معبود ماننا چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے آباء اجداد کرتے چلے آئے ہیں۔ جس بات کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو، ہمیں تو اس کی صداقت میں بڑا ہی شک ہے۔ اور اس کی وجہ سے ہمارے دل میں بڑا اضطراب پیدا ہوتا ہے (کیونکہ وہ ہمارے اسلاف کے

مسلک کے خلاف ہے)۔

اس کے جواب میں حضرت صالحؑ نے کیا ارشاد فرمایا؟ وہی جو کورانہ تقلید کے مسلک کے پیرؤں کیلئے صحیح جواب ہو سکتا ہے!

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّىْ وَ اٰتٰىنِىْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِىْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ ۣ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِىْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ۝ (۱۱/۶۳)

اس پر (حضرت) صالحؑ نے کہا کہ اے میری قوم! کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ خدا نے مجھے وحی جیسی نعمت کبریٰ سے نوازا ہے، اور اس کی بنا پر میں صحیح راستے کی طرف راہ نمائی دینے والی روشن قندیل لئے کھڑا ہوں۔ اگر اس کے باوجود میں اس کے احکام سے سرکشی اختیار کروں تو مجھے اس کے قانونِ مکافات کی گرفت سے کون بچا لے گا؟ تم جو کچھ مجھ سے چاہتے ہو، اس سے تم میرے بھلے کی بات نہیں کرتے، بلکہ سراسر تباہی کی طرف لے جانے ہو۔

یعنی تم اپنے مسلک کی صداقت کے ثبوت میں یہ دلیل رکھتے ہو کہ یہ تمہارے آباء و اجداد سے متوارث چلا آرہا ہے اور میرے پاس میرے اللہ کی عطا فرمودہ وہ قندیل فروزاں ہے جس کی روشنی میں حق و باطل الگ الگ دکھائی دیتے ہیں۔ پھر کہئے کہ میں ایسی شمع نورانی کو چھوڑ کر اندھوں کی لاٹھی کے پیچھے کس طرح چل پڑوں؟

پھر یہ بھی دیکھئے کہ ایک پیغمبر بھی اپنے آپ کو قوانینِ الٰہیہ کی معصیت کے انجام سے محفوظ خیال نہیں کرتا اور قانونِ مکافات کا تقاضا بھی یہی ہے۔ یہ ہے وہ ایمان جس پر نظامِ خداوندی کی ثریا بوس عمارت مستحکم ہوتی ہے۔ یعنی اس نظام میں سب سے برگزیدہ و بلند ترین ہستی بھی اپنے آپ کو قانونِ خداوندی کا مطیع و فرمانبردار سمجھتی اور اس کی خلاف ورزی سے خوف کھاتی ہے۔ (اپنے مقام پر یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ حضور نبی اکرمؐ نے بھی یہی فرمایا تھا)۔ (۶/۱۵، ۱۰/۱۰، ۳۹/۱۳)

خفیہ سازشیں

ادھر سے تذکیر و موعظت اور ادھر سے تکذیب و تہدید ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی خفیہ سازشیں بھی، کہ اربابِ قوت و استبداد کے یہی حربے ہیں جو حق و صداقت کا گلا گھونٹنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔

وَ كَانَ فِى الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ وَ لَا يُصْلِحُوْنَ ۝ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَ اَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝ (۲۷/۴۸-۴۹)

(جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے) اس قوم کے دار السلطنت میں نو بڑے بڑے منتخب سردار تھے جن کے ذمے معاشرے کا

نظم و نسق تھا۔ وہی ان تمام شرارتوں کی جڑ تھے۔ وہ ملک میں ناہمواریاں پیدا کرتے رہتے تھے اور قوم کو کبھی اصلاح کیطرف آنے نہیں دیتے تھے۔

(چونکہ جس نظامِ عدل کی طرف صالحؑ دعوت دیتے تھے اس سے اُن اربابِ اقتدار کی مفاد پرستیوں پر زد پڑتی تھی، اس لئے وہی سب سے زیادہ اُس کی مخالفت کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی میٹنگ بلائی اور) آپس میں کہا کہ تم اللہ کی قسم اٹھاؤ کہ ہم سب مل کر، صالحؑ اور اس کے ساتھیوں پر رات کو حملہ کریں گے۔ اور ہم مقتولین کے وُرثاء کے سامنے صاف مُکر جائیں گے اور کہہ دیں گے کہ ہم نے انہیں ہلاک ہوتے دیکھا تک نہیں، اور ہم بالکل سچ کہتے ہیں۔

ایک اہم نکتہ اس مقام پر ذرا رکئے اور ایک اہم حقیقت پر غور کیجئے۔ یہاں کہا گیا ہے کہ ان لوگوں نے کہا کہ "تم اللہ کی قسم اٹھاؤ"۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ لوگ اللہ پر ایمان رکھتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ جب وہ اللہ پر ایمان رکھتے تھے تو انہیں اللہ پر ایمان لانے کی دعوت کیوں دی جاتی تھی۔ اس کی وضاحت سابقہ جلدوں میں کی جا چکی ہے۔ یہاں مختصر اشارہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ دین جب بگڑ کر مذہب کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو اس میں خدا پر ایمان تو ہوتا ہے لیکن اس خدا کا تصوّر وہ نہیں رہتا جو دین نے عطا کیا تھا۔ ان لوگوں کی حالت یہ تھی کہ وہ خدا پر ایمان رکھنے کے مدعی تھے، لیکن رزق کے سرچشموں کو اپنی ذاتی ملکیت میں لئے ہوئے تھے۔ حضرت صالحؑ انہیں جو خدا کی طرف دعوت دیتے تھے تو اس سے مراد یہ تھی کہ اُن کا اپنے تصوّر کے مطابق خدا پر ایمان، ایمان نہیں تھا۔ خدا پر ایمان کے معنی یہ تھے کہ حکومت صرف اس کے قوانین کی ہو..... اور رزق کے سرچشموں کا مالک بھی اُسی کو سمجھا جائے۔ یہ ہے فرق "مذہب" میں خدا پر ایمان، اور "دین" میں خدا پر ایمان میں؛ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم اہلِ کتاب کو بھی اللہ پر ایمان لانے کے لئے کہتا ہے۔ (۲/۱۳۷)؛ حتّٰی کہ مسلمانوں کو بھی (۲/۶۲؛ ۴/۱۳۶؛ ۵/۶۹؛ ۵۷/۲۸) [تفصیل سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے]

اب آگے بڑھئے۔ اس قوم کے مفسدین خفیہ سازش کر رہے تھے کہ حضرت صالحؑ اور ان کے ساتھیوں کو چپکے سے قتل کر دیا جائے۔ ان خفیہ تدابیر کا جواب لوحِ مکافات کی پیشانی پر ایک ہلکے سے تبسّم کے سوا کیا ہو سکتا تھا حضرت صالحؑ نے انہیں بار بار آگاہ کیا لیکن انہیں نہ ماننا تھا نہ مانے۔ حتّٰی کہ ان لوگوں نے، جو آنکھیں بند کئے ہلاکت و بربادی کے جہنم کی طرف بڑھتے جا رہے تھے، علانیہ کہنا شروع کر دیا کہ جاؤ! تم اس عذاب کو لے آؤ جس کی یوں دھمکی دیتے چلے آ رہے ہو!

۷/۷۷ وَ قَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝

اور صالحؑ سے کہا کہ اگر تم واقعی خدا کے پیغمبر ہو تو جس عذاب کی تم دھمکی دیتے تھے، اسے لا کر دکھاؤ۔

ناقۂ صالحؑ

انسان بھی کس قدر خود شکن واقع ہوا ہے! اپنی ہلاکت کو بُلا بُلا کر گھر دکھاتا ہے۔ ان کی پاداشِ عمل کا وقت آ پہنچا تھا۔ مہلت کی میعاد ختم ہو چکی تھی۔ لیکن آخری حجت کے طور پر حضرت صالحؑ نے کہا کہ دیکھو یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ تم احکامِ خداوندی کا احترام کرنا چاہتے ہو یا نہیں، ایک محسوس چیز تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمیں کھول کر بات نہیں بتائی گئی۔

حضرت صالحؑ نے جس محسوس شے کو بطور فیصلہ پیش کیا اس تک آنے سے پہلے یہ دیکھ لیجئے کہ مابہ النزاع بات کیا تھی۔ اُس زمانہ میں مویشی اور چراگاہیں۔ چشمے اور کھیت سب سے بڑی دولت ہوتے تھے۔ اربابِ اقتدار کی حالت یہ تھی کہ وہ چراگاہوں اور چشموں کو اپنے مویشیوں کے لئے مخصوص کر لیتے تھے اور کمزور انسانوں کے جانور بھوکے پیاسے مرجاتے تھے۔ حضرت صالحؑ کا پیغام یہ تھا کہ یہ چشمے اور چراگاہیں ربوبیتِ عامہ کے لئے خدا کی طرف سے بلا معاوضہ ملتی ہیں اس لئے انہیں تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے۔ وہ اس کی مخالفت کرتے تھے۔ ہزار رد وکد کے بعد انہوں نے اس کا اقرار کیا کہ ہم سب کے جانوروں کو یکساں طور پر چراگاہوں میں چرنے اور چشموں سے پانی پینے کی اجازت دیتے ہیں۔ حضرت صالحؑ نے کہا کہ اس کا عملی طریق یہ ہے کہ مختلف لوگوں کے جانوروں کی باریاں باندھ دی جائیں تاکہ نہ کسی پر زیادتی ہو نہ کسی کے حقوق میں کمی۔ انہوں نے اس پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا تو آپ نے کہا کہ اس بات کا عملی ثبوت (کہ تم اس معاہدہ کا احترام کرتے ہو یا نہیں) یہ ہے کہ یہ ایک اونٹنی ہے جس کے متعلق یوں سمجھو کہ یہ کسی کی ملکیت نہیں۔ خدا کی زمین اور خدا کی اونٹنی۔ اسے میں اس کی باری کے لئے چھوڑتا ہوں۔ اگر تم نے اسے آزاد چرنے دیا تو سمجھا جائے گا کہ تمہارے قلوب، قانونِ خداوندی کے احترام کی طرف مائل ہیں۔ اگر تم نے اسے ایذاء پہنچائی تو وہ اس امر کی دلیل ہو گی کہ تم اپنی روش پر قائم ہو۔ فرمایا۔

۷/۷۳ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (نیز ۱۱/۶۴)

لہ "خدا کی اونٹنی اور خدا کی زمین" بس یہ ہے دین کے معاشی نظام کا نقطۂ ماسکہ۔ نبی اکرمؐ کے ارشادِ گرامی کے مطابق

—— "اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے" (ابو داؤد)

یہ ایک اونٹنی ہے۔ تم اس کے متعلق یہ نہ دیکھو کہ یہ کس کی اونٹنی ہے۔ کسی سردار کی ہے یا غریب آدمی کی۔ بس یہ سمجھ لو کہ اسے اللہ نے پیدا کیا ہے۔ اور یہ اسی کی اونٹنی ہے۔ دوسری طرف یہ زمین ہے جسے اللہ نے پیدا کیا ہے۔ اسی لئے وہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔

مَیں اس اللہ کی اونٹنی کو، اللہ کی زمین میں، کھلے چھوڑتا ہوں تاکہ یہ اس میں چرے چُگے اور اپنی باری پر پانی پیئے (۹۱/۱۳)۔ اگر تم نے اسے اس طرح چرنے چُگنے دیا تو یہ اس امر کی علامت ہوگی کہ تم اپنی موجودہ روش سے باز آجانیکا ارادہ رکھتے ہو۔ لیکن اگر تم نے اسے نقصان پہنچایا تو اس سے ظاہر ہو جائیگا کہ تم اپنی غلط روش کو چھوڑنے والے نہیں۔ اس کے بعد، تم پر تباہی کا وہ عذاب آجائے گا جس کے ظہور کا وقت کچھ دُور نہیں۔ میری آنکھیں اسے بہت قریب دیکھ رہی ہیں۔

اس ناقہ کے لئے پانی پینے کی باری ٹھہرا دی۔

قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّ لَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۚ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ○ (۲۶/۱۵۵-۱۵۶)

ہم باریاں مقرر کر لیتے ہیں اور اس کا اعلان کر دیتے ہیں۔ یہ اُونٹنی اپنی باری پر پانی پیا کرے گی اور تمہاری اونٹنیاں اپنی باری پر۔ اگر تم نے اس کی باری کے دن، اسے پانی پینے سے روکا اور کوئی اذیت پہنچائی تو یہ اس کی علامت ہوگی کہ تم اپنی موجودہ روش سے باز نہیں آنا چاہتے۔ اور تمہاری یہ روش ایسی ہے جس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں۔

ان تمام حدود و شرائط سے مقصود یہ دیکھنا تھا کہ وہ احکامِ الٰہیہ کے احترام کا جذبہ اپنے دل میں رکھتے ہیں یا نہیں۔

اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ○ وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ○ (۵۴/۲۷-۲۸)

اور دیکھو، صالحؑ! ذرا ہمت سے کام لو، اور تھوڑا سا انتظار کرو۔ یہ اونٹنی، جس کے متعلق اُنہوں نے وعدہ کیا ہے کہ اسے اپنی باری پر پانی پینے اور چراگاہ میں چرنے دینگے، اُن کا جھوٹ اور سچ نکھار کر رکھ دے گی، اور جب یہ عہد شکنی کرینگے تو وہ ان کی تباہی کا موجب بن جائے گی۔

تم انہیں واضح طور پر بتا دو کہ اس معاہدہ کی رو سے طے یہ پایا ہے کہ ہر ایک کے مویشی اپنی اپنی باری پر پانی پیا کرینگے۔ اور اسطرح یہ اونٹنی بھی اپنی باری پر گھاٹ پر آیا کرے گی۔

اسی لیئے اس اونٹنی کو ایک "واضح نشانی" کہا گیا ہے کہ اس سے ان کی قلبی کیفیات و رجحانات محسوس و مشہود طریق سے بے نقاب ہو سکتے تھے یعنی اس سے معاملہ محض نظری نہیں رہا تھا، عملی ہو گیا تھا۔

وَ اٰتَیۡنَا ثَمُوۡدَ النَّاقَۃَ مُبۡصِرَۃً فَظَلَمُوۡا بِہَا ؕ وَ مَا نُرۡسِلُ بِالۡاٰیٰتِ اِلَّا تَخۡوِیۡفًا ﴿۱۷/۵۹﴾

(ان لوگوں کا مطالبہ ہے کہ اگر ان پر تباہی آنے والی ہے تو اس کی کوئی محسوس نشانی ان کے سامنے آنی چاہیئے۔ ان سے کہو کہ ہمارے لئے اس قسم کی نشانیاں بھیجنا کچھ مشکل نہیں۔ ہم اقوام سابقہ کی طرف بھی ایسی نشانیاں بھیجا کرتے تھے۔ جو ان کے لئے ظہورِ عذاب کی پیش خبری بن جاتیں۔ اسی طرح قوم ثمود کی طرف اونٹنی کو، اس قسم کی نشانی بنا کر بھیجا۔ یعنی اُن سے کہدیا کہ اگر انہوں نے اُس اونٹنی کو اُس کی باری پر پانی نہ پینے دیا تو اس امر کی نشانی ہو گی کہ وہ قانونِ خداوندی کی پاسداری نہیں کرنا چاہتے)۔

کھلی ہوئی سرکشی

کرنے کو تو ان لوگوں نے معاہدہ کر لیا لیکن سرمایہ پرستی، اور اقتدار خواہی کی لذت اتنی آسانی سے چھوٹا نہیں کرتی۔ اس لئے انہوں نے اپنے قول و اقرار کی ذرا بھی پرواہ نہ کی اور اونٹنی کو ہلاک کر دیا۔

۷/۷۷ فَعَقَرُوا النَّاقَۃَ وَ عَتَوۡا عَنۡ اَمۡرِ رَبِّہِمۡ وَ قَالُوۡا یٰصٰلِحُ ائۡتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿﴾

اُنہوں نے اُس اونٹنی کو کاٹ ڈالا اور اس طرح اس بات کا ثبوت دے دیا کہ وہ قانونِ خداوندی سے سرکشی برتنے سے باز نہیں آنا چاہتے اور صالحؑ سے کہا کہ اگر تم واقعی خدا کے پیغمبر ہو تو جس عذاب کی تم دھمکی دیتے تھے اسے لا کر دکھاؤ۔

اونٹنی کو کسی نے یونہی اتفاقیہ ہلاک نہیں کیا۔ ان سرکشی کرنے والوں نے خاص اہتمام سے اپنے سرغنہ کو بلایا اور اس نے بھرپور ہاتھ مار کر اُسے ہلاک کیا۔

فَنَادَوۡا صَاحِبَہُمۡ فَتَعَاطٰی فَعَقَرَ ﴿۵۴/۲۹﴾

اُنہوں نے جا کر اپنے رفیق (قبیلہ کے سردار) کو ماجرا سُنایا۔ (وہ سخت غصے میں آ گیا اور کہا کہ ہیں! اُس کی اونٹنی، ہمارے مویشیوں کے برابر ہو گئی؟) اُس نے بڑی جسارت سے اپنا ہاتھ بڑھایا، اور اُس اونٹنی کو ہلاک کر دیا۔

ہلاک کرنے کو تو کر گئے۔ لیکن جب اس کا احساس بیدار ہوا کہ ہم نے کس قدر پختہ عہد کیا تھا اور اب اس سے کس طرح بیدردی سے پھر گئے ہیں، تو دل میں کھٹک پیدا ہوئی۔

فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ٥ (۲۶/۱۵۷)

انہوں نے اس اونٹنی کو مارنے کو تو مار ڈالا، لیکن بعد میں سخت پشیمان ہوئے کہ اگر صالحؑ کی بات سچی نکلی تو پھر کیا ہوگا؟

چنانچہ وقت گزرتا گیا اور اس قوم کی سرکشی بڑھتی چلی گئی۔ ان کا معمول یہ ہو گیا کہ حضرت صالحؑ نے جو کچھ کہا انہوں نے اس کی تکذیب کی اور ہر طرح سے اس کی خلاف ورزی کی۔ حضرت صالحؑ نے آخر میں کہا کہ آتش فشاں پہاڑ تمہارے سر پر کھڑا ہے۔ یہ پھٹنا چاہتا ہے۔ اس سے بچ نکلنے کا سامان کرو۔ لیکن انہوں نے حسبِ معمول اس کا بھی مذاق اڑایا۔

فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِیْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ٥ (۱۱/۶۵)

صالحؑ نے ان سے کہا کہ تم اپنے گھروں میں تین دن تک اور بس لو، اس کے بعد تم پر تباہی آ جائے گی۔ یہ ایسا وعدہ ہے جو کبھی جھوٹا ثابت نہیں ہوگا۔ (چونکہ وہ صالحؑ کی کسی بات کو سچا نہیں مانتے تھے، اس لئے انہوں نے اسے بھی دھمکی ہی سمجھا)۔

غور کیجئے۔ انہیں تین دن پہلے بتایا جاتا ہے کہ اب تمہاری تباہی کے اسباب پیدا ہو رہے ہیں۔ لیکن وہ چونکہ ان کی ہر بات کو جھٹلاتے تھے اس لئے انہوں نے اس وعید کا بھی مذاق اڑایا۔ اور آنے والی تباہی کی کوئی پرواہ نہ کی[1]

اس کے بعد؟

ہلاکت انگیز عذاب! اس کے بعد وہ کچھ ہوا جس کے تصور سے آج بھی ہر قلب سلیم سینے میں دھڑکنے لگ جائے اور ہر دیدۂ عبرت چشم حیراں بن جائے۔ ان آگ سے بھرے ہوئے (آتش فشاں) پہاڑوں میں ایک دھماکا ہوا جس سے ایک چیخ۔ ایک گرج۔ ایک کڑک کی آواز فضا میں گونجی اور قوم ثمود کی بستیاں راکھ کا

---

[1] جیسا کہ ہم تذکرۂ حضرت نوحؑ کے ضمن میں بھی لکھ چکے ہیں کہ ان حوادث کے متعلق حضرات انبیائے کرامؑ کو قبل از وقت معلوم ہو جاتا تھا۔ (خواہ فراست کی بنا پر، یا وحی خداوندی کی رُو سے) وہ اپنے اس علم کو چھپا کر نہیں رکھتے تھے بلکہ اس کا اعلان کر دیتے تھے لیکن چونکہ قوم ان کی ہر بات کا مذاق اڑاتی تھی اس لئے ان کے اس اعلان کو بھی سنجیدگی سے (SERIOUSLY) نہیں لیتی تھی اور اپنی حفاظت کا سامان نہیں کرتی تھی۔ اس لئے تباہ ہو جاتی تھی۔

ڈھیر ہو کر رہ گئیں۔

۷/۷۸ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ۝

سو ایک لرزا دینے والی تباہی (شدید زلزلہ ۱۱/۶۷) نے اُنہیں گھیر لیا اور وہ اپنے مکانوں میں بے حس و حرکت پڑے رہ گئے۔

یہاں اس عذاب کو "لرزہ انگیز دہشت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسری جگہ اسے زور کی کڑک سے موسوم کیا گیا ہے۔

وَاَخَذَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الصَّیْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دِیَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ۙ كَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا ؕ اَلَاۤ اِنَّ ثَمُوْدَاۡ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ۝ (۱۱/۶۷-۶۸) نیز (۱۵/۸۳-۸۴) و (۴۱/۱۷) نیز (۵۴/۳۱-۲۹)

اور ان سرکش لوگوں کو ایک زور کی کڑک نے آ لیا اور اپنے گھروں میں بے حس و حرکت پڑے رہ گئے۔ (نیز ۹۱/۱۴-۱۵ ؛ ۱۵/۸۳-۸۴ ؛ ۵۴/۳۱-۲۹ ؛ ۴۱/۱۷)۔ اور وہ گھر اس طرح ویران ہو گئے گویا یہ لوگ اُن میں کبھی بسے ہی نہ تھے۔ یاد رکھو! ثمود نے قوانین خداوندی سے انکار و سرکشی کی راہ اختیار کر رکھی تھی۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ گئے۔

اللہ کی تدبیر قوم ثمود نے حضرت صالحؑ کے خلاف ایک خفیہ تدبیر کی تھی وہ تو ناکام و نامراد رہی اور قانونِ مکافات کی وہ تدبیر جو یوں اُن کے پاؤں کے نیچے پختگی کو پہنچ رہی تھی اس طرح اُبھری کہ کوئی اُبھرنے والا سامنے نہ رہا۔

وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ۝ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝ فَتِلْكَ بُیُوْتُهُمْ خَاوِیَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝ (۲۷/۵۰-۵۲)

وہ ادھر یہ تدبیر سوچ رہے تھے، اور ہم اپنے قانونِ مکافات کی رُو سے، ایک اور تدبیر کر رہے تھے جس کا اُنہیں شعور و احساس تک نہ تھا۔

سو تم دیکھو کہ اُن کی تدبیر کا انجام کیا ہوا اور خدا کی تدبیر نے کیا کیا؟ (صالحؑ اور اس کی جماعت تو صحیح و سلامت رہی) اور وہ مفسدین، اور اُن کی قوم، سب تباہ و برباد ہو گئے۔

یہ ہیں ان کی بستیاں جو آج تک ویران پڑی ہیں۔ اور یہ سب اس لئے ہوا کہ وہ لوگوں پر ظلم کرتے تھے

اس سرگزشت میں اُن لوگوں کے لئے سامانِ عبرت ہے جو علم و بصیرت سے کام لیتے ہیں۔

وہ اس ہلاکت و تباہی کے خوفناک طوفانِ آتشیں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے لیکن اتنے عاجز و بے بس تھے کہ اپنی حفاظت کا کوئی سامان نہ کر سکے اور اس آفتِ جہاں سوز سے راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گئے۔

وَفِيْ ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ ○ فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ○ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ وَّمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ ○ (۵۱/۴۵-۴۳)

اور قومِ ثمود کے واقعہ میں بھی (اسی طرح ہمارے قانونِ مکافات کی نشانیاں ہیں)۔ ہم نے انہیں مہلت دی اور کہا کہ اس مدت میں وہ سامانِ زیست سے اچھی طرح فائدہ اٹھالیں۔

لیکن انہوں نے مہلت کے اس وقفے سے فائدہ نہ اٹھایا اور قوانینِ خداوندی سے سرکشی اختیار کر لی۔ چنانچہ (ظہورِ نتائج کا وقت آیا تو) دیکھتے ہی دیکھتے، انہیں ایک ہولناک زلزلہ نے آپکڑا۔ (ان کے متکبرانہ دعوے سب خاک میں مل گئے) اور ان میں اتنی سکت بھی نہ رہی کہ گرنے کے بعد، ایک بار پھر اٹھ کھڑے ہوتے ——— یا اپنی مدد کے لئے کسی کو بلا سکتے ——— خدا کے قانونِ مکافات کے خلاف مدد کون دے سکتا ہے؟[1]

ہلاکت اور ایسی ہلاکت! تباہی اور اس قدر تباہی!!

وَعَادًا وَّثَمُوْدَا وَاَصْحٰبَ الرَّسِّ وَقُرُوْنًا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ○ وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ○ (۲۵/۳۹-۳۸) نیز (۵۳/۵۱ ؛ ۶۹/۵)

اور اسی طرح، قومِ عاد اور ثمود اور اصحاب الرس کا انجام بھی ایسا ہی ہوا۔ اور دیگر بہت سی اقوام کا بھی، جو اُن کے درمیان ہو گزریں۔

ان تمام اقوام کے سامنے ہم، تاریخی شواہد پیش کر کے، بتاتے رہے (کہ قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتنے کا انجام کیا ہوتا ہے، لیکن انہوں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی اور اپنی غلط روش پر اڑے رہے اور (آخر الامر) ہمارے قانونِ مکافات کی رو سے تباہ اور برباد ہو گئے۔ (نیز ۵۳/۵۱ و ۶۹/۵)۔

---

[1] ظاہر ہے کہ جب حضرت صالحؑ نے انہیں قبل از وقت آگاہ کر دیا تھا تو اگر وہ ان کی بات کو درخورِ اعتنا سمجھتے اور وہاں سے نکل جاتے تو اس تباہی سے محفوظ رہتے جیسے حضرت صالحؑ اور ان کی جماعت اسی طرح اس تباہی سے محفوظ رہی تھی کہ وہ قبل از وقت وہاں سے نقل مکانی کر گئے تھے۔

وہ تباہی جو آج بھی ہر سننے والے کے لئے وجۂ ہزار عبرت و موعظت ہے۔

فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۝ (۲۶/۱۵۸-۱۵۹)

اور صالحؑ کی بات سچی نکلی ـــــ اسے سچا نکلنا ہی تھا ـــــ چنانچہ ان پر تباہی آگئی۔ (جو قوم بھی دوسروں کو خدا کے دیئے ہوئے سامان زیست سے محروم رکھے گی، اس پر تباہی آجائے گی)۔ اس واقعہ میں بھی غور و فکر کرنیوالوں کے لئے ہزار سامان عبرت و موعظت ہے۔ لیکن اس کے باوجود، ان میں سے اکثر، خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان نہیں لائیں گے۔

(لیکن اس سے خدا کا کیا بگڑے گا؟) اُس کا قانون بڑی قوتوں کا مالک ہے۔ وہ ان پر غالب آکر رہے گا، اور ایسا نظام قائم ہوگا جس میں خدا کا عطا کردہ سامانِ رزق تمام مخلوق کی نشو و نما کے لئے عام ہو۔ قانونِ خداوندی عزیز ہے ظالموں کے لئے، رحیم ہے مخلوقِ خدا کے لئے نیز (۶/۴۵)

یہاں آیت کے اخیر میں، خدا کے "عزیز و رحیم" ہونے کا ذکر خاص طور پر آیا ہے۔ عزیز تو صاحبِ غلبہ کو کہتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل سے بڑھ کر غلبہ و اقتدار کس کا ہو سکتا ہے؟ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ ایسا کرنا خدا کی صفتِ رحیمیت کا بھی تقاضا تھا۔ یہ نکتہ غور طلب ہے؟ ان کی ہلاکت، رحمتِ خداوندی کا تقاضا اس لئے تھی کہ خدا نے تمام نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے سامانِ رزق کو سطحِ ارض پر بکھیر رکھا ہے۔ لیکن مستبد قوتیں انہیں اپنے قبضے میں لے لیتی ہیں اور مخلوقِ خدا بھوکوں مرتی رہتی ہے۔ ان لوگوں کو ہزار سمجھایا کہ وہ دوسرے لوگوں کو اللہ کے دیئے ہوئے رزق سے محروم نہ کریں لیکن انہوں نے ایک نہ مانی۔ اب اس کے بعد دو ہی صورتیں باقی تھیں۔ یا تو ان لوگوں کو اسی طرح چھوڑ دیا جاتا اور باقی انسانوں کو بھوکوں مرنے دیا جاتا۔ اور یا ان لوگوں کو راستے سے ہٹا کر، عام انسانوں کو رزق کے سرچشموں تک پہنچنے دیا جاتا۔ رحمتِ خداوندی (خدا کی ربوبیتِ عامہ کی اسکیم) کا تقاضا یہی تھا کہ ان مستبد قوتوں کو راستے سے ہٹا کر رزق کو عام کر دیا جائے۔

سورۃ الشمس میں اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَا ۝ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ۝ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْیٰهَا ۝ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۝ فَدَمْدَمَ عَلَیْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ۝ وَلَا یَخَافُ عُقْبٰهَا ۝ (۹۱/۱۱-۱۵)

(اس حقیقت پر تاریخی واقعات بھی شاہد ہیں۔ مثلاً) قوم ثمود نے اپنی سرکشی کی وجہ سے اس قانون کو جھٹلایا۔ اور اسکی مخالفت کے لئے وہ شخص، اُن کے لیڈر کی حیثیت سے سامنے آیا، جو ان میں سب سے شقی القلب اور بدبخت تھا۔

اُن کے رسول نے اُن سے کہا تھا کہ خدا کے عطا کردہ رزق کے سرچشموں کو، ربوبیت عامہ کے لئے کھلا رہنے دو ــــــ اس کی نشانی یہ ہے کہ اِس اونٹنی کو ــــــ جس کے متعلق یوں سمجھو کہ یہ کسی فرد کی اُونٹنی نہیں، کہ اس کے مالک کی حیثیت کی نسبت سے اس کے ساتھ برتاؤ کیا جائے۔ یہ ــــــ "خدا کی زمین پر خدا کی اونٹنی ہے" اسے اس کی باری پر پانی پینے دو۔ (نیز ۲۶/۱۵۵ ذ ۷/۳)

اُنہوں نے اس بات کا وعدہ تو کرلیا لیکن پھر اپنے قول و اقرار سے پھر گئے، اور اُس اونٹنی کو ہلاک کر دیا۔ (اور یوں ثابت کر دیا کہ وہ خدا کے نظامِ ربوبیت کی مخالفت سے باز نہیں آئیں گے)۔

تو ان کی اس روش کے نتیجے میں، خدا کے قانونِ مکافات کا دمدمہ آیا اور انہیں تہس نہس کر کے زمین کے ساتھ ہموار کر کے رکھ دیا۔ (انہیں پیس کر خاکِ راہ گزر بنا دیا)۔

اور ایسا کرتے وقت وہ (خدا) اس بات کے احساس سے قطعاً نہیں گھبرایا کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس لئے کہ یہ بات ظلم اور نا انصافی کی نہیں تھی، بلکہ ان کے اعمال کا فطری نتیجہ تھا جو اُن کے سامنے آگیا۔ (لہٰذا قانونِ خداوندی کے لئے اِس میں تذبذب، پشیمانی، اضطراب یا تأسّف کی کوئی بات نہیں تھی۔ قانونِ عدل اِس قسم کے جذبات سے بلند ہوتا ہے)۔

قانونِ مکافات کی ہمہ گیری

آپ آخری آیت پر غور فرمائیے اور دیکھئے کہ اس میں خدائے کائنات کی سطوت و جبروت اور اس کے قانون کی ہمہ گیری و نفاذ پذیری کس شوکت و اجلال سے ہیبت فگن اور لرزہ انگیز ہے۔ اس کے ساتھ ہی بِذَنْۢبِهِمْ کا ٹکڑا اُبھر اُبھر کر گواہی دے رہا ہے کہ یہ شانِ جبروت و کبریائی (معاذاللہ) ایک مستبد و مطلق العنان بادشاہ کی لاپرواہی اور بدمستی کی مظہر نہیں بلکہ اس قوت و اقتدار کی آئینہ دار ہے جس کی رُو سے نظامِ کائنات اس نظم و ضبط اور عدل و انصاف سے چل رہا ہے۔ جس میں ایک ذرّہ جیسے مقدار سے لے کر عظیم الشّان کُرّوں تک ذراسی خلاف ورزی احکام کی مجال نہیں رکھتے۔ اور جب خارجی کائنات میں اس کے نظامِ عدل کی یہ کیفیت ہے تو انسانی اعمال، قانونِ جزا و سزا کی گرفت سے کیسے باہر جا سکتے ہیں؟ اور جب اس قانون کے تحت اس کا فیصلہ نافذ ہوتا ہے تو اس پر کسی قسم کے جذبات اثرانداز نہیں ہوسکتے کہ وہ جہاں رحمٰن و رحیم ہے وہاں مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ

بھی ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ذرا اس پردۂ ساز کو اٹھا کر دیکھا جائے تو اس کا مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (قانونِ مکافاتِ عمل کا حاکمِ مطلق) ہونا بھی دراصل اس کی رحمت ہی کا ایک گوشہ ہے کہ اگر قانونِ مکافات اس طرح بے لوث طریق پر نافذ العمل نہ ہو تو کائنات میں فساد برپا ہو جائے۔ لہٰذا وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا وہ محورِ عظیم ہے جس کے گرد تمام نظامِ کائنات گردش کر رہا ہے۔ خارجی کائنات بھی اور خود انسانوں کا معاشرتی اور اجتماعی نظام بھی۔ جس کا فیصلہ عدل اور رحمتِ عامہ کے تقاضوں کے مطابق ہو، اسے اپنے فیصلے کے عواقب سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہوتی (قانون بنانے والے اور قانون کو نافذ کرنے والے کے لئے ہونا ہی ایسا چاہیئے کہ وہ جذبات سے متاثر نہ ہو۔

جماعتِ مومنین کو بچا لیا گیا

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ان لوگوں سے تین دن پہلے کہہ دیا گیا تھا کہ ہلاکت بہت قریب آرہی ہے یعنی حضرت صالحؑ کو اس آنے والے حادثہ کا علم پہلے سے دے دیا گیا تھا۔ چنانچہ حضرت صالحؑ اپنی جماعتِ مومنین کو ساتھ لے کر کسی محفوظ مقام کی طرف چلے گئے۔

۷/۷۹ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ○

(اس قوم پر یہ تباہی اس وقت آئی) جب صالحؑ، ان سے کنارہ کش ہو چکا تھا۔ جاتے وقت اُس نے ان سے کہا تھا کہ اے میری قوم! میں نے اپنے نشو و نما دینے والے کا پیغام تم تک پہنچایا، اور چاہا کہ تم کسی طرح تباہی سے بچ جاؤ۔ لیکن تمہیں میری خیر خواہی خوش نہ آئی۔ سو تم اپنی سرکشی کے نتائج بھگتو۔ میں بصد تأسف تم سے الگ ہو رہا ہوں۔

دوسرے مقام پر ہے۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ○ (۱۱/۶۶)۔ نیز (۲۷/۵۳ ؛ ۴۱/۱۸)

چنانچہ جب ظہورِ نتائج کا وقت آگیا تو ہم نے صالحؑ کو اور اس کے اُن ساتھیوں کو جو صاحبِ ایمان تھے، اپنی رحمت سے، اُس رسواکُن عذاب سے بچا لیا۔ یقیناً تیرے خدا کا قانون بڑا ہی طاقتور اور غالب رہنے والا ہے (نیز آیات ۲۷/۵۳ ؛ ۴۱/۱۸)۔

ان بقایائے ثمود سے جو نسل آگے بڑھی انہیں ثمودِ ثانیہ کہا جاتا ہے۔

یہ ہے قومِ ثمود کی داستانِ عبرت انگیز جو ہر صاحبِ علم و بصیرت کے لئے اپنے اندر سامانِ بصیرت رکھتی ہے اور جن کی اُجڑی ہوئی بستیاں ہر رہ گذر سے پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ ع

دیکھو، ہمیں جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو!

فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوا ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ○ (۲۷/۵۲)

یہ ہیں اُن کی بستیاں جو آج تک ویران پڑی ہیں۔ اور یہ سب اس لئے ہوا کہ وہ لوگوں پر ظلم کرتے تھے۔ اس سرگذشت میں ان لوگوں کے لئے سامانِ عبرت ہے جو علم و بصیرت سے کام لیتے ہیں۔

اسی داستان کو قرآنِ کریم نے بغیر نام لئے سورۂ المؤمنون کی چند آیات میں سمٹا کر بیان کر دیا ہے۔ قومِ نوحؑ کی غرقابی کے بعد ارشاد ہے۔

ثُمَّ أَنْشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ ○ .... ثُمَّ أَنْشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قُرُونًا آخَرِينَ ○ (۲۳/۳۱-۴۲)

قومِ نوحؑ کے بعد ہم نے قوموں کا ایک اور دَور شروع کر دیا۔

چنانچہ (اس کے بعد آنے والی) قوم میں بھی ہم نے اپنا رسول بھیجا، جس نے اسی پیغام کو دُہرایا یعنی یہ کہ تم صرف خدا کی اطاعت اختیار کرو۔ اس کے سوا اور کوئی ہستی ایسی نہیں جس کی محکومیت اختیار کی جائے ہر قسم کا اقتدار صرف خدا کو حاصل ہے۔ سو تم بتاؤ کہ تم اُس کے قوانین کی نگہداشت کرنے کے لئے تیار ہو یا نہیں۔ (اگر تم نے ایسا کر لیا تو اپنی موجودہ غلط روش کی تباہیوں سے بچ جاؤ گے)۔

اس کی قوم کے اُن اکابرین نے جنہوں نے قوانینِ خداوندی سے انکار اور سرکشی کی راہ اختیار کر رکھی تھی، جو خدا کے قانونِ مکافات اور مستقبل کی زندگی کے قائل نہیں تھے، اور جنہیں سامانِ زندگی کی فراوانیاں حاصل تھیں (اور وہ دیکھتے تھے کہ نظامِ خداوندی کی زد اُن کے ذاتی مفادات پر پڑے گی، مخالفت کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُنہوں نے) اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ یہ شخص (جو خدا کا پیغامبر ہونے کا مدعی ہے) تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہے۔ یہ بھی وہی کچھ کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو، وہی کچھ پیتا ہے جو تم پیتے ہو۔ (یہ تم سے، کس حیثیت سے ممتاز ہے جو تم اس کی بات مانو!)

اگر تم نے اس، اپنے ہی جیسے انسان، کی اطاعت اختیار کر لی، تو سمجھ لو کہ تم تباہ ہو گئے۔ (اطاعت اُس کی اختیار کرنی چاہیئے جو فوق البشر خصوصیات کا حامل ہو ــــ اُسے البشر کا اوتار، یا ظل اللہ علی الارض ہونا چاہیئے۔ ایک عام انسان کی اطاعت کے کیا معنی ہ پھر جس نظام کی طرف یہ دعوت دیتا ہے ــــ یعنی انسانی تکریم و مساوات کا نظام ــــ اس میں سراسر تمہارا نقصان ہے)۔

(دولت تمہارے پاس۔ اقتدار تمہارے پاس۔ تم جو چاہو سو کرو۔ تمہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ لیکن یہ کہتا ہے کہ نہیں! خدا کا قانونِ مکافات ایسا ہے جس کی گرفت سے تم بچ نہیں سکتے۔ حتیٰ کہ مرنے کے بعد بھی تم اس کے احاطہ سے باہر نہیں جا سکتے۔ اسی لئے یہ) تمہیں دھمکیاں دیتا رہتا ہے کہ جب تم مر جاؤ گے اور مٹی اور ہڈیوں کا ڈھیر رہ جاؤ گے، تو تم پھر دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے جاؤ گے (تاکہ جو ظلم اور زیادتی تم دنیا میں کرتے رہے ہو، اس کی تمہیں سزا ملے)۔

ذرا سوچو کہ یہ کیسی اَنہونی بات ہے! کیسی عقل سے دُور اور قیاس سے بعید بات جس سے یہ تمہیں ڈرا رہا ہے۔

(مرنے کے بعد پھر زندہ ہونا کیسا؟) زندگی، بس اسی دُنیا کی زندگی ہے (ہماری آنکھوں کے سامنے ہر روز) لوگ مرتے رہتے ہیں اور نئے بچے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ (یہ سب اسی دنیا میں ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ غلط ہے کہ) ہم مرنے کے بعد پھر اٹھائے جائیں گے۔[1]

یہ شخص، اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنی طرف سے جھوٹی باتیں بناتا ہے اور انہیں اللہ کی طرف منسوب کر دیتا ہے ہم اس کی بات کبھی نہیں ماننے کے۔

اُس رسولؑ نے خدا سے کہا کہ اے میرے پروردگار! یہ لوگ میری بات سُنتے ہی نہیں، اور اندھا دھند تکذیب کئے جا رہے ہیں۔ تو اُن کے خلاف میری مدد کر۔

خدا نے کہا کہ (ان کی مہلت کا وقفہ ختم ہونے کو ہے)۔ عنقریب ان کے اعمال کے نتائج ان کے سامنے آ جائیں گے، اور یہ اپنی ان باتوں پر خود ہی پشیمان ہونگے۔

---

[1] مادی تصورِ حیات (MATERIALISTIC CONCEPT OF LIFE) کچھ ہمارے ہی دور کی اختراع نہیں۔ یہ تصور بہت پرانا ہے۔

(چنانچہ زیادہ وقت گزرنے نہ پایا تھا کہ) ایک ہولناک آواز کے عذاب نے انہیں آپکڑا۔ اور ہم نے انہیں خس و خاشاک کی طرح پامال کر دیا۔ (کیونکہ وہ ہمارے تعمیری نتائج پیدا کرنے والے پروگرام کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل تھے (۱۱/۶۸)۔

سو دیکھو کہ جو لوگ ظلم واستبداد کی روش اختیار کرتے ہیں، وہ کسطرح زندگی کی کامرانیوں اور خوشگواریوں سے محروم رہ جاتے ہیں (یہ ہمارا اٹل قانون ہے جو شروع سے ایسا ہی چلا آرہا ہے۔ اور حق وانصاف پر مبنی ہے)۔

پھر اُن کے بعد، ہم نے اور قوموں کا دور شروع کیا۔

اور اس کے بعد وہ نقطۂ ماسکہ جو قوموں کی موت وحیات کے لئے ایک اٹل قانون کی حیثیت لئے ہوئے ہے یعنی:

مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَ مَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ۝ (۲۳/۴۳)

(وہ بھی اسی طرح اپنی غلط روش کے نتائج کی وجہ سے تباہ ہوگئیں۔ یاد رکھو! ہمارے قانونِ مکافات کی رُو سے) نہ تو کوئی قوم ظہورِ نتائج سے پہلے تباہ ہوتی ہے، نہ ہی ایسا ہوسکتا ہے کہ وہ ظہورِ نتائج کے بعد زندہ رہ سکے اس میں کمی بیشی ہو نہیں سکتی۔ (۷/۳۴ ؛ ۱۳/۳۸ ؛ ۱۵/۵)

یہ وقتِ معین (اجل) کسی قوم کے اجتماعی اعمال کے ظہورِ نتائج کا نام ہوتا ہے (اس کی تفصیل سابقہ جلد میں گزر چکی ہے۔ دیکھئے انڈکس)۔

سورۂ مومنون (۲۳) کی مندرجۂ صدر آیات کو ایک بار پھر سامنے لائیے۔ ان میں کہا گیا ہے کہ وہ لوگ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو قوم صرف اس زندگی کو آخری زندگی سمجھے وہ کبھی اپنی عیش سامانیوں کو چھوڑ کر نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے جدوجہد کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوسکتی۔ اس کے لئے تو صرف وہی آمادہ ہوسکتا ہے جو یہ سمجھے کہ زندگی کو مسلسل آگے چلنا ہے اور اگلی زندگی میں خوشگواریوں کا معیار یہ ہے کہ اس نے اس زندگی میں دوسروں کی پرورش کے لئے کیا کیا ہے؟ یہ وجہ ہے کہ قرآن سرمایہ پرستی کے خون آشام نظام کو مٹانے کے لئے ایمان بالآخرۃ کو بنیادی تصور قرار دیتا ہے۔ (تفصیل قرآن کے معاشی نظام کے عنوان کے تابع سابقہ جلدوں میں ملے گی)۔

رسول اَجرِ رسالت نہیں مانگتا

قوم ثمود کا قصہ یہیں تک ہے۔ لیکن دو ایک مقامات ایسے ہیں جن پر آگے بڑھنے سے پیشتر مزید غور و تفکر کی ضرورت ہے۔

آپ نے حضرت نوحؑ اور حضرت ہودؑ کے تذکرہ میں دیکھا ہوگا کہ قرآن کریم نے ان حضرات کا یہ قول خصوصیت سے درج کیا ہے کہ "میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا اجر اللہ کے ہاں ہے"۔ حضرت صالحؑ کے تذکرہ میں بھی اس چیز کو دُہرایا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۞ (۲۶/۱۴۵)

اور دیکھو! میں اس بات کا تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔ میرا معاوضہ خدا کی ربوبیتِ عالمینی کے ذمّے ہے۔

یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے جس کا قرآنِ کریم نے یوں تکرار ذکر کیا ہے۔ ایک داعیِ الی الحق کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی دعوتِ رشد و ہدایت کا معاوضہ کچھ نہیں چاہتا۔ اس کے نزدیک تبلیغ پیامات الہٰیہ اور قیامِ نظامِ خداوندی کے لئے جدّوجہد ایک اہم فریضہ ہے جس کی ادائیگی اس پر لازم آتی ہے۔ اس لئے وہ انسانوں سے اس کا کوئی اجر یا معاوضہ نہیں مانگتا۔ اور یہ اس داعیٔ الی الحق کے عدیم النظیر کیریکٹر کی درخشندگی کی دلیل ہے۔ تفصیل اس کی سابقہ باب (سورۃ الانعام) میں گزر چکی ہے۔

ناقۃ اللہ

دوسری چیز یہ کہ اس اونٹنی کو جس کا ذکر قصّۂ حضرت صالحؑ میں آیا ہے ناقۃ اللہ سے موسوم اور "آیت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۷/۷۳ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۞ (۷/۷۳)

صالحؑ نے ان سے کہا کہ یہ ایک اونٹنی ہے، جس کے متعلق یہ سمجھو کہ یہ کسی کی ملکیت نہیں ——— خدا کی زمین اور خدا کی اونٹنی ——— میں اسے کھلا چھوڑتا ہوں کہ یہ چراگاہ میں آزادانہ چرے۔ اگر تم نے اسے آزادانہ چرنے دیا تو یہ اس بات کی نشانی ہوگی کہ تم اپنے عہد پہ پابند ہو۔ اگر تم نے اِسے کوئی گزند پہنچائی تو اس سے واضح ہو جائے گا کہ تم اپنی سابقہ روش سے باز نہیں آئے۔ اس کا نتیجہ تمہارے لئے الم انگیز تباہی ہوگا۔

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اس اونٹنی کو نَاقَۃُ اللہ کیوں کہا گیا تھا اور وہ کس بات کی نشانی تھی۔ اس حقیقت کو اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اونٹنی، عام اونٹنیوں جیسی اونٹنی تھی۔ قرآن نے کہیں یہ نہیں کہا کہ اس کی تخلیق غیر معمولی انداز سے بطور خرقِ عادت ہوئی تھی۔ محض آیت کے لفظ سے یہ کہنا کہ اس کی پیدائش معجزانہ طور پر ہوئی

تھی، قرآن کے اسلوب بیان اور حقیقی تعلیم سے بیگانگی کی دلیل ہے۔ قرآن نے کشتیِ حضرت نوحؑ کے متعلق بھی فرمایا کہ وہ آیت (نشانی) تھی۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَ اَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَجَعَلْنٰهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (۲۹/۱۵)

مخالفین غرق ہوگئے۔ اور نوحؑ اور اس کے ساتھیوں کو، جو کشتی میں سوار ہوگئے تھے، ہم نے اس تباہی سے محفوظ رکھا۔

اس واقعہ میں اقوامِ عالم کے لئے ہمارے قانونِ مکافات کی صداقت کی نشانی ہے (جو یہ بتاتی ہے کہ سرکش اور ظالم اقوام کا حشر کیا ہوا کرتا ہے۔

حالانکہ وہ عام طریقہ کے مطابق ہی تیار ہوئی تھی۔ خانہ کعبہ کے متعلق بھی فرمایا ہے کہ

فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ (۳/۹۶)

اس میں کھلی کھلی نشانیاں ہیں۔

کعبہ بھی آیت ہے

اور یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ خدا کے اس گھر کی تعمیر میں بھی کسی خرقِ عادت واقعہ کا دخل نہ تھا۔ معمارِ حرم (علیہ السلام) نے اس کی تعمیر اسی طرح کی تھی جس طرح اور مکانوں کی کی جاتی ہے۔ لیکن وہ ملّتِ حنیفہ کے لئے مرکزِ محسوس اور ان کی موت و حیات کے پرکھنے کی ایک کھلی ہوئی علامت (آیت) ہے[1] جس طرح قومِ ثمود سے کہا گیا تھا کہ یہ ناقۃ اللہ تمہارے کفر و ایمان پرکھنے کی ایک نشانی ہے۔ اگر تم نے اس کی حفاظت کی تو یہ تمہاری اِنَابَت اِلَی اللہ کی نشانی ہوگی اور اگر اسے ضرر پہنچایا تو اس سے تمہارا انکار وجحود واضح ہو جائے گا۔ اسی طرح ملّتِ اسلامیہ کی ایمانی قوت و ضعف کے پرکھنے کا معیار بیت اللہ ہے۔ اگر ان میں بیت اللہ کی حفاظت کی ہمت رہی (یعنی اس نظام کی حفاظت جس کا مرکزِ محسوس کعبہ ہے) تو یہ ان کی ملّی زندگی اور حرارتِ ایمانی کی دلیل ہوگی۔ اور اگر اس پر دوسروں کا اثر غالب آگیا تو یہ ان کی اسلامی موت کی نشانی (آیت) ہوگی۔ قومِ ثمود نے ناقۃ اللہ کی حفاظت نہ کی اور اللہ کے رسواکن عذاب میں گرفتار ہوگئے۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ۝ (۱۱/۶۶)

---

[1] کعبہ کے متعلق تفصیل "کعبہ"۔ "ابراہیم"۔ "حج" کے عنوانات دیکھئے۔

چنانچہ جب ظہورِ نتائج کا وقت آگیا تو ہم نے صالحؑ کو اور اُس کے اُن ساتھیوں کو جو صاحبِ ایمان تھے، اپنی رحمت سے، اس رسوا کن عذاب سے بچا لیا۔ یقیناً تیرے خدا کا قانون بڑا ہی طاقتور اور غالب رہنے والا ہے۔

اور ہم بیت اللہ کی حفاظت کے قابل نہ رہے تو ذلت و رسوائی کا عبرت انگیز عذاب ہم پر مسلّط ہوگیا۔ اور قوم ثمود کی طرح اُس نوّے کروڑ "ہجوم مومنین" کی یہ حالت ہوگئی کہ

فَاَصْبَحُوْا فِیْ دِیَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ۝ كَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا (۱۱/۶۷-۶۸)

جب صبح ہوئی تو سب اپنے گھروں میں اوندھے پڑے تھے۔ گویا ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے۔

ہم اپنے دیار و امصار میں یوں مُردوں کی طرح اوندھے پڑے ہیں گویا ان میں کبھی زندوں کی طرح بسے ہی نہ تھے!

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً (۲۶/۱۵۸)

یقیناً اس میں ایک عظیم نشانی ہے۔

وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ (۲۶/۱۵۸)

اور (حقیقت یہ ہے کہ) ان میں اکثر ایمان لانے والے نہیں۔

حقیقت یہی ہے کہ ہم میں سے اکثر ان حقائق و عبر پر "ایمان" نہیں رکھتے۔ یونہی سرسری طور پر پڑھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ خود ہماری ہی عبرتناک داستان ہے۔ کسی اور کا قصہ نہیں۔

اس ضمن میں اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ جس چیز کی نسبت خدا اپنی طرف کرتا ہے اس سے بالتخصیص یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ وہ تمام نوعِ انسانی کے مشترکہ فائدے کے لئے ہے۔ اس پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ قوم ثمود کے اکابر مویشیوں کی نسبت امیروں اور غریبوں کی طرف کر کے، غریبوں کے مویشیوں کو چشموں کے قریب نہیں آنے دیتے تھے۔ جب ان سے اس بات پر معاہدہ ہوا کہ یہ چشمے اور چراگاہیں سب کے مویشیوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رہیں گے تو اس کیلئے علامت و نشان یہ کہا گیا کہ یہ ایک اونٹنی ہے جس کے متعلق یہ سمجھو کہ یہ نہ کسی امیر آدمی کی ہے۔ نہ غریب کی۔ یہ خدا کی مخلوق ہے اس لئے اسے خدا کی زمین میں چرنے کا حق ہے نَاقَةُ اللّٰهِ اور اَرْضِ اللّٰهِ میں یہی خصوصیت مضمر ہے۔ اُسی طرح، جیسے خدا نے کعبہ کو بیتی (میرا گھر) کہہ کر یہ اعلان کر دیا کہ وہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتا۔ وہ تمام نوعِ انسانی کے مفاد کے لئے یکساں طور پر کھلا رہے گا۔

واضح رہے کہ ارض کو اسی لئے ارض اللہ کہا گیا ہے کہ زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ اسے تمام نوعِ انسان کی پرورش کے لئے کھلا رہنا چاہیئے۔ (تفصیل اس کی قرآن کے معاشی نظام" کے عنوان میں ملے گی)۔

قوم (حضرت) لوطؑ

ازاں بعد، سورۃ الاعراف کی آیات (۸۴ - ۸۰) میں داستانِ حضرت لوطؑ مذکور ہے۔ انہی کی نسبت سے اس قوم کو جس میں وہ مبعوث ہوئے تھے، قومِ لوطؑ کہا جاتا ہے۔

مطالب الفرقان (جلد سوم) میں حضرت ابراہیمؑ کا تذکار جلیلہ آپ کے سامنے آچکا ہے۔ انہوں نے جب اپنے وطن میں اپنی دعوت کا آغاز کیا تو فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ...... (۲۹/۲۶) "ان کا برادرزادہ، لوطؑ ان پر ایمان لایا" اور ہجرت ابراہیمی میں وہ ان کے ساتھ تھے۔ (۲۱/۷۱)۔ حضرت ابراہیمؑ تو ارضِ فلسطین میں متمکن ہو گئے لیکن حضرت لوطؑ سدوم کی طرف تشریف لے گئے۔

یمن سے بحرِ احمر (RED SEA) کے کنارے کنارے ایک قدیمی تجارتی قافلوں کی سڑک حجاز و مدین سے گزر کر عقبہ وغیرہ تک چلی گئی ہے۔ سدوم کی بستی اسی شاہراہ پر واقع تھی (قرآن کریم نے اس شاہراہ کو اِمَامٍ مُّبِیْن کہا ہے۔ (۱۵/۷۹) قیاس یہ ہے کہ یہ علاقہ بحرمیت (DEAD SEA) کے قریب تھا۔ زلزلوں کی وجہ سے اس کا بہت سا حصہ سمندر کے نیچے آگیا۔ حضرت لوطؑ کو اسی علاقہ میں بسنے والی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا۔ (وَاِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ○ (۳۷/۱۳۳)" اور بلاشبہ لوطؑ (ہمارے) پیغمبروں میں سے تھا" انہوں نے آکر اصولی طور پر اسی پیغام خداوندی کی طرف دعوت دی جس کی طرف اس سے پیشتر حضرات انبیاء کرامؑ دعوت دیتے چلے آرہے تھے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ِۨ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ۝ (۲۶/۱۶۰-۱۶۳)

اسی طرح قومِ لوطؑ نے بھی پیغامبرانِ خداوندی کی تکذیب کی۔ (۱۵/۶۲ ؛ ۲۹/۲۸-۲۹ ؛ ۷/۸۰ ؛ ۲۱/۷۴ ؛ ۵۱/۳۵ ؛ ۱۵/۶۱ ؛ ۲۶/۱۶۵ ؛ ۲۷/۵۴ ؛ ۶۵/۱۹۵)

آخر الامر، اُن کی طرف اُن کے بھائی بندوں میں سے، لوطؑ آیا۔ اور اس نے کہا کہ مجھے بتاؤ کہ تم اپنی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے بچنا چاہتے ہو یا نہیں؟

میں تمہاری طرف، خدا کے وہ قوانین لایا ہوں جو تمہارے امن و سلامتی کے ضامن ہیں۔

لہٰذا ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرو، اور اس کا عملی طریق یہ ہے کہ تم میری اطاعت کرو۔

دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضرت لوطؑ اس قوم میں پہلے رسول نہ تھے بلکہ یہ قوم آپ سے پیشتر اور رسولوں کی بھی تکذیب کر چکی تھی۔ اسی لئے کَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ۣالْمُرْسَلِيْنَ ۝ (۲۶/۱۶۰) فرمایا۔ دوسرے یہ کہ حضرت لوطؑ کو اس قوم کا بھائی (اَخُوْهُمْ) کہا گیا ہے۔ اسی سورۃ میں حضرت نوحؑ، ہود اور صالح (عَلَيْهِمُ السَّلَامُ) کا ذکر بھی انہی الفاظ میں کیا گیا ہے۔ ان کے متعلق تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ چونکہ انہی قبائل میں سے تھے جن کی طرف وہ مبعوث کئے گئے تھے اس لئے قبیلہ کی نسبت سے ان کے بھائی کہلا سکتے تھے۔ لیکن حضرت لوطؑ تو باہر سے تشریف لے گئے تھے۔ اس لئے قوم سدوم سے کسی قبائلی نسبت کی بنا پر ان کا رشتۂ اخوت نہ تھا۔ انہیں ایسا ان میں رہنے سہنے کی وجہ سے کہا گیا ہے۔

انہوں نے اللہ کی طرف دعوت دی اور ساتھ ہی وہ عظیم الشان اعلان بھی فرما دیا جو داعیانِ الی الحق کا امتیازی وصف چلا آ رہا ہے۔ یعنی

وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۲۶/۱۶۴)

میں اس کے لئے تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ میرا معاوضہ خدا کے عالمگیر نظامِ ربوبیت کے ذمے ہے۔

شرمناک فحاشی

یوں تو حضرات انبیائے کرامؑ جس قوم کی طرف مبعوث ہوتے تھے وہ قوم بالعموم کفر و شرک، فسق و فجور، معصیت کوشی اور بدکرداری، سرکشی و تمرّد اور سلب و نہب کی لعنتوں میں گرفتار ہوتی تھی اور ان حضرات کی بعثت کی غرض ہی یہ تھی کہ وہ ان راہ گم کردہ لوگوں کو ان کے اعمال کے ہلاکت انگیز نتائج سے آگاہ کریں۔ لیکن قوم سدوم جس شرمناک اور حیا سوز فحاشی میں مبتلا تھی وہ دنیا جہان سے نرالی تھی۔ یہ بدبخت، اپنی شہوانی خواہشات کی تسکین کے لئے عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس فعلِ شنیع کی ابتدا بھی اسی قوم سے ہوئی۔ لفظ لواطت (تلوّط) خود اس پر شاہد ہے کہ اس کی نسبت قوم لوط سے ہے۔ انگریزی میں (SODOMY) سدوم (SODOM) کی نسبت سے ہے۔

(۷/۸۰-۸۱) وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ
مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ۭ بَلْ
اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ۝

اور اسی طرح ہم نے لوطؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اُس نے ان سے کہا کہ تم ایسی بے حیائی کے کام کرتے ہو جو تم سے پہلی قوموں میں کسی نے نہیں کئے۔

تم، عورتوں کو چھوڑ کر، شہوت رانی کے لئے، مردوں کی طرف آتے ہو، اور اس طرح، افزائش نسل کے مادہ کو بے محل صرف کر کے ضائع کرتے ہو، اور ان حدود سے تجاوز کرتے ہو جو قانونِ فطرت نے اس باب میں مقرر کی ہیں۔

سورۂ اعراف میں مُسْرِفُوْنَ ۸۱/۷ اور سورۂ شعراء میں عٰدُوْنَ (۲۶/۱۶۶) کی جامعیت پر غور فرمائیے! حدودِ فطرت سے تجاوز کی طرف کس بلیغ انداز میں اشارہ کیا گیا ہے۔ سورۂ نمل میں فرمایا۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ○ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ○ (۲۷/۵۵-۵۴)۔

اسی طرح لوطؑ کی سرگزشت ہے جس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم سب کچھ دیکھتے بھالتے، سمجھتے سوچتے، اس قدر کھلی ہوئی بے حیائی کا کام کرتے ہو!

تمہاری حالت یہ ہے کہ تم جنسی خواہش کی تسکین کے لئے، عورتوں کو چھوڑ کر، مردوں کی طرف آتے ہو۔ یہ کتنی بڑی جہالت کی بات ہے۔

وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ۔ یعنی دیدہ و دانستہ، جانتے بوجھتے، اس حیاسوز فعل قبیح کے مرتکب ہوتے ہو۔ اس سے بڑی جہالت کچھ اور بھی ہو سکتی ہے؟ (اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ)[1] سورۂ عنکبوت میں ہے کہ وہ لوگ اس درجہ بے غیرت اور آبرو باختہ ہو چکے تھے کہ کھلی مجالس میں بے حیائی کی باتیں کیا کرتے اور اس سے ذرا شرم محسوس نہیں کرتے تھے۔ حتّٰی کہ ان حیاسوز فحاشیوں کے خلاف ان کے دل میں کوئی کھٹک تک بھی پیدا نہیں ہوتی تھی (۲۹/۲۹)

رہزنی بھی حقیقت یہ ہے کہ جب انسان ایسی کھلی ہوئی معصیت کوشی کی زندگی پر اتر آئے تو پھر شرم و حیا باقی نہیں رہتی! آج بھی دنیا کی ان اقوام پر نگاہ ڈالئے جو جذبات پرستی اور فحش کاری کے سیلاب

---

[1] تُبْصِرُوْنَ اور تَجْهَلُوْنَ کے تقابل پر غور فرمائیے۔ یعنی وہ لوگ فہم و بصیرت رکھتے ہوئے بدترین جہالت میں مبتلا تھے۔ لہٰذا وہ علم جو سیرت انسانی کی صحیح تشکیل یعنی افکار و اعمال کی تطہیر نہیں کر سکتا۔ علم نہیں جہالت ہے روشنی نہیں تاریکی ہے۔ آج سے چار ہزار سال پیشتر بھی اور آج بھی۔

ہیں بہے جا رہی ہیں۔ ان میں غیرت اور حیا کہیں نام کو نہیں ہوتی۔ اس بے غیرتی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ یوں تو انگلستان (بلکہ یورپ کے دیگر ممالک میں بھی) اغلام کی لعنت (SODOMY) ایک عرصہ سے چلی آ رہی تھی، لیکن (۱۹۶۷ء میں) اسے انگلستان میں قانوناً جائز قرار دے دیا گیا! سچ کہا تھا قرآن نے کہ جب انسان پستی کی طرف گرتا ہے تو حیوانات سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ ہم جنس سے جنسی اختلاط (اغلام) حیوانات کے تصور میں بھی نہیں آ سکتا۔

قوم لوطؑ، رہزنی بھی کرتی تھی۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ○ اِئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ط

(۲۹/۲۸-۲۹)

اور اسی طرح لوطؑ کی سرگزشت ہے۔ جب اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم ایک ایسی بے حیائی کے مرتکب ہوتے ہو جسے، اس سے پہلے، دنیا جہان میں کسی نے اختیار نہیں کیا تھا۔

تمہاری حالت یہ ہے کہ تم جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے، عورتوں کو چھوڑ کر، مردوں کے پاس جاتے ہو۔ (۷/۸۰-۸۱) اور اس راستے کو منقطع کرتے ہو جسے فطرت نے افزائش نسل کے لئے تجویز کیا ہے[1]۔ نیز تم اپنی مجلسوں میں نازیبا حرکتیں کرتے ہو۔

تَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ تم اس طرح (عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کی طرف مائل ہونے سے) اس راستے کو منقطع کرتے ہو جسے فطرت نے افزائش نسل انسانی کے لئے وضع کیا ہے۔

تذکیر موعظت کا جواب

یہ تھی وہ قوم جس کی طرف حضرت لوطؑ مبعوث ہوئے۔ جب آپ نے انہیں ان کی بدکرداریوں سے منع کیا تو ان کی طرف سے جو جواب ملا وہ ان کی فطرتِ خبیثہ کا صحیح آئینہ دار ہے۔

۷/۸۲ وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ

---

[1] قطع السبیل کے معنی رہزنی بھی ہیں۔

یَتَطَهَّرُوْنَ ○

لوطؑ کی قوم کے پاس اگر اس کا کچھ جواب تھا تو یہ کہ آپس میں کہنے لگے "ان لوگوں کو اپنی بستی سے نکال باہر کرو۔ یہ لوگ بڑے پاک باز بننا چاہتے ہیں"

ابلیسی ذہنیت کی کیسی صحیح تصویر ہے، آج بھی کسی بدکردار کو اس کی حیاسوز حرکات سے منع کرنے کی کوشش کیجئے تو یہی جواب ملے گا۔ جب آپ نے زیادہ زور دیا تو یہ لوگ اس حربے پر اتر آئے جو نشۂ قوت کی بدمستی کا خاصہ ہوتا ہے۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ یٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِیْنَ ○ (۲۶/۱۶۷)

تو وہ کہنے لگے "اے لوطؑ! اگر تو باز نہ آیا تو یاد رکھ تو لامحالہ (یہاں سے) نکال دیا جائے گا۔

انہوں نے یہ دھمکی دی اور آپ نے نہایت سکوت و سکون سے یہ جواب دے دیا کہ ان دھمکیوں سے تمہارے اعمال کے خلاف میرے دل کی نفرت کم تھوڑی ہو جائے گی؟

قَالَ اِنِّیْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِیْنَ ؕ (۲۶/۱۶۸)

لوطؑ نے کہا، تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو، میرے خلاف کر لو، لیکن میں تمہاری ان حرکات کے خلاف لب کشائی سے باز نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کہ) یہ ایسا مذموم فعل ہے جسے دیکھ کر میرا دل جل جاتا ہے۔ (میرے سینے میں، جذبات نفرت کا سیلاب امنڈ آتا ہے۔ اور یہ ہو نہیں سکتا کہ جس فعل کو میں اس قدر شنیع سمجھوں، اس کے خلاف کچھ نہ کہوں۔ لہذا، میں جو کچھ تم سے کہتا ہوں، اس سے باز نہیں آسکتا)۔

یہ سلسلہ جاری رہا۔ ادھر سے تذکیر و تنذیر اور ادھر سے ضد اور انکار برابر بڑھتا گیا۔ جب حضرت لوطؑ ان سے کہتے کہ اللہ کے عذاب سے ڈرو اور اس نے جو تمہیں مہلت دے رکھی ہے اس سے فائدہ اٹھاؤ، تو وہ اس کا بھی مذاق اڑاتے اور کہتے کہ جاؤ! وہ عذاب لے آؤ جس کی یوں دھمکی دے رہے ہو۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ○ (۲۹/۲۹)

اس قوم کے پاس، اس کی ان باتوں کا جواب کچھ نہیں تھا، بجز اس کے کہ انہوں نے کہا کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو (کہ ہماری اس روش سے خدا کا عذاب آجائے گا) تو اس عذاب کو لا کر دکھاؤ۔

دوسرے مقام پر ہے۔

وَلَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ ○ (۵۴/۳۶)

لوطؑ نے اپنی قوم کو بار بار تنبیہ کی تھی کہ خدا کے قانون مکافات کی گرفت سے ڈرو۔ لیکن انہوں نے اس کی پرواہ

نہ کی اور سمجھے کہ وہ یونہی خالی دھمکیاں دیتا ہے، اس لئے اُس سے اُلٹا جھگڑنے لگے۔
جب حضرت لوطؑ ان راہ گم کردہ بدبختوں کے انکار وجحود اور سرکشی وتمرد کی ان حدود فراموشیوں کو دیکھتے تو اللہ سے دعائیں مانگتے کہ وہ انہیں اور ان کے متبعین کو اس انسانیت فروش قوم کے اعمالِ بد کے تباہ کن نتائج سے محفوظ رکھے۔ اور اُن پر غلبہ ونصرت عطا فرمائے۔

رَبِّ نَجِّنِیْ وَاَهْلِیْ مِمَّا یَعْمَلُوْنَ ○ (۲۶/۱۶۹)

اُس نے اُن لوگوں سے یہ کہا، اور پھر اپنے نشوونما دینے والے سے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! مجھے اور میرے رفقاء کو، اس تباہی سے بچالے جو ان لوگوں پر اُن کے اعمالِ بد کے نتیجے میں آنے والی ہے۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِیْ عَلَی الْقَوْمِ الْمُفْسِدِیْنَ ○ (۲۹/۳۰)۔

اس پر لوطؑ نے اپنے رب سے عرض کیا کہ بارالٰہا! مفسدین کی اس قوم کا مقابلہ کرتے ہیں، تو میری مدد فرما۔
یہ مہلت کا عرصہ یونہی گزرتا گیا حتّٰی کہ وہ وقت آپہنچا جب قانون مکافات کے مطابق اُن کے اعمال کی کھیتی پک گئی اور ظہور نتائج کا زمانہ آگیا۔ خدا کے فرستادہ اس قوم کی طرف آئے تاکہ آخری حجت کا بھی اتمام ہو جائے۔ یہ راستے

ظہور نتائج کا وقت

میں پہلے حضرت ابراہیمؑ کے ہاں گئے اور انہیں حضرت اسحاقؑ کی خوشخبری دی (تفصیل سابقہ عنوان میں گزر چکی ہے) جب حضرت ابراہیمؑ کو معلوم ہوا کہ قوم لوطؑ پر تباہی اور بربادی کا عذاب آنے والا ہے تو اُن کی رقیق القلبی نے بہت چاہا کہ کسی طرح اُنہیں مہلت کا مزید موقعہ مل جائے جس سے وہ شاید اپنی حرکاتِ قبیحہ سے باز آجائیں۔ (۱۱/۶۹-۷۶) و (۱۵/۵۱-۵۶) و (۵۱/۲۴-۳۰)۔
لیکن مشیتِ ایزدی کے علم میں تھا کہ وہ قوم رجعت وانابت کی حد سے کہیں آگے بڑھ چکی ہے۔ ان کی بازآفرینی کی کوئی صورت باقی نہیں۔ ان کے اعمال کے ہلاکت آمیز نتائج مرتب ہو چکے ہیں۔ سورۂ ہود میں ہے۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِیْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰی یُجَادِلُنَا فِیْ قَوْمِ لُوْطٍ ○
اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَحَلِیْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِیْبٌ ○ یٰٓاِبْرٰهِیْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ
جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَاِنَّهُمْ اٰتِیْهِمْ عَذَابٌ غَیْرُ مَرْدُوْدٍ ○ (۱۱/۷۴-۷۶)

جب ابراہیمؑ کے دل سے، ان کی طرف سے پیدا شدہ گھبراہٹ دُور ہو گئی اور بیٹے کی خوشخبری سے اور بھی اطمینان حاصل ہوا، تو قومِ لوطؑ کے متعلق اُن سے سوال وجواب کرنے لگا۔ کہ اُنہیں کیوں ہلاک کیا جارہا ہے۔
ہمیں شبہ نہیں کہ ابراہیمؑ بڑا متحمل مزاج تھا، اس لئے وہ ذرا سی بات پر یونہی بھڑک نہیں

اُٹھتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ سینے میں بڑا دردمند دل رکھتا تھا جس کی وجہ سے وہ دوسروں کی مصیبت کو بڑی شدت سے محسوس کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قومِ لوطؑ کی تباہی کی خبر کو اُس نے اس طرح محسوس کیا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی، اس کی کیفیت یہ تھی کہ وہ ہر معاملہ کے فیصلے کے لئے ہماری طرف رجوع کرتا تھا۔ اِس لئے اس کی رقیق القلبی، اتباعِ قوانین پر غالب نہیں آتی تھی۔

اُنہوں نے کہا۔ اے ابراہیمؑ! تو اس کا خیال چھوڑ دے (کہ وہ قوم تباہی سے بچ جائے) حقیقت یہ ہے کہ تیرے پروردگار کے قانون کے مطابق، اس قوم کے اعمال کے نتائج کے ظہور کا وقت آچکا ہے۔ اب ان پر وہ تباہی آنے والی ہے جو پلٹ نہیں سکتی۔

خدا کے فرستادہ

اس کے بعد وہ حضرت لوطؑ کے ہاں پہنچے۔ قرآن کریم نے اس واقعہ کا ذکر کئی ایک مقام پر کیا ہے اس لئے کہ یہ اس قوم کی بداعمالیوں کا نقطۂ آخریں (CLIMAX) تھا۔ خدا کے یہ برگزیدہ بندے، حضرت لوطؑ جیسے پاکباز انسان کے ہاں، مہمان آتے ہیں اور یہ بدبخت ان پر پل پڑتے ہیں۔

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِيٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيبٌ ۝ وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُونَ اِلَيْهِ ۖ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۖ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ۖ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ۝ قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ۝ (۱۱/۷۷-۷۹)

چنانچہ جب ہمارے فرستادگان ابراہیمؑ سے رخصت ہو کر لوطؑ کے پاس پہنچے، تو وہ ان کی وجہ سے پریشان ہو گیا، اور اپنی بے بسی کے احساس سے، دل میں کہنے لگا کہ آج بڑی مصیبت کا دن ہے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے! (اُس کی پریشانی کی وجہ یہ تھی کہ وہ جانتا تھا کہ وہاں کے لوگ، نوواردِ اجنبیوں سے کس قسم کا سلوک کیا کرتے ہیں۔ اور چونکہ یہ نووارد، آ کر ٹھہرے بھی لوطؑ کے پاس تھے، اِس لئے وہ اور بھی زیادہ پریشان ہو گیا)۔

اُس کی قوم کے لوگ اجنبیوں کے آنے کی خبر سُن کر، بدمستی میں دوڑتے ہوئے آئے ——— وہ پہلے ہی سے اِس روشِ بد کے خُوگر تھے ——— لوطؑ نے انہیں (الگ لے جا کر) کہا کہ ذرا سوچو تو سہی کہ تم کیا کر رہے ہو! یہ تمہاری بیویاں، جو میرے لئے بمنزلہ میری بیٹیوں کے ہیں، تمہارے لئے جائز اور مناسب ہیں۔ اُن کی طرف رجوع کرنا، بڑی پاکیزہ روش ہے۔ تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو، اور میرے مہمانوں کے معاملے میں مجھے رسوا نہ کرو (یہ بڑی شرم کی بات ہے)۔ کیا تم میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں جو شرافت سے کام لے اور عقل و ہوش کو نہ تیاگ دے؟

(۱۵/۷۵ ؛ ۲۹/۲۸-۲۹ ؛ ۱۵/۶۱ ؛ ۵۱/۳۵ ؛ ۲۱/۷۴ ؛ ۷/۸۰ ؛ ۲۶/۱۶۵ ؛ ۲۷/۵۴)

اُنہوں نے کہا کہ تو جانتا ہے کہ ہمیں عورتوں سے، جنہیں تو اپنی بیٹیاں کہتا ہے، کچھ دلچسپی نہیں۔ اور تجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ہمارا ارادہ کیا ہے۔

اس واقعہ کی مزید تفصیل کے لئے دیکھئے۔ (۱۵/۵۷-۶۰ ؛ ۱۵/۶۷-۷۲ ؛ ۲۹/۳۱-۳۳)

حضرت لوطؑ کا اضطراب

غرضیکہ اُدھر سرکشی و تمرّد اور قوّت و استیلاء کے اندھے نشے کا بپھرا ہوا طوفان تھا جو چاروں طرف سے دیوار و در کی تمیز فراموش کئے، محیط تھا اور اِدھر خدا کا ایک تنہا بندہ ان نو وارد مسافروں کی حفاظت کے لئے سینہ سپر کھڑا تھا۔ پریشانی تھی تو صرف ان مہمانوں کے لئے۔

قَالَ لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّۃً اَوْ اٰوِیْۤ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ ۝ (۱۱/۸۰)

لوطؑ نے کہا کہ اے کاش! میرے پاس تمہارے مقابلہ کی خود طاقت ہوتی، یا کوئی قوی سہارا ہوتا جس کی مدد سے میں تمہیں ان حرکات سے باز رکھ سکتا۔

جب مہمانوں نے حضرت لوطؑ کی اس گھبراہٹ کو دیکھا تو انہیں تسلّی دی کہ مت گھبراؤ! یہ ہم تک دست درازی نہیں کر سکتے۔

قَالُوْا یٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّکَ لَنْ یَّصِلُوْۤا اِلَیْکَ .... اِنَّ مَوْعِدَھُمُ الصُّبْحُ ط
اَلَیْسَ الصُّبْحُ بِقَرِیْبٍ ۝ (۱۱/۸۱)

لوطؑ کے مہمانوں نے کہا کہ تم گھبراؤ نہیں۔ ہم تیرے پروردگار کے فرستادہ ہیں (اور اہتمامِ حجت کے لئے ان کی طرف آئے ہیں)۔ یہ لوگ تجھ پر قابو نہیں پاسکیں گے۔ تُو ان کی دست درازیوں سے محفوظ رہے گا۔ یوں کرو کہ جب رات کا تھوڑا سا حصّہ گزر جائے تو اپنے رفقاء کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ، اور اس سرزمین سے یوں دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہو کہ پھر اس کی طرف مُڑ کر بھی نہ دیکھو۔ تمہارے سب رفیق تمہارے ساتھ چلے جائیں گے لیکن تمہاری بیوی تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔ (یہ دوسری پارٹی سے تعلق رکھتی ہے اس لئے) اسے وہی کچھ پیش آئے گا جو دوسروں کو پیش آنے والا ہے۔ ان کی تباہی کے لئے صبح کا وقت مقرر ہو چکا ہے۔ اور صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں۔

نیز دیکھئے۔ (۱۵/۶۱-۶۶ ؛ ۲۹/۳۴)

عذاب کی نوعیت

قوم سدوم کا علاقہ آتش فشاں پہاڑوں اور گندھک کی کانوں سے پٹا پڑا تھا۔

آتش فشاں پہاڑوں کا انشقاق بڑا ہلاکت انگیز عذاب ہوتا ہے۔ کبھی تو آتش فشاں سیّال مادّہ (لاوا) کی شکل میں ایک بہتا ہوا جہنم بن کر گردو پیش کے علاقوں کو دُہکتے ہوئے انگاروں کی بھٹّی بنا دیتا ہے۔ اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ پہاڑ کے دہانہ سے راکھ اور پتھروں کا مینہ برستا ہے جس کی بوچھاڑ دُور دُور تک جاتی ہے۔ پمپیائی کی تباہی اسی قسم کی "بارش" سے ہوئی تھی اور کہا جاتا ہے کہ ان پتھروں کی زد سینکڑوں میل تک تھی۔ قومِ لوطؑ کی تباہی کے وقت بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اسی قسم کی سنگ باری ہوئی۔ گندھک کی کانوں میں آگ بھڑک اٹھی اور پھر ایسے زلزلے آئے کہ زمین نیچے دھنس گئی اور جھیل (DEAD SEA) کا پانی اوپر آگیا۔ یہ علاقہ آج بھی بالکل کھنگر ہے، اور بحرمیت کے پانی میں اس قدر تیزابی مادّوں کی آمیزش ہے کہ وہ خود ایک آتش سیّال ہے۔ قرآنِ کریم نے اسی حقیقت کو مختلف پیرایوں میں بیان فرمایا ہے۔ سورۂ اعراف میں فقط اتنا کہا ہے کہ:

۷/۸۴ وَ اَمۡطَرۡنَا عَلَیۡہِمۡ مَّطَرًا ؕ فَانۡظُرۡ کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الۡمُجۡرِمِیۡنَ ۝

اور ہم نے (اس قوم پر) پتھروں کی بارش کی (جو آتش فشاں پہاڑ سے اُڑ اُڑ کر آ رہے تھے)، سو تم دیکھو کہ ان مجرمین کا انجام کیا ہوا۔

یہ مینہ، جلے ہوئے پتھروں (کھنگروں) کا تھا۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا جَعَلۡنَا عَالِیَہَا سَافِلَہَا وَ اَمۡطَرۡنَا عَلَیۡہَا حِجَارَۃً مِّنۡ سِجِّیۡلٍ ۬ۙ مَّنۡضُوۡدٍ ۙ۝
مُّسَوَّمَۃً عِنۡدَ رَبِّکَ ؕ وَ مَا ہِیَ مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ بِبَعِیۡدٍ ۝ (۱۱/۸۲-۸۳)

چنانچہ جب اس تباہی کا وقت آگیا تو اس بستی کی تمام بلند عمارتیں نیچے گر کر پستیوں میں تبدیل ہوگئیں۔ (آتش فشاں پہاڑ کے ایک جھٹکے نے اسے تہ و بالا کر دیا) اور اس کے بڑے بڑے کھنگر ان پر بارش کی طرح برسنے لگے (۵۱/۳۴) ——— پیہم اور مسلسل بارش کی طرح۔

وہ پتھر، خدا کے ہاں سے موت کا پیغام بن کر ان پر نازل ہونے شروع ہو گئے۔ اس لئے کہ قانونِ مکافات کی رُو سے، تباہی کا عذاب، ظالمین سے کچھ دُور نہیں ہوتا کہ اسے وہاں تک پہنچنے میں دیر لگے اور وہ اتنے میں اپنی حفاظت کا سامان کر لیں۔

یہاں پتھروں کی بارش کی تصریح کے ساتھ زلزلہ کا عبرت انگیز منظر بھی بیان کر دیا، جس سے بڑی بڑی بلند عمارات پستیوں میں تبدیل ہوگئیں۔ بلکہ وہ اتنا نیچے دھنس گئیں کہ پانی سطحِ ارض کے اوپر چڑھ آیا۔ (دوسری جگہ انہی کو مُؤۡتَفِکٰت (وہ جن کی بستیاں اُلٹ دی گئی تھیں) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دیکھئے ۹/۷۰ (۶۹/۹)۔ سورۂ حجر میں ان دونوں چیزوں کو یکجا

ساتھ "صَیْحَۃً" (ایک ہولناک آواز) کا اضافہ کیا گیا، جس سے اس واقعہ کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے۔ (دیکھئے ۱۵/۷۳-۷۷)۔ آیت (۱۵/۷۸) میں قوم سدوم کے ساتھ اصحٰب الایکہ کا بھی ذکر آگیا ہے کیونکہ ان کا علاقہ ان سے ملحق تھا۔ (اس کی تشریح اپنے مقام پر آئے گی) یہاں یہ چیز مزید غور طلب ہے کہ قوم سدوم کے اس تباہ شدہ علاقہ کے متعلق فرمایا کہ یہ ایک ایسی شاہراہ (اِمَامٍ مُّبِیْنٍ (۱۵/۷۹)) پر واقع ہے جو نزول قرآن تک قائم (سبیلِ مقیم) تھی یہ وہی تجارتی سڑک ہے جس کا ذکر شروع میں کیا جا چکا ہے۔ قریش کے قافلے اس سڑک پر سے گزرتے تو ان تباہ شدہ بستیوں کے کھنڈرات اپنی آنکھوں سے دیکھتے [اسی لئے (۱۱/۸۳) میں کہا گیا ہے کہ وَمَا ھِیَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ بِبَعِیْدٍ۔ "یہ علاقہ ان ظالمین سے کہیں دور نہیں"۔ اس پر تو یہ اکثر گزرتے رہتے ہیں]۔ اس کے باوجود ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ تکذیب و انکار کا نتیجہ کیا ہوا کرتا ہے۔

سورۂ شعراء میں اس عذاب کے متعلق کہا کہ حضرت لوطؑ اور ان کے متبعین کو تو بچا لیا گیا اور دوسروں کو تباہ کر دیا۔

ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِیْنَ ۚ وَ اَمْطَرْنَا عَلَیْہِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِیْنَ ۝

(۲۶/۱۷۲-۱۷۳) نیز (۳۷/۱۳۶)

چنانچہ ہم نے ان سب کو جو اس طرح پیچھے رہ گئے تھے تباہ کر دیا۔

اور یہ تباہی ان پتھروں سے ہوئی جو کوہ آتش فشاں نے ان پر برسائے تھے کیسی تباہ کن تھی یہ بارش جو ان لوگوں پر ہوئی جنہیں پہلے متنبہ کر دیا گیا تھا، کہ اگر تم نے لوطؑ کی بات نہ مانی تو ہلاک ہو جاؤ گے۔ (نیز ۳۷/۱۳۶)

نیز دیکھئے۔ (۲۷/۵۸)؛ (۵۱/۳۲-۳۴)؛ (۵۴/۳۴)؛ (۵۴/۳۸)

اہل سے مراد!

گزشتہ آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ قوم لوطؑ کی تباہی کے ضمن میں یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ حضرت لوطؑ اور ان کے اہل اور آل کو بچا لیا گیا۔ البتہ ان کی بیوی ان میں شامل نہیں تھی۔

اہل اور آل سے کیا مراد ہے؟ اس کی تفسیر سورۂ ذٰریٰت میں ان الفاظ میں فرما دی۔

فَاَخْرَجْنَا مَنْ کَانَ فِیْہَا مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ فَمَا وَجَدْنَا فِیْہَا غَیْرَ بَیْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ (۵۱/۳۵-۳۶)

(چنانچہ وہ ابراہیمؑ سے رخصت ہو کر، قوم لوطؑ کی طرف گئے) وہاں لوطؑ کے گھر کے سوا، کوئی گھرانہ ایسا نہ تھا جس نے قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کیا ہو۔ ہماری ہدایت کے مطابق اس گھرانے کے افراد (سوائے لوطؑ کی بیوی کے)

وہاں سے نکل کر بحفاظت دوسری جگہ منتقل ہو گئے اور باقی سب تباہ ہو گئے۔

یعنی حضرت لوطؑ کے اہل سے مراد "گھر والے" اور "آل سے مفہوم" ان کی اولاد" نہ تھی بلکہ اس سے مراد جماعت مومنین تھی معیار خداوندی کے مطابق "اپنوں اور بیگانوں" کی تمیز و تفریق کے متعلق سابقہ عنوانات میں کئی ایک جگہ ذکر آچکا ہے بالخصوص تذکرۂ حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ میں۔ اسی سلسلہ میں اس کڑی کو بھی شامل کر لیجئے۔ قرآن کریم کی رُو سے اپنے "اہل اور آل" وہ ہیں جو ایمان کے رشتہ سے منسلک ہیں۔ جو اس رشتہ سے مربوط نہیں وہ بیٹا ہو یا باپ، بیوی ہو یا بھائی "اپنوں" میں سے نہیں ہو سکتا۔ ان تمام رشتوں میں بیوی اور خاوند کا رشتہ، چولی اور دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے اسی لئے میاں اور بیوی کو "ایک دوسرے کے لباس" سے تشبیہ دی ہے۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (۲/۱۸۷)

وہ تمہارے لئے لباس اور تم اُن کے لئے لباس ہو!

لیکن ایمان کا رشتہ ایسا قوی ہے کہ وہ چولی کو دامن سے اور لباس کو جسم سے الگ کر دیتا ہے۔ اس کے لئے قرآن کریم نے دو مثالیں بیان کی ہیں۔ سورۂ تحریم میں ہے۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّ امْرَاَتَ لُوْطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا وَّ قِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ○ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَ نَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَ عَمَلِهٖ وَ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ○ (۶۶/۱۰-۱۱)

(قانونِ مکافات کے اٹل ہونے کے سلسلے میں) اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے لئے جو ان قوانین سے انکار کرتے ہیں نوحؑ اور لوطؑ کی بیویوں کی مثال پیش کرتا ہے۔ وہ ہمارے نہایت صالح بندوں کے نکاح میں تھیں لیکن انہوں نے ان سے خیانت کی (یعنی ایمان میں ان کا ساتھ نہ دیا) تو اُن کے شوہر، خدا کے قانونِ مکافات کے مقابلہ میں ان کے کسی کام نہ آسکے، اور وہ عورتیں تباہ ہونے والوں کے ساتھ تباہ ہو گئیں۔ (یعنی خاوند کا حُسنِ عمل، بیویوں کے بھی کام نہ آسکا حالانکہ ان دونوں کا رشتہ بڑا ہی پیوستگی کا ہوتا ہے۔

ان کے برعکس، اللہ مومنین کے لئے فرعون کی بیوی کی مثال بیان کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ یہ دُعا مانگا کرتی تھی کہ اے میرے نشو ونما دینے والے! تو اپنی طرف سے میرے لئے جنت میں گھر بنا دے، اور مجھے فرعون اور اسکے

غلط اعمال سے نجات دے۔ بلکہ اس پوری کی پوری قوم سے جس نے اس طرح ظلم و ستم پر کمر باندھ رکھی ہے۔
(اس مثال میں خاوند کے بُرے اعمال بیوی کے ایمان پر اثرانداز نہیں ہوئے)۔
اس سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے اپنوں اور بیگانوں کا معیار کیا ہے۔ یہی معیار "دو قومی نظریہ" کی بنیاد ہے۔

داستانِ عبرت یہ ہے قومِ لُوطؑ کا واقعہ اور ان کا ایسا انجام جس میں ہر صاحبِ عقل و بصیرت کے لئے عبرت و موعظت کی داستانیں پوشیدہ ہیں۔ ان تباہ شدہ بستیوں کے کھنڈرات اپنی لُٹی ہوئی عظمتوں اور چھپی ہوئی ثروتوں کے زندہ مرثیے ہیں۔ لیکن صرف اُن کے لئے جو حیاتِ آخرت (یعنی قانونِ مکافاتِ عمل) پر ایمان رکھیں۔ ورنہ مٹی کے ڈھیر ہیں۔ یا زیادہ سے زیادہ علمائے آثار و حفریات کی دلچسپیوں کا مرکز۔ قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو سورۂ فرقان میں ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

وَلَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْٓ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ؕ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ﴿۲۵ / ۴۰﴾

(ان قوموں کی داستانیں تو خیر، پھر بھی ان مخاطبین ۔۔۔۔ عربوں ۔۔۔۔ کے لئے ذرا دُور کی باتیں ہیں) اُس (قومِ لُوطؑ کی) بستی کے کھنڈرات پر سے تو ان کا گذر اکثر ہوتا رہتا ہے جسے کوہِ آتش فشاں کے پتھروں کی بارش نے تباہ کر دیا تھا۔ کیا یہ لوگ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتے کہ اُس قوم کا انجام کیا ہوا تھا؟ (دیکھتے تو ہیں، لیکن چونکہ یہ لوگ) قانونِ مکافاتِ عمل اور تسلسلِ حیات پر یقین نہیں رکھتے (اس لئے یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان دے لیتے ہیں کہ وہ ایک اتفاقی حادثہ تھا جو ہو گیا۔ ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا)۔

چونکہ ان لوگوں کا قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان نہیں، اس لئے ان اُمم گزشتہ کے یہ نشانات ان کے لئے عبرت کا موجب نہیں بنتے۔

وَاِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ﴿﴾ اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ؕ ﴿۲۵ / ۴۱-۴۲﴾

یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ جب تجھے دیکھتے ہیں تو مذاق کرتے ہیں اور (ایک ایسے انداز سے جس میں استہزاء و استخفاف کے نشتر پوشیدہ ہوں) کہتے ہیں کہ "اچھا! یہ ہے وہ جسے خدا نے رسولؐ بنا کر بھیجا ہے! اگر ہم اپنے مسلک پر ثابت قدم نہ رہتے تو اس نے ہمیں ہمارے معبودوں سے بہکا ہی دیا تھا۔"

اس کے بعد فرمایا:

وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ۝ (۲۵/۴۲)

جب ان کے سامنے عذاب آجائے گا تو اس وقت انہیں معلوم ہوگا کہ وہ کون ہے جو صحیح راستہ چھوڑ کر، غلط راہ پر چل رہا ہے۔

دیکھنے بوجھنے آنکھوں پر پردے اس لئے پڑ جاتے ہیں کہ انسان اپنی خواہشات کا محکوم و پرستار بن جاتا ہے۔

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ۝ (۲۵/۴۳)

(حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی خواہشات اور جذبات ہی کو اپنا معبود بنا رکھا ہے)۔ سو جو شخص اپنی خواہشات ہی کا غلام اور پرستار بن جائے، اسے کون راہ راست پر لا سکتا ہے؟ (ایسا شخص علم و عقل رکھنے کے باوجود غلط راہ پر چلتا رہتا ہے۔ ۴۵/۲۳)۔ اے رسولؐ! کیا تیرے لئے ممکن ہے کہ تو اس قسم کے آدمی کی اس طرح نگہبانی کر سکے کہ وہ تباہی کے جہنم میں نہ گرے؟ تو، ایسے شخص کا، ذمہ کبھی نہیں لے سکتا!

اور یہاں پہنچکر اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ فہم و بصیرت کی استعداد اور سمجھنے بوجھنے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود اندھا اور بہرا ہو جاتا ہے اور یوں شرف انسانیت کھو کر حیوان بلکہ ان سے بھی گیا گزرا!

اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ۝ (۲۵/۴۴)

کیا تو سمجھتا ہے کہ اس قسم کے لوگ، دلائل و براہین پر کان دھرتے، اور عقل و خرد سے کام لیتے ہیں؟ (بالکل نہیں۔ جو شخص اپنے جذبات کے پیچھے ہی چلتا رہے، وہ عقل و خرد سے کیسے کام لے سکتا ہے؟) یہ لوگ (انسانی سطح زندگی تک پہنچے ہی نہیں)، محض حیوانی سطح پہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ غلط راہ پر چلتے ہیں۔ (اس لئے کہ حیوانات کم از کم، اپنے جبلی تقاضوں کے مطابق تو چلتے ہیں، اور اس راہ سے کبھی اِدھر اُدھر نہیں ہوتے۔ ان کے برعکس، جذبات کے تابع چلنے والا انسان لمحہ بہ لمحہ اپنی روش بدلتا رہتا ہے۔ (۷/۱۷۹)؛ (۶۷/۱۰)۔

سورۂ شعراء میں قوم لوطؑ کی تباہی اور ہلاکت کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (۲۶/۱۷۴)

اس واقعہ میں بھی، ارباب بصیرت کے لئے سامان صد موعظت ہے۔ لیکن اس کے باوجود، ان لوگوں میں سے

اکثر خدا کے قانونِ مکافات پر ایمان نہیں لائیں گے ۔

وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ نے پھر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ یہ قصص و وقائع ان لوگوں کے لئے اس لئے آ

عبرت نہیں بنتے کہ یہ لوگ خدا کے قوانین پر ایمان نہیں رکھتے اور عقل و بصیرت سے کام نہیں لیتے ۔

وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○ (۲۹/۳۵)

(چنانچہ وہ قوم تباہ ہو گئی) ۔ ان کی داستان میں بھی ہم نے عقل و فکر سے کام لینے والوں کے لئے قانونِ مکافاتِ

عمل کی صداقت اور محکمیت کی واضح نشانی رکھی ہے ۔

اور اللہ کی ان نشانیوں سے آنکھیں بند کئے گزر جاتے ہیں ۔

وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ۙ وَبِالَّيْلِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ (۳۷/۱۳۸-۱۳۷)

تم صبح شام ان کی اُجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات پر سے گزرتے ہو ۔ کیا تم اس پر بھی عقل و فکر سے کام

نہیں لیتے اور نہیں سوچتے کہ قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتنے کا نتیجہ کیا ہوا کرتا ہے ؟

اور قانونِ مکافات کی محکم گرفت سے نہیں ڈرتے ۔

وَتَرَكْنَا فِيْهَآ اٰيَةً لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ○ (۵۱/۳۷)

اس واقعہ میں جو اس بستی کے کھنڈرات پر منقوش چلا آ رہا ہے، ان لوگوں کے لئے عبرت و موعظت کا سامان ہے جو

غلط روشِ زندگی کے الم انگیز انجام سے ڈرتے ہیں ۔

یعنی صحیح علم و بصیرت اور عقل و فکر کا یہ تقاضا ہے کہ ان واقعات سے استقرائی طور پر اس نتیجہ پر پہنچا جائے کہ ان اقوامِ گزشتہ نے یہ کچھ کیا تو ان کا انجام یہ ہوا ۔ اگر ہم بھی وہی کچھ کریں گے تو ہمارا بھی انجام ایسا ہی ہوگا ۔ اس لئے کہ جس طرح فطرت کے اٹل قوانین خارجی کائنات میں کار فرما ہیں ۔ اسی طرح انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بھی قوانینِ خداوندی جاری و ساری ہیں ۔ اگر پانی آج بھی اسی طرح نشیب کی طرف بہتا ہے جس طرح قومِ لوطؑ و عاد و ثمود کے زمانہ میں بہتا تھا تو غلط روش کے نتائج آج بھی وہی ہوں گے جو اس زمانہ میں ہوتے تھے ۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (۳۳/۶۲) قوانینِ الٰہیہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوا کرتی ۔ یہ ایک عام حقیقت ہے جس کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کے دماغ اور ارسطو کے ذہن کی ضرورت نہیں ۔ کتابِ فطرت ایک واضح صحیفہ ہے جو ہر سلیم الطبع انسان کی سمجھ میں آ سکتا ہے ۔ اسی لئے سورۂ قمر میں اممِ گزشتہ کے احوال و ظروف اور ان کے اعمال کے نتائج و عواقب بیان کرتے ہوئے ہر کڑی کے بعد فرمایا کہ

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ○ (۵۴/۴۰)

"ہم نے ان واقعات کو قرآن میں بیان کر کے بات کا سمجھنا بہت آسان کر دیا ہے۔ تو کیا کوئی ہے جو اس پر غور و فکر کر کے نصیحت حاصل کرے؟"

یہ ہے تذکرۂ جلیلہ حضرت لوطؑ کا جنہیں اللہ نے حکم و علم عطا فرمایا۔

وَلُوۡطًا اٰتَيۡنٰهُ حُكۡمًا وَّعِلۡمًا وَّنَجَّيۡنٰهُ مِنَ الۡقَرۡيَةِ الَّتِىۡ كَانَتۡ تَّعۡمَلُ الۡخَبٰٓئِثَ ؕ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا قَوۡمَ سَوۡءٍ فٰسِقِيۡنَ ۙ (۲۱/۷۴) ؛ (۲۷/۵۸)

(ابراہیمؑ کے ساتھ لوطؑ نے بھی ہجرت کی تھی۔ اس وقت اُن کا شمار عام مومنین کی صف میں تھا۔ لیکن بعد میں) ہم نے اسے نبوت کا علم، اور اس کے مطابق لوگوں کے معاملات میں فیصلے کرنے کا منصب عطا کیا۔ اس کی بستی کے لوگ بڑی ناشائستہ حرکات کیا کرتے تھے۔ وہ صحیح راستے کو چھوڑ کر بڑی خراب راہوں پر چل رہے تھے۔ ہم نے اُس بستی کو تباہ کر دیا اور لوطؑ کو وہاں سے محفوظ نکال کر دوسری جگہ لے گئے۔

تورات کا بیان

لیکن اس کے برعکس ذرا تورات کو اٹھا کر دیکھئے اور پھر غور کیجئے کہ اللہ کے ان برگزیدہ رسولوں کی سیرت کو کس انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ کتاب پیدائش۔ باب ۱۸ آیت ۲۳ میں حضرت لوطؑ کو نیکوکار کہا گیا ہے۔ لیکن چار ہی قدم آگے چل کر یہ قصہ بھی مذکور ہے جسے ہم سینے پر پتھر رکھ کر نقل کرتے ہیں۔

اور لوط ضغر سے اپنی دو بیٹیوں سمیت نکل کر پہاڑ پر جا رہا۔ کیونکہ ضغر میں رہنے سے اسے دہشت ہوئی اور وہ اور اس کی دونوں بیٹیاں ایک غار میں رہنے لگیں۔ تب پلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ ہمارا باپ بوڑھا ہے اور زمین پر کوئی مرد نہیں جو تمام جہان کے دستور کے موافق ہمارے پاس اندر آئے۔ آؤ ہم اپنے باپ کو مے پلائیں اور اس سے ہم بستر ہوں تاکہ اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں۔ سو انہوں نے اپنے باپ کو مے پلائی اور پلوٹھی اندر گئی اور اپنے باپ سے ہم بستر ہوئی۔ پر اُس نے اس کے لیٹتے اور اُٹھتے وقت اُسے نہ پہچانا۔ اور دوسرے روز ایسا ہوا کہ پلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ دیکھ کل رات کو میں اپنے باپ سے ہم بستر ہوئی۔ آج رات بھی اس کو مے پلائیں اور تو بھی جا کے اس سے ہم بستر ہو کہ اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں۔ سو اس رات کو بھی اُنہوں نے اپنے باپ کو مے پلائی۔ اور چھوٹی اُٹھ کے اس سے ہمبستر ہوئی اور اس نے اس کے لیٹتے اور اُٹھتے وقت اُسے نہ پہچانا۔ سو لوط کی دونوں بیٹیاں اپنے باپ سے حاملہ ہوئیں۔ اور بڑی ایک بیٹا جنی اس کا نام موآب رکھا اور وہ موآبیوں کا اب تک ہیں باپ ہوا۔ اور چھوٹی کے بھی ایک بیٹا جنی اور اس کا نام بن عمی رکھا۔ وہ بنی عمون کا جو اب تک ہیں باپ ہوا۔ (پیدائش ۱۹/۳۰-۳۸)

ہم سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی خرافات کا نقل کرنا بھی قارئین کے ذوقِ سلیم کے منافی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

اس قسم کے تقابل کے بغیر یہ حقیقت اجاگر ہو نہیں سکتی کہ سابقہ "کتبِ آسمانی" کی موجودگی میں خدا کی طرف سے ایک "نئی کتاب" (قرآنِ کریم) کی کیا ضرورت تھی؟ سابقہ "کتبِ آسمانی" کے ان بیانات سے محرّف اور خالص پیغامِ خداوندی کا فرق نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے۔

بیٹیوں سے مُراد

قرآنِ کریم میں قومِ لوط کی عبرت انگیز داستان اتنی ہی مذکور ہے۔ لیکن آگے بڑھنے سے پیشتر دو ایک مقامات پر غور کرنا ضروری ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ جب بستی کے لوگوں نے ضیوفِ حضرت لوطؑ کو آن گھیرا ہے تو حضرت لوطؑ نے ان سے کہا کہ

يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ؕ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ۝ (۱۱/۷۸)

(اس کی قوم کے لوگ اجنبیوں کے آنے کی خبر سُن کر، بدمستی میں دوڑتے ہوئے آئے ——— وہ پہلے ہی سے اس روشِ بد کے خوگر تھے ———) لُوطؑ نے انہیں (الگ لے جاکر کہا کہ ذرا سوچو تو سہی تم کیا کر رہے ہو!) یہ تمہاری بیویاں، جو میرے لئے بمنزلہ میری بیٹیوں کے ہیں، تمہارے لئے جائز اور مناسب ہیں۔ ان کی طرف رجوع کرنا، بڑی پاکیزہ روش ہے۔ تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو، اور میرے مہمانوں کے معاملے میں مجھے رُسوا نہ کرو۔ (یہ بڑی شرم کی بات ہے)۔ کیا تم میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں جو شرافت سے کام لے اور عقل ہوش کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ (۱۵/۷۲؛ ۲۹/۲۸-۲۹؛ ۱۵/۶۱؛ ۵۱/۳۵؛ ۲۱/۷۴؛ ۷/۸۰؛ ۲۶/۱۶۵؛ ۲۷/۵۴)

یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت لوطؑ نے انہیں "اپنی بیٹیوں کی طرف کیوں متوجہ کیا؟ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ ان لوگوں نے اپنی بیویوں کو چھوڑ رکھا تھا۔

وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ (۲۶/۱۶۶ نیز ۷/۸۱؛ ۲۷/۵۵)

تم عورتوں کو چھوڑ کر، جنہیں تمہارے نشوونما دینے والے نے اس مقصد کے لئے پیدا کیا ہے (کہ ان سے فرائض

نسل ہو) مردوں کے پاس جاتے ہو۔ (تم تو بالکل حد سے گزر گئے)۔

اور خواہشاتِ نفس کی تسکین کے لئے مردوں کی طرف رجوع کرتے تھے۔ حضرت لوطؑ انہیں اس خلافِ فطرت خبیثانہ فعل سے روکتے تھے اور فطرت کی صحیح راہوں کی طرف ان کی توجہ ملتفت کراتے تھے۔ اس خاص مقام پر بھی آپ نے اپنی دعوت کو دہرایا اور ان سے کہا کہ اس حماقت سے کیا حاصل! تمہارے لئے تمہاری بیویاں (بستی کی عورتیں) پاک و صاف موجود ہیں۔ اُن کی طرف رجوع کیوں نہیں کرتے؟

"بستی کی عورتوں" کو آپ نے بیٹیاں کہا۔ ایک مرد بزرگ و پاکباز کے نزدیک بستی کی عورتیں بمنزلہ بیٹیوں کے ہوتی ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ باوجودیکہ حضرت لوطؑ اس قوم میں ایک اجنبی کی حیثیت رکھتے تھے قرآن کریم نے انہیں قوم لوطؑ کا بھائی [اَخُوْهُمْ = اُن کا بھائی ۲۶ / ۱۶۱] کہا ہے اور اس برباد ہونے والی قوم کو [اِخْوَانِ لُوْطٍ ۵۰ / ۱۳] کہہ کر پکارا ہے۔ اسی نسبت سے حضرت لوطؑ نے بستی کی عورتوں کو، جنہیں ان بدبختوں نے چھوڑ رکھا تھا، اپنی بیٹیاں کہہ کر پکارا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک مومن کے نزدیک (اپنی بیوی کو چھوڑ کر) دنیا کی تمام عورتیں بمنزلہ اپنی بیٹیوں بہنوں اور ماؤں کے ہوتی ہیں۔

یہ مہمان کون تھے؟

دوسرا غور طلب مقام یہ ہے کہ حضرت لوطؑ کے مہمان (بلکہ یوں کہئیے کہ ضیوفِ ابراہیمؑ) کون تھے؟ قرآن کریم نے انہیں اللہ کے فرستادہ (مرسلین) کہہ کر پکارا ہے اور اس کی کہیں تصریح نہیں کہ وہ فرشتے تھے۔ لیکن جس انداز سے قرآن کریم نے مختلف مقامات پر ان کا ذکر کیا ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ بارگاہ ایزدی میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ مثلاً سورۂ ھود میں کہا کہ

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى (۱۱ / ۶۹)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہمارے بھیجے ہوئے (قاصد) ابراہیمؑ کے پاس خوشخبری لے کر آئے تھے۔

یہی کچھ سورۂ عنکبوت (۲۹ / ۳۱) میں آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ خدا کے فرستادہ تھے جو حضرت ابراہیمؑ کے پاس بیٹے کی پیدائش کی بشارت لے کر آئے تھے۔ سورۂ ھود میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ کی بیوی کو ہم نے خوشخبری دی۔

وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ۝

(۱۱ / ۷۱)

ابراہیم کی بیوی بھی پاس ہی کھڑی تھی۔ اسے یہ سن کر اطمینان ہوا اور وہ جی میں خوش ہوئی کہ خطرہ کی کوئی بات نہیں۔ عین اسی وقت ہم نے اسے اسحٰقؑ کی پیدائش کی خوشخبری دی۔ اور یہ بھی کہ اسحٰقؑ کے بعد ان کے ہاں ان کا پوتا یعقوبؑ پیدا ہوگا، اور اس طرح اس سرزمین پر (قومِ لوط کی تباہی کے بعد) اُن کی نسل پھیل جائے گی۔

اور دوسرے مقامات پر ہے کہ ان فرستادگانِ بارگاہِ ایزدی نے کہا کہ ہم تمہیں بشارت دیتے ہیں۔

قَالُوْا لَا تَخَفْ ؕ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ۝ (۵۱/۲۸)

(اس پر بھی وہ کھانے کے لئے آمادہ نہ ہوئے تو ابراہیمؑ کو کچھ گھبراہٹ سی ہوئی) اس پر انہوں نے کہا کہ گھبراؤ نہیں ہم سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ (ہم دشمن نہیں، دوست ہیں۔ ہم خدا کے رسول ہیں، اور اس کی طرف سے) تمہیں ایک ایسے بیٹے کی خوشخبری دیتے ہیں جو بڑا صاحبِ علم ہوگا۔

ان مقامات میں تطبیق مشکل نہیں۔ بشارت ان فرستادگان کی زبان سے دی گئی تھی اس لئے اسے ان کی طرف منسوب کیا گیا۔ لیکن چونکہ یہ بشارت ان کی اپنی طرف سے نہیں تھی بلکہ یہ صرف اس کے پہنچانے والے تھے اس لئے (۱۱/۷۱) میں اس بشارت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کر لیا۔

اسی طرح قومِ لوط پر عذابِ خداوندی کے متعلق بھی دونوں نسبتیں پائی جاتی ہیں۔ سورۂ حجر میں ہے کہ انہوں نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا۔

قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ۝ۙ اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ؕ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ۙ اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝ (۱۵/۵۸-۶۰)

انہوں نے کہا کہ ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں، یعنی قومِ لوط کی طرف۔ وہ قوم تباہ ہو جائے گی، بجز لوطؑ کی اپنی جماعت کے لوگوں کے۔ انہیں بچا لیا جائے گا۔ حتّٰی کہ لوطؑ کے اپنے گھرانے کے لوگوں میں سے اس کی بیوی بھی تباہ ہو جائے گی۔ قرائن سے مترشح ہے کہ وہ لوطؑ کے ساتھ نہیں جائے گی۔ قومِ مخالف کے ساتھ پیچھے رہ جائے گی۔

پہلی آیت میں ہے کہ "ہم قومِ لوطؑ کی طرف بھیجے گئے ہیں" اس سے آگے ہے کہ "ہم آلِ لوط کو نجات دیں گے" اس سے اگلی آیت میں ہے کہ "یہ ہمارا اندازہ ہے کہ حضرت لوطؑ کی بیوی تباہ ہونے والوں میں سے ہوگی" اسی طرح دیگر مقامات میں ہے (دیکھئے۔ ۵۱/۳۲-۳۴ و ۲۹/۳۱-۳۲ و ۲۹/۳۳-۳۴) ان تمام مقامات میں قومِ لوطؑ پر عذاب نازل کرنے، اور متبعینِ حضرت لوطؑ کو نجات دینے کی نسبت ان فرستادگان کی طرف

کی گئی۔ لیکن دوسرے مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

مثلاً سورۂ اعراف میں فرمایا:۔

۷/۸۴ وَ اَمۡطَرۡنَا عَلَیۡہِمۡ مَّطَرًا ؕ فَانۡظُرۡ کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الۡمُجۡرِمِیۡنَ ؏

ہم نے اُن پر (پتھروں کا) مینہ برسا دیا۔ سو دیکھو، مجرموں کا انجام کیسا ہوا؟ نیز (۱۱/۸۲ و ۵۴/۳۴)

ان مقامات میں بھی کوئی الجھاؤ نہیں۔ قوم لوطؑ پر عذاب اور جماعتِ مومنین کی اس سے رستگاری۔ دونوں خدا کے قانونِ مکافات کے تابع تھے۔ لیکن یہ فرستادگان چونکہ اس مقصد کے لئے مامور تھے کہ ان کے ذریعے اس سرکش قوم پر اتمامِ حجت ہو اور متبعین حضرت لوطؑ اس عذاب سے محفوظ رکھے جائیں۔ اس لئے انہوں نے ان امور کو اپنی طرف منسوب کیا۔ جیسے، جب کوئی مامور من اللہ (رسول) اپنی قوم سے کہتا ہے کہ "میری بات سنو" تو اس سے مقصود پیغام خداوندی ہوتا ہے۔ یا وہ کہتا ہے کہ "میری اطاعت کرو" تو اس سے مفہوم اللہ کی اطاعت ہوتی ہے۔ اس ضمن میں سورۂ ہود کی ان آیات پر بھی غور کیجئے جن میں ذکر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جب ان فرستادگان سے سنا کہ وہ قوم لوطؑ کی تباہی کے لئے مامور ہو کر جا رہے ہیں تو آپ نے چاہا کہ کسی طرح اس قوم پر سے عذاب ٹل جائے اور انہیں مزید مہلت مل جائے تاکہ (شاید) وہ اس دوران میں اپنی اصلاح کر سکیں" یہ سب باتیں فرستادگان" سے ہو رہی تھیں۔ اور انہوں نے بھی جواب میں کہا تھا کہ

یٰۤاِبۡرٰہِیۡمُ اَعۡرِضۡ عَنۡ ہٰذَا ۚ اِنَّہٗ قَدۡ جَآءَ اَمۡرُ رَبِّکَ (۱۱/۷۶)

اُنہوں نے کہا کہ اے ابراہیمؑ! تو اس بات کا خیال چھوڑ دے (کہ وہ قوم تباہی سے بچ جائے)، حقیقت یہ ہے کہ تیرے پروردگار کے قانون کے مطابق، اس قوم کے اعمال کے نتائج کے ظہور کا وقت آچکا ہے۔ (اب ان پر تباہی آنے والی ہے جو پلٹ نہیں سکتی۔ ۱۱/۷۶)

لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی اس درخواست کے متعلق کہا ہے کہ

یُجَادِلُنَا فِیۡ قَوۡمِ لُوۡطٍ (۱۱/۷۴)

اس نے قوم لوط کے بارے میں ہم سے سوال و جواب شروع کئے۔

اس لئے کہ کسی پیغامبر سے پیغام کے متعلق کچھ کہنا، در اصل صاحب پیغام سے کہنے کے مرادف ہوتا ہے۔ پیغامبر تو کسی کا پیغام پہنچانے والا ہوتا ہے۔ پیغام کے متعلق جو کچھ کہا جائے گا وہ صاحب پیغام (جس کی طرف سے پیغام آیا ہے) سے ہی متعلق ہوگا۔ اللہ اور اس کے رسولوںؑ کے اس باہمی تعلق کو پیش نظر رکھنے سے انسان بہت سی غلط فہمیوں سے بچ سکتا ہے۔

یہ بحث کہ اللہ تعالیٰ کس طرح اپنے امور کو انسانوں کی طرف اور انسانوں کے ہاتھوں سرانجام دئیے گئے کاموں کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے پہلے گزر چکی ہے۔ (انڈکس میں دیکھئے)

یہ بھی واضح رہے کہ یہ "فرستادگان" ملائکہ نہیں تھے کیونکہ (جیسا کہ مطالب الفرقان جلد دوم ص۶۹ پر) بتایا گیا ہے، ملائکہ انسانوں کو نظر نہیں آیا کرتے چہ جائیکہ وہ انسانی پیکروں میں سامنے آئیں؟

قومِ مدین ——— حضرت شعیبؑ

اس بعد سورۃ الاعراف کی آیات (۸۵ - ۸۷) میں قوم مدین کا ذکر ہے جس کی طرف حضرت شعیبؑ کو مبعوث کیا گیا تھا۔ ان کا تذکرہ بھی حسب سابق مسلسل پیش خدمت ہے۔ ان کی انقلابی دعوت کا مرکزی نقطہ بھی حضرت صالحؑ کی طرح معاشیات سے متعلق تھا، اس فرق کے ساتھ کہ حضرت صالحؑ کا زمانہ زرعی معیشت کا تھا (یا یوں کہئے کہ ان کی قوم کی معیشت زرعی تھی)، اور حضرت شعیبؑ کی قوم کی معیشت کاروباری تھی۔

مطالب الفرقان (جلد سوم ص۳۸ پر) ذریت حضرت ابراہیمؑ کے سلسلہ میں دیکھا جا چکا ہے کہ آپ کی بیوی (قطورا) کے بطن سے جو اولاد پیدا ہوئی، ان میں ایک بیٹے کا نام مدین تھا۔ حضرت اسمٰعیلؑ ارض حجاز میں متمکن ہوئے اور حضرت اسحٰقؑ فلسطین میں، مدین، حجاز کے شمال میں شام سے متصل علاقہ میں سکونت پذیر ہو گیا اور اس کی نسل، تاریخ کے صفحات پر قوم مدین کے نام سے متعارف ہوئی۔ حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ سنہ ۲۱۰۰ یا سنہ ۲۲۰۰ ق م) ہے۔ اس لئے قوم مدین کے آغاز کا زمانہ سنہ ۲۰۰۰ ق م تصور کرنا چاہیئے۔ جو قافلہ حضرت یوسفؑ کو چاہِ کنعان سے بازارِ مصر میں لے گیا تھا کہا جاتا ہے کہ وہ انہی مدیانیوں کا تھا۔ یہ قوم اس علاقہ میں بڑھی۔ پھولی پھلی۔ قریب چار سو سال تک یہی حالت رہی تا آنکہ ان میں حضرت شعیبؑ کی بعثت ہوئی۔ جب

قوم مدین

حضرت موسیٰؑ (قبل از نبوت) مصر سے بھاگ کر نکلے ہیں تو مدین کی بستی کی طرف ہی آئے تھے۔ قرآن کریم میں ہے کہ انہوں نے یہاں پہنچ کر ایک کبیر سن بزرگ کے ہاں رہائش اختیار کر لی۔ اور گلہ بانی کی خدمت سنبھال لی۔ انہوں نے اپنی بیٹی کا عقد حضرت موسیٰؑ سے کر دیا۔ (ملاحظہ ہو ۲۰/۴۰ ؛ ۲۸/۲۲-۲۸) قرآن کریم نے یہ نہیں بتایا کہ یہ بزرگ

کون تھے لیکن بعض محققین کا خیال ہے کہ آپ حضرت شعیبؑ ہی تھے۔ تورات میں ان کا نام کہیں رعوایل کہیں یترو اور کہیں حوباب لکھا ہے۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ آپ کا نام حوباب ہی تھا جیسا کہ کتاب گنتی (۱۰/۲۹) میں مذکور ہے، باقی نام دراصل القاب تھے اور یہی حوباب ہیں جو قرآن کریم میں شعیبؑ کے نام سے موسوم ہیں۔ اس اعتبار سے حضرت شعیبؑ اور حضرت موسیٰؑ کا زمانہ ایک ہی ہے یعنی ۱۶۰۰/۱۲۰۰ (ق۔م)

اصحاب الایکہ

تورات میں مذکور ہے کہ مدین کا ایک اور بھائی تھا جس کا نام یقشان تھا۔ اس کا بیٹا ودان اپنے چچا مدین کے قریب ہی آباد ہو گیا۔ یہ علاقہ بڑا سرسبز و شاداب اور گھنے جنگلوں سے پٹا ہوا تھا۔ قرآن کریم میں ہے کہ حضرت شعیبؑ قوم مدین کے علاوہ، اصحاب الایکہ کی طرف بھی مبعوث ہوئے تھے۔ ارباب تحقیق کا خیال ہے کہ اصحاب الایکہ بنو ودان ہی تھے۔ ایکہ کے معنی ہیں جنگل۔ ان کی بستی کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ وہ اسی شاہراہ (امام مبین) پر واقع تھی جو حجاز سے شام کی طرف جاتی ہے اور جس کا ذکر قوم لوطؑ کی سرگزشت میں آچکا ہے۔

وَاِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ ۙ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۘ وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ (۱۵/۷۸-۷۹)

اور اس طرح اصحاب الایکہ (گھنے جنگل کے رہنے والے) ـــــــــ بھی بڑے سرکش تھے۔
سو ہم نے انہیں بھی، ان کی سرکشی کی سزا دی ـــــــ اور یہ دونوں بستیاں (یعنی قوم لوطؑ اور قوم مدین کے شہر) عام شاہراہ پر واقع ہیں۔

یہ تھے وہ قبائل جن کی طرف حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے۔ (نسبی طور پر آپ مدین کے قبیلہ سے متعلق تھے)۔

۷/۸۵ وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۗ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۗ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ۗ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (نیز ۱۱/۸۴)

اور اہل مدین کی طرف ہم نے، ان کے بھائی بندوں میں سے شعیبؑ کو بھیجا۔ اس نے بھی ان سے یہی کہا کہ قوانین خداوندی کی اطاعت کرو۔ اس کے سوا کوئی ایسی قوت نہیں جس کی محکومیت اختیار کی جائے۔ تمہارے پاس تمہارے نشو و نما دینے والے کی طرف سے واضح تعلیم آچکی ہے۔ تمہیں چاہیئے کہ اپنے معاشی نظام میں عدل برتو۔ ناپ تول کو پورا رکھو لوگوں کے حقوق و واجبات میں کمی نہ کرو۔ (۸۳/۱-۳) اور معاشرہ میں، ہمواریاں پیدا ہو جانے کے بعد، ناہمواریاں نہ پیدا کرو۔ یہ سب کچھ تمہارے اپنے ہی بھلے کے لئے ہے اگر تم اس پر یقین رکھو۔ (نیز ۱۱/۸۴)

آپ ان قبائل کی طرف سب سے پہلے رسولؑ نہ تھے بلکہ آپ سے پہلے اور رسولؑ بھی آ چکے تھے جن کی تکذیب کی گئی تھی۔

كَذَّبَ أَصْحٰبُ الْأَيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ (۲۶/۱۷۶)

اسی طرح اہلِ مدین نے بھی اپنے پیغمبروںؑ کی تکذیب کی۔

انہی کو حضرت شعیبؑ نے مخاطب کیا تھا۔

إِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ أَلَا تَتَّقُوْنَ ○ إِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ أَمِيْنٌ ○ (۲۶/۱۷۷-۱۷۸)

آخرالامر اُن کی طرف شعیبؑ آیا، اور ان سے کہا کہ کیا تم اپنی روش کے تباہ کن نتائج سے بچنا نہیں چاہتے؟

(۷/۸۵-۸۷) اور (۱۱/۸۴) ؛ (۱۱/۸۷) ؛ (۸۳/۱-۶)

میں تمہاری طرف، خدا کے ہاں سے، ایسا ضابطۂ قوانین لے کر آیا ہوں جو امن و سلامتی کا ضامن ہے۔

دولت کے نشہ میں مست

ایک تو علاقہ سرسبز و شاداب۔ اس پر دُور دُور تک کی تجارت۔ اہلِ مدین دولت کے نشہ میں مست تھے۔ دولت کے ساتھ کثرتِ افراد بھی شامل تھی جو قبائلی زندگی میں بہت بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ اس لئے دولت و قوت کی فراوانی سے یہ قوم طاغوتی سرکشیوں کا آتشیں پیکر بن چکی تھی۔ جب سرمایہ داری اور تجارت ایک خدا فراموش قوم کے ہاتھ میں ہوں، تو وہ لوگ جن ابلیسی حربوں سے لوگوں کا گلا گھونٹتے ہیں وہ محتاجِ تشریح نہیں۔ اس قوم میں یہ سب خرابیاں ایک ایک کر کے آ چکی تھیں۔ اس تاجرانہ "جیب تراشی" کے علاوہ، یہ لوگ اپنی قوت و کثرت کے بل بوتے پر رہزنی سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ یہاں کی عام حالت تھی۔ جب حضرت موسیٰؑ نے (بعد از نبوت) بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے ہجرت کی ہے تو انہی علاقوں میں خیمہ زن ہوئے تھے۔ بنی اسرائیل روزمرہ کی ضروریات کی چیزیں انہی لوگوں سے خریدتے تھے۔ یہ انہیں یوں بھی لوٹتے تھے اور پھر ہر قسم کا فتنہ و فساد بھی برپا کرتے تھے۔ تورات (سفر القضاۃ اور سفر اعداد) میں دیکھئے، کہ انہوں نے بنی اسرائیل کے خلاف کس کس قسم کی ننگِ انسانیت حرکتیں کیں۔ ان کی عورتوں نے بنی اسرائیل کے نوجوانوں کو (جو درحقیقت ان کی سپاہ تھی) اپنے دامِ فریب میں پھنسا کر بداخلاقی کو عام کرنا شروع کر دیا۔ انہیں،

فتنہ و فساد

آہستہ آہستہ، ان کے سرداروں سے باغی کر دیا۔ اور دگرد کے قبائل کے ساتھ سازشیں شروع کر دیں کہ بنی اسرائیل کو ان علاقوں سے نکال دیا جائے۔ غرضیکہ جس طرح ہر ستمبد قوم کا شیوہ ہے انہوں نے اس قسم کے اپلہ فریب حربوں سے بنی اسرائیل کے جواہر ملّی کو ایک ایک کر کے چھین لینا چاہا۔ یہ تھا وہ وقت

جب حضرت شعیبؑ نے انہیں للکارا اور کہا کہ وہ اس قسم کے انسانیت سوز جرائم سے کیوں غضبِ الٰہی کو دعوت دے رہے ہیں؟ سورۂ اعراف میں ہے۔

(۷ / ۸۶-۸۵) وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۗ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ
قَدْ جَاءَتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ فَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ
أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن
كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝ وَلَا تَقْعُدُوا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوعِدُونَ وَتَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ
اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِهِ وَتَبْغُونَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْكُرُوا إِذْ كُنتُمْ قَلِيلًا فَكَثَّرَكُمْ ۖ
وَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ۝

اور اہلِ مدین کی طرف ہم نے، اُن کے بھائی بندوں میں سے شعیبؑ کو بھیجا۔ اُس نے بھی ان سے یہی کہا کہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرو۔ اُس کے سوا کوئی ایسی قوت نہیں جس کی محکومیت اختیار کی جائے۔ تمہارے پاس تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے واضح تعلیم آچکی ہے۔ تمہیں چاہیئے کہ اپنے معاشی نظام میں عدل برتو۔ ناپ تول کو پورا رکھو، لوگوں کے واجبات میں کمی نہ کیا کرو۔ (۸۳/۳-۱) اور معاشرہ میں، ہمواریاں پیدا ہو جانے کے بعد، ناہمواریاں نہ پیدا کرو۔ یہ سب کچھ تمہارے اپنے ہی بھلے کے لئے ہے اگر تم اس پر یقین رکھو۔

دیکھو! ایسا نہ کرو حق و صداقت کی طرف سے جانے والے راستوں پر راہزنوں کی طرح بیٹھ جاؤ۔ جو لوگ صحیح نظامِ خداوندی قائم کرنے کے لئے اُٹھیں، اُنہیں دھمکیاں دے دے کر، اس راستے سے روکو اور انسانیت کی راہ میں پیچ و خم پیدا کرنے کے درپے رہو۔ تم اپنی اُس حالت کو یاد کرو جب تم تعداد میں بہت کم تھے (اور بے سروسامان بھی) سو خدا نے (امن و عافیت دے کر) تمہاری تعداد بھی بڑھا دی اور تمہیں ویسے بھی بہت کچھ دیا۔ (اب تم معاشرہ میں فساد برپا کرتے ہو) لیکن اسے تو سوچو کہ معاشرہ میں فساد برپا کرنے والوں کا انجام کیا ہوا کرتا ہے؟

غور کیجئے۔ وہ تمام عیوب و جرائم جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے کس طرح ایک ایک کر کے بیان کئے گئے ہیں۔ سورۂ ہود میں ارشاد ہے۔

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ وَلَا
تَنقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ ۚ إِنِّي أَرَاكُم بِخَيْرٍ وَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ
مُّحِيطٍ ۝ وَيَا قَوْمِ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ

وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝ بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ۝ (۸۶-۸۵/۱۱)

اور اس طرح ہم نے قوم مدین کی طرف، اُنکے بھائی بند، شعیبؑ کو بھیجا۔ اُس نے بھی اُن سے یہی کہا کہ تم صرف خدا کی محکومیت اختیار کرو۔ اُس کے سوا تمہارے لئے کوئی صاحب اقتدار نہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اِس وقت تو تم بڑے خوشحال ہو، لیکن تم نے اپنے معاشرہ میں سخت معاشی ناہمواریاں پیدا کر رکھی ہیں۔ اِس حالت کو بدلو۔ اور اپنے ناپ تول کے پیمانوں کو پورا رکھو۔ ہر ایک کو اُس کا پورا پورا حق دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو مجھے خطرہ ہے کہ تم پر ایسی تباہی آجائے گی جو تم سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیگی۔

اے میری قوم کے لوگو! اپنے معاشی نظام کی بُنیاد، عدل و انصاف پر رکھو اور کسی کے حق میں کمی نہ کرو۔ ایسا کروگے تو ملک میں سخت ناہمواریاں پیدا ہو جائیں گی۔ اور معاشرہ نہس نہس ہو جائے گا۔

یاد رکھو! (جو کچھ تم اس طرح فریب کاری اور سلب و نہب سے جمع کر لیتے ہو، اگرچہ وہ بظاہر بہت کچھ نظر آتا ہے، لیکن وہ تمہارے لئے قطعاً نفع بخش نہیں ہو سکتا) ثبات و دوام صرف اُن مفادات کیلئے ہے جو قانونِ خداوندی کے مطابق حاصل کئے جائیں ——— اور خدا کا قانون یہ ہے کہ ثبات و دوام اُسے حاصل ہو سکتا ہے جو نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔ (۱۳/۱۷) لیکن یہ بات تمہاری سمجھ میں اسی صورت میں آسکے گی کہ تم خدا کے قانون کی صداقت کو تسلیم کرو۔ (اگر تم اس پر یقین نہیں رکھتے تو اسے تم سے جبراً نہیں منوایا جا سکتا اس لئے کہ) میں تم پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا (۱۱/۱۱۲ و ۶/۱۸۴)

دعوتِ شعیبی بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ کے ٹکڑے پر غور فرمائیے۔ دنیائے معاملات کا کون سا گوشہ ہے جو اس احاطہ کے اندر نہیں آجاتا۔ تم پوری پوری محنت کرو اور پھر اس محنت کے ماحصل کو خدا کے اس نظام کے تابع رکھو جو ربوبیتِ عامہ کے لئے متشکل ہوا ہے۔ وہاں سے اس رزق کی تقسیم قانونِ خداوندی کی رُو سے اس طرح ہو گی کہ کسی ضرورت مند کی ضرورت رُکی نہیں رہے گی۔ جو کچھ اس طرح سے حاصل ہو، حقیقی خوشگواریاں اور سرفرازیاں اس سے ملتی ہیں۔ اسی سے تمہاری صلاحیتوں کی نشوونما اور انسانیت کی پرورش ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں آیات (۱۸۴-۱۷۹/۲۶ و ۲۹/۳۶) بھی دیکھئے۔

دعوت کا جواب قوم کی حالت اور حضرت شعیبؑ کی دعوت ہمارے سامنے آچکی ہے۔ اس دعوت کا بھی وہی حشر ہوا جو اس سے پیشتر کی اقوام میں ہوا تھا۔ کچھ لوگوں نے اس سے عبرت حاصل کی۔

لیکن باقی اپنی سرکشی میں بدمست رہے۔ (۷/۸۶)۔
قوم کی بدعنوانیاں اور حضرت شعیبؑ کی اصلاح کی کوششیں دوش بدوش آگے بڑھتی گئیں حتّٰی کہ وہ قوم ان اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئی جو اندھی قوت کے آخری حربے ہوتے ہیں۔ قرآن کریم نے قوم اور حضرت شعیبؑ کے مکالمات کو اپنے خاص انداز میں بیان فرمایا ہے جسے اسی ترتیب و اسلوب سے درج کیا جاتا ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے۔

نواں پارہ شروع

۷/۸۸ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ

اس پر ان اکابرین نے، جو قوت اور دولت کے نشے سے بدمست ہو رہے تھے، کہا کہ اے شعیبؑ! دو باتوں میں سے ایک بات ضرور ہوگی۔ تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو پھر سے وہی سابقہ مسلک اختیار کرنا ہوگا، جسے چھوڑ کر وہ تمہارے ساتھ ہو لئے ہیں، ورنہ ہم تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو اپنی بستی سے نکال دیں گے ——— تم خود سوچ لو کہ تم کیا چاہتے ہو؟

تخویف و ترہیب دیکھئے جب دانش و بصیرت پر مبنی کوئی جواب بن نہیں پڑتا تو مستبد قوتیں کن دھمکیوں پر اتر آتی ہیں "یا تو اس انقلاب انگیز مسلک سے باز آجاؤ۔ ورنہ ملک بدر کر دیئے جاؤ گے"! لیکن جن کی آنکھیں حقیقت کو بے نقاب دیکھ چکی ہوں ان پر ان دھمکیوں کا کیا اثر ہو سکتا ہے؟ حضرت شعیبؑ نے فرمایا۔ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ۝ (۷/۸۸) خواہ ہم اس مسلک کو ناپسند ہی کیوں نہ کرتے ہوں! پھر بھی اسے اختیار کرلیں؟ غور کیجئے! استبداد کے مطالبات کا کیسا صحیح نقشہ کھینچا گیا ہے۔ مستبد قوتیں اس کی اجازت نہیں دے سکتیں کہ جسے آپ کی بصیرت درست سمجھے اسے اختیار کرلینے کا آپ کو حق حاصل ہو۔ آپ کو وہ مسلک اختیار کرنا ہوگا جسے ان کی مصلحتیں اپنے مفید مطلب سمجھیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ جو اللہ کا بندہ علیٰ وجہ البصیرت ان گمراہ کن راستوں کو چھوڑ چکا ہو، وہ محض استبداد کے ڈر سے ان راہوں کو کیسے اختیار کر سکتا ہے؟ حضرت شعیبؑ نے فرمایا۔

۷/۸۸-۸۹ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ۝ قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ

بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ۝ (۸۸-۸۹)

اس پر شعیبؑ نے اُن سے کہا کہ خواہ تمہارے مسلک و مشرب کو ہم ناپسند ہی کیوں نہ کریں، پھر بھی ہمیں، تمہارے ڈر کی وجہ سے، اُسے زبردستی اختیار کرنا پڑے گا؟

اگر ہم تمہارے مسلک کو اختیار کرلیں، حالانکہ (خدا نے اپنی وحی کی روشنی عطا کر کے) ہمیں اس باطل مسلک سے نجات دلائی ہے، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ ہمیں خدا نے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے، تو یہ سب افترا اور خدا پر بہتان ہی ہے۔ تم کان کھول کر سن لو کہ ہم، تمہارے مسلک کی طرف لوٹ کر نہیں آسکتے ایسا ہرگز ہرگز نہیں ہوسکتا[1]۔ ہم نے یہ دین، اُس خدا کی طرف سے ملی ہوئی راہنمائی کی بنا پر اختیار کیا ہے جس کا علم تمام چیزوں کو محیط ہے۔ باقی رہیں تمہاری دھمکیاں، سو ہم ان سے بالکل نہیں ڈرتے۔ ہمارا بھروسہ قانونِ خداوندی کی محکمیت پر ہے۔

شعیبؑ نے پوری جرأت اور استقامت سے اُن اکابرین کو یہ جواب دیا اور پھر کہا کہ اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو اپنے قانونِ مکافات کی رُو سے، ہم میں اور ہماری قوم میں، کھلا کھلا اور آخری فیصلہ کر دے۔ تو سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے (کیونکہ تیرا فیصلہ قانون اور عدل پر مبنی ہوتا ہے۔ اس میں نہ کسی کی رعایت ہوتی ہے، نہ کسی کے خلاف تعصب اور انتقام کا جذبہ کارفرما)۔

جب حضرت شعیبؑ کی محکم خودی کے سامنے ان لوگوں کی کوئی پیش نہ چلی تو عوام کو ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا کہ خبردار! جو شخص اس کے پیچھے چلے گا سخت عذاب میں ماخوذ کر دیا جائے گا۔

(۹۰) وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۝

---

[1] اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا کے یہی معنی ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے، اسلوبِ قرآن کریم میں "استثنا بالمشیّت" ثبوت اور استمرار کے لئے آتا ہے یعنی جہاں اِلَّا کے بعد مَاشَآءَ اللّٰهُ وغیرہ ہو تو اُس کا مطلب ہوتا ہے کہ جو کچھ کہا ہے، اس کے خلاف کبھی نہیں ہوگا (ملاحظہ ہو لغات القرآن جلد چہارم ص۱۶۱۵ عنوان ن۔س۔ی)

اب اُس قوم کے اکابرین نے دوسرا حربہ اختیار کیا۔ انہوں نے شعیبؑ سے مزید بات کرنے کے بجائے اُس کے متبعین کو دھمکانا شروع کیا کہ اگر تم شعیبؑ کا اتباع کرتے رہے، تو یاد رکھو کہ تم سخت نقصان اٹھاؤ گے۔

غور کیجئے! دعوتِ حق و صداقت کو کس طرح دبایا جاتا ہے! دنیا میں کوئی طاغوتی قوت ایسی نہیں جو دعوت الی اللہ کی عام تبلیغ اور اس کی اتباع و اطاعت کی اجازت دیدے۔ ابد سے یہی ہوتا چلا آرہا ہے اور ازل تک یہی ہوتا چلا جائے گا۔

ایک نکھرا ہوا معیار آپ نے نہیں دیکھا کہ ابلیس، آدم کے ساتھ اس اسٹیج پر کن دعاوی کو ساتھ لے کر آیا ہے؟ لہٰذا اگر طاغوتی قوتوں کی طرف سے کسی دعوت کی مخالفت نہیں ہوتی تو سمجھ لیجئے کہ وہ دعوت حق و صداقت کی دعوت نہیں خواہ اس پر خدا پرستی کے کیسے ہی جاذب نگاہ اور نظر فریب پردے کیوں نہ ڈال دیئے گئے ہوں۔ اس لئے کہ انسانوں کے خود ساختہ نظام ہائے زندگی (خواہ ان کی شکل کچھ اور نام کوئی سا کیوں نہ ہو) ان کی مفاد پرستیوں پر مبنی ہوتے ہیں اور نظامِ خداوندی نوعِ انسانی کی ربوبیتِ عامہ کے لئے وجود میں آتا ہے۔ اس سے ان لوگوں کی مفاد پرستیوں اور عیش سامانیوں پر سخت زد پڑتی ہے۔ لہٰذا ان کی طرف سے اس نظام کی مخالفت فطری چیز ہے۔ اگر وہ اس کی مخالفت نہیں کرتے تو سمجھ لیجئے کہ یہ نظام صحیح معنوں میں نظامِ خداوندی نہیں۔ حق و صداقت اور باطل و ضلالت کی دعوتیں پرکھنے کا یہ ایک ایسا کھلا ہوا معیار ہے جس میں کبھی، کہیں، کوئی استثنا نظر نہیں آئے گا۔ لہٰذا حضرت شعیبؑ کے ساتھ یہی کچھ کیوں نہ ہوتا؟

سورۂ ہود میں قوم کی طرف سے ایک ایسے اعتراض کا ذکر کیا گیا ہے جو اسلام کی ایک بہت بڑی اصولی حقیقت کو اپنے آغوش میں لئے ہے۔ انہوں نے کہا۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۭ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ۝ (۱۱/۸۷)

انہوں نے کہا کہ اے شعیبؑ! (تم جو کچھ کہتے تھے اس سے ہم نے سمجھا تھا کہ تم صرف پوجا پاٹ کا کوئی اپنا طریق لے کر آئے ہو۔ اس لئے ہم نے اس سے کچھ تعرض نہیں کیا تھا۔ ہمارے ذہن میں تھا کہ ہم اپنے آباء و اجداد کے طریقے پر پوجا پاٹ کرتے رہیں گے۔ تم اپنے طریق پر کرتے رہو۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ معاملہ صرف پوجا پاٹ کا ہی نہیں۔ تیری صلوٰۃ پرستش نہیں۔ یہ تو ہماری روزمرہ کی عملی زندگی کے ان شعبوں میں بھی دخیل ہو رہی ہے جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں)۔ کیا تیری صلوٰۃ تجھ سے یہ کہتی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے اسلاف کرتے چلے آئے ہیں۔ اور یہ کہ نہ ہم جس طرح ہمارا جی چاہے دولت حاصل کریں۔ اور نہ ہی جس طرح

جو چاہے اُسے خرچ کریں؟ چہ خوب! اِس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے آباء واجداد، جن سے یہ موجودہ نظام منتقل ہو کر چلا آرہا ہے، سب ظالم اور جاہل تھے۔ اور عقل وفہم اور تحمل وبُردباری، غریبوں کی ہمدردی اور غمخواری، سب تمہارے حصے میں آگئی ہے!

مذہب و سیاست

مذہب کے متعلق یہ ایک عام خیال ہے کہ مذہب خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق کا نام ہے اسے ..... دنیاوی معاملات سے کیا واسطہ؟ مذہب کا دائرہ۔ پوجا پاٹ۔ نماز روزہ "نیک عملی اور خدا پرستی" تک محدود ہے، اس سے آگے دنیاوی معاملات ہیں۔ ان معاملات میں مذہب کو دخل انداز نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ خیال نیا نہیں۔ خدا کا سچا مذہب (جس کے لئے صحیح لفظ دین، یعنی نظامِ اطاعتِ خداوندی ہے) جہاں اور جب بھی پیش کیا گیا خود ساختہ قوانین پر چلنے والے انسانوں نے ہمیشہ یہی کہا ہے۔ کہ "مذہب کو ان معاملات کے ساتھ کیا تعلق؟ خدا کی عبادت (بہ معنی پوجا پاٹ) سے دنیا میں کوئی نہیں روکتا۔ اس سے دوسرے کا بگڑتا کیا ہے۔ آپ صبح سے شام تک اس شکل کی عبادت کرتے رہیئے آپ کو کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ یہ وہ چیز ہے جس کی ہر جگہ آزادی ہے۔ لیکن جب آپ عبادت بہ معنی عبودیت (یعنی انسانوں کے بجائے قوانینِ خداوندی کی محکومیت)، کو مذہب (یعنی دین) کی حیثیت سے اختیار کرینگے تو مستبد قوتیں کبھی اس کی اجازت نہیں دیں گی اسلئے کہ دنیا کا نظامِ استبداد، انسانوں کو حق دیتا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کو اپنی مرضی کے مطابق چلائیں۔ لیکن اللہ کا نظام (یعنی دین) انسانوں سے یہ حق چھین کر اس ذات کے سپرد کر دیتا ہے جو حکومت کی فی الواقعہ سزاوار ہے۔ لہٰذا دوسروں پر اپنی مرضی چلانے کا خوگر انسان اسے کس طرح گوارا کرسکتا ہے؟ یہ ہے وہ جذبۂ محرکہ جس کے تحت مستبد قوتوں کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی ہے کہ مذہب پوجا پاٹ کی حد تک رہے تو بالکل درست۔ لیکن اگر ان کے معاملات میں دخل دینے لگ جائے تو سخن درین است۔ یہی ہے وہ اعتراض جو قومِ مدین نے کیا۔ انہوں نے حضرت شعیب سے کہا کہ آپ نمازیں پڑھتے رہیئے۔ ہم کب روکتے ہیں۔ لیکن ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ آپ کی یہ نماز کیسی ہے جو کہتی ہے کہ ہم اپنے اموال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف نہ کریں بلکہ اسے کسی اور قانون کے تابع رکھیں۔ "اموال" کے لفظ کو خاص طور پر سامنے رکھیئے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ نظامِ صلوٰۃ صرف مساجد کی چار دیواری تک محدود نہیں۔ اس کا دائرہ معاشیات کو بھی اپنے اندر لے آتا ہے[1]۔ حقیقت یہ ہے کہ دینِ خداوندی ان ناہمواریوں کو دور

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب "نظامِ ربوبیت"۔

کرنے کے لئے آتا ہے، جو تقسیم رزق کے بارے میں انسانوں نے اپنے خود ساختہ آئین وقوانین کی رو سے پیدا کر رکھی ہیں۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچکر غیر خدائی نظام، نظامِ خداوندی کے مقابلہ میں آتا ہے اور اس سے بڑی شدت سے متصادم ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر تم اپنی صلوٰۃ کا دائرہ اپنی مساجد تک رکھو تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ اعتراض تو ایک طرف میں تمہاری مساجد کی تعمیر، مرمت، روشنی، پانی، جھاڑ فانوس، فرش، قالین تک کے لئے مدد دونگا لیکن اگر تم یہ کہو کہ خدا کا قانون ہماری معاشی زندگی کو بھی محیط ہے تو اس کی ہم اجازت نہیں دے سکتے۔

یہ تو تھا آیت کے دوسرے ٹکڑے کے متعلق۔ اب پہلے ٹکڑے پر غور کیجئے۔ اہلِ مدین بت پرست تھے بُت پرستوں سے پوچھئے۔ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ ہم پرستش تو درحقیقت خدا ہی کی کرتے ہیں لیکن ان بتوں کو خدا کی صفات کا مظہر سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان کے ذریعے خدا کی پرستش کرتے ہیں۔

مقصود سب کا ایک ہے بابا

لہٰذا تمہاری نماز اور ہماری بھگتی ایک ہی منزل تک پہنچنے کے دو راستے ہیں۔ اور بُت پرستوں تک ہی کیا موقوف ہے! دنیا میں کسی "خدا کے بھگت" سے پوچھئے۔ وہ یہی کہے گا کہ راستے مختلف ہیں لیکن قبلۂ مقصود سب کا ایک ہے۔ کسی نے خدا خدا کہہ لیا۔ کسی نے رام رام۔ بات ایک ہی ہے۔ یہ تعلیم بظاہر بڑی خوش آیند ہے اور دلآویز۔ اسی لئے مذہب کو خدا اور بندے کے درمیان نجی تعلق تک محدود رکھنے کے مدعی اور ساعی ہمیشہ اس قسم کے بزرگوں کے اقوال پیش کرتے رہتے ہیں جن سے یہ پایا جائے کہ راستے جدا جدا ہیں مطلوب سب کا ایک ہے۔ (جمنا ایک، گھاٹ بہتیرے۔ کہت کبیر سمجھ کے پھیرے) اور اس کے بعد ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہیں کہ جب عالمگیر سچائیاں سب جگہ یکساں طور پر موجود ہیں[1] تو پھر اختلافِ طریق پر کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ دوسروں کو اپنے طریق کی دعوت دے۔ جس طریق پر کوئی چلا آرہا ہے ٹھیک ہے۔ غور کیجئے۔ قومِ مدین نے حضرت شعیبؑ سے کیا یہی نہیں کہا؟ انہوں نے کہا کہ ہم اپنے آباء واجداد کے جس طریق پر چلے جا رہے ہیں اور جن چیزوں کی پرستش کر رہے ہیں وہ اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ تم جس انداز سے اپنے رب کی عبادت کرتے ہو وہ اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ تمہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ لوگوں سے یہ کہو کہ وہ اپنے طریقہ کو چھوڑ کر تمہارا طریقہ اختیار کر لیں؟

متذکرۂ صدر تصریحات کو سامنے رکھ کر آیت نظر پر پھر غور کیجئے کہ حقائق و عبر کا کتنا بڑا بحرِ ذخار ہے جو چند الفاظ کے سواحل میں گھرا ہوا موجزن ہے۔ دینِ الٰہی خدا اور بندے کے درمیان محض پرستش (پوجا پاٹ) کا تعلق نہیں۔ دین

---

[1] اس مسلک کی اشاعت مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے اپنے ترجمان القرآن میں کی تھی۔

دین کا صحیح مفہوم حکومتِ خداوندی کا ضابطۂ قوانین ہے جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ اس لئے دنیا کا کوئی معاملہ دین کی حدود سے باہر نہیں۔ اور دینِ خداوندی (اسلام) میں عبادت سے مفہوم پرستش (پوجا پاٹ) نہیں بلکہ اس ضابطۂ قوانین کی ـــــ عملی اطاعت ہے جس کا نفاذ قوت و حکومت کے بغیر ممکن نہیں۔ عبادت کی مختلف شکلیں (نماز۔ روزہ وغیرہ) اسی اطاعت کا محسوس مظہر ہیں اور اس نظام کے قیام و بقا کا ذریعہ۔ (تفصیل سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے)

قوم نے یہ کہا اور اس کے جواب میں حضرت شعیبؑ نے فرمایا۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ○ (۱۱/۸۸)

شعیبؑ نے کہا کہ اے میری قوم! ذرا اس پر غور کرو کہ میرے پروردگار نے عقل و بصیرت کے نمایاں راستے میرے سامنے کشادہ کر دیئے ہوں۔ اور لوٹ کھسوٹ، بد دیانتی اور بے ایمانی سے حاصل کردہ روزی کی بجائے مجھے نہایت عمدہ، خوشگوار اور حلال و طیّب روزی عطا کی ہو۔ (تو میں اس کے بعد بھی تمہیں صحیح راستے کی طرف آنے کی دعوت نہ دوں؟)۔ نہ ہی میں ایسا کر سکتا ہوں کہ جن باتوں سے میں تمہیں روکتا ہوں، انہیں خود اختیار کر لوں۔ میں جو کچھ دوسروں سے کہتا ہوں خود اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ میں تو اس کا تہیّہ کر چکا ہوں کہ جہاں تک میرے بس میں ہوگا، میں تمہارے غلط نظامِ معاشرہ کی اصلاح کر دوں گا۔ (میں جانتا ہوں کہ اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے جن اسباب و ذرائع کی ضرورت ہے، وہ سرِ دست مجھے میسّر نہیں۔ لیکن) مجھے وہ تمام اسباب، قانونِ خداوندی کے مطابق عمل کرنے سے حاصل ہو جائیں گے۔ اُس کے قانون کی محکمیت پر مجھے پورا پورا بھروسہ ہے۔ اور سفرِ حیات میں میرا ہر قدم، اُسی سرچشمۂ خیر و خوبی کی طرف اُٹھتا ہے۔

اس بصیرت افروز جواب کے مختلف ٹکڑوں پر غور فرمائیے۔ قوم نے یہ کہا تھا کہ ہم اُس روش پر چلے جا رہے ہیں جو ہمارے آباؤ اجداد سے ہم تک متوارث پہنچی ہے۔ تم اس کے خلاف کیوں کہتے ہو؟ آپ نے اس کے جواب میں وہی کہا جو اس سے پیشتر ہر رسولؑ نے اس اعتراض کے جواب میں کہا تھا۔ یعنی جب میرے پاس

اسلاف پرستی

اللہ کی طرف سے ایک کھلی ہوئی روشنی موجود ہے جس سے میں غلط اور صحیح کی پرکھ کر سکتا ہوں تو پھر بلا سوچے سمجھے آنکھیں بند کئے کسی روش کہن پر چلے جانا کھلی ہوئی گمراہی ہے۔ یہ واضح دلیل اور کھلی ہوئی روشنی، حضرت شعیبؑ کی تعلیم تھی جو بذریعہ وحی آپ کو دی گئی تھی۔

اس کے بعد فرمایا کہ دوسری بات یہ ہوسکتی ہے کہ میں تمہاری تخویف و ترہیب سے ڈر جاؤں۔ لیکن ڈرے وہ جو تمہارا محتاج ہو۔ جسے اللہ پر ایمان ہو وہ انسانوں کا محتاج کیسے ہوسکتا ہے۔ تم میرے رازق نہیں ہو۔ مجھے رزق اس مبداءِ فیض سے ملتا ہے جو خَیۡرُ الرّٰزِقِیۡن ہے۔ جس کا عطا کردہ رزق، درحقیقت رزقِ حسنہ (بہترین روزی) ہے تم غیر اللہ کو رازق سمجھتے ہو اور ان کی محکومیت اختیار کئے ہوئے ہو۔ اس لئے تمہاری حالت یہ ہے کہ روٹی کے ایک ٹکڑے کے لئے تمہیں دس مرتبہ مقامِ انسانیت سے گرنا پڑتا ہے۔ لیکن میرا خدا وہ ہے کہ رزق بھی دیتا ہے اور اس کے ساتھ دنیا جہان کی سرفرازیاں بھی۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

این خدا نانے دہد، جانے برد　　　آں خدا نانے دہد، جانے دہد

پھر فرمایا کہ تم کہتے ہو کہ میں بھی تمہاری روش اختیار کر لوں، لیکن تم یہ نہیں سوچتے کہ جس بات کو میں علیٰ وجہ البصیرت صحیح سمجھتا ہوں اور اس پر چلنے کے لئے تمہیں دعوت دیتا ہوں، تو کیا میں خود اس کے خلاف چلنے لگ جاؤں؟ میں جو کچھ تم سے کہتا ہوں وہی کچھ خود بھی کرتا ہوں۔ باقی رہا یہ کہ میری صلوٰۃ یہ کیوں حکم دیتی ہے کہ میں تمہارے "دنیاوی معاملات" میں بھی دخل انداز ہوں اور تم سے تمہارے آباء و اجداد کی روشِ کہن چھڑا کر ایک اور راہ پر لے چلوں۔ سو یہ اس لئے ہے کہ میں اپنی استطاعت بھر تمہاری اصلاح چاہتا ہوں اور اصلاح کے لئے یہ سب کچھ ضروری ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ میں جو کچھ کہتا ہوں اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ ایسا نہ کرو کہ چونکہ تم نے پہلے ہی سے دل میں فیصلہ کر لیا ہے کہ میری مخالفت ضرور کرنی ہے اس لئے میں جو کچھ کہوں اُس کا اُلٹ کرتے جاؤ۔ یہ روش سرتاپا حماقت ہے۔ اور اس کا نتیجہ ہلاکت و بربادی۔

وَیٰقَوۡمِ لَا یَجۡرِمَنَّکُمۡ شِقَاقِیۡۤ اَنۡ یُّصِیۡبَکُمۡ مِّثۡلُ مَاۤ اَصَابَ قَوۡمَ نُوۡحٍ اَوۡ قَوۡمَ هُوۡدٍ اَوۡ قَوۡمَ صٰلِحٍ ؕ وَمَا قَوۡمُ لُوۡطٍ مِّنۡکُمۡ بِبَعِیۡدٍ ○ (۱۱/۸۹)

اے میری قوم! دیکھنا! میری مخالفت میں تم کوئی ایسی بات نہ کر بیٹھنا جس سے تمہارا بھی وہی حشر ہو جائے جو نوحؑ، ہودؑ یا صالحؑ کی قوم کا ہوا تھا۔ یا قومِ لوطؑ کا سا حال، جس سے تم اچھی طرح باخبر ہو کیونکہ وہ کچھ زیادہ عرصہ کی بات نہیں۔ نہ ہی ان کی تباہ شدہ بستیاں تم سے کچھ زیادہ دُور واقع ہوئی ہیں۔

محض ضد غور کیجئے! کیا دنیا میں حق و صداقت کی مخالفت عام طور پر اسی لئے نہیں ہوتی کہ محض ضد اور تعصب کی بنا پر فیصلہ کر لیا جاتا ہے کہ اس کی مخالفت کرنی ہے اور پھر اس کے بعد کبھی سوچا ہی نہیں جاتا کہ جو کچھ وہ کہتا ہے اس پر غور تو کر لیا جائے؟ یہی وہ راہ ہے جو سیدھی تباہی اور بربادی کے جہنم تک لے جاتی ہے۔ اس روش سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیئے۔ حضرت شعیبؑ نے فرمایا۔

وَ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ۝ (۱۱/۹۰)

تم اپنی موجودہ غلط روش کے تباہ کن نتائج سے اس طرح بچ سکتے ہو کہ تم اُس راستے کو چھوڑ کر، خدا کے راستے کی طرف آجاؤ۔ اور سلب و نہب کے موجودہ نظام کی جگہ خدا کا نظامِ ربوبیت قائم کرکے، اُس سے اپنی حفاظت کا سامان طلب کرو ——— وہ نظامِ خداوندی نہایت شفقت آمیز انداز سے سامانِ مرحمت عطا کرتا ہے۔

قوم کے پاس ان محکم دلائل کا جواب کیا ہو سکتا تھا؟ لیکن کیا اُنہوں نے لاجواب ہو کر اعترافِ حقیقت کر لیا؟ توبہ! توبہ! نخوت و تکبّر کے شیاطین بھلا کب اس کی اجازت دیتے ہیں؟ انہوں نے کہا:

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَ لَوْ لَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۫ وَ مَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ۝ (۱۱/۹۱)

اُنہوں نے کہا کہ اے شعیبؑ! پہلی بات یہ ہے کہ جو کچھ تم چاہتے ہو اس میں سے بہت سی باتیں ہماری سمجھ میں ہی نہیں آتیں! اس لئے اُنہیں ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ تم کوئی ایسے صاحبِ قوّت و اقتدار بھی نہیں کہ اس کی وجہ سے ہم تمہاری باتوں کو مجبوراً مان لیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں محض تمہاری برادری کا لحاظ ہے۔ اگر یہ لوگ تمہارے ساتھ نہ ہوتے تو ہم تمہیں سنگسار کر دیتے اور تم ہمارا کچھ بھی بگاڑ نہ سکتے۔

اس جواب پر صحیح تبصرہ خود حضرت شعیبؑ کے ارشاد میں موجود ہے جو اس سے اگلی آیت میں ہے۔ آپ نے فرمایا۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝ (۱۱/۹۲)

شعیبؑ نے کہا کہ اچھا! تمہیں خدا کے قانونِ مکافات کا کوئی ڈر نہیں۔ ڈر ہے تو میری برادری کا ہے۔ میں اب سمجھا کہ تم جو خدا کا نام لیتے رہتے ہو، وہ محض برائے وزن بیت ہے۔ تم نے اُسے بطور (EXTRA) اپنے ساتھ رکھ چھوڑا ہے، کہ جب اور کوئی ذریعہ باقی نہ رہے تو اس سے کام لے لیا جائے، ورنہ مدد اور سہارے

کے لئے تمہاری نگاہیں اور ہی طرف اُٹھتی ہیں ۔ حالانکہ اگر تم آنکھیں رکھتے تو تمہیں نظر آجاتا کہ خدا کا قانونِ مکافات تمہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے ۔

کتنی بڑی حقیقت ہے جسے دو الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے ۔ دنیا میں انسان ، دوسرے انسانوں کا پاسِ خاطر تو کرتا ہے لیکن خدا کا خیال کبھی نہیں کرتا ! آپ نے کیسی حقیقت کشا اور دلآویز بات کہی ہے کہ کم بختو ! تمہارے نزدیک میری برادری کی طاقت تو ایسی ہے جس کا تم پاس کرو لیکن خدا کا قانونِ مکافات تمہارے نزدیک (معاذاللہ) کچھ شے ہی نہیں کہ اس کا بھی کچھ خیال رکھا جائے ! غور کیجئے !

خدا کا قانونِ مکافات

کیا دنیا میں تمام بڑی بڑی خرابیوں کی علت یہی نہیں کہ لوگ انسانوں کا پاسِ خاطر تو کرتے ہیں لیکن قانونِ خداوندی کو پسِ پشت ڈالے رکھتے ہیں ۔ اگر اس کا دھیان پیشِ نظر رہے تو خلش و اضطراب اور فتنہ و فساد کا یہ جہنم ، سکون و طمانیت کی جنت بن جائے ۔

مندرجہ صدر آیت (۱۱/۹۲) میں ظِهْرِيًّا کا لفظ بڑا معنی خیز ہے ۔ عربوں کے ہاں قاعدہ تھا کہ جب وہ سفر میں جاتے تو چلنے اونٹوں کی فی الواقعہ ضرورت ہوتی ان سے ایک آدھ زائد ساتھ لے لیتے کہ اگر راستے میں متعینہ اونٹوں میں سے کسی کو کوئی عارضہ لاحق ہو گیا یا حادثہ پیش آگیا تو یہ فالتو اونٹ (EXTRA) کام آجائے گا ۔ حضرت شعیبؑ نے ان سے کہا کہ تم خدا کا نام ضرور لیتے ہو اور اس کے ماننے کے مدعی بھی ہو ۔ لیکن عملی زندگی میں تم نے اس کی حیثیت ، ایک ظِهْرِيٌّ جیسی رکھ چھوڑی ہے کہ جب اور کوئی تدبیر کارگر نہ ہو تو اسے بطور آخری حربہ استعمال کر لیا جائے ۔ یہ ہے تمہارا خدا کو ماننا ۔

غور کیجئے ! کیا آج ہماری بھی یہی حالت نہیں ؟

جب حضرت شعیبؑ نے دیکھا کہ قوم اپنی ضد پر بُری طرح سے جمی ہوئی ہے تو فرمایا کہ میں نے اپنا فریضہ ادا کر دیا ۔ تم اگر تباہ ہونے پر تلے بیٹھے ہو تو تمہیں تمہاری غلط روش کے نتائج سے کون بچا سکتا ہے ؟

وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ؕ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ؕ وَارْتَقِبُوْۤا اِنِّىْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ۝ (۱۱/۹۳)

بہرحال ، میں نے سمجھ لیا ہے کہ وعظ و نصیحت کا تم پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا ۔ اس لئے اب میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتے جاؤ اور مجھے میرے پروگرام کے مطابق کام کرنے دو ۔ نتائج بہت جلد بتا دیں گے کہ وہ کون ہے جس پر رُسوا کُن تباہی کا عذاب آتا ہے ۔ اور کون سچا اور کون جھوٹا ہے ۔

تم بھی انتظار کرو، میں بھی انتظار کرتا ہوں۔

یعنی وہی استنتاجی طریق استدلال (PRAGMATIC TEST) کہ میرے پروگرام کو تکمیل تک پہنچ لینے دو، اس کے نتائج خود بتا دیں گے کہ میرا دعویٰ سچا ہے یا جھوٹا۔

سورۂ شعراء میں ہے کہ قوم نے کہا کہ تمہاری ان باتوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ (خاکم بدہن) تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ۝ (۲۶/ ۱۸۵)

اُنہوں نے کہا ہمیں ایسا نظر آتا ہے کہ تو بھی انہی میں سے ہے جو اس فریب میں مبتلا ہو کر کہ خدا اُن سے باتیں کرتا ہے، (قوم کے مصلح بننے کی کوشش کرتے ہیں)۔

بشر اور رسول؟

اس لئے کہ تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ جو کچھ تم کہتے ہو اپنی طرف سے نہیں کہتے بلکہ تم پر اللہ کی طرف سے وحی ہوتی ہے۔ لیکن تم تو ہمارے جیسے انسان ہو۔ تم پر وحی کیسے ہو سکتی ہے؟ یعنی اسی سازِ کہن کی صدائے بازگشت جو ہم اس سے پیشتر امم سابقہ کے احوال و کوائف میں سنتے چلے آئے ہیں۔

وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ (۲۶/ ۱۸۶)

تو ہماری طرح کا انسان ہے (اس لئے تو خدا کا رسول کسطرح ہو سکتا ہے؟) ہم تمہیں تمہارے دعویٰ میں سراسر جھوٹا سمجھتے ہیں۔

اگر تم واقعی سچے ہو تو وہ عذاب لے آؤ جس کی دھمکی دے رہے ہو!

فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (۲۶/ ۱۸۷)

اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو کہ ہماری اس روش کے نتیجے میں ہم پر تباہی آنے والی ہے، تو تم آسمان کا کوئی ٹکڑا ہم پر گرا دو (اور اس طرح اس ناگہانی آفت کو ہم پر لے آؤ)۔

اس کے جواب میں آپ نے فقط اتنا کہا کہ

قَالَ رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ (۲۶/ ۱۸۸)

شعیبؑ نے کہا کہ (میں تم پر آسمانی آفت کیا گراؤں گا)، میرا نشوونما دینے والا خوب جانتا ہے کہ تم کیا کرتے ہو، (اور تمہارے یہ اعمال، تم پر کس قسم کی تباہی لائیں گے)۔

وہ تمہارے اعمال سے واقف ہے اور اعمال کے ظہورِ نتائج کا وقت بھی اُس کو معلوم ہے۔ اس لئے میں تم پر عذاب کیا لاؤں گا؟ عذاب لائیں گے خود تمہارے اعمال!

ظہورِ نتائج کا وقت قومِ مدین اپنی بدعنوانیوں اور سرکشیوں میں آگے ہی آگے بڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق مہلت کا زمانہ ختم ہوگیا اور ظہورِ عذاب شروع ہوگیا۔

تورات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ مدیانیوں کا فتنہ و فساد حد سے بڑھ چکا ہے اس لئے اب ان سے انتقام لو۔

پھر خداوند نے موسیٰؑ کو خطاب کرکے فرمایا کہ مدیانیوں کو تنگ کرو اور انہیں مارو۔ (گنتی $\frac{25}{17-16}$)

پھر خداوند نے موسیٰؑ کو خطاب کرکے فرمایا کہ اہلِ مدیان سے بنی اسرائیل کا انتقام لے۔ اور تو بعد اُس کے اپنے لوگوں سے مل جائے گا۔ (گنتی $\frac{31}{2}$)

چنانچہ ایک قیامت خیز جنگ ہوئی جس میں مدیانی بُری طرح سے تباہ ہوئے۔ قرآن کریم میں جنگ کا ذکر نہیں بلکہ اس کے بعد کا ذکر ہے جو زلزلہ اور آتش فشانی کی صورت میں اُن پر مسلّط ہوا اور جس سے اُن کی بستیاں ویرانوں میں تبدیل ہوگئیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کے بعد اُنہیں مزید مہلت دی گئی کہ وہ اپنی حالت میں اصلاح کر لیں۔ لیکن جب وہ اس پر بھی اپنی سرکشیوں اور بدعنوانیوں سے باز نہ آئے تو پھر اُن کی بربادی کا وقت آ پہنچا۔ سورۂ اعراف میں ہے۔

$\frac{7}{91-92}$ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ۝ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا شُعَیْبًا كَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا ۚ اَلَّذِیْنَ كَذَّبُوْا شُعَیْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِیْنَ ۝

($\frac{7}{91-92}$)

اس کش مکش کے بعد ہوا یہ کہ جن لوگوں نے شعیبؑ کو جھٹلایا تھا، اُنہیں لرزا دینے والے عذاب نے آگھیرا اور وہ اپنے گھروں میں، مٹی کے تودوں کی طرح بے حس و حرکت پڑے کے پڑے رہ گئے۔

وہ اس طرح نیست و نابود ہوگئے گویا وہ ان بستیوں میں کبھی بسے ہی نہ تھے۔ (وہ شعیبؑ کے متبعین سے کہا کرتے تھے کہ تم اپنی روش سے باز آجاؤ، ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔ لیکن ہوا یہ کہ نقصان اُنہی کا ہوا جو شعیبؑ کی تکذیب کیا کرتے تھے۔ — قوانینِ خداوندی کی تکذیب کا یہی نتیجہ ہوا کرتا ہے۔

یہی الفاظ سورۃ عنکبوت میں ہیں۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ○ (۲۹/۳۷)

انہوں نے شعیبؑ کی تکذیب کی تو (آخرالامر) انہیں زلزلہ کی تباہی نے اس طرح آپکڑا کہ وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ گرے ہوئے پائے گئے۔

حضرت شعیبؑ اس سے پہلے ہی ان سے الگ ہو چکے تھے۔

۷/۹۳ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ○

شعیبؑ اس تباہی سے پہلے ہی اُن سے الگ ہو گیا تھا۔ اُس نے جاتے وقت اُن سے کہا تھا کہ اے میری قوم! میں نے تمہیں، اپنے نشوونما دینے والے کے پیغامات پہنچا دیئے۔ میں نے بہتیرا چاہا کہ تمہارا بھلا ہو جائے لیکن تم نے ایک نہ سُنی۔ (اور اپنی غلط روش پر برابر آگے بڑھتے چلے گئے)۔ اب اُس کے نتیجہ میں جو تباہی تم پر آرہی ہے میں اس پر کیا افسوس کروں!

آیت کے آخری الفاظ پر غور فرمایئے۔ ان میں بظاہر قوم کے عبرت انگیز انجام سے بے تعلقی پائی جاتی ہے لیکن ذرا گہرائی میں جا کر دیکھئے تو اس بے تعلقی میں بھی ہمدردی و شفقت کے کس قدر نازک اور شدید جذبات مضمر ہیں! مصلحین کو بھی کیسا دردمند دل عطا ہوتا ہے (نیز دیکھئے ۱۱/۹۴-۹۵ ؛ ۲۶/۱۸۹)

یہ ہے سرگزشت قوم مدین۔ اصحاب الایکہ کا ضمنی ذکر قرآن کریم کے دو اور مقامات میں بھی آیا ہے۔

وَثَمُوْدُ وَقَوْمُ لُوْطٍ وَّاَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ ؕ اُولٰٓئِكَ الْاَحْزَابُ ○ (۳۸/۱۳ ؛ ۵۰/۱۴)

نیز قوم ثمود۔ قوم لوط اور اصحاب الایکہ (اہلِ مدین) نے بھی۔ اُن کا بڑا الاؤ لشکر تھا (سب کے سب تباہ کر دیئے گئے۔) (نیز ۵۰/۱۴)

۷/۹۴ وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ○

(یہ محض چند واقعات ہیں جنہیں اس مقام پر سامنے لایا گیا ہے، ورنہ تمام اقوامِ سابقہ کی تاریخی یادداشتیں

اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ) ہم نے جب بھی کسی بستی کی طرف کوئی نبی بھیجا، (تو اُس کے اربابِ دولت و ثروت نے اس کی مخالفت کی ۳۴/۳۴ و ۴۳/۲۳۔ جب تک اُن کی غلط روش، اِس درجہ تک نہ پہنچتی کہ وہ اِن کی آخری تباہی کا موجب بن جائے)) ان پر ہلکی ہلکی مصیبتیں آئیں مقصود اس سے یہ تھا کہ وہ اپنی غلط روش کا نتیجہ دیکھ کر، قوانینِ خداوندی سے سرکشی چھوڑ دیں، اور اُن کے سامنے جُھک جائیں۔ یہ مصیبتیں اور مشکلیں خود اُن کے غلط نظام کی پیدا کردہ ہوتی تھیں۔

سابقہ آیات میں اقوامِ گزشتہ کی داستانیں ہمارے سامنے آئی ہیں۔ اس کے بعد ملخصاً بتایا گیا ہے کہ ان کی تباہی اور بربادی کی وجہ کیا تھی، اور وہ تباہی اُن پر کس انداز سے آئی۔ اگرچہ یہ حقیقت متعدد بار سامنے آچکی ہے، بایں ہمہ اسے چند الفاظ میں، بارِ دیگر، دُہرا دیا جائے کہ دین کی تاریخ اُس کشمکش کی تاریخ ہے جو نظامِ ملوکیت، سرمایہ داری اور مذہبی

غلط کار قوموں کی تباہی

پیشوائیت اور نظامِ خداوندی میں پیہم اور مسلسل چلی آرہی۔ اِس سے دین اور مذہب کا فرق بھی واضح ہوجاتا ہے۔ مذہب کو اِن باطل نظامہائے زندگی سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ اس کا مقصد بندے اور خدا کے درمیان ایک پرائیویٹ قسم کا تعلق پیدا کرنا ہوتا ہے، جو پوجا پاٹ۔ بندگی۔ پرستش کے ذریعے ہر قسم کے نظام میں حاصل ہوسکتا ہے۔ دین اِن باطل نظاموں کو مٹاتا اور ان کی جگہ نظامِ خداوندی قائم کرتا ہے۔

اب رہا وہ طریق جس کے مطابق غلط کوش اور غلط کار قوموں کی تباہی ہوتی ہے۔ غلط نظام آہستہ آہستہ خرابیاں پیدا کرتا ہے۔ اگر شروع ہی میں اِن کی روک تھام کا انتظام کر لیا جائے تو قوم تباہی سے بچ جاتی ہے۔ اگر اِن خرابیوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں تو وہ بڑھتی چلی جاتی ہیں، تاآنکہ ان کی آخری تباہی کی نوبت آجاتی ہے۔ زیرِ نظر آیات میں اسی حقیقت کو سامنے لایا گیا ہے۔

یہاں اِن ہلکے ہلکے جھٹکوں کا مقصد یہ بتایا گیا؛ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ـــــ تَضَرُّعَ کا مفہوم آیت (۷/۵۵) کی تشریح میں بتایا جا چکا ہے۔ غلط نظام میں قوم زندگی بخش سرچشموں سے کٹ جاتی ہے۔ انہیں اس قسم کی وارننگ سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ پھر ان چشمہ ہائے حیات بخش کی طرف پلٹ آئیں۔ وہ چشمے جن کی نشاندہی وحی آیات آگے آیت (۷/۹۶) میں کی گئی ہے۔

۷/۹۵ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّ قَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ○

وہ اِن قوانین کے سامنے جُھک جاتے، تو اُن کی مصیبتیں، خوشحالیوں میں بدل جاتیں۔ جب اُن پر، اس طرح، ایک عرصہ گزر جاتا، تو وہ پھر بُھول جاتے کہ بدحالی اور خوشگواری، قانونِ خداوندی سے وابستہ ہے (۷/۹۴)۔ وہ کہتے کہ اس قسم کی تبدیلیاں، یونہی اتفاقی طور پر رونما ہوتی رہتی ہیں۔ ہمارے اسلاف کی بھی یہی حالت رہی کہ اُن پر کبھی اچھے دن آجاتے، کبھی بُرے۔ اِس لئے قانونِ مکافات کوئی چیز نہیں۔ وہ اِس طرح، اپنی غلط روش میں اندھا دھند آگے بڑھتے چلے جاتے، تا آنکہ ظہورِ نتائج کا وقت آجاتا، اور وہ اس طرح اچانک پکڑے جاتے کہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوتا کہ اُن پر یوں تباہی آجائے گی۔

اِس میں قوموں کی عمومی ذہنیت سامنے لائی گئی ہے۔ یعنی اِن پر جھٹکا آتا ہے تو وہ سنبھل جاتی ہیں۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد، اسے بُھول جاتی ہیں اور پھر اُسی روشِ کہن پر گامزن ہو جاتی ہیں۔

اِس کے بعد قرآنِ کریم نے تاریخ کے ایک عمیق فلسفہ کی طرف توجہ دلائی ہے۔ جن لوگوں کی نگاہ قوموں کے عروج و زوال کے ابدی قوانینِ خداوندی پر نہیں (یعنی سیکولر نظامِ زندگی کے پیرو ہیں)، وہ اپنے آپ کو اس فریب

یہ کچھ اتفاقیہ نہیں ہوتا

میں مُبتلا رکھتے ہیں کہ اس قسم کے حادثات اتفاقیہ رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے آباؤ اجداد کے زمانے میں بھی ایسا ہی ہوتا تھا، اور اب بھی ویسے ہی ہوتا ہے لیکن قرآنِ کریم کا ارشاد یہ ہے کہ کارگہِ کائنات میں کوئی واقعہ اتفاقیہ رونما نہیں ہوتا۔ یہاں ہر واقعہ اور حادثہ قانونِ علت و معلول (CAUSE AND EFFECT) کے مطابق ظہور میں آتا ہے۔ (انڈکس میں "تاریخ" اور "قوموں کے عروج و زوال کے قوانین" کے عنوانات دیکھئے)۔ قرآن کے دعویٰ کی صداقت کا عجیب ثبوت ہے کہ اب سیکولر مغرب کے دانشور بھی اس نتیجے پر پہنچ رہے ہیں کہ دُنیا میں واقعی کوئی حادثہ اتفاقیہ (BY CHANCE) رُونما نہیں ہوتا۔ اس کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے۔ جب تک وہ سبب ہمارے علم میں نہیں آتا، ہم اسے (CHANCE) کہتے ہیں۔ جب وہ سبب معلوم ہو جاتا ہے تو وہی چانس، قانون کے احاطہ میں آجاتا ہے۔

جب کوئی قوم اپنی تباہی کے آثار کو محض اتفاقی (CHANCE) سمجھتی رہے تو وہ اپنی اصلاح کی طرف توجہ ہی نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ اصلاح سے مراد ہوتی ہے اس خرابی کا دُور کرنا جو اس تباہی کا سبب ہو۔ اور ایسا وہی قوم کر سکتی ہے جس کی نگاہ قوموں کے عروج و زوال کے غیر متبدل قوانین پر ہو۔ جھٹکے کے وقت وہ سوچے گی کہ ہم سے کون سے قانون کی

تقدیر اور سیکولرازم

خلاف ورزی ہوئی ہے جس کا نتیجہ یہ خرابی ہے۔ اور جب اس علت کی تحقیق کر لے گی تو اسے دُور کرنے کی تدبیر کرے گی۔ واضح رہے کہ جسے سیکولر اصطلاح میں چانس

کہا جاتا ہے، اُسے مذہب پرست طبقہ تقدیر کہکر پکارتا ہے۔ چانس میں بھی کوئی شخص اس حادثہ کی ذمہ داری اپنے سر پر نہیں لیتا
عقیدہ تقدیر میں بھی یہی ہوتا ہے۔ تقدیر پرست قومیں کبھی اپنی اصلاح کر ہی نہیں سکتیں۔ جب ان کی تباہی آتی ہے تو وہ
شعوری طور پر سمجھ ہی نہیں سکتیں کہ ایسا کیوں ہوا ہے۔ سیکولر ذہنیت یہ کہکر اپنے آپ کو مطمئن کر لیتی ہے کہ یہ محض
اتفاقی حادثہ ہے، اور تقدیر پرست یہ کہکر اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں کہ خدا کی مرضی ہی ایسی تھی! ان کے برعکس قرآن
کہتا ہے کہ یہ سب (عروج و زوال) قوانین خداوندی کے مطابق ہوتا ہے۔

۷/۹۶ وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَ
الْأَرْضِ وَلَٰكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ○

اگر یہ لوگ ہمارے قانون کی صداقت پر یقین رکھتے، اور (اُس کے اتباع سے) زندگی کی تباہیوں سے محفوظ رہنے
کی فکر کرتے، تو ہم ان پر زمین اور آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے (۵/۶۶ و ۷/۴۰)۔ یعنی
اُن برکات کے دروازے جن سے اُنہیں اس دنیا کی زندگی کی خوشحالیاں اور سرفرازیاں بھی میسر آ جائیں اور اُخروی
زندگی کی شادابیاں اور ثمر باریاں بھی۔ لیکن اُنھوں نے اُسے جھٹلایا تو اُن کے اعمال کے نتائج نے اُنہیں
آن پکڑا۔

یہ آیت، اِس سے پہلے آیات (۵/۶۶ ؛ ۷/۴۰) میں آ چکی ہے۔ وہاں مفہوم دیکھ لیجئے۔ "ارض وسماء" کی
برکات کے ارتباط سے قرآن کریم نے دنیاوی زندگی اور وحی میں جس ربطِ باہمی کی طرف اشارہ کیا ہے اس سے نگہ بصیرت

دنیا اور دین کا ارتباط

وجد میں آ جاتی ہے۔ اسلام نہ سیکولرازم ہے جس میں منتہیٰ ارض (محض دنیوی زندگی)
ہوتی ہے، اور نہ ہی مذہب یا تصوّف جس میں دنیا کو قابلِ نفرت قرار دے کر مقصد
حیات (رمز عومہ) "روحانیت" قرار دی جاتی ہے۔ اقبالؒ کے یہ بصیرت افروز اشعار نہ معلوم کتنی بار پہلے سامنے آ چکے
ہیں، اور کتنی بار اور سامنے آئیں گے۔ کہ

غربیاں را زیرکی سازِ حیات ‏ شرقیاں را عشق رازِ کائنات
زیرکی از عشق گردد حق شناس ‏ کارِ عشق از زیرکی محکم اساس
عشق چوں با زیرکی ہمبر شود ‏ نقشبندِ عالمِ دیگر شود
خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ ‏ عشق را با زیرکی آمیز دہ (جاوید نامہ صفحہ ۱)

یہ "عشق اور زیرکی" کا آمیزہ ہے جسے قرآن نے "ارض وسماء" کا ارتباط کہکر پکارا ہے۔ اسی کا نام اسلام ہے جو

از کلیدِ دین درِ دنیا کشاد

دنیا کے ہر دروازے کو دین کی چابی سے کھولتا ہے۔

ان قوموں کا جرم یہ تھا کہ انہوں نے ارتباطِ "ارض و سماء" کے اس قانونِ ازلی کو جھٹلایا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ خدا کے قانونِ مکافات نے انہیں پکڑ لیا۔ یہاں اَخَذْنٰهُمْ (ہم نے انہیں پکڑا) کے بعد بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (ان کے غلط اعمال کی وجہ سے) کا اضافہ کر کے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ خدا کی گرفت کیوں ہوتی ہے۔

اس کے بعد استعارہ کے طور پر بتایا ہے کہ ان قوموں کی حالت کیا ہو چکی ہوتی ہے۔

۷/۹۹-۹۷

أَفَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرٰىٓ أَنْ يَّأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآئِمُوْنَ ۝
أَوَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرٰىٓ أَنْ يَّأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ ۝
أَفَأَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

(یہ ہیں وہ حقائق جو تاریخی شہادتوں سے ثابت ہیں) تو کیا اس کے بعد بھی (یہ تمہارے مخاطب جو مختلف بستیوں میں رہتے ہیں، اس سے نڈر ہو چکے ہیں کہ ہمارا عذاب ان پر رات کے وقت آئے جب وہ سو رہے ہوں۔ (۹۷)

کیا یہ اس سے بالکل نچنت ہو رہے ہیں کہ ہمارا عذاب ان پر چاشت کے وقت آئے جب وہ بےخبر کھیل کود میں مشغول ہوں۔ (۹۸)

کیا یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ انہیں خدا کی تدبیروں کی طرف سے امان مل چکی ہے؟ یاد رکھو! اپنے آپ کو اس قسم کی خود فریبی میں وہی قوم رکھ سکتی ہے جس نے تباہ و برباد ہونا ہو۔ (۹۹)

تباہ ہونے والی قوموں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ یا تو وہ قوت اور دولت کے نشہ میں اس قدر مدہوش ہوتی ہیں کہ انہیں (سونے والے کی طرح) اس کی خبر ہی نہیں ہوتی کہ ان کے گرد و پیش ہو کیا رہا ہے، اور تباہیاں اور بربادیاں کس طرح ان کے سر پر منڈلا رہی ہیں۔ اور یا یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ جاگ رہے ہوتے ہیں، لیکن (شطرنج کھیلنے

تباہی کب آتی ہے

والوں کی طرح) اپنے جذبات کی دنیا میں اس قدر جذب ہوتے ہیں کہ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا (۷/۱۷۹) "ان کی آنکھیں تو ہوتی ہیں، لیکن وہ ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ ان کے کان بھی ہوتے ہیں لیکن ان سے سنتے نہیں۔ ان کے دل و دماغ بھی ہوتے ہیں، لیکن وہ ان سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے"۔ وہ اس مدہوشی کے عالم میں قانونِ مکافات کی طرف سے بالکل نچنت ہوتے ہیں۔ انہیں اس کا خیال تک

نہیں آتا کہ غلط نظام کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔

۱۰۰ أَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِينَ يَرِثُونَ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ أَهْلِهَا أَنْ لَوْ نَشَاءُ أَصَبْنَاهُمْ بِذُنُوبِهِمْ ۚ وَنَطْبَعُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ○

یہ لوگ جو پہلی قوموں کی تباہی کے بعد، اُن کے ملک اور دولت کے وارث ہوئے ہیں، کیا ان پر یہ بات اب بھی واضح نہیں ہوئی کہ ہمارا قانون ان کے جرائم کی بنا پر، اُنہیں مصیبتوں میں مُبتلا کرسکتا ہے؟

لیکن یہ جو، اِس قدر واضح دلائل وشہادات کے باوجود، ان باتوں پر کان نہیں دھرتے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ، اسلاف کی اندھی تقلید، اور مفاد پرستیوں کے جذبات، نے اِن کے سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں کو سلب کردیا ہے۔

انڈکس میں قانونِ استبدال واستخلافِ قومی کا عُنوان دیکھئے۔ اِس میں قرآن نے کہا ہے کہ جب ایک قوم اپنی صلاحیت کھودیتی ہے تو اس کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے۔ اِس قوم سے کہدیا جاتا ہے۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ (۱۰/۱۴)

پھر ہم نے تمہیں سابقہ قوم کا جانشین بنایا، یہ دیکھنے کے لیے کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو۔

اگر تم نے بھی اُسی قوم کی روش اختیار کی جس کے تم جانشین بنے ہو، تو تمہارا انجام بھی اُنہی جیسا ہو جائے گا۔ تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے لیگی۔ یہاں تو اصول ہی یہ ہے کہ زندہ وہی قوم رہتی ہے جس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اور مرنے والی قوم کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ وہ عقل وفکر سے کام لینا چھوڑ دیتی ہے۔

۱۰۱ تِلْكَ الْقُرَىٰ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَائِهَا ۚ وَلَقَدْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ ۚ فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا مِنْ قَبْلُ ۚ كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِ الْكَافِرِينَ ○

بہرحال یہ ہیں وہ چند اقوامِ سابقہ جن کے حالات ہم نے تم سے بیان کئے ہیں۔ ان کے رسول، ان کی طرف واضح دلائل واحکام لے کر آتے۔ وہ لوگ بجائے اس کے کہ جو کچھ ان سے کہا جاتا اس پر غور وفکر کرتے، بلا سوچے سمجھے اُسے جھٹلا دیتے ——— کبھی اِس بنا پر کہ اس سے پہلے اُن کے آباء واجداد، اُسے جھٹلا چکے تھے۔ اور کبھی یوں کہ ایک دفعہ، جو بات یونہی منہ سے نکل گئی، اس پر جم کر بیٹھ گئے ——— حقیقت سے اِنکار کرنے والوں کے دلوں پر یوں مہریں لگا کرتی ہیں۔ اسلاف کی اندھی تقلید، اور اپنی بات کی پچ، انسان سے سمجھنے سوچنے کی صلاحیت سلب کر لیا کرتی ہے۔

ضد اور تعصّب تباہ ہونے والی قوم کی ایک ذہنیت یہ بھی ہوتی ہے کہ جس بات سے وہ ایک دفعہ انکار کر دیں، آپ لاکھ سمجھائیے، وہ اپنی ضد پر اڑے رہیں گے (اس کی وضاحت آیات (۱۱۰-۱۱۲/۶) میں کی جا چکی ہے)۔ اس قسم کی ذہنیت، قوت اور استبداد کا نشہ پیدا کر دیتا ہے۔

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ (۲۷/۱۴)

ظلم اور تکبّر نے اُن کی ذہنیت ایسی کر دی تھی کہ وہ صداقت سے بدستور انکار کرتے چلے گئے، حالانکہ انہیں دل میں یقین تھا کہ بات سچی ہے۔ یہ وہ فسادِ قلب و نگاہ تھا جس کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔

آپ آیت (۷/۲) کی تشریح دیکھئے جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ حقیقت اور صداقت کو تسلیم کرنے کے لئے کس قدر کشادِ قلب کی ضرورت ہوتی ہے۔ تعصّب اور تنگ نظری بدترین خصلت ہے۔ اسے دلوں پر مُہر لگ جانا کہتے ہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب کبھی یہ خالی الذہن ہو کر سوچتے ہیں تو صداقت کو تسلیم کر لیتے ہیں، لیکن پھر تنگ نظری کا شکار ہو جاتے ہیں تو اپنے سابقہ اقرار پر قائم نہیں رہتے۔

۷/۱۰۲ وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ۝

اِن اقوامِ سابقہ میں سے اکثر کی یہی حالت رہی کہ وہ قوانینِ خداوندی کے وفاشعار نہ رہے۔ اُنہوں نے خدا سے جو عہد کیا تھا، اس پر قائم نہ رہے۔ وہ صحیح راستے کو چھوڑ کر، غلط راہوں پر چلنے لگ گئے۔

چوتھا باب

سورۃ الاعراف - آیات ۱۰۴ تا ۱۲۶

صاحب ضربِ کلیمؑ

۱ ـــــــ تجلّی گاہِ طور

۲ ـــــــ عقل کے تجرباتی طریق اور وحی میں فرق۔

۳ ـــــــ عصا و ید بیضا۔

۴ ـــــــ تسبیح اور ذکر کا انقلابی مفہوم۔

۵ ـــــــ نبوّت سے پیشتر کے مراحل۔

ـــــــ خدا نبی کو "اپنے ایک کام" کے لئے تیار کرتا ہے۔

۶ ـــــــ خدا کی معیت کا مفہوم۔

ہرمزان اور حضرت عمرؓ کا مکالمہ

۷ ـــــــ دربار فرعون میں۔

اسلاف کے متعلق نظریہ۔

۸ ـــــــ ذبح ابنا اور پارٹی بازی ـــــــ حکمت فرعونی

۹ ـــــــ مذہبی پیشواؤں کے ساتھ مناظرہ۔ ساحرین کا مفہوم

۱۰ ـــــــ محکوم کی کوئی بات قابلِ اعتنا نہیں ہوتی۔

۱۱ ـــــــ فرعون کا ادعا ـــــــ انا ربکم الاعلیٰ۔

۱۲ ـــــــ ساحرین کا ایمان

ـــــــ استبداد کی شعلہ فشانیاں۔

ایمان کی قوت۔

چوتھا باب

کشمکش فرعون و صاحب ضرب کلیمؑ

سابقہ باب میں اقوامِ (حضرت) نوح، ہود، صالح، لوط اور شعیب (علیہم السلام) کی داستانیں سامنے آ چکی ہیں۔ آئندہ آیات میں حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی کشمکش اور بنی اسرائیل کے کوائفِ حیات کا تذکرہ ہے۔ یہ تذکار، سابقہ جلدوں میں بھی آچکے ہیں۔ آئندہ آیات میں سے جو آیات پہلے آچکی ہیں، اُن کا تو صرف حوالہ دیا جائیگا دیگر آیات کی تشریح کی جائے گی۔

حضرتِ موسیٰؑ کی داستانِ زندگی کے کچھ اشارات، مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۷۰ (زیر آیت ۲/۴۰) دیئے جا چکے ہیں۔ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ تفصیلی سلسلۂ کلام اس مقام سے شروع کیا جائے جہاں انہیں شرفِ نبوّت سے سرفراز کیا گیا تھا اور فرعون کے ساتھ تصادم کا حکم دیا گیا۔ جہاں تک خدا کے ساتھ ہم کلامی کا تعلق ہے اس کے متعلق مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۲۰۲ (زیر آیت ۲/۱۱۸) ذکر آچکا ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے، مدین میں جہاں شادی کی تھی، تو ایک مُعینہ مدّت تک وہیں رہنے کا معاہدہ بھی کیا تھا۔ جب وہ مدّت ختم ہوگئی، تو آپؑ اپنے اہل وعیال کو ساتھ لے کر وہاں سے چل نکلے۔ چرواہوں کی زندگی کچھ ایسی ہوتی ہے کہ اپنے ریوڑ کو لئے لئے مختلف چراگاہوں میں پھرتے رہتے ہیں۔ آج اس جنگل میں۔ کل اُس نخلستان میں۔ ایک چھوٹا سا خیمہ۔ چند ضروریات کی چیزیں۔ سر پر اللہ کا آسمان۔ سامنے اس کی کھلی ہوئی زمین۔ صاف ہوا۔ مصفا پانی۔ اسی انداز میں، حضرت موسیٰؑ شبانی سے جہانبانی کے طریقے سیکھ رہے تھے کہ اب ایک اور منزل سامنے آگئی۔

اندھیری رات، جاڑے کا موسم، جنگل کا سماں۔ اپنی بستی سے دور، کوہِ طور کے دامن میں۔ شاید راستہ بھولے ہوئے دور، پہاڑ پر آگ دکھائی دی۔ اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے کہ میں جاتا ہوں۔ وہاں سے آگ کا انگارہ بھی لاتا ہوں اور راستہ کا اتا پتا بھی۔

فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖٓ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۝ (۲۸ / ۲۹)

سو جب موسیٰ نے (مدین میں) اپنی مدّتِ معینہ پوری کر لی اور اپنے اہلِ خانہ کو ساتھ لے کر چلا۔ تو طور کی جانب آگ دیکھی۔ اس نے اپنے اہلِ خانہ سے کہا کہ ٹھہرو۔ میں نے آگ دیکھی ہے۔ تمہیں وہاں سے (راستے کی) کوئی خبر لادوں۔ یا آگ کا انگارہ۔ تاکہ تم تاپ سکو۔

تجلّی گاہِ طور یہ سورۂ قصص کی آیت ہے۔ لیکن سورۂ طٰہٰ میں یہ واقعہ زیادہ تفصیل سے مذکور ہے اس لئے پہلے اس سورت کی متعلقہ آیات دیکھئے۔ فرمایا۔

وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۝ (۲۰ / ۹ - ۱۰)

(اس حقیقتِ کبریٰ کو جاننے کے لئے کہ خدا کے ضابطۂ قوانین پر عمل پیرا ہونے سے کس طرح ابتدائی دشوار گزار مراحل کے بعد، بالآخر کامیابیاں اور کامرانیاں نصیب ہو جاتی ہیں) تمہیں موسیٰؑ کی سرگزشت اپنے سامنے رکھنی چاہیئے۔

(اس داستان کا آغاز ہم اس مقام سے کرتے ہیں) جب اُس نے (دور سے) آگ دیکھی تو اپنے ساتھیوں سے کہا کہ میں نے آگ دیکھی ہے۔ تم یہاں ٹھہرو۔ میں جاتا ہوں۔ ممکن ہے میں وہاں سے تمہارے لئے ایک انگارا لے آؤں، یا کم از کم) الاؤ پر کوئی ایسا آدمی مل جائے جو ہمیں (اس اندھیری رات میں) راستے کا پتہ نشان بتا سکے۔

(تنہا عقلِ انسانی، وحی کی مدد کے بغیر، اس طرح، قیاسات نشانِ راہ تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہے)۔

حضرت موسیٰؑ، آگ کے نشان پر نگاہ رکھے، اپنے دھیان میں چلے جا رہے تھے کہ کسی پکارنے والے نے آپ کا نام لے کر پکارا۔

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ۝ۙ (۲۰ / ۱۱)

پھر جب وہ وہاں پہنچا، تو اس وقت پکارا گیا۔ اے موسیٰ!

اس سنسان جنگل میں، جہاں کوئی واقف معلوم نہیں ہوتا تھا، اپنا نام سن کر ٹھٹک کر رہ گئے۔ کہ اتنے میں پکارنے والے نے خود ہی اس استعجاب کو رفع کر دیا۔ آواز آئی۔

اِنِّیْۤ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝ (۲۰/۱۲)

میں تیرا نشو ونما دینے والا ہوں۔ تو اب اُس مقام تک پہنچا ہے جہاں تیرے لئے عقل کے تجرباتی اور قیاسی طریق سے نتائج تک پہنچنے کی طول طویل مسافتیں لپیٹ دی گئی ہیں، اور اس کی جگہ وحی کا مقدس راستہ کھول دیا گیا ہے۔ جہاں حقائق از خود منکشف ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔ لہٰذا تو اب اُس لمبے سفر کے سازوسامان کو الگ رکھ کر، اطمینان سے بیٹھ جا۔ وہ دور ختم ہو گیا۔ (۷۹/۱۶) ؛ (۹۳/۷)۔

قارئین کو معلوم ہوگا کہ دنیا کی ہر زبان کی طرح عربی زبان میں بھی، الفاظ کے حقیقی معانی (LITERAL MEANINGS) بھی ہوتے ہیں اور مجازی معانی بھی۔ قرآنِ کریم عربی زبان میں نازل ہوا ہے اس لئے اس کا اسلوب بیان بھی عربی زبان ہی کا ہے۔ اس بنا پر قرآن مجید کے الفاظ کے حقیقی معانی بھی ہوتے ہیں اور مجازی معانی بھی۔ میں نے، قرآنی الفاظ کے حقیقی اور مجازی معانی سے متعلق، اپنی لغات القرآن کے پیشِ لفظ میں بڑی تفصیلی بحث کی ہے۔ واضح رہے کہ مجازی معانی لینے سے مراد یہ نہیں کہ جو معانی آپ کا جی چاہے لے لیں۔ بالکل نہیں۔ یہ معانی بھی ان الفاظ کے حقیقی معانی کے اندر پوشیدہ ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت لغات القرآن میں پیش کردہ معانی سے اچھی طرح سمجھ بھی آسکتی ہے۔ قرآن مجید کا مفہوم سمجھنے کا میرا انداز یہ ہے کہ جن الفاظ کے حقیقی معانی، اُس کے عمومی مفہوم میں فٹ نہ بیٹھتے ہوں ہیں وہاں ان کے مجازی معانی لیتا ہوں۔ ان سے بات واضح ہو جاتی ہے۔ سابقہ جلدوں میں بیشتر مقامات پر آیات قرآنی کا مجازی مفہوم آپ کے سامنے آچکا ہے۔ بالخصوص جلد چہارم میں معجزات حضرت عیسیٰؑ کے ضمن میں (مطالب الفرقان۔ جلد چہارم۔ صفحہ ۱۱۱-۱۱۰)۔ داستان حضرت موسیٰؑ کے سلسلہ میں بھی یہی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ آیت (۲۰/۱۲) کا حقیقی معانی کے اعتبار سے، ترجمہ یہ ہوگا — "میں ہوں تیرا پروردگار۔ پس اپنی جوتی اتار دے۔ تو طویٰ کی مقدس وادی میں کھڑا ہے۔"

لیکن جب ہم وَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى کے الفاظ پر غور کرتے ہیں تو ایک بہت بڑی حقیقت ہمارے سامنے آجاتی ہے ظاہر ہے کہ حقائق کائنات کے معلوم کرنے کا ذریعہ عقل ہے۔ عقل کا طریق تجرباتی ہوتا ہے۔ یعنی وہ کسی ایک معاملہ کو لیتی ہے۔ اس کے متعلق کچھ فیصلہ کرتی ہے۔ اس فیصلہ پر عمل کرتی ہے اور پھر تجربہ بتاتا ہے کہ وہ فیصلہ صحیح تھا یا غلط۔ غلط ہونے کی صورت میں وہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کرتی ہے اور پھر اس پر تجربہ کر کے دیکھتی ہے کہ وہ صحیح ہے یا غلط۔ ظاہر ہے کہ یہ طریق بہت لمبا بھی ہوتا ہے اور گوناگوں مشکلات کا حامل بھی۔ اس کے برعکس، وحی، انسان کو پہلے ہی دن

بنا دیتی ہے کہ کون سا راستہ صحیح ہے اور کون سا غلط۔ اس لئے وحی کی راہ نمائی سے سفرِ زندگی کی طویل طویل راہیں سمٹ کر بہت مختصر ہو جاتی ہیں۔ طویٰ کے یہی معنی ہیں۔ لپٹی ہوئی۔ سمٹائی ہوئی۔ کہا یہ گیا کہ تو اب تجرباتی طریقوں سے نکل کر وحی کی سمٹی ہوئی مقدس وادی میں پہنچ گیا ہے اس لئے اب تو اس لمبے سفر کے ساز و سامان (نَعْلَيْكَ) کو الگ کر دے۔ وحی نے تیرے سفر کی منزلوں کو سمٹا دیا ہے۔

وَ اَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ○ (۲۰/۱۳)

میں نے تجھے، ایک عظیم مقصد کے لئے منتخب کیا ہے۔ سو جو بات تجھے، اس وحی کے ذریعہ بتائی جاتی ہے، اُسے دل کے کانوں سے سنو۔

وہ اولین وحی کیا تھی؟

اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ○ (۲۰/۱۴)

اس وحی کا اولین پیغام یہ ہے کہ اللہ میں ہی ہوں۔ میرے سوا کائنات میں کسی کا اقتدار و اختیار نہیں۔ اس لئے تم صرف میری محکومیت اختیار کرو، اور میرے قانون اور نظام کو غالب کرنے کے لئے صلوٰۃ کا نظام قائم کرو۔

قیامِ حکومتِ خداوندی کی بنیاد یعنی قیامِ حکومتِ خداوندی کی وہی بنیادی تعلیم جو اس سے پیشتر تمام حضرات انبیائے کرامؑ کی زبانی ہم سنتے چلے آ رہے ہیں۔ ایک خدا کے سوا کسی کے سامنے جھکنا جائز نہیں۔ عبودیت اسی کی اختیار کی جائے گی۔ اور اس عبودیت (یعنی اللہ کی محکومیت) کا نظام، الصّلوٰۃ سے قائم ہو گا۔ اس انقلابِ عظیم کی اوّلیں منزل، سرکش قوتوں کا استہلاک ہو گا کہ جب تک لَآ اِلٰهَ (ہر طاغوتی قوت سے انکار) کی تکمیل نہ ہو گی۔ اِلَّا اللّٰه (اللہ کی محکومیت) کا ظہور نہیں ہو گا۔ اس لئے:

اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى ○ (۲۰/۱۵)

(اس حقیقت کو یاد رکھ کہ تیرے ہاتھوں ایک) انقلابِ عظیم رونما ہونے والا ہے۔ ہمارا پروگرام یہ ہے کہ وہ انقلاب، جو اس وقت ظاہر بین نگاہوں سے پوشیدہ تھا، اب نکھر کر سامنے آ جائے۔ یہ انقلاب اس لئے سامنے آئے گا تاکہ ہر شخص کو اُس کی محنت کا پورا پورا صلہ مل سکے (اور سلب و نہب کا موجودہ فرعونی، قارونی اور ہامانی معاشرہ جس میں حالت یہ ہے کہ محنت کوئی کرتا ہے اور اس کا ماحصل کوئی لے لیتا ہے، الٹ کر رکھ دیا جائے۔ یہ انقلاب نظامِ صلوٰۃ قائم کرنے سے آئے گا)۔

وہ وقت اب قریب آنے والا ہے کہ سرکش قوتوں کے اعمال کے فطری نتائج ان کے سامنے نمودار ہو جائیں مستبد قوتوں کے نظام میں ہوتا یہ ہے کہ محنت کوئی کرتا ہے اور اس کا ماحصل کوئی لے جاتا ہے

دانہ ایں می کارد و آں حاصل بُرد

لیکن اس انقلاب کے بعد، جو قوانین خداوندی کے نفاذ کے لئے ظہور میں آئے گا، ایک ایسا معاشرہ قائم ہو گا جس میں سلب و نہب کا کوئی دخل نہ ہو۔ اس میں ہر شخص کو اس کی محنت کا صلہ مل جائے گا۔ کوئی مستبد قوت کسی سے کچھ چھین نہیں سکے گی۔

اس کے بعد، ایک ایسی حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا جو آنے والے راستہ میں بڑی خطرناک گھاٹی تھی۔ ایک طرف بنی اسرائیل کے متعلق علم تھا کہ ان کی خوئے غلامی نے ان کے ایمان و عمل کی قوتوں کو مفلوج کر رکھا ہے اس لئے وہ اس جانگسل کشاکش حق و باطل میں قدم قدم پر ہمت ہار بیٹھیں گے۔ اس لئے یہ واضح کر دیا کہ ان کی بزدلی اور دوں ہمتی۔ عدم استقلال و فقدان استقامت ضعف ایمان اور کم، وریٔ عمل حضرت موسیٰؑ کے راستہ میں سنگ گراں بن کر حائل نہ ہو جائیں۔ دوسری طرف، قوم فرعون تھی جو اس انقلاب کی سب سے بڑی مزاحم بننے والی تھی۔ اس لئے کہ اس سے ان کی مفاد پرستیوں پر زد پڑتی تھی۔ ان کی طرف سے شدید ترین مخالفت کا یقین تھا۔ لہذا یہ بھی بتا دیا کہ انکی اس مخالفت سے یہ خیال کبھی دل میں پیدا نہیں ہونا چاہیئے کہ چلئے ان سے مفاہمت کر کے بین بین کا راستہ اختیار کر لیا جائے حق اور باطل میں مفاہمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ وہ حقیقتیں ہیں جن کی طرف اس ایک آیت میں اشارہ کیا گیا ہے جہاں فرمایا۔

فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ۝ (۲۰/۱۶)

اس کے لئے ایک بات کو اچھی طرح سمجھ رکھو۔ جو لوگ اس آنے والے انقلاب کے واقع ہونے پر یقین نہ رکھیں اور اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے لگے رہیں (انہیں اپنے ساتھ نہ رکھنا، ورنہ) وہ تمہارے راستے میں سنگ گراں بن کر حائل ہو جائیں گے، اور اپنے ساتھ، تیری تباہی کا بھی موجب بن جائیں گے (یہ انقلاب انہی لوگوں کے ہاتھوں رونما ہو گا جو اس پر دل سے یقین رکھیں اور اپنی انفرادی مفاد پرستیوں کے خیال سے بالاتر ہو جائیں)

غور کیجئے کتنی اہم حقیقت ہے جسے اشاروں ہی اشاروں میں یوں بے نقاب کر دیا گیا ہے۔ حق و باطل کی معرکہ آرائی میں وہی قوم کامیاب و کامران ہو گی جو اپنی خواہشات و مقتضیات نفس اور امیال و عواطف قلب کو جذبۂ حصول مقصد کے تابع رکھے خواہ اس میں کتنی ہی مشکلات کا سامنا کیوں نہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ جو اس انقلاب کے راستہ میں

سنگِ گراں بن کر حائل ہوگا وہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔

اس طرح حضرت موسیٰؑ کو اس آنے والے انقلاب کے متعلق ضروری احکام دیئے گئے۔ قرآن کریم نے اس کے بعد جو کچھ کہا ہے وہ بڑا غور طلب ہے۔ ہم پہلے ان آیات کا وہ ترجمہ لکھتے ہیں جو عام طور پر کیا جاتا ہے (یہ ترجمہ آپ کو ہر مترجم قرآنِ کریم میں ملے گا) اس کے بعد ہم یہ بتائیں گے کہ اگر ان آیات کے الفاظ کو مجاز پر محمول کیا جائے تو ان سے کون سی حقیقت سامنے آتی ہے۔ پہلے عمومی ترجمہ کیجیے۔ حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا۔

وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يٰمُوسٰى ۝ (۲۰/۱۷)

اور "اے موسیٰ! تیرے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟

عرض کیا۔

قَالَ هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِي وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرٰى ۝ (۲۰/۱۸)

عرض کیا۔ میری لاٹھی ہے۔ چلنے میں اس کا سہارا لیتا ہوں۔ اسی سے اپنی بکریوں کے لئے پتے جھاڑ لیتا ہوں۔ میرے لئے اس میں اور بھی طرح طرح کے فائدے ہیں۔

آواز آئی۔

قَالَ أَلْقِهَا يٰمُوسٰى ۝ (۲۰/۱۹)

حکم ہوا "اے موسیٰ اسے ڈال دے"

انہوں نے تعمیل ارشاد کی۔

فَأَلْقٰهَا فَإِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ۝ (۲۰/۲۰)

چنانچہ موسیٰ نے ڈال دیا۔ اور دیکھتا کیا ہے کہ وہ تو ایک سانپ ہے جو دوڑ رہا ہے۔

صدائے غیبی نے کہا۔

قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولٰى ۝ (۲۰/۲۱)

حکم ہوا "اب اسے پکڑ لے اور مت ڈر۔ ہم اسے پھر اس کی اصلی حالت پر کئے دیتے ہیں۔

پھر ارشاد ہوا۔

وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوٓءٍ اٰيَةً أُخْرٰى ۝ (۲۰/۲۲)

اور (نیز حکم ہوا) کہ اپنا ہاتھ بغل میں رکھ۔ اور پھر نکال۔ بغیر اس کے کہ کسی طرح کا عیب ہو، چمکتا ہوا نکلے گا یہ (تیرے لئے) دوسری نشانی ہوئی۔

اس کے بعد فرمایا کہ یہ ہماری نشانیاں ہیں۔ انہیں محض بطور اعجوبہ کاری نہیں دکھایا گیا بلکہ یہ ہماری بہت بڑی نشانیوں کی تمہید ہیں۔

لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ۚ (۲۰/۲۳)

"یہ نشانیاں اس لئے (دی گئی ہیں) کہ آئندہ تجھے اپنی قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں۔"

دُوسرا مفہوم | یہ تو ہے ان آیات کا عمومی ترجمہ۔ لیکن اگر ہم ان الفاظ کے مجازی معانی لیں تو بات کچھ اور سامنے آتی ہے[1]۔

اس اعتبار سے ان آیات کا مفہوم یہ ہوگا کہ جب حضرت موسیٰؑ کو اس عظیم مہم سے متعلق احکام و ہدایات دیئے گئے تو ندائے غیب نے پوچھا کہ مَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى (۲۰/۱۷) اے موسیٰ! تم ان احکام پر غور کرو اور قوت و برکت دونوں نقاط نگاہ سے بتاؤ کہ ان کے متعلق تمہارا خیال کیا ہے؟ حضرت موسیٰؑ نے جواب میں کہا کہ بارالہا! یہ احکام کیا ہیں؟ هِيَ عَصَايَ (۲۰/۱۸) یہ تو میرے لئے سفر زندگی میں بہت بڑا سہارا ہیں اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا۔ میں اب انہی کے آسرے سے چلوں گا۔ وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ۔ انہی کے ذریعے اب میں اپنے ریوڑ (بنی اسرائیل) کو جھنجھوڑوں گا اور ان کے جمود و تعطّل کو حرکت و حرارت میں بدل دوں گا۔ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى (۲۰/۱۸)۔ ان کے علاوہ دیگر معاملات زندگی بھی جو میرے سامنے آئیں گے ان میں ان سے بصیرت و راہ نمائی حاصل کروں گا۔ حکم ہوا کہ جاؤ اور انہیں لوگوں کے سامنے پیش کرو۔ قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى (۲۰/۱۹)

اس وفورِ شوق کے بعد جب اس نئی مہم اور ان انقلاب آور احکام و ضوابط کے نتیجہ میں جو کچھ ہونے والا تھا اس پر غور کیا تو حضرت موسیٰؑ نے دیکھا کہ وہ احکام نہیں، ایک اژدھا ہے جو بڑی تیزی سے دوڑ رہا ہے فَاَلْقٰهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ۝ (۲۰/۲۰) خدا نے کہا کہ موسیٰؑ اس خیال سے مت گھبراؤ۔ انہیں مضبوطی سے تھام لو (قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ) ان کے متعلق جو بات تم نے پہلے کہی تھی (کہ میں ان سے فلاں فلاں کام لوں گا) ہم انہیں ایسا ہی بنا دیں گے۔ (سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى (۲۰/۲۱)۔ اس مہم میں تو بالکل پریشان نہ ہو۔ تو نہایت سکون و سکوت اور پوری دل جمعی سے اپنی دعوت کو روشن اور واضح دلائل کے ساتھ پیش کرتا چلا جا۔ تو ان تمام مشکلات سے محفوظ و مصئون

---

[1] ان الفاظ کا مجازی مفہوم کس طرح لیا گیا ہے اس کی وضاحت آگے چل کر اس مقام پر کی جائے گی جہاں حضرت موسیٰؑ کے ساحرین دربار فرعون کے ساتھ مقابلہ کا منظر سامنے آئے گا۔

باہر نکل آئے گا۔ وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ (۲۰ / ۲۲)۔ تیری اس طرح کی کامیابی تیری دعوت کی صداقت کی نشانی ہوگی یعنی دشمنوں کی ہلاکت منفیانہ حیثیت سے نشان، اور تمہاری کامیابی مثبت حیثیت سے نشان۔ لِنُرِيَكَ مِنْ آيَاتِنَا الْكُبْرَىٰ ۝ (۲۰ / ۲۳)۔ یہ احکام ہم تجھے اس لئے دیتے ہیں کہ تجھے دکھا دیں کہ انکے ذریعے کتنا بڑا انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔

یہ ہوگا ان آیات کا مفہوم اگر ان کے الفاظ کے مجازی معانی لئے جائیں[1]۔ ان احکام و ضوابط اور ان کی اس طرح تبئین و تشریح کے بعد حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا کہ

اِذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ ۝ (۲۰ / ۲۴)

اب تم فرعون کی طرف جاؤ۔ وہ اپنے ظلم و استبداد میں بہت ہی زیادہ آگے بڑھ چکا ہے۔ اس کی سرکشی حدود فراموش ہوگئی ہے۔

طَغَىٰ کے لفظ پر غور فرمائیے اور قرآنی بلاغت کے اعجاز پر وجد کیجئے۔ سرکشی و معصیت کوشی کی تمام کف بر وہاں طغیانیوں کو کس طرح ایک لفظ میں سمیٹ کر رکھ دیا گیا ہے!

جب حضرت موسیٰؑ نے سُنا کہ وہ مہم جس کے سر کرنے کے لئے انہیں مامور کیا جا رہا ہے کس قدر صبر آزما اور استقامت طلب ہے تو اس کی توفیق کے لئے بھی اسی باب عالی کے سامنے ہتھیلی پھیلا دی۔ عرض کیا۔

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ۝ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ۝ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي ۝ يَفْقَهُوا قَوْلِي ۝ وَاجْعَل لِّي وَزِيرًا مِّنْ أَهْلِي ۝ هَارُونَ أَخِي ۝ اشْدُدْ بِهِ أَزْرِي ۝ وَأَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي ۝ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيرًا ۝ وَنَذْكُرَكَ كَثِيرًا ۝ إِنَّكَ كُنتَ بِنَا بَصِيرًا ۝ (۲۰ / ۲۵-۳۵)

کہ اے میرے نشوونما دینے والے! (یہ مہم بڑی سخت ہے، اس کے لئے تو) میرے سینے میں وسعت اور کشاد عطا کر دے (کہ بڑی سی بڑی مشکل بھی مجھے پریشان نہ کر سکے۔ ۹۴ / ۱)۔

اور جو دشواریاں میری راہ میں آئیں، انہیں مجھ پر آسان کر دے۔

اور میری زبان میں ایسی طلاقت اور روانی پیدا کر دے (کہ میں تیرے پیغام کو بطریقِ احسن فریقِ مقابل تک

---

[1] واضح رہے کہ میں اس پر اصرار نہیں کرتا کہ آپ ان آیات کا مجازی مفہوم ہی لیں۔ اگر آپ ان کے عمومی مفہوم سے مطمئن ہیں تو ٹھیک ہے۔ میں بہرحال ان کا وہی مفہوم لیتا ہوں جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔

پہنچا سکوں"۔ اور میری بات اُن کی سمجھ میں آجائے (اور سیدھی اُن کے دل تک اُتر جائے)

(چونکہ یہ مہم بڑی سخت ہے اس لئے) میرے اہلِ خاندان میں سے، میرے بھائی، ہارونؑ کو میرے ساتھ کر دے تاکہ وہ میرا بوجھ بٹائے۔ اُس کی مدد سے میری قوت مستحکم ہو جائے گی۔ وہ اس عظیم مہم میں میرا شریکِ کار رہے گا۔

یوں ہم دونوں مل کر، تیرے تفویض کردہ پروگرام کی تکمیل میں بہت زیادہ سرگرمِ عمل رہیں گے اور تیرے قانون اور نظام کو غالب بنانے کے لئے بیش از بیش قدم اٹھا سکیں گے۔

تُو ہم دونوں کے حالات سے باخبر ہے (اور جانتا ہے کہ ہم دونوں مل کر کس طرح اس مہم کو سر کریں گے)۔

زبان کی گرہ کشائی

سینہ کی فراخی (شرحِ صدر) وسعتِ ظرف اور دشواریٔ منزل کی آسانی کے ساتھ، زبان کی گرہ کشائی کی بھی دعا مانگی گئی ہے۔ اس لئے کہ ایک مدت تک مدین کے بیابانوں میں بدویت کی زندگی بسر کرنے سے زبان میں غالباً وہ طلاقت نہیں رہی ہو گی جو ایسے مواقع پر حسنِ خطابت کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ اس کی تائید سورۂ قصص کی چونتیسویں (۳۴) آیت سے ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

وَاَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا (۲۸ / ۳۴)

(دوسری بات یہ ہے کہ ایک عرصۂ دراز تک شہری آبادی سے دُور رہنے کی وجہ سے، میری زبان بھی ایسی صاف نہیں رہی کہ میں دربارِ فرعون کے لوگوں سے فصیح و بلیغ گفتگو کر سکوں) میرا بھائی، ہارونؑ، مجھ سے زیادہ فصیح اللّسان ہے۔

مذکورہ بالا آیات (۲۰ / ۳۳-۳۵) میں نُسَبِّحَكَ (تاکہ ہم تیری تسبیح کریں) اور نَذْكُرَكَ (ہم تیرا ذکر کریں) کے

تسبیح و ذکر کا مفہوم

ٹکڑوں پر بھی غور کیجئے۔ حضرت موسیٰؑ کے ذمہ فریضہ یہ عائد کیا گیا تھا کہ وہ جائیں، فرعون اور اس کے طاغوتی لشکر کو شکست دیں۔ اور بنی اسرائیل کو غلامی و محکومی کی پستیوں سے نکال کر حکومت و سطوت کی بلندیوں پر لے جائیں اور ان کی حکومت کی بنیاد قوانینِ خداوندی پر رکھیں۔ اس عظیم الشان مہم کے لئے آپ نے اللہ تعالیٰ سے تائید و نصرت کی التجا کی۔ اور اپنے قوتِ بازو، حضرت ہارونؑ کو بھی اپنی معیت کے لئے مانگا۔ اور یہ اس لئے تاکہ وہ عظیم الشان مہم سر ہو سکے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اس کے لئے یہ الفاظ آئے ہیں "تاکہ ہم تیری تسبیح بیان کریں اور بہت زیادہ ذکر کریں" اس سے ظاہر ہے کہ اللہ کی تسبیح اور ذکر سے صحیح مفہوم کیا ہے؟ دنیا سے غیر خدائی قوتوں کے غلبہ و استیلاء (یعنی فساد) کو مٹا کر اس کی جگہ حکومتِ خداوندی

کاقیام وبقاء۔ یہ ہے تسبیح اور یہ ہے ذکر[1]۔ نہ کہ زاویوں اور خانقاہوں کی تنگ وتاریک کوٹھڑیوں میں، سربزانو، ہزار ہزار دانوں کی تسبیح پر زبان سے اللہ کا نام دہراتے رہنا، اور عملاً ہر طاغوتی قوت کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر قانع رہنا۔ وہ تسبیح و ذکر تھا مردانِ خود آگاہ و خدامست کا، اور یہ تسبیح و ذکر ہے ان کا جو کشمکشِ زندگی سے منہ موڑنے کا نام "معرفت" رکھ لیں۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں:

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے　　شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے میری بات
یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل　　یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہب مردانِ خود آگاہ و خدامست
یہ مذہب مُلّا و جمادات و نباتات

حضرت موسیٰؑ کی درخواست کے جواب میں اُس درگاہِ عاجز نواز سے ارشاد ہوا کہ

قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ○ (۲۰/۳۶)

ارشاد ہوا۔ اے موسیٰؑ! تیری درخواست منظور ہوئی۔

اس لئے کہ جو کچھ مانگا گیا ہے وہ تو اس مقصد کی تکمیل کے لئے ہے جس کے لئے تدبیرِ الٰہی کی مختلف کڑیاں اس سے پیشتر سامنے آچکی ہیں۔

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى ○ اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى ○ اَنِ اقْذِفِيْهِ فِى التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِى الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّىْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ ؕ وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّىْ ۚ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِىْ ○ اِذْ تَمْشِىْٓ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَنْ يَّكْفُلُهٗ ؕ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ كَىْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ○ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ○ فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِىْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ○ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ○ (۲۰/۳۷-۴۰)۔

(یہ سُن کر موسیٰؑ کا سرِ نیاز، اظہارِ تشکر کے لئے جُھک گیا، اور اُس نے کہا کہ بارالہا! یہ تیرا بہت بڑا احسان ہے

---

[1] مفہوم کے لئے انڈکس دیکھئے۔

جو مجھ پر کیا گیا ہے۔ اس پر بارگاہِ خداوندی سے ارشاد ہوا کہ اے موسیٰؑ! تم پر ہمارا یہ احسان کچھ پہلی مرتبہ نہیں ہوا۔ اس کا سلسلہ بہت پہلے سے شروع ہوا تھا۔

جب ہم نے (تمہاری پیدائش کے ساتھ ہی) تمہاری ماں کی طرف (اپنے ایک بندے کی معرفت) یہ حکم بھیجا تھا کہ وہ اپنے بچے کو صندوق میں ڈال دے، اور پھر اس صندوق کو دریا میں بہا دے۔ دریا کی لہریں اسے کنارے پر لگا دیں گی جہاں سے اسے وہ شخص لے جائے گا جو میرے احکام و قوانین کا بھی دشمن ہے اور خود اس بچے کا بھی دشمن۔

(اس طرح اے موسیٰؑ! تو فرعون کے محلات میں جا پہنچا، اور) ہم نے اپنی عنایت سے تجھے ایسا بنا دیا تھا کہ سب لوگ تجھ سے محبت کریں۔ یہ تمام انتظام اس لئے کیا گیا تھا کہ ہم چاہتے تھے کہ تمہاری پرورش و تربیت، ہماری زیرِ نگرانی (شاہی محلات میں) ہو (تاکہ تو ان رموزِ مملکت و سیاست سے اچھی طرح واقف ہو جائے جن کا تجھے آخر الامر مقابلہ کرنا تھا)۔

(تو جب وہاں پہنچ گیا تو فرعون کے گھر والوں کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ تمہاری رضاعت (دودھ پلانے) کا کیا انتظام کیا جائے (اس وقت) تمہاری بہن وہاں سے گزری تو اس نے ان سے کہا کہ کیا میں تمہیں ایسی عورت کا پتہ بتاؤں جو اس کی پرورش کر سکے گی؟ (یہ عورت خود تمہاری والدہ تھی)۔ اس طرح ہم نے تجھے پھر تمہاری والدہ کی گود میں پہنچا دیا تاکہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ (بیٹے کی جدائی کی وجہ سے) غمگین نہ ہو۔

(اس کے بعد تو بڑا ہوا تو) تو نے ایک آدمی کو مار ڈالا۔ لیکن ہم نے تجھے اس معاملہ کی پریشانی سے نجات دلائی۔ پھر تجھے (محلات سے نکال کر، سخت اور درشت زندگی کی) کٹھالیوں میں ڈالا (تاکہ تو کندن بنتا چلا جائے)۔

اس طرح تو کئی برس تک مدین میں چرواہا بن کر رہا۔

اس قدر مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد کہیں جا کر، تو ہمارے پیمانے پر پورا اترا۔

سب کچھ اندازے کے مطابق

"علیٰ قدر" کے الفاظ پر غور فرمائیے یعنی جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے۔ وہ اتفاقاً نہیں ہو گیا وہ اللہ کے متعین فرمودہ پیمانوں اور اندازوں کے مطابق ہو رہا ہے۔ ان منازل سے گزارنے کے بعد۔

وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي ۚ (۲۰ : ۴۱)

اس طرح ہم نے، اے موسیٰؑ! تجھے اپنے ایک خاص کام کے لئے تیار کیا ہے۔ (یہ نہیں کہ تو بکریاں چراتے

چراتے، اتفاق سے آگ لینے کے لئے اِدھر آنکلا اور ہم نے تیرے سر پہ تاج نبوت رکھ دیا!)
یعنی "تجھے اپنے لئے تیار کیا ہے"۔ دیکھئے! کتنے واضح الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ نبی کو مقامِ نبوّت کے لئے وہبی طور پر تیار کیا جاتا ہے۔ یہ جوہرِ عظمیٰ اس کے کسب و ہنر کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ اور پھر یہ بھی کہ نبوّت ہر کس وناکس کو یونہی نہیں مل جاتی۔ جس سینہ کو مہبطِ وحی بنانا مقصود ہوتا ہے، اسے اس کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ یہ قولِ بے خبراں ہے ــــ کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے۔ پیمبری ہر ایک کو یونہی نہیں مل جایا کرتی۔ قدرت اسے پہلے دن سے پیمبری کے لئے تیار کر رہی ہوتی ہے اور جب وہ اس کو مقرر کردہ اندازے کے مطابق، اس بارِ عظیم کے اٹھانے کے قابل ہو جاتا ہے تو پھر اسے اس منصبِ جلیلہ پر فائز کیا جاتا ہے۔ (ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى)

اس مقام پر ایک وضاحت نہایت ضروری ہے۔ نبی سے متعلق آیات کا ترجمہ فعل حال (PRESENT TENSE) میں اس لئے کیا گیا ہے کہ قرآن کریم نے بھی یہی اسلوب اختیار کیا ہے۔ (مثلاً) "جب وہ خدا کے مقرر کردہ اندازے کے متعلق اس بارِ عظیم کے اٹھانے کے قابل ہو جاتا ہے تو پھر اسے اس منصبِ جلیلہ پر فائز کیا جاتا ہے" (وغیرہ)۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اب بھی ایسا ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے۔ قطعاً نہیں۔ نبوّت کا سلسلہ حضور نبی اکرمؐ کی ذات گرامی پر ختم ہو گیا اس لئے اب کسی کو نبوّت نہیں مل سکتی۔ لہذا، وحی اور نبوّت کے متعلق جو کچھ قرآن میں آیا ہے وہ سب ماضی سے متعلق ہے۔ یعنی "ایسا ہوا کرتا تھا"۔ یہ نہیں کہ اب بھی ایسا ہونا ہے۔ وحی اور نبوّت کے متعلق جہاں بھی کچھ آئے، اس نکتہ کو ہمیشہ ذہن میں رکھئے۔

اس کے بعد پھر انہی آیات کی طرف آجائیے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِىْ "ہم نے تجھے اپنے ایک مقصد کے حصول کے لئے تیار کیا ہے"۔ حضرت موسیٰؑ کو جس مقصد کے حصول کے لئے مامور کیا گیا تھا وہ تھا کہ بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجۂ استبداد و استحصال سے چھڑا کر، انہیں ایسی آزادی کی فضا میں اذن بال کشائی دے جس میں محکومیت صرف قوانینِ خداوندی کی ہو۔ اس مقصد کو خدا نے "اپنا ایک کام" قرار دیا ہے۔ آپ مطالب الفرقان۔ جلد چہارم۔ کے انڈکس میں "خدا" کا عنوان دیکھئے۔ اس کے تابع بتایا گیا ہے کہ خدا کس طرح اپنی ذمہ داریوں کو انسانوں کے ہاتھوں پوری کرایا کرتا ہے۔ نیز جلد اوّل (ص۱۸۴) جہاں بتایا گیا ہے کہ خدا انسانوں کے کاموں کو بھی کس طرح اپنی طرف منسوب کرتا ہے[1]۔ زیرِ نظر آیات میں مقصد مظلوم بنی اسرائیل کی داد رسی ہے اور اسے خدا نے اپنا مقصد قرار دیا ہے اور

---

[1] اس سلسلہ میں میرا مقالہ بعنوان "تقدیر کی گرہیں" بھی دیکھئے جو طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا تھا۔

حضرت موسیٰؑ کو اس مقصد کے حصول کے لئے مامور کیا ہے۔ ان مقامات سے، انسان اور خدا کا باہمی تعلق واضح ہو جاتا ہے۔

یہ کہنے کے بعد کہ ہم نے تمہیں اپنے ایک مقصد کے لئے تیار کیا ہے، اس مقصد کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کر دی۔

اِذْهَبْ اَنْتَ وَ اَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَ لَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ۚ (۲۰/۴۲)

سو اب تم اور تمہارا بھائی، دونوں، ہمارے قوانین کو لے کر، فرعون کی طرف جاؤ۔ اور دیکھنا! میرے پروگرام کے مطابق عمل کرنے میں ذرا بھی سستی نہ کرنا۔

یعنی اس مقصد کی تکمیل یوں ہوگی۔ یہاں پھر ذکر کا لفظ قابلِ غور ہے اور اس تشریح کی تائید کر رہا ہے جو پہلے گزر چکی ہے۔

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۚ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝ (۲۰/۴۳-۴۴)

(اس کے بعد موسیٰؑ اس مہم کے لئے روانہ ہو گیا، اور جب اس کا بھائی ہارونؑ بھی اس کے ساتھ آ ملا، تو انہی ہدایات کا پھر اعادہ ہوا اور) ان سے کہا گیا کہ تم دونوں فرعون کی طرف جاؤ۔ وہ اپنے ظلم و ستم میں حد سے زیادہ آگے بڑھ گیا ہے۔ اس کی سرکشی کی کوئی انتہا نہیں رہی۔

جب اس کی طرف جاؤ تو اس سے نرمی سے بات کرنا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس طرح نصیحت پکڑ لے، یا اپنی سرکشی کے عواقب سے ڈر جائے۔

دعوتِ انقلاب کے دو مقام

دعوتِ حق و صداقت کے سلسلہ کی پہلی کڑی پر غور فرمائیے یعنی فرعون کے پاس پہنچو تو پہلے نرمی سے سمجھانا۔ شاید اس کے دل پر اثر ہو جائے اور وہ صحیح بات کو سمجھ لے اور اپنے انجام و عواقب سے ڈر جائے۔ ایک داعیٔ حق و صداقت کی پہلی آواز، نرمی اور نصیحت کی ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ دیکھتا ہے کہ اس سے سرکش قوتوں پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ بلکہ وہ اپنی معصیت کوشی میں اور زیادہ دلیر ہو گئی ہیں تو پھر ضربِ کلیمی کی باری آتی ہے جس کے لئے عصا کی ضرورت پڑتی ہے۔ کیونکہ

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

جو زخم، مرہم سے مندمل نہ ہو اس کا علاج، نوکِ نشتر کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے کے لئے شکنجوں میں کسنا ہی پڑتا ہے۔ جو کچھ حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا ہے، وہ قیامت تک جماعتِ مومنین کے لئے شمعِ ہدایت ہے، انہیں بھی ایسے مقامات پر یہی انداز اختیار کرنا چاہیئے۔

مزید ہدایات

اِدھر حضرت موسیٰؑ کو یہ حکم ملا اور اُدھر حضرت ہارونؑ[1] کو مصر میں اشارہ مل گیا کہ وہ جا کر اپنے بھائی سے ملیں۔ چنانچہ وہ اُن سے راہ میں آ کر مل گئے۔ اب واقعہ کی مزید کڑیاں اُس زمانہ سے متعلق ہیں جب یہ دونوں بھائی اکٹھے ہو گئے تھے۔

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ یَّفْرُطَ عَلَیْنَآ اَوْ اَنْ یَّطْغٰی ۝ (۲۰ : ۴۵)

اِن دونوں نے کہا کہ اے ہمارے نشو ونما دینے والے! ہمیں ڈر ہے کہ فرعون ہماری مخالفت میں پیش دستی نہ کرے یا سرکشی سے پیش نہ آئے۔

یہ خوف بیجا نہ تھا۔ اُدھر قہرمانی قوتوں کا ایک بپھرتا ہوا سیلاب، جیوش وعساکر، تلوار وسنان، تمرّد وفرعونیت کے ساز وسامان کی شکل میں موجزن۔ اور اِدھر (یوں سمجھئے کہ) دو گدڑیئے! لیکن جو قوّت اِن کے ساتھ تھی وہ فرعون اور اس کے جنود وعساکر کو کہاں میسّر تھی؟ فرمایا

قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِیْ مَعَکُمَآ اَسْمَعُ وَ اَرٰی ۝ (۲۰ : ۴۶)

خدا نے کہا کہ تم مت گھبراؤ۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں سب کچھ سُنتا ہوں، سب کچھ دیکھتا ہوں۔ اِسلئے وہ تمہارا بال تک بیکا نہیں کر سکے گا۔

فرعون کے پاس بے دھڑک جاؤ۔

فَاْتِیٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّکَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ ۙ۬ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ؕ قَدْ جِئْنٰکَ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّکَ ؕ وَالسَّلٰمُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی ۝ (۲۰ : ۴۷)

تم اُس کے پاس بے دھڑک جاؤ اور اس سے کہو کہ ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ اس کا پیغام یہ ہے کہ تم بنی اسرائیل پر اس قدر سختیاں نہ کرو، بلکہ انہیں ہمارے ساتھ بھیج دو۔ اگر تم اس راستے پر چلو گے جو خُدا کا بنایا ہوا ہے، تو تمہارے لئے سلامتی ہو گی۔ سلامتی ہوتی ہی اُس کے لئے ہے جو خدا کے بنائے ہوئے راستے پر چلے۔

جو سیدھی راہ اختیار کرے اس پر امن وسلامتی کی بشارت ہے۔ لیکن جو اپنی ضد پر اڑ جائے تو

اِنَّا قَدْ اُوْحِیَ اِلَیْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰی مَنْ کَذَّبَ وَ تَوَلّٰی ۝ (۲۰ : ۴۸)

---

[1] حضرت ہارونؑ بھی نبی تھے۔

لیکن اگر تم پیغام خداوندی کو جھٹلاؤ گے اور اس سے سرتابی اختیار کرو گے، تو پھر تباہی اور بربادی کے عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے۔

اب تم خود سوچ سمجھ کر فیصلہ کر لو کہ تم کونسا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہو۔

ان دونوں ٹکڑوں میں اسلام کی پوری خصوصیات سمٹ کر آگئی ہیں۔ جو سیدھی راہ اختیار کرے۔ وہ امن وسلامتی میں ہے اور یہی وہ جنت ارضی ہے جس کے لئے ابن آدم مارا مارا پھر رہا ہے اور اپنی ہرنا کام جستجو کے بعد تھک کر پکار اٹھتا ہے کہ

"تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی"

اسلام قوانین خداوندی کے سامنے جھکنے والوں کو امن وسلامتی کی جنت عطا کرتا ہے ان کے برعکس جو سرکشی اختیار کرے اور دوسرے انسانوں کو اپنے پنجۂ استبداد میں جکڑے رکھنا چاہے، اس کے لئے ہلاکت وبربادی کا رسواکن عذاب ہے۔

آیت (۲/۴۶) میں کہا ہے کہ تم فرعون سے مت ڈرو انی معکما "میں تمہارے ساتھ ہوں" سوال یہ ہے کہ خدا کی اس معیت کے معنی کیا ہیں۔ یوں تو اس نے تمام انسانوں سے کہا ہے کہ ھو معکم اینما کنتم (۵۷/۴) "تم جہاں بھی ہو خدا تمہارے ساتھ ہوتا ہے"۔ لیکن اس معیت میں اور اُس میں جہاں حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ سے کہا گیا ہے کہ انی معکما، بنیادی فرق ہے۔ خدا کی اس معیت کے معنی کیا ہیں اس کے متعلق ہم سے نہیں۔ ایک ایسے مخالف کی زبان سے سنئے جس نے اس معیت خداوندی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا۔ خلافتِ فاروقی میں، جب جماعتِ مومنین نے ایران کو فتح کیا ہے تو وہاں کا ایک نامور گورنر، ہرمزان، قیدی کی حیثیت سے حضرت عمرؓ کے سامنے آیا۔ آپ نے اس سے کہا کہ تمہارے متعلق فیصلہ تو بعد میں کیا جائے گا۔ پہلے میرے ایک سوال کا جواب، دو جس نے ہمیں ورطۂ حیرت میں ڈال رکھا ہے۔ اس سے پہلے حالت یہ تھی کہ تم ایرانی، ہم عربوں کو کبھی خاطر میں نہیں لایا کرتے تھے۔ ہمیں بڑی نفرت اور حقارت کی نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ دوستی تو ایک طرف، تم، ہم سے جنگ کرنا بھی اپنے لئے باعثِ عار سمجھا کرتے تھے اور اگر کہیں مٹھ بھیڑ ہو جاتی تھی تو تم ایک ہی جھٹکے میں ان کے چھکے چھڑا دیا کرتے تھے۔ اب کیا ہوا ہے کہ وہی عرب ہیں اور وہی ایرانی۔ لیکن صورت یہ ہے کہ عرب تمہیں ذلت آمیز شکست دیئے جا رہے ہیں اور تم پابہ زنجیر یہاں کھڑے ہو۔ یہ حیرت انگیز انقلاب کیسے رونما ہو گیا؟

ہرمزان نے کہا کہ عمرؓ! بات یہ ہے کہ ایام جاہلیت میں ہم اور تم اکیلے اکیلے دوسرے سے نپٹتے تھے اس لئے ہم تم پر غالب آجایا کرتے تھے۔ لیکن اب صورت یہ ہے کہ مقابلہ کے وقت ہم (ایرانی) تو اکیلے ہوتے ہیں اور تمہارے ساتھ

تمہارا خدا بھی ہوتا ہے۔ ہمارے لئے ممکن ہی نہیں کہ تم دونوں کا مقابلہ کرسکیں!

یہی تھی خدا کی وہ معیت جس کا اس نے حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ کو یقین دلایا تھا۔ یعنی خدا کے مقصد کو پورا کرنے کے لئے شمشیر بکف اور کفن بدوش میدان میں نکل آنا اور اپنا ہر قدم اُس کے قوانین کی اطاعت میں اٹھانا۔ یہی ہے خدا اور بندے کا وہ تعلق جس کے متعلق فرمایا۔ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ (۴۷/۷)۔ "اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا"۔ خدا کی معیت اور نصرت مشروط ہے اس سے کہ انسان خدا کے متعین کردہ مقصد کے حصول کے لئے میدان میں نکل آئے۔ جب وہ یہ کرے گا تو اسے خدا کی نصرت میسّر آجائے گی! وہ نصرت کیا ہوگی؟ يُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ (۴۷/۷)۔ تمہارے پاؤں میں لغزش نہیں آئے گی۔

اس کے بعد اس داستانِ انقلاب کی اگلی کڑی آتی ہے لیکن آگے بڑھنے سے پیشتر یہ ضروری ہے کہ قرآن کریم کے جن دیگر مقامات میں اتنا حصہ بیان ہوا ہے انہیں بھی سامنے رکھ لیا جائے تاکہ مفہوم بالکل واضح ہوجائے

مزید بکھرے ہوئے موتی

اور تمام جزئیات سامنے آجائیں۔ سورۂ قصص کی آیت ۲۹ پہلے لکھی جاچکی ہے جس میں مذکور ہے کہ حضرت موسیٰؑ کس طرح آگ لینے کے لئے پہاڑ کی طرف بڑھے۔ اس سے آگے ہے۔

فَلَمَّآ اَتٰهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰٓى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ٥ (۲۸/۳۰)

جب وہ وہاں پہنچا تو وادی کے دائیں کنارے، اُسے بابرکت زمین کے ایک درخت کی طرف سے آواز آئی کہ اے موسیٰؑ! یہ آواز تمہارے خدا کی طرف سے آرہی ہے جو تمام اقوامِ عالم کا نشو ونما دینے والا ہے (۲۷/۸) {اس آواز کو وحی کہا ہے (۲۰/۱۳-۱۳)}

سورۂ طٰہٰ میں اسے "وَادِي الْمُقَدَّسِ طُوًى" (۲۰/۱۲)۔ کہا گیا تھا۔ یہاں مزید وضاحت فرمادی کہ ندا ئے جمال وادی کے دائیں جانب، جھاڑی کے پاس سے آئی تھی۔ اس کے بعد ہے۔

وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ؕ يٰمُوْسٰٓى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ ۫ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ٥ (۲۸/۳۱)

پھر موسیٰؑ کو مختلف احکام و ہدایات دے کر کہا کہ ان احکام کو، جو تیرے لئے زندگی کا محکم سہارا اور وجۂ جامعیت

ہیں، فرعون کے سامنے پیش کرو۔ موسیٰؑ نے جب پیشِ نظر مہم اور ان احکام و ہدایات پر غور کیا تو اسے یوں محسوس ہوا گویا وہ ایک مہم نہیں، جیتا جاگتا سانپ ہے جسے پکڑنے کا اسے حکم دیا جا رہا ہے۔ موسیٰؑ نے اپنے خیال میں اس مہم سے ہٹنا چاہا اور فرعون کی طرف جانے سے خائف ہوا۔ اس پر آواز آئی کہ اے موسیٰؑ! ڈرو نہیں۔ اس مہم کو نہایت اطمینان سے سنبھال لو تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکے گا۔ (۷/۱۰۷-۱۰۸) ؛ (۲۰/۱۷-۲۴) ؛ (۲۶/۳۲-۳۴) ؛ (۲۷/۱۰-۱۲)۔

سورۂ طٰہٰ میں اسے حیۃ (سانپ) کہا گیا ہے۔ یہاں کَاَنَّھَا جَآنٌّ کہہ کر وضاحت فرما دی کہ وہ "گویا سانپ" تھا۔ یہ ترجمہ مجازی نہیں۔ لیکن اگر ان الفاظ کو بطور استعارات لیا جائے تو مفہوم یہ ہوگا کہ حضرت موسیٰؑ کو مختلف احکام دیکر کہا کہ ان احکام کو جو بنیر سے لئے زندگی کا محکم سہارا ہیں جا کر فرعون کے سامنے پیش کرو۔ حضرت موسیٰؑ نے جب اس مہم اور اس سے متعلقہ احکام پر غور کیا تو انہیں محسوس ہوا کہ فرعون کے خلاف یہ مہم نہیں۔ ایک اژدہا ہے جسے زندہ پکڑنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اس خیال سے حضرت موسیٰؑ نے دل میں کچھ خوف سا محسوس کیا۔ اس پر آواز آئی کہ اے موسیٰؑ! ڈرو نہیں۔ تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ تم ہماری حفاظت میں رہو گے۔

اُسْلُكْ يَدَكَ فِىْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ؗ وَّاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝ (۲۸/۳۲)

پھر موسیٰؑ کو ایسے احکام دیئے جن میں حُسنِ عمل کے خوشگوار نتائج کی خوش خبریاں تھیں۔ نیز اُن تمام احکام کی تائید میں روشن اور تابناک دلائل و براہین۔ اُس سے کہا کہ ان دلائل کو نہایت دلجمعی سے پیش کرنا۔ لوگوں کے لیے یہ بہت خوش آئند ہوں گی۔ ان میں سے کوئی بات بھی اُن کے لئے ناگواری کا باعث نہیں ہوگی۔ اگر کہیں خوف کا مقام آئے تو وہاں پھڑپھڑانا نہیں، بلکہ اپنے بال و پر سمیٹ کر، پوری جمعیتِ خاطر سے، مقابلہ کے لئے تیار رہنا اور اپنی جماعت کی تنظیم اچھی طرح سے کرنا (۸/۱۵)۔ یہ دونوں قسم کے احکام (مُنذرات و مُبشرات) تیرے پروردگار کی طرف سے، فرعون اور اُس کے اہلِ دربار کے لئے، واضح دلائل ہیں۔ انہیں اُن کے سامنے پیش کرو، وہ لوگ بڑے ہی غلط راستے پر چل رہے ہیں۔

قرآنِ کریم نے حضرات انبیاء کرامؑ کو مبشرین اور منذرین کہہ کر پکارا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کا فریضہ فریقِ مخالف

کو تباہ کرنا نہیں ہوتا تھا۔ وہ انہیں سمجھاتے تھے کہ تم نے (قوانینِ خداوندی کے خلاف) جو روش اختیار کر رکھی ہے اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔ لیکن اگر تم اپنی اس روش کو چھوڑ کر، قوانینِ خداوندی کی اطاعت اختیار کرلو تو دنیا اور آخرت دونوں کی خوشگواریاں اور کامرانیاں تمہارے حصے میں آجائیں گی۔ حضرت موسیٰؑ کو جو پروگرام دیا گیا اسے "بُرْهَانُنِ" کہا گیا ہے۔ یعنی دو روشن دلیلیں۔ ایک دلیل ان کی غلط روش کے نتیجہ میں ان کی تباہی۔ یہ تنذیر تھی۔ دوسری دلیل ان کی صحیح روش کے نتیجہ میں، درخشندہ کامیابیاں۔ یہ تبشیر تھی۔ حضرت موسیٰؑ کے ید بیضا سے مراد یہی تبشیر تھی اور عصا سے مراد تنذیر۔

جب حضرت موسیٰؑ کو اس خدشہ کی طرف سے محفوظیت کا اطمینان دلادیا، تو انہوں نے عرض کیا۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ قَتَلۡتُ مِنۡهُمۡ نَفۡسًا فَاَخَافُ اَنۡ یَّقۡتُلُوۡنِ ۝ وَ اَخِیۡ هٰرُوۡنُ هُوَ اَفۡصَحُ مِنِّیۡ لِسَانًا فَاَرۡسِلۡهُ مَعِیَ رِدۡاً یُّصَدِّقُنِیۡۤ ۫ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اَنۡ یُّکَذِّبُوۡنِ ۝ (۲۸/۳۳-۳۴)

موسیٰؑ نے کہا کہ اے میرے پروردگار! میرے ہاتھوں ان کا ایک آدمی مر گیا تھا۔ میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے گرفتار کر کے قتل کر دیں گے۔

(دوسری بات یہ ہے کہ ایک عرصۂ دراز تک شہری آبادی سے دور رہنے کی وجہ سے، میری زبان بھی ایسی صاف نہیں رہی کہ میں دربارِ فرعون کے لوگوں سے فصیح و بلیغ گفتگو کر سکوں) میرا بھائی، ہارونؑ، مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہے۔ اسے میری امداد کے لئے میرے ساتھ بھیج دیجئے تاکہ جو کچھ میں کروں یا کہوں، وہ میری تائید و تصدیق کرتا جائے۔ مجھے ڈر ہے وہ لوگ ضرور میری تکذیب کریں گے۔

جواب میں ارشاد ہوا۔

قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَکَ بِاَخِیۡکَ وَ نَجۡعَلُ لَکُمَا سُلۡطٰنًا فَلَا یَصِلُوۡنَ اِلَیۡکُمَا ۚۛ بِاٰیٰتِنَاۤ ۚۛ اَنۡتُمَا وَ مَنِ اتَّبَعَکُمَا الۡغٰلِبُوۡنَ ۝ (۲۸/۳۵)

اللہ نے کہا کہ گھبراؤ نہیں۔ میں تمہارے بھائی کو تمہارے ساتھ بھیج کر، اسے تمہارا دست و بازو بنا دوں گا، اور تم دونوں کو ایسا غلبہ عطا کروں گا کہ ان لوگوں کا ہاتھ تم تک نہیں پہنچ سکے گا۔ تم ان احکامات کو لے کر ان کی طرف جاؤ تو سہی۔ تم دونوں، اور جو لوگ تمہارا اتباع کریں گے، یقیناً اہلِ فرعون پر غالب رہیں گے۔

دیکھئے! کس وضاحت اور یقین سے کہا گیا کہ جاؤ! ہماری طرف سے قوت و نصرت تمہارے ساتھ ہوگی۔ اور تم اور تمہارے

متبعین، اس سرکش و جابر قوم پر غالب آجائیں گے۔

سورۂ نمل میں اس واقعہ کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖٓ اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا ؕ سَاٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِيْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ○ (۲۷/۷)

(یہ جو کہا گیا ہے کہ غلط راستے پر چلنے کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے، اس کے لئے فرعون اور موسیٰؑ کی کشمکش کو دیکھو۔ اس داستان کا آغاز اس واقعہ سے ہوا کہ جب، ایک تیرہ و تار شب میں، موسیٰؑ اور اس کے ساتھی ایک پہاڑ کے دامن میں تھے۔ رات کی تاریکی میں راستے کا پتہ نشان نہیں ملتا تھا، اور سردی بلا کی تھی)۔ موسیٰؑ نے ان سے کہا کہ مجھے (دور، پہاڑ پر) آگ دکھائی دی ہے۔ تم یہیں ٹھیرو۔ میں جاتا ہوں، اور یا تو وہاں کسی سے راستے کے متعلق پتہ نشان لاتا ہوں، اور یا آگ کا انگارہ، کہ تم لوگ اسے تاپ سکو (اور اس طرح رات بسر ہو جائے) (۲۸/۲۹)

جب حضرت موسیٰؑ آگ کے نشان کی طرف بڑھے تو آواز آئی۔

فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ (۲۷/۸)

جب موسیٰؑ آگ کے قریب پہنچا تو اسے آواز سنائی دی کہ یہ مقام جس میں آگ نظر آرہی ہے (یعنی طور کی چوٹی) اور اس کا اردگرد (ارض فلسطین) بڑی مبارک سرزمین ہے (جہاں اس قدر انبیاء پیدا ہونے والے ہیں اور جو بنی اسرائیل کے لئے انقلاب عظیم کی آماجگاہ بننے والی ہے (۷/۱۳۷ و ۲۸/۳۰)۔

(لیکن تم اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ تمام برکات و سعادات اسی خطۂ زمین تک محدود ہیں، باقی دنیا اس سے محروم ہے۔ نہیں، ایسا نہیں)۔ وہ خدا جو تمام نوع انسان کو نشو و نما دینے کا ذمہ دار ہے، وہ اس سے بہت بلند ہے (کہ وہ صرف کسی ایک خطۂ زمین کو اپنے سحاب کرم کے لئے مخصوص کرے اور باقی دنیا اس کی گوہر پاشیوں سے محروم رہے۔ اس کی طرف سے عطا شدہ سامان نشو و نما ——— خواہ اس کا تعلق طبیعی ضروریات سے ہو یا انسانی ذات سے ——— تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ اس نے سامان رزق بھی ہر قوم کو دیا ہے اور وحی کی رہنمائی بھی)

مقصود یہ بتانا تھا کہ یہ مقام (طور) اور اس کے ارد گرد کا علاقہ (ارضِ فلسطین) بڑی بابرکت زمین ہے کیونکہ اس سے پہلے بھی یہاں مختلف انبیاء کرامؑ کی وساطت سے پیغاماتِ خداوندی کا عام چرچا ہوا تھا اور اب بھی یہ علاقہ (کچھ عرصہ بعد) نظامِ خداوندی کی آماجگاہ بننے والا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت کر دی کہ برکات و سعادت اسی خطّہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ خدا تو رب العالمین ہے۔ اس لئے اس کی رحمتیں تمام ارض پر چھائی ہوئی ہیں۔ وہ اس تصوّر سے بہت بلند ہے کہ اس کی ربوبیت کو کسی خاص علاقہ یا خاص نسل میں محدود کر دیا جائے۔ اس کے بعد فرمایا۔

يٰمُوْسٰٓى اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۙ (۲۷/۹)

(موسیٰؑ حیران تھا کہ یہ آواز کہاں سے آئی اور کس نے دی؟ اس پر) ندائے جمال نے کہا کہ اے موسیٰؑ! یہ آواز تمہارے خدا کی طرف سے آئی ہے، جو بڑی قوتوں کا مالک اور عمدہ ترین تدابیر کا حامل ہے۔ (اس کی قوّت و حکمت کا مظاہرہ اس کشمکش میں ہوگا جو تیرے سامنے آنے والی ہے)۔

"عَزِيْزُ الْحَكِيْمُ" کی صفتِ خداوندی پر غور فرمائیے۔ غالب اور حکمت والا۔ جس عظیم الشان مہم کو سَر کرنے کے لئے حضرت موسیٰؑ کو مامور کیا جا رہا تھا اس کے لئے ایسے ہی غالب و حکیم خدا کی تائید و نصرت کی ضرورت تھی۔ غلبہ کے ساتھ حکمت (RATIONALITY) نہ ہو تو وہ دھاندلی ہوتی ہے، اور اگر حکمت کے ساتھ غلبہ نہ ہو تو وہ نرا وعظ۔ اس کے بعد ارشاد ہے۔

وَاَلْقِ عَصَاكَ ۭ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَاۗنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ۭ يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۣ اِنِّىْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ (۲۷/۱۰)

(پھر موسیٰؑ کو، اس مہم کے سلسلہ میں، مختلف احکام دے کر کہا کہ) ان احکام کو، جو تیرے لئے زندگی کا محکم سہارا اور وجۂ جامعیت ہیں (فرعون کے سامنے جا کر) پیش کرو۔ موسیٰؑ نے جب اس مہم، اور اسے سر کرنے کے پروگرام پر غور کیا تو اسے یوں محسوس ہوا گویا وہ ایک جیتا جاگتا اژدھا ہے جس کا مقابلہ کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ موسیٰؑ نے اپنے خیال میں اس سے پیچھے ہٹنا چاہا اور فرعون کی طرف جانے سے خائف ہوا۔ (۷/۱۰۸ ؛ ۲۰/۱۷-۲۲ و ۲۶/۳۲-۳۳)۔

آواز آئی کہ اے موسیٰؑ! ڈرو نہیں۔ جب ہم اپنے پیغمبروں کے ساتھ ہیں، تو پھر ان کے لئے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی (۲۶/۱۵)۔ (یہاں لفظ مرسلون نے بات واضح کر دی کہ سانپ سے ڈرنے کی بات نہیں تھی۔ رسالت کی بے پناہ ذمہ داریوں کے احساس کا خوف تھا)۔

اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ ($\frac{27}{11}$)

نہ ہی اُسے ڈرنے کی ضرورت ہے جس سے کبھی دانستہ زیادتی ہو گئی ہو، لیکن اُسنے اس سے توبہ کر کے زندگی کی حسین اور ہموار راہ اختیار کر لی ہو۔ اس لئے کہ ہمارے قانونِ مکافات میں اس کی گنجائش ہے کہ ایسے شخص کو، اُس کی سابقہ لغزشوں کے نقصان رساں اثرات سے محفوظ رکھا جائے، اور اُس کی نشوونما برابر ہوتی رہے۔ (لہذا، اگر تمہارے دل میں یہ خیال ہو کہ تم نے غلطی سے ایک شخص کو مار ڈالا تھا، اور اس طرح تم سے ایک جرم سرزد ہو گیا تھا، اس لئے اب اس عظیم مہم کو کسطرح سرانجام دیا جا سکے گا، تو اس خیال کو بھی دل سے نکال دو۔)

پھر فرمایا۔

وَاَدْخِلْ یَدَكَ فِیْ جَیْبِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ فِیْ تِسْعِ اٰیٰتٍ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ○ ($\frac{27}{12}$)

پھر موسیٰؑ کو، ان احکام کی تائید میں، براہینِ نیرّہ عطا کیں جن میں اربابِ عقل و بصیرت کے لئے روشنی اور بینائی کا سامان تھا۔ وہ اگر ان پر غور و فکر کریں گے تو اُنہیں نظر آجائے گا کہ احکامِ خداوندی کے اتباع میں کسی خرابی کا احتمال نہیں ہو سکتا۔ وہ تو سرتاپا خیر ہوتے ہیں ($\frac{28}{32}$)۔ یہ دلائل ان نو (۹) آیات ($\frac{7}{133}$ ؛ $\frac{7}{130}$ ؛ $\frac{17}{101}$) سے متعلق تھے جنہیں لے کر موسیٰؑ، فرعون اور اس کی قوم کی طرف گیا تھا ـــــ وہ قوم جو زندگی کے صحیح راستہ کو چھوڑ کر، غلط راہوں پر چل نکلی تھی۔

ان تسع اٰیات (نو نشانیوں یا احکام) کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

مذکورہ صدر مقامات میں تفصیل دی گئی ہے لیکن سورۃ نازعات میں ان تفاصیل کو اجمال میں سمیٹ دیا گیا ہے۔

فرمایا۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِیْثُ مُوْسٰی ۘ○ اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًی ○ اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی ○ ($\frac{79}{15-17}$)

(یہ انقلاب کوئی نیا انقلاب نہیں ہو گا۔ یہ سلسلہ تو شروع سے چلا آرہا ہے۔ مستبد قوتیں، کمزوروں کو دباتی رہی ہیں، اور انبیاء کرامؑ اُن کے رفقاء کی جماعتیں ان کمزوروں اور ناتوانوں کو ابھار کر اُوپر لاتی رہی ہیں۔ (مثلاً) موسیٰؑ اور فرعون کی کشمکش کو لو۔ اور اس داستان کا آغاز وہاں سے کرو جب موسیٰؑ، اس مقام

ہیں پہنچ چکا تھا جہاں عقل کے تجرباتی طریق کی لمبی مسافتوں کو لپیٹ کر رکھ دیا گیا تھا، اور اس پر وحی کے ذریعے براہِ راست انکشافِ حقائق کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ (۲۰ / ۱۲)۔ یعنی جب موسیٰؑ کو نبوت سے سرفراز کیا گیا تھا، اس وقت، اُس کے نشو ونما دینے والے نے اُسے پکارا، اور کہا کہ)

تم فرعون کی طرف جاؤ۔ اس نے دھاندلی مچا رکھی ہے۔ وہ بڑا ہی سرکش ہو گیا ہے۔ اُس نے کمزوروں کو بُری طرح دبا رکھا ہے۔

سورۂ شعراء میں ہے۔

وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰٓى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۙ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ؕ اَلَا يَتَّقُوْنَ ○

(۲۶ / ۱۰ - ۱۱)

(اس حقیقت کی شاہد، داستانِ بنی اسرائیل ہے، جسے اس جگہ مختصراً دُہرایا جاتا ہے۔ اس کی ابتداء اس مقام سے کی جاتی ہے)۔ جب ہم نے موسیٰؑ کو آواز دی اور اُس سے کہا کہ تم اس قوم (فرعون) کی طرف جاؤ جس نے بڑی سرکشی اختیار کی ہے۔

ان کی طرف جاؤ اور اُن سے پوچھو کہ کیا وہ اپنی غلط روش کے تباہ کن عواقب سے بچنا چاہتے ہیں یا نہیں؟

حضرت موسیٰؑ نے عرض کیا۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ؕ وَيَضِيْقُ صَدْرِیْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِیْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ○ (۲۶ / ۱۲ - ۱۳)

موسیٰؑ نے عرض کیا کہ اے میرے نشو ونما دینے والے! مجھے ڈر ہے کہ وہ (میری بات نہیں مانیں گے بلکہ اُلٹا) مجھے جھٹلائیں گے۔

(ہو سکتا ہے کہ ان کی مخالفت اس قدر شدت اختیار کر لے کہ اس کا مقابلہ کرنا تنہا میرے بس کی بات نہ رہے) میرا دم گھٹنے لگ جائے اور میں ان سے کھل کر بات بھی نہ کر سکوں۔ اس لئے تو ایسا کر کہ ہارون کی طرف بھی پیغام بھیج دے (کہ وہ میرے ساتھ چلنے کے لئے تیار رہے)

سورۂ طٰہٰ کے الفاظ میں، حضرت موسیٰؑ نے دعا مانگی تھی کہ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ (۲۰ / ۲۵) " اے اللہ! میرا سینہ کھول دے "۔ یہاں اس اہم ذمہ داری کے بوجھ کی طرف اشارہ ہے جس کے لئے شرحِ صدر کی آرزو، دعا بن کر لب پر آگئی۔ پھر حضرت موسیٰؑ نے سورۂ طٰہٰ میں عرض کیا تھا کہ " میری زبان کی گرہ کشائی فرما دیجئے تاکہ وہ

میری بات سمجھ لیں" (۲۰/۲۸-۲۷)۔ یہاں اپنے عجزِ بیان کے متعلق کہا کہ لَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ اس لئے حضرت ہارونؑ کو میرے ساتھ کر دیجئے کہ ھُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا (۲۸/۳۴)۔ (وہ مجھ سے زیادہ فصیح البیان ہے)

اس کے بعد عرض کیا کہ ایک بات اور بھی ہے۔

وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ۝ (۲۶/۱۴)

(دوسری بات یہ بھی ہے کہ)، وہ لوگ میرے خلاف قتل کا الزام دھرتے ہیں، اس لئے مجھے خدشہ ہے کہ وہ مجھے گرفتار کر کے قتل نہ کر دیں۔

دیکھئے! حضرت موسیٰؑ نے یہ نہیں کہا کہ وہ فی الواقعہ مجرم ہیں۔ اس لئے کہ آپ قتلِ عمد کے مرتکب نہیں تھے۔ بلکہ وہ حادثہ محض اتفاقی تھا۔ لیکن (جیسا کہ پہلے آچکا ہے) حکومتِ فرعونی کے اربابِ بست و کشاد، آپ پر قتلِ عمد کا الزام دھر کر آپ کو قتل کر دینا چاہتے تھے۔ (ملاحظہ ہو آیات (۲۸/۱۵-۲۱) جو پہلے درج کی جا چکی ہیں)۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ دونوں بھائی جاؤ۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ۝ (۲۶/۱۵)

خدا نے کہا کہ (مت ڈرو) اُن کی مجال نہیں کہ وہ ایسا کریں۔ (لیکن یہ ٹھیک ہے کہ مہم کی سختی کے پیشِ نظر، ہارونؑ کو بھی تمہارے ساتھ جانا چاہیئے) پھر تم دونوں، ہمارے قوانین کو لے کر اُن کی طرف جاؤ۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم ایک ایک بات کو سُنتے (دیکھتے) رہیں گے۔ (۲۰/۴۶)۔

یہ تھے وہ واقعات جو سرِطور لہرانے والی برقِ تجلّی کے دامن میں، آگ کی تلاش میں نکلے ہوئے (حضرت) موسیٰؑ کو پیش آئے۔

طور سے واپسی

اہلِ خانہ انتظار میں ہونگے کہ آپ آگ لے کر آئیں! انہیں کیا معلوم کہ وہاں سے کون سی زندہ حرارت مل گئی ہے جو افراد کے خون میں ہی نہیں بلکہ قوم کی رگِ جان میں برقِ تپاں بن کر دوڑ جائے گی۔ حضرت موسیٰؑ اس مقصدِ عظیم کو دل میں لئے، جس کے لئے آپ کو مامور کیا گیا تھا، مصر کی جانب روانہ ہو گئے۔ غور کیجئے! یہاں سے بھاگے تھے تو کس حالت میں۔ اور اب لوٹے ہیں تو کس انداز سے! اُس وقت فرعون اور اسکے اربابِ حکومت کی سازش سے بچ کر نکلے تھے اور اب مراجعت ہوئی ہے تو ہاں نمط کہ انقلابات کی ایک دنیا جلو میں ہے

دربارِ فرعون میں

اور سینے میں سوائے ایک اللہ کے کسی کا خوف مضمر نہیں۔ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی آمد

اوران کے ارادوں کی اطلاع، بنی اسرائیل اور فرعونی حکومت کو مل چکی ہوگی۔ بہرحال آپ فرعون کے پاس پہنچے اور اپنی آمد کا مقصد بتایا۔

۷/۱۰۴ وَقَالَ مُوسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّىْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۷/۱۰۴)

موسیٰؑ نے فرعون سے کہا کہ (تم نے انسانوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر رکھا ہے۔ ایک گروہ کو پامال کرتے ہو، دوسرے کو سر پر چڑھاتے ہو۔ اس سے معاشرہ میں سخت ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں ۲۸/۴)۔ میں اُس خدا کی طرف سے پیامبر ہوں جو تمام نوعِ انسان کا نشوونما دینے والا ہے۔ (اُس کے نزدیک انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں، یہی انداز معاشرہ کا ہونا چاہیئے۔)

"میں خدا کا فرستادہ ہوں اس لئے حق کے سوا کچھ نہ کہوں گا۔ مطالبہ میرا فقط ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ بنی اسرائیل کو غلامی پر مجبور نہ کر۔ خدا کے فرستادہ کے حوالہ کردے تاکہ وہ انہیں انسانوں کی انسانیت سوز محکومی سے چھڑا کر، خدا کی محکومیت میں لائے اور اس طرح اُنہیں انسانیت کی زندگی سے روشناس کرائے۔"

۷/۱۰۵ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِىَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝

مجھ پر لازم ہے کہ میں خدا کے متعلق، حق کے سوا کچھ نہ کہوں۔ میں تمہارے پاس نشوونما دینے والے کی طرف سے، کھلے کھلے دلائل اور قوانینِ حیات لایا ہوں۔ (ان قوانین کی رُو سے، کسی قوم کو اپنی غلامی اور محکومی میں رکھنا کسی طرح بھی جائز نہیں)۔ لہٰذا تم بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دو۔ (تاکہ یہ آزادی کی فضا میں سانس لے سکیں)۔ یہ خدا کے بندے ہیں، تمہارے نہیں، اس لئے انہیں میرے سپرد کرو تاکہ میں انہیں انسانوں کی غلامی سے نجات دلا کر، قوانینِ خداوندی کے تابع لے آؤں۔ اسی کا نام آزادی ہے۔ (۱۸/۴۲)

اس مقام کے علاوہ حسبِ ذیل آیات میں بھی اس بات کو دُہرایا گیا ہے۔

(۷۵/۱۰ ؛ ۹۶-۹۷/۱۱ ؛ ۴۵-۴۶/۲۳ ؛ ۳۵-۳۶/۲۵ ؛ ۱۶-۱۷/۲۶ ؛ ۲۳-۲۴/۴۰ ؛ ۴۶/۴۳ ؛ ۱۷-۲۷/۴۴ ؛ ۳۸/۵۱)

حضرت موسیٰؑ نے سب سے پہلے یہی کہا کہ میں اپنے رب کی طرف سے رسول ہوں۔ یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ مصری بُت پرست تھے اور ان کے بادشاہ شانِ الوہیت کے مظہر سمجھے جاتے تھے۔ بُت پرستی کا مسلک یہ ہے کہ

مختلف صفات معبودیت کے لئے مختلف دیوتا تصوّر کرلئے جاتے ہیں اور پھر ہر دیوتا کا مجسّمہ تراش کر، ان سے وہی کچھ مانگا جاتا ہے جس کا اسے دیوتا قرار دیا جاتا ہے۔ بارش برسانے والا دیوتا۔ ہوائیں چلانے والا دیوتا۔ اولاد

فرعون کا استفسار

دینے والا دیوتا۔ وقس علیٰ ہذا۔ پھر ہر قبیلہ اور ہر قریہ کا جدا جدا دیوتا اور الگ الگ "خدا" ہوتا ہے۔ جب حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ میں اپنے (یا تمہارے) رب کی طرف سے پیغامبر ہوں تو فرعون نے سب سے پہلے ہی سوال کیا کہ

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ○ (۲۰/۴۹)

"اگر ایسا ہی ہے تو بتلاؤ تمہارا پروردگار کون ہے اے موسیٰ؟"

کون سے رب کی طرف سے؟ کون سے خدا کی جانب سے؟ اس کے جواب میں حضرت موسیٰؑ نے چار لفظ کہے ہیں اور غور کیجئے تو کس طرح بساطِ کائنات کے چاروں گوشے ان کے اندر سمٹ کر آگئے ہیں وحی کا انداز ہی یہ ہوتا ہے۔ فرمایا:۔

قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ○ (۲۰/۵۰)

موسیٰؑ نے کہا کہ ہمارا رب، کسی خاص گروہ یا قوم کا رب نہیں۔ ہمارا رب وہ ہے جو ہر شے کو پیدا کرتا ہے اور پھر اسے وہ راستہ بتا دیتا ہے (جس پر چل کر وہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتی ہے۔ انسانوں تک یہ رہنمائی وحی کے ذریعہ آتی ہے، جسے لے کر ہم تمہارے پاس آئے ہیں)۔

حضرت موسیٰؑ کا جواب

وہ رب جس نے ہر شے کو خلقت عطا فرمائی۔ غور کیجئے۔ ہر شے کا پیدا کرنے والا۔ یہ نہیں کہ صرف بارش برسانے والا۔ اولاد عطا فرمانے والا۔ بلکہ اس وسیع و عریض کائنات میں جس شے کا بھی تصوّر کرسکو اس کا خالق اور صرف خالق ہی نہیں بلکہ پیدا کرنے کے بعد ہر شے کو جس منتہیٰ تک پہنچنا ہے، وہاں تک کی راہ نمائی کرنے والا۔ سلسلۂ ارتقاء کی اوّلین اور آخری کڑیوں کا مالک کہیئے! ایسے خدا کی موجودگی میں کسی شے کو اپنی زندگی کے کسی شعبہ میں کسی اور "خدا" کی ضرورت لاحق ہو سکتی ہے؟

حضرت موسیٰؑ نے جو کہا تھا کہ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ (۷/۱۰۴) اور اس کے جواب میں ——— فرعون نے پوچھا تھا کہ وہ "رب" کونسا ہے تو اس میں ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ بھی ہے۔ فرعون کا دعویٰ تھا [اور دنیا کے ہر "فرعون" کا یہی دعویٰ ہوتا ہے] کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (۷۹/۲۴) لوگوں کو میں سامانِ زندگی عطا کرتا ہوں اس لئے میں ہی ان کا رب ہوں۔ حضرت موسیٰؑ نے جو کہا کہ میں رب العالمین کی طرف سے رسول ہوں تو اس سے

فرعون کے اس دعوائے ربوبیت کی بھی تردید کر دی۔ اس لئے فرعون نے دُہرا کر پوچھا کہ وہ کون سا رب ہے جس کی طرف سے تم آئے ہو۔ اس سرزمین میں "رب" تو میں ہی ہوں۔

بہرحال فرعون نے سوچا تھا کہ حضرت موسیٰؑ کو اس الجھاؤ میں الجھا لے گا۔ لیکن جواب ایسا مسکت اور جامع ملا کہ سٹی بھول گیا۔ اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ اس راہ سے کترا کر دوسری طرف نکل جائے۔ کہنے لگا اچھا! یہ بتاؤ کہ جو لوگ پہلے ہو گزرے ہیں ان کا کیا حال ہے؟ ان میں سے کون راہِ راست پر تھا اور کون گمراہ۔ خدا کے ہاں اس وقت ان کی کیا حالت ہے؟ کس کی نجات ہوئی اور کون عذاب میں مبتلا ہے۔

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ○ (۲۰/۵۱)

(جب فرعون نے دیکھا کہ اس سوال کے جواب میں موسیٰؑ پر گرفت کی گنجائش نہیں نکل سکتی تو اس نے بحث کا رُخ بدلا اور خاص "حکمتِ فرعونی" سے کام لینا چاہا۔ اس کے گرد و پیش، امراء و وزراء بیٹھے تھے۔ وہ اور اُن کے آباء و اجداد مشرک تھے، اور موسیٰؑ کے معیار کے مطابق، جہنم کے سزاوار۔ اس لئے) اُس نے موسیٰؑ سے کہا کہ یہ بتاؤ کہ جو لوگ پچھلے زمانے میں گزر چکے ہیں (یعنی ہمارے اسلاف) اُن کا کیا حشر ہوگا۔ (کیونکہ وہ تو تمہارے خدا پر ایمان نہیں رکھتے تھے)۔

یہ سوال ایسا تھا کہ اس کے جواب سے فرقہ وادی اور گروہ سازی کی ہزار افتراق انگیز راہیں پیدا ہو سکتی تھیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس سے فرعونی سیاست کی دسیسہ کاری کا مقصد یہ بھی تھا کہ جب حضرت موسیٰؑ اس قوم کے اسلاف میں سے کسی کے متعلق بھی یہ کہیں گے کہ وہ گمراہ تھے تو فرعون اپنے اہلِ دربار اور عوام سے کہے گا کہ دیکھو! یہ شخص تمہارے واجب الاحترام بزرگوں کی توہین کرتا ہے۔ اس طرح اُن کے جذبات کو بھڑکا کر، انہیں حضرت موسیٰؑ کا مخالف بنا دیا جائے گا۔ اور یوں وہ مقصدِ عظیم جس کے لئے وہ آئے ہیں نگاہوں سے اوجھل کر دیا جائے گا

ایک اور بصیرت افروز جواب

لیکن (جیسا کہ ہم حضرت ابراہیمؑ اور آپ کے مخالف بادشاہ کے مکالمہ میں دیکھ چکے ہیں (دیکھئے مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۵۶) حضرات انبیائے کرامؑ کا مسلک، مجادلانہ نہیں ہوتا، اعیانہ ہوتا ہے، وہ بحث و مناظرہ کے لفظی گورکھ دھندے سے بچ کر، اس انداز سے حقیقت کشائی کر دیتے ہیں جس سے پوچھنے والا ساکت بھی ہو جائے اور مطمئن بھی۔ حضرت موسیٰؑ نے جواب میں فرمایا۔

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ○ (۲۰/۵۲)

(اس نے یہ سوال اس نیت سے کیا تھا کہ جب اس کے جواب میں موسیٰؑ کہے گا کہ وہ سب جہنم میں جائیں گے تو اس کے اہلِ دربار مشتعل ہو جائیں گے اور یوں بنی اسرائیل کی آزادی کا مسئلہ مذہبی جذبات کے سیلاب میں بہ جائے گا۔ لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کا سابقہ کس سے پڑا ہے) موسیٰؑ نے کہا کہ اس بات کا مجھے کچھ علم نہیں (کہ وہ لوگ کس حال میں ہیں)۔ اس کا علم میرے پروردگار کے نوشتے میں ہے (اس لئے اُن کے معاملہ کا فیصلہ، خدا کے نوشتے کے مطابق ہو جائے گا)۔ وہ خدا ایسا نہیں کہ کھویا جائے، یا بھول میں پڑ جائے۔ (اس لئے ان کا فیصلہ ٹھیک ٹھیک اُن کے اعمال کے مطابق ہو جائے گا۔ تم اپنے پہلے سوال کا جواب سنو، کہ جس رب نے ہمیں تمہاری طرف بھیجا ہے، وہ رب کیسا ہے؟)

جواب کے ایک ایک لفظ پر غور فرمائیے اور حقائق و معارف کی اس بصیرت افروز دنیا میں جذب ہو جائیے۔ فرمایا کہ اسلاف کا علم، نوشتۂ الٰہی میں ہے اور وہ نوشتہ ایسا ہے جس میں کسی قسم کی غلطی اور سہو کا امکان نہیں[1] اس لئے مجھے (یا تمہیں) اس بحث میں اُلجھنے کی ضرورت نہیں۔ ان لوگوں کا حال اُن کے رب کے علم میں ہے لیکن تمہارے لئے فقط اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ اللہ کا قانونِ مکافاتِ عمل ایسا محکم گیر اور محیطِ کل ہے کہ اس میں کسی قسم کی کوتاہی اور غلطی کا امکان نہیں۔ اس لئے تمہیں فکر اپنی اپنی کرنی چاہیئے۔ ہماری نجات کے لئے ہم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ فلاں بزرگ بڑا ہے یا فلاں۔ اور فلاں کی نجات ہوگی یا نہیں۔ ان کے متعلق ہمارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ ہم عرض کریں کہ۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ (۵۹/۱۰)

اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو ہمارے لئے بھی سامانِ حفاظت عطا فرما دے اور ہمارے ان بھائیوں کے لئے بھی، جو ایمان میں ہم پر سبقت لے گئے ہیں۔

ان کے اعمال کے متعلق ہم سے بازپرس نہ ہوگی۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا

---

[1] یہ آیۂ مبارکہ حیات بعد الممات کے اہم گوشہ سے متعلق ایک بنیادی اصول بھی بیان کر رہی ہے۔ لیکن چونکہ وہ نکتہ ایک مبسوط تشریح کا محتاج ہے اس کا بیان اس کے اپنے مقام پر آئے گا۔

یَعۡمَلُوۡنَ ۝ (۲/۱۴۱)

بہر حال، اگر اس کے باوجود، تم اصرار کرتے ہو کہ تمہارے اسلاف ایسے نہیں تھے، ایسے تھے، تو اس سے اصل بات پر کیا اثر پڑتا ہے۔ وہ جیسے بھی تھے، اُن کے اعمال اُن کے لئے تھے اور تمہارے اعمال تمہارے لئے ہیں۔ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تمہارے اسلاف کس روش پر چلتے تھے اور کیسے کام کرتے تھے۔ تم سے تو یہ پوچھا جائے گا کہ تم نے کس قسم کے کام کئے تھے ——— یہ ہے دین کی اصل جس میں کسی جھگڑے کی گنجائش نہیں۔

اُن کے اعمال ان کے ساتھ۔ ہمارے اعمال ہمارے ساتھ۔ اس لئے اس فکر کی کیا ضرورت ہے کہ ان کا کیا حال ہے؟ فکر یہ کرو کہ ہمارا کیا حال ہو گا؟

آیۂ عبرت! حضرت موسیٰؑ کے اس جواب پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ اس سے فرعون کی چال کس طرح ناکام بنا کر رکھ دی گئی اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی سوچئے کہ ہم تشتّت و افتراق کے جس جہنّم میں مبتلا ہیں کیا اس کی ایک بڑی وجہ یہی نہیں کہ بجائے اس کے کہ ہم اسلاف پرستی کے اس سوال کے جواب میں (جو فرعون نے کیا تھا) وہی طریق اختیار کریں جو زبانِ وحی سے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ عِلۡمُهَا عِنۡدَ رَبِّیۡ فِیۡ کِتٰبٍ۔ ایک ایک کے متعلق عدالت کی کرسی بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور (معاذ اللہ) خدائے احکم الحاکمین کا منصب بھی خود ہی اختیار کر لیتے ہیں؟ اس سے باہمی تکفیر و تفسیق کے دروازے کھل جاتے ہیں اور یوں، ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب کی ماننے والی اُمّتِ واحدہ، سینکڑوں فرقوں میں بٹ کر عملی شرک کی نظیر بن جاتی ہے۔ اور، قیامت بالائے قیامت، کہ تحزّب و تشیّع اور فرقہ سازی اور گروہ بندی کی ان تمام مذموم کوششوں کا نام "خدمتِ اسلام" رکھا جاتا ہے! یا للعجب!!

بہر حال، حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے اس سوال کا بھی ایسا مسکت جواب دیا کہ اس کے بعد کوئی بات بن نہ پڑی چونکہ اس جواب میں آپ نے اللہ تعالیٰ کے قانون مکافاتِ عمل کی طرف اشارہ کیا تھا اس لئے اس کی مزید تفصیل میں اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا بھی اجمالی تذکرہ کر دیا جس سے قانونِ کائنات کی ہمہ گیری سے، قانونِ مکافات، پر استدلال کیا جاتا ہے۔ یعنی مبداء سے معاد کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔ (تفصیل ان امور کی اپنے مقام پر آئے گی) آپ نے فرمایا:-

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِیْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ
مَآءً ؕ فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ۝ كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ؕ اِنَّ فِیْ
ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰى ۝ؑ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِیْهَا نُعِیْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ
تَارَةً اُخْرٰى ۝ (۲۰/۵۵-۵۳)

وہ ربّ، وہ ہے جس نے تم سب کے لئے اس وسیع و عریض زمین میں سامانِ پرورش جمع کر دیا، اور تمہاری نقل و حرکت کے لئے راستے بنا دیئے۔ وہ ربّ جو بادلوں سے مینہ برساتا ہے اور اس کی آب پاشی سے انواع و اقسام کی نباتات پیدا کر دیتا ہے۔

تاکہ تم خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو بھی کھلاؤ۔ اس تمام نظامِ فطرت میں، صاحبانِ عقل و بصیرت کے لئے اس حقیقتِ کبریٰ کے لئے بڑی بڑی نشانیاں ہیں، کہ کائنات میں پروردگاری صرف خدا کی ذات کے لئے ہے۔ (لہٰذا، کسی فرعون کا یہ کہنا کہ "اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى" میں تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں۔ (۷۹/۲۴)۔ یہ زمین۔ یہ دریا۔ یہ ملک سب میری ملکیت ہیں (۴۳/۵۱)۔ اس لئے تم میرے محتاج اور محکوم ہو۔" بے بنیاد دعویٰ اور حماقت پر مبنی تصوّر ہے)۔

اُس پروردگارِ حقیقی نے تم سب کو اس زمین (بے جان مادہ) سے پیدا کیا ہے۔ پھر وہ (تمہارے بے جان مادی جسم کو اسی میں لوٹا دیتا ہے، لیکن اس کے بعد، تمہیں حیاتِ نو عطا کر کے اس سے اٹھا کھڑا کرے گا جو پہلی کڑیوں سے مختلف ہو گی (اُخرویٰ موت سے آخرت کی)۔ لہٰذا، انسانوں میں آقا اور بندہ۔ حاکم اور محکوم کی تفریق کیسی؟ آقا اور حاکم صرف خدا ہے۔ سب انسان آپس میں برابر اور اُس کے محکوم ہیں)۔
(کیا اب تم سمجھ گئے ہو کہ وہ خدا کون سا ہے جس کا پیغام لے کر ہم تمہاری طرف آئے ہیں؟)

سورۂ شعراء میں بھی اس مکالمہ کا ذکر ہے۔ قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (۲۶/۲۳)۔ (فرعون نے پوچھا کہ ربّ العلمین کون ہے؟ حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا۔ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِیْنَ ۝ (۲۶/۲۴)۔ (موسیٰؑ نے کہا کہ وہ پستیوں اور بلندیوں کا اور ان سب کا جو ان کے درمیان ہیں، ربّ ہے۔ اگر تم یقین کرنے والے ہو تو)۔ ظاہر ہے کہ اس الٰہ حقیقی کا عقیدہ، نہ صرف قومِ فرعون کی اصنام پرستی ہی کو جڑ سے اکھیڑ دیتا تھا بلکہ خود فرعون کے دعوائے ربوبیت کو بھی خاک میں ملا دیتا تھا۔ اس لئے کہ فرعون کا دعویٰ

فرعون کا دعوائے ربوبیت

یہ تھا کہ اَنَا رَبُّکُمُ الۡاَعۡلٰی (۷۹/۲۴) "میں تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں" اور حقیقت یہ کہ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) ایک فرعون موسیٰؑ ہی پر کیا موقوف ہے۔ دنیا میں ہر مستبد قوت، اپنے دبدبہ و اقتدار کو انہی راہوں سے قائم کرتی ہے۔ وہ رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضہ میں لے لیتی ہے اور پھر بھوکے انسانوں سے، جو جی میں آئے منوا اور کرا لیتی ہے۔ ورنہ انسان اگر اپنی روٹی کے لئے کسی کا محتاج نہ ہو تو کسی کے سامنے جھکے کیوں؟ فرعون کے دعوائے ربوبیت کی بھی یہی بنیاد تھی۔ اس لئے جب حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ میرا خدا رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ ہے۔ یعنی کائنات کی ہر شئے کا پروردگار۔ اور پھر اس دعویٰ کی دلیل میں تفصیل سے بتا دیا کہ خدا کس طرح مخلوق کے لئے سامانِ رزق مہیا کرتا ہے (۲۰/۵۵-۵۲)۔ تو فرعون نے اپنے حواریوں کی طرف دیکھا اور کہا کہ "سنتے ہو۔ یہ کیا کہہ رہا ہے؟" (۲۶/۲۵)۔ فرعون کے اس استفسار میں ایک طرف تضحیک کا پہلو بھی ہے، لیکن دوسری طرف، اپنے اربابِ حکومت کی توجہ اس انقلابی روح کی طرف بھی منعطف کرا دی گئی ہے جو حضرت موسیٰؑ کے اس دعوائے ایمان میں جھلک رہی تھی۔ جس شخص کا ایمان یہ ہو کہ کائنات کی تمام اشیاء کا نشو و نما دینے والا خدائے بزرگ و برتر کے سوا کوئی نہیں، وہ کسی انسان کو کسی دوسرے انسان کے سامنے بھلا کب جھکنے دے گا؟

اور اس دعوے کا ابطال

فرعون کی نگاہوں نے حضرت موسیٰؑ کے اس سادہ سے جملہ میں انقلابِ آسمانی کی وہ تمام بجلیاں بھانپ لیں جو اس قسم کے ایمان کے سحاب میں بے تاب ہوتی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کی استہزاء آمیز تنقید کو اسی حقارت سے ٹھکرا دیا جس کی وہ مستحق تھی۔ وہ اس کی طرف آنکھ اٹھائے بغیر آگے بڑھ گئے۔ اور فرمایا۔ قَالَ رَبُّکُمۡ وَ رَبُّ اٰبَآئِکُمُ الۡاَوَّلِیۡنَ ○ (۲۶/۲۶) "وہ اللہ تمہارا رب اور تمہارے آباء و اجداد کا رب ہے"۔ اس ٹکڑے میں درحقیقت ضمناً فرعون کے اس "نشتر" کا بھی جواب تھا کہ تم لوگوں کی ربوبیت کے مدعی ہو۔ حالانکہ تم اور تمہارے آباء و اجداد (جنہیں تمہاری طرح یہی دعویٰ تھا) سب اپنی پرورش کے لئے بھی اسی بارگاہِ صمدیت کے محتاج تھے (اور ہیں) سو جب تم خود اپنی پرورش کے لئے کسی اور کے محتاج ہو تو تم دوسروں کی پرورش کیا کر سکتے ہو؟ فرعون نے پھر اہلِ دربار کی طرف دیکھا اور کہا کہ سنتے ہو! اب یہ کیا کہہ رہا ہے؟ میں اور میرے آباء و اجداد (یعنی وہ تمام شہنشاہ جن کی عظمت کے سامنے دنیا کانپتی تھی) اس کے نزدیک سب محتاج ہیں؟ کیا اس قسم کی باتیں کوئی سلیم العقل انسان کر سکتا ہے؟

قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِیْٓ اُرْسِلَ اِلَیْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ۝ (۲۶/۲۷)

فرعون نے اپنے اہل دربار سے مخاطب ہو کر کہا کہ لو بھئی! خدا نے تمہاری طرف اپنا رسول بھی بھیجا تو ایک پاگل بھیجا!

حضرت موسیٰؑ نے فرعون کی اس جگر پاش تنقید سے پھر اسی بے رخی کا برتاؤ کیا جس کی وہ سزاوار تھی، اور اپنے سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ وہ اللہ صرف تمہاری حکومت کے دائرہ میں بسنے والوں ہی کا پروردگار نہیں۔ بلکہ ساری دنیا میں بسنے والی مخلوق کا رب ہے۔

قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَیْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (۲۶/۲۸)

(موسیٰؑ نے اُس کے ہفوات پر پھر کوئی توجہ نہیں دی، اور اپنے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے)

کہا کہ وہ خدا مشرق و مغرب، اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا پرورش کرنے والا ہے۔ اگر تم ذرا بھی عقل و خرد سے کام لو تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔

تخویف کا اوچھا حربہ

فرعون یہ کچھ سنتا جا رہا تھا اور غم و غصہ سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اب جو اس نے دیکھا کہ اس کے دعوائے ربوبیت کی یوں پے در پے دھجیاں بکھری جا رہی ہیں۔ اور وہ بھی اس کے ارکین سلطنت کے سامنے۔ تو کھسیانہ ہو کر، اس حربہ پر اتر آیا جو مستبد قوتوں کے پاس آخری "دلیل" ہوتا ہے۔ کہا

قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَیْرِیْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِیْنَ ۝ (۲۶/۲۹)

(اب فرعون سے نہ رہا گیا۔ اس نے طیش میں آکر موسیٰؑ سے کہا کہ اپنی زبان بند کرو، اور کان کھول کر سن لو کہ) اگر تم نے (میری مملکت میں رہتے ہوئے) میرے سوا کسی کو صاحب اقتدار تسلیم کیا (خواہ وہ تمہارا خدا ہی کیوں نہ ہو، تو یہ کھلی ہوئی بغاوت ہوگی جس کی پاداش میں) تمہیں جیل بھجوا دوں گا۔ (۲۶/۲۹)

دیکھئے! سیاستِ فرعونی اور حکمتِ کلیمی کی تفاصیل کس طرح اس مختصر مکالمہ کے اندر جھلمل جھلمل کر رہی ہیں دنیا میں فرعونی قوتیں، انسانوں سے اپنی "معبودیت" تسلیم کرانا چاہتی ہیں اپنے مزعومہ دعوائے "ربوبیت" کی بنا پر اور حکمتِ کلیمی ان کے دعوائے ربوبیت کی حقیقت کو بے نقاب کر کے ان کی "معبودیت" کے زعم باطل کو مٹی میں ملا دیتی ہے۔ شروع سے آج تک دنیا میں یہی کشمکش جاری ہے۔ اور جاری رہے گی۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز　　چراغ مصطفویؐ سے شرار بولہبی

سلسلۂ صید و صیّاد

یوں تو دنیا میں ہر شکار میں لذت ہوتی ہے لیکن یہ لذت اپنی انتہا تک اس وقت پہنچتی ہے جب ایک انسان کا شکار دوسرا انسان ہو۔ یہ وہ لہو ہے جو منہ سے لگے نہیں چھوٹتا۔ تاریخ نوعِ انسانی پر غور کیجیئے تو یہ اسی سلسلۂ صید و صیاد کی خونچکان داستان نظر آئے گی۔ قومِ بنی اسرائیل، مصریوں کے پنجۂ آہنی میں بے بس شکار کی طرح تڑپ رہی تھی۔ حضرت موسیٰؑ کا مطالبہ اس کے سوا کیا تھا کہ اس مظلوم شکار کو چھوڑ دو اور اجازت دو کہ میں انہیں ساتھ لے کر چلا جاؤں جہاں یہ آزادی کی فضائے بسیط میں اطمینان کا سانس لے سکیں۔ بنظرِ معقولیت (یعنی بنگاہِ انسانیت) دیکھئے تو اس پر اہلِ فرعون کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے تھا، لیکن اگر وہ بنی اسرائیل کو ملک سے نکل جانے کی اجازت دے دیتے تو پھر اپنی ہوسِ حکمرانی کی تشنگی کس طرح بجھاتے؟ مستبد قوتیں، صرف اپنے معاملات کی درستی کے لئے اپنی حکومت قائم نہیں کرتیں۔ انہیں اپنے جذبۂ حکومت کی تسکین کے لئے کسی دوسری قوم کی بھی ضرورت ہوتی ہے جن کے خون کی رنگینی ان کے قصرِ دولت کی آرائش و زیبائش کے کام آسکے۔ اس لئے اس قسم کی مستبد قوتیں کبھی اجازت نہیں دے سکتیں کہ محکوم قوم ان کے نظامِ حکومت سے نکل جائے۔ اس لئے کہ اس سے وہ محکوم قوم برابری کے درجہ پر آجاتی ہے۔ محکوم نہیں رہتی۔ اور جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے

فرعون کی حیلہ کاریاں

مستبد قوم کی حکومت کے لئے، کسی محکوم قوم کا وجود ضروری ہوتا ہے جسے وہ مختلف حیلوں اور حربوں سے دبائے رکھے۔ یہی کچھ فرعون نے کر رکھا تھا۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِى الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْىٖ نِسَآءَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ○ (۲۸/۴)

واقعہ یہ تھا کہ فرعون نے اپنی مملکت میں بڑی سرکشی اختیار کر رکھی تھی۔ اس نے اپنی قوت کو مستحکم رکھنے کے لئے ملک کے باشندوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر رکھا تھا، اور ان میں سے ایک پارٹی (بنی اسرائیل) کو کمزور سے کمزور تر کرتا چلا جاتا تھا۔ اس کے لئے اُس کی پالیسی یہ تھی کہ وہ اس قوم کے ان افراد کو جن میں اسے جوہرِ مردانگی نظر آتے، ذلیل و خوار کر کے غیر مؤثر بنا دیتا اور جو ان جوہروں سے عاری ہوتے، اُنہیں ابھارتا اور آگے بڑھاتا رہتا۔ اس طرح وہ اس قوم کے اندر ناہمواریاں پیدا کر کے، اُن کی قوت کو توڑتا چلا جاتا (۲/۴۹ ; ۷/۱۴۱ ; ۴۰/۲۵)۔

اس آیۂ جلیلہ کے غوامض پر غور کیجیئے۔ مفسد اربابِ حکومت کی دسیسہ کاریوں کی طولانی فہرست چند لفظوں میں

دسیسہ کاریاں اور گروہ سازیاں

سمٹ کر آگئی ہے۔ گروہ سازی اور پارٹی بندی، وہ بنیادی حربہ ہے جس پر ابلیسی نظام کے قیام کا دارومدار ہوتا ہے۔ (جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا) اور ان میں سے ایک جماعت کو کمزور رکھنے کی ہر ممکن کوشش تاکہ وہ ابھرنے نہ پائے۔ ان میں سے جو لوگ ایسے نظر آئیں جن میں جرأت و حریت کے جوہر ہوں انہیں ذلیل و خوار کیا جائے اور جو لوگ ان صفات سے عاری ہوں انہیں معزز و مقرب بنادیا جائے۔ اس طرح اس محکوم قوم پر احسان بھی رکھا جائے کہ اس سے کس قدر فیاضانہ سلوک کیا جاتا ہے اور انہیں دبائے بھی رکھا جائے۔ یہ ہے وہ فسادِ آدمیت جو ہر فرعونی نظامِ حکومت کا خاصہ ہوتا ہے (اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ) اور اسی فساد کو مٹانے کے لئے ضربِ کلیمی اور حزب اللہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ غور کیجئے! کہنے کو تو یہ آج سے تین چار ہزار سال پہلے کی ایک قوم کی داستان ہے۔ لیکن درحقیقت یہ وہ ابدی حقائق ہیں جو کبھی پرانے نہیں ہوا کرتے۔ یہ حقیقت آج بھی اسی طرح تازہ اور زندہ ہے جس طرح آج سے چار ہزار سال پہلے تھی۔ قرآن، حقائق سے بحث کرتا ہے جو فطرت کے اٹل قوانین کی طرح غیر متبدل ہوتے ہیں۔ طاغوتی سیاست کی جن مُہرہ بازیوں کا اوپر ذکر ہوا ہے وہ کسی خاص قوم، خاص ملک اور خاص زمانہ سے متعلق نہیں۔ ابلیس شروع سے آدم کے ساتھ ہے اور ساتھ ہی رہے گا۔ وَفِيْهَا اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ۔

مطالبات

یہ تھے وہ حالات جن میں، حضرت موسیٰؑ نے یہ مطالبہ پیش کیا تھا کہ بنی اسرائیل کو ملک چھوڑ دینے کی اجازت دیدی جائے۔ یہ مطالبہ، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، ایسا نہیں تھا جسے باآسانی تسلیم کر لیا جاتا۔ اس کی مخالفت میں تو ہر ممکن قوت صرف ہو جانی چاہیئے تھی۔ اور ایسا ہی ہوا۔

پھر حضرت موسیٰؑ کا دوسرا مطالبہ، کہ خدائے واحد کی محکومیت اختیار کرو، فرعون کے نزدیک پہلے سے بھی زیادہ سخت تھا۔ جس روش پر آباؤ اجداد کے وقت سے چلے آ رہے ہیں، اس کا چھوڑ دینا! جس حکومت اور "شانِ خداوندی" کو اسلاف سے ورثہ میں حاصل کیا ہے اسے تیاگ دینا!! جس نشۂ قوت و ثروت میں صدیوں سے بدمست چلے آ رہے ہیں اسے ترک کر دینا!!! کچھ آسان نہ تھا۔ اس کے لئے بڑے محکم ایمان کی ضرورت تھی۔ قومِ فرعون بھلا اسے کس طرح آسانی سے قبول کر لیتی؟ اگر ایسے مطالبات اتنی آسانی سے قبول کو لئے جایا کرتے تو دنیا میں باطل شکن بازوؤں کی ضرورت ہی کیوں پڑتی؟

قومِ فرعون سے ان مطالبات کی مخالفت اور سخت مخالفت غیر متوقع نہ تھی۔ لیکن مشیّت کو یہ منظور تھا کہ جس

مظلوم قوم کو اس درجہ کمزور و ناتوان بنا دیا گیا ہے اسے دنیا میں سرفرازی عطا کرے۔ (کیونکہ ان میں ہنوز اس سرفرازی کی صلاحیت باقی تھی)۔

وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ۝ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُمْ مَا كَانُوا يَحْذَرُونَ ۝ (۲۸/۵-۶)

چنانچہ اس کی سرکشی اور فساد انگیزی کے پیش نظر ہمارے قانونِ مکافات کا فیصلہ یہ تھا کہ جس قوم کو وہ اس قدر کمزور کئے جا رہا تھا، اُسے ہماری نعمتوں سے نوازا جائے۔ یعنی اُنہیں ملک کی سرداری عطا کر دی جائے اور ایک خطۂ زمین کا مالک بنا دیا جائے۔

جہاں اُن کی اپنی حکومت ہو، اور فرعون اور اس کے مذہبی پیشواؤں کے سردار (ہامان) اور اُن کے سب لاؤ لشکر کو وہ کچھ دکھایا جائے جسے دیکھنے سے وہ اس قدر خائف تھے، اور جس سے بچنے کیلئے وہ اس قدر محکم تدابیر اختیار کیا کرتے تھے ـــــــ یعنی اُن کی تباہی اور بربادی۔

خدا کا احسان کیا ہوتا ہے؟

دوسری آیت کے آخری الفاظ پر غور کیجئے۔ اہل فرعون کو یہی خوف تھا کہ بنی اسرائیل کسی دن اُبھر کر سامنے نہ آجائیں۔ اسی لئے وہ انہیں کچلنے کی مختلف تدابیر اختیار کرتے رہتے تھے۔ لیکن مشیّت خداوندی نے یہ اعلان کر دیا کہ بالآخر وہی ہو کر رہے گا جس سے وہ یوں لرزاں تھے۔ بنی اسرائیل اُبھرے اور فلسطین اور اس کے گرد و نواح کی زمینوں پر (جو اس زمانہ میں حکومت مصر کی باجگذار ریاستیں تھیں) قابض ہو گئے۔ یہ تھا کمزوروں پر اللہ کا احسان۔

لیکن کیا یہ احسان یونہی بیٹھے بٹھائے سایہ فگن ہو گیا تھا؟ اس کے جواب کے لئے ابھی چند صفحات کا اور انتظار کیجئے۔ جب وہ ٹکڑا سامنے آئے گا تو اس وقت معلوم ہو گا کہ یہ احسان کن جاں گداز اور صبر آزما مراحل سے گزرنے کے بعد وجۂ سرفرازی ہوا تھا۔

دعوت موسوی کا استقبال

بہرحال، یہ تھا حضرت موسیٰؑ کا وہ مطالبہ اور یہ تھی ان کی وہ دعوت۔ اب دیکھیئے کہ اس دعوت کا استقبال کس طرح سے ہوا۔ فرعون نے کہا کہ تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ تم اللہ کی طرف سے رسولؑ ہو اور اس مقصد کے لئے مامور کئے گئے ہو کہ بنی اسرائیل

کو یہاں سے آزاد کر کے لے جاؤ۔ لیکن اس کا ثبوت کیا ہے کہ تم واقعی مامور من اللہ ہو!

۷/۱۰۶ قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○

فرعون نے کہا کہ اگر تم خدا کی طرف سے کوئی واضح دلیل لائے ہو، تو اسے اپنے دعوے کی صداقت میں پیش کرو۔

اس کے جواب میں

۷/۱۰۸-۱۰۷ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ○ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ○ ع (۷/۱۰۸-۱۰۷)

اس پر موسیٰؑ نے اُن قوانین و دلائل کو پیش کیا جن کی بنا پر اُس نے وہ دعویٰ کیا تھا اور جنہیں وہ نہایت مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا۔ یہ محکم دلائل، اپنی صداقت کے زورِ دروں پر، اس طرح آگے بڑھتے چلے جاتے تھے کہ ان کی قوّت اور شدّت واضح طور پر سامنے آ رہی تھی[1] (ان کی شدت سے مراد یہ تھی کہ ان کی خلاف ورزی کا نتیجہ کس قدر ہلاکت انگیز ہو گا۔

پھر وہ اُن روشن دلیلوں کو سامنے لایا جن کی رُو سے بتایا گیا تھا کہ ان قوانین کی اطاعت سے زندگی کا ہر گوشہ کس طرح تابناک ہو جائے گا۔ یہ بصیرت افروز دلائل ہر دیدۂ بینا کے لئے چراغِ راہ بن سکتے تھے۔ (۲۰/۲۱-۱۷؛ ۲۶/۳۳-۳۲؛ و ۲۸/۳۲)

جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے یہ ان الفاظ کا مجازی مفہوم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے ان قوانین و دلائل کو پیش کیا جس کے سہارے انہوں نے یہ دعویٰ کیا تھا اور جسے وہ نہایت مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ان قوانین سے سرکشی کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہو گا۔ یہ دلائل و براہین اپنے زورِ دروں سے اس طرح آگے بڑھتے چلے جاتے تھے کہ ان کی قوّت و شدّت واضح طور پر سامنے آتی چلی جاتی تھی۔ اس کے بعد وہ ان براہین کو سامنے لائے جن میں بتایا گیا تھا کہ قوانینِ خداوندی پر عمل کرنے کا نتیجہ کس قدر خوشگوار و تابناک ہو گا

---

[1] یہ ان الفاظ (عصا۔ ثعبان مبین۔ ید بیضا) کے مجازی معنی ہیں جنہیں، ہمارے نزدیک، استعارۃً استعمال کیا گیا ہے۔ (اس کی سند لغات القرآن میں اپنے اپنے مقام پر ملے گی)۔ ویسے عصا کے حقیقی معنی لاٹھی۔ ثعبانِ مبین کے معنی نمایاں اژدھا۔ اور ید بیضا کے معنی سفید چمکیلا ہاتھ ہیں۔

ان دلائل کی درخشندگی و تابناکی ہر دیدہ بینا کو نظر آتی چلی جارہی تھی۔

ارباب حکومت نے جب یہ سب کچھ دیکھا تو آپس میں کہنے لگے۔

(۱۰۹-۱۱۰) قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ۙ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ۝ (۱۰۹-۱۱۰)

اس پر فرعون کے سرداران قوم نے ایک دوسرے سے کہا، یہ تو بڑا ماہر سحرکار نظر آتا ہے (جو اپنے زور بیان سے جھوٹ کو سچ بنا کر دکھاتا چلا جارہا ہے[۱])

اس کا منشاء یہ نظر آتا ہے کہ (اس طرح لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر) تمہیں اس ملک سے نکال باہر کرے۔ اور یہاں اپنی حکومت قائم کرے۔ سو کہو کہ تمہارا اس باب میں مشورہ کیا ہے؟ (۲۶/۳۵)

اس کے بعد انہوں نے فرعون سے کہا۔

(۱۱۱-۱۱۲) قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِى الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ۙ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ۝

انہوں نے (باہمی مشورہ کے بعد) فرعون سے کہا کہ تم موسیٰؑ اور اس کے بھائی کے معاملہ کو تو سردست التوا میں رکھو، اور اس اثنا میں نقیبوں کو ملک کے بڑے بڑے شہروں میں بھیجو کہ وہاں سے سحرکار مذہبی پیشواؤں کو اکٹھا کر کے لائیں (تاکہ وہ ان کا مقابلہ کر کے انہیں شکست دے سکیں)۔

اس مقام پر ذرا رکئے اور مذہبی پیشواؤں کی ذہنیت پر غور کیجئے۔ فرعون نے انہیں بلایا تھا کہ وہ (حضرت) موسیٰؑ کے دعاوی کے مقابلہ میں اپنے معتقدات اور مسلک کی حقانیت کو ثابت کریں۔ یہ ان کا مذہبی فریضہ بھی تھا اور اپنے آپ کو برسرِ حق ثابت کرنے کے جذبہ کا تقاضا بھی۔ اس لئے انہیں نہایت جوش و خروش سے آگے بڑھنا چاہیئے تھا۔ لیکن وہ فرعون سے اس طرح معاملہ بازی کرتے ہیں گویا وہ اس کا کوئی کام کرنے کے لئے آئے ہیں۔ اس لئے وہ پہلے طے کر لینا چاہتے ہیں کہ اس کام کی انہیں اجرت کیا ملے گی؟ مذہبی پیشوائیت میں ہوتا ہی یہ ہے۔ ان کا ذریعۂ معاش مذہب ہوتا ہے اس لئے وہ ہر مذہبی فریضہ کی ادائیگی کا معاوضہ لیتے ہیں ——— ، اذان دینے کا معاوضہ خطبہ دینے کا معاوضہ۔ نماز پڑھانے کا معاوضہ۔ نکاح پڑھانے کا معاوضہ۔ حج کے مناسک ادا کرانے کا معاوضہ۔

---

[۱] سحر کے معنی جھوٹ اور فریب کے بھی ہیں۔

وقس علیٰ ہذا۔ جہاں جہاں مذہبی پیشوائیت ہے، وہاں یہی کچھ ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے اسی لئے ان (مذہبی پیشواؤں) کے متعلق کہا ہے کہ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ (۹/۳۴) اِن علماء و مشائخ کی حالت یہ ہے کہ یہ لوگوں کا مال غلط طریق سے کھاجاتے ہیں۔ یہ خود کچھ کمائی نہیں کرتے اور لوگوں کی محنت کی کمائی پر پلتے ہیں۔ ان سادہ لوحوں سے کہتے یہ ہیں کہ ہم تمہاری راہ نمائی خدا کی طرف لے جانے والے راستے کی طرف کرتے ہیں، لیکن درحقیقت خدا کی طرف لے جانے والے راستے میں سب سے بڑی روک یہی لوگ ہوتے ہیں۔ اس بنا پر قرآن کریم نے مذہبی پیشوائیت (PRISTHOOD) کے اجارہ ہی کو ختم کر دیا۔ قرآنی نظام میں ان کا تصور تک باقی نہیں رہتا۔ اسی لئے ان کی انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ وہ نظام قائم نہ ہونے پائے۔

یہی کچھ آج سے چار پانچ ہزار سال پہلے ہوتا تھا۔ یہی کچھ آج ہو رہا ہے۔

بات یہاں تک ہوئی تھی کہ فرعون کے اہل دربار نے اس سے کہا کہ (حضرت موسیٰؑ سے نپٹنا ہمارے آپ کے بس کی بات نہیں۔ اسے مذہبی پیشواؤں سے بھڑا دیجئے۔ عوام مذہب پرست واقع ہوتے ہیں، یہ (مذہبی پیشوا) انکے جذبات کو بھڑکا دیں گے تو "عوامی تحریک" اسے (حضرت موسیٰؑ کو) سیلاب کی طرح بہا کر لے جائے گی۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ اس کا ذکر ذرا آگے چل کر آئے گا۔ اس مقام پر ہم فقط اتنا دیکھیں گے کہ فرعون اور اسکی قوم کی طرف سے اس دعوت کا استقبال کسطرح ہوا۔ قرآن کریم مختلف مقامات پر اس گوشہ کے متنوع پہلوؤں کو سامنے لایا ہے۔ سورۂ اعراف کی متعلقہ آیات اوپر گزر چکی ہیں۔ سورۂ یونس میں ہے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْۤا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ (۱۰/۷۶)

چنانچہ جب ان کے سامنے ہمارا وہ پیغام پیش کیا گیا جو سرتاسر حق و صداقت پر مبنی تھا، تو انہوں نے یہ کہکر اس سے انکار کر دیا، کہ یہ کھلا ہوا جھوٹ اور باطل ہے۔

اس کا جواب حضرت موسیٰؑ کی طرف سے کیا ملا؟ فرمایا۔

قَالَ مُوْسٰۤى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ۝ (۱۰/۷۷)

موسیٰؑ نے ان سے کہا کہ کیا تم اس حق کے متعلق جو تمہارے سامنے اس طرح پیش کیا جا رہا ہے، یہ کہتے ہو کہ وہ جھوٹ اور باطل ہے۔ یاد رکھو! جن لوگوں کے دعوے جھوٹ اور باطل پر مبنی ہوتے ہیں، وہ کبھی

کامیابی کا منہ نہیں دیکھا کرتے۔ (اور تم دیکھ لو گے کہ میں اپنے مشن میں کس طرح کامیاب ہوتا ہوں۔)

اسلاف پرستی

اس بصیرت افروز دلیل کا جواب کیا ہو سکتا تھا؟ لیکن وہ، بجائے اس کے کہ حقیقت کو تسلیم کر لیتے، علم و عقل کی راہ چھوڑ کر، فوراً اس روش کی طرف آ گئے جسے ہم امم سابقہ کے تذکرہ میں دیکھ آئے ہیں۔ یعنی اسلاف پرستی کا اندھا جذبہ!

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ○ (۱۰/۷۸)

(جو قانونِ خداوندی موسیٰؑ نے پیش کیا تھا، وہ لوگ، علم و براہین کی بنا پر تو اس کی تردید کر نہیں سکتے تھے، اس لئے انہوں نے وہی روش اختیار کی جو باطل پرستوں کے ہاں شروع سے چلی آ رہی ہے)۔ انہوں نے کہا کہ کیا تم ہمارے پاس اس لئے آئے ہو کہ ہمیں اس مسلک سے برگشتہ کر دو جو ہمارے آباء و اجداد سے متوارث چلا آ رہا ہے؟ اور اس طرح ہمارے اقتدار کو ختم کر کے، مملکت کا اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لو! (ہم تمہاری چالوں کو خوب سمجھتے ہیں، اس لئے) ہم تمہاری کوئی بات ماننے کے نہیں۔

اسلاف پرستی کی عقیدت اور قوت و حکومت کا نشہ، انہیں کس طرح چھوڑا جا سکتا تھا؟

سورۂ بنی اسرائیل میں ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ○ (۱۷/۱۰۱)

ہم نے موسیٰؑ کو (قومِ فرعون کی آخری تباہی سے پہلے) نو کھلی کھلی نشانیاں دی تھیں۔ (اے رسولؐ! تم اپنی قومِ مخاطب سے کہو کہ اگر یہ اس کی تصدیق کرنا چاہتے ہیں تو) بنی اسرائیل سے دریافت کر لیں کہ ایسا ہوا تھا یا نہیں۔ (۷/۱۳۲-۱۳۰ و ۲۷/۱۲) ۔ ہوا یہ تھا کہ جب موسیٰؑ قومِ فرعون کی طرف آیا تو فرعون نے سب کچھ سننے کے بعد، اس سے کہا کہ (تم جو کہتے ہو کہ تم خدا کی طرف سے رسول ہو، تو اس باب میں یا تو تمہیں خود دھوکہ لگ گیا ہے۔ یا) تم دوسروں کو دھوکا دیتے ہو۔ (۱۷/۱۰۱)

(ان نشانیوں کا ذکر آگے چل کر آئے گا) دوسری جگہ ہے۔

فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ○ (۵۱/۳۹)

فرعون نے، اپنی قوت کے زعم میں، ان قوانین سے روگردانی کی، اور موسیٰؑ کے متعلق کہا کہ وہ یا تو بڑا

چالاک اور جھوٹا ہے، اور یا پاگل ہو گیا ہے۔

سچ ہے! قوت کے نشہ میں، عقل و ہوش کی باتیں ایسی ہی نظر آیا کرتی ہیں۔ جیسے رنگین چشمہ سے ہر شے رنگ دار نظر آتی ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے فرمایا۔

قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ ۚ وَاِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ۝ (۱۷/۱۰۲)

موسیٰؑ نے اس سے کہا کہ تو (یقیناً اپنے دل میں اس حقیقت کو پا چکا ہے کہ) یہ روشن دلائل، یہ قوانین و ضوابط، جنہیں میں نے تمہارے سامنے پیش کیا ہے، مجھ پر خدائے ارض و سمٰوٰت کے سوا کسی نے نازل نہیں کئے۔ (تم میرے متعلق کہتے ہو کہ مجھے دھوکا لگ گیا ہے) لیکن میں دیکھتا ہوں کہ دھوکے میں تم خود مبتلا ہو کہ تباہی تمہارے سر پر منڈلا رہی ہے، تم اس میں چاروں طرف سے گھر چکے ہو، (اور وہ تمہیں نظر نہیں آتی)۔

کس طرح لگی لپٹی رکھے بغیر کہہ دیا کہ تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی سے نظر آرہا ہے کہ تمہاری ہلاکت کے دن قریب آچکے ہیں۔ غور کیجئے! یہ اس مستبد بادشاہ سے کہا جا رہا ہے جس کے نام کی نسبت سے دنیا میں سرکشی و عدوان متعارف ہے۔ یعنی فرعونیت، رعونت اور تکبر کی شدید ترین صورت کا نام بن چکی ہے۔ لیکن جو مردِ خدا صرف قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کے عواقب سے ڈرنے والا ہو، اس کے سینے میں کسی اور کا ڈر کیسے آسکتا ہے؟ بقول علامہ اقبالؒ، خوف تو شرک سے پیدا ہوتا ہے۔

ہر کہ رمزِ مصطفیٰؐ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ نے نہایت مسکت دلائل سے واضح کر دیا کہ وہ کس خدا کے فرستادہ ہیں تو فرعون نے کہا

قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ۝ (۲۰/۵۷)

اُس نے موسیٰؑ سے کہا کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ اپنے باطل مذہب اور نگاہ فریب دلائل کے زور سے، ہمیں ہماری مملکت سے نکال باہر کرے؟

سورۂ مومنین میں، سردارانِ حکومت کی طرف سے ایک ایسا جواب منقول ہوا ہے جو حقائق و معارف کی ایک دنیا اپنے اندر رکھتا ہے

فَقَالُوٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ۝ (۲۳/۴۷)

اُنہوں نے (بجائے اس کے کہ جو کچھ اُن کے سامنے پیش کیا گیا تھا، اس پر غور کرتے) کہا کہ کیا ہم اُن کی بات مان لیں جو انسان ہونے کے اعتبار سے ہمارے ہی جیسے ہیں۔ (فوق البشر نہیں)۔ اور جہاں تک رتبہ اور درجہ کا تعلق ہے، وہ اُس قوم کے افراد ہیں جو ہماری محکوم ہے۔ (محکوم قوم کے پاس عقل و بصیرت کہاں ہوسکتی ہے؟ اور پھر انہیں یہ جرأت کیسے ہوگئی کہ اپنی حاکم قوم کو آکر سبق پڑھانے لگیں! یہ ہمارے لئے سخت باعثِ ذلت ہوگا اگر ہم اُن کی بات مان لیں)۔

رسولوں کی بشریت پر اعتراض

پہلے حصہ میں ہے کہ کیا ہم ان پر ایمان لے آئیں جو ہماری ہی طرح کے دو انسان ہیں! یہ وہ اعتراض ہے جو اس سے پیشتر بھی ہم سنتے چلے آئے ہیں یعنی انسانوں کی اعجوبہ پسند طبیعت اسے باور کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتی کہ اپنی جیسا ایک انسان خدا کا رسول ہوسکتا ہے! یہی وجہ ہے جو تمام اقوام و ملل نے اپنے اپنے "بانیان مذاہب" کو انسانیت کے مقام سے اٹھا کر، الوہیت کے درجہ تک پہنچا دیا اور پھر ان کی طرف ایسے ایسے "طلسم ہوش رُبا" کے سے افسانے منسوب کر دیئے جنہیں سُن کر انسان جادو کے جزیروں میں پہنچ جائے۔ یہی اعتراض قوم فرعون نے کیا۔

محکوم کی بصیرت

لیکن اس اعتراض کا دوسرا حصہ اور بھی زیادہ غور طلب ہے۔ انہوں نے کہا کہ کیا ہم ان کی بات مان لیں جو اُس قوم کے فرد ہیں جو خود ہماری محکوم ہے۔ غور کیجئے، حاکم قوم کی نفسیاتی کیفیت کو چند سادہ الفاظ میں کس قدر وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے۔ دنیا میں، حاکم قوم کے نزدیک، محکوم قوم کی کوئی بات درخورِ اعتنا نہیں سمجھی جاتی۔ قوم غالب کی ہر ادا میں ایک شانِ محبوبیت ہوتی ہے جسے مغلوب قوم بلا سوچے سمجھے اختیار کئے جاتی ہے اور رفتہ رفتہ وہی اس قوم کا تمدّن اور اس کی تہذیب بن جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اس محکوم قوم کے خیالات، نظریات و معتقدات بھی وہی کچھ ہو جاتے ہیں جو حاکم قوم کے نزدیک قابلِ ستائش ہوں۔ وہ دیکھتی ہے تو اُن کی آنکھوں سے، سنتی ہے تو اُن کے کانوں سے اور سوچتی ہے تو ان کے دماغ سے لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا (۱۷۹/۷)۔ "دل ہیں لیکن ان سے سوچنے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں ہیں لیکن ان سے دیکھنے

نہیں۔ کان ہیں مگر سنتے نہیں اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ط ۝ (۷ / ۱۷۹) "یہ (انسان نہیں) حیوان ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔" اس لئے کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝ (۷ / ۱۷۹) "یہ لوگ (اپنے مقام سے) بے خبر ہیں۔"

لیکن ان کے برعکس قوم غالب کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ یہ بات ان کے حیطۂ تصوّر میں بھی نہیں آسکتی کہ محکوم قوم کے ہاں بھی کوئی معقول بات ہوسکتی ہے! اور سچ پوچھئے تو وہ ایسا سمجھنے میں چنداں مورد الزام بھی نہیں قرار پاسکتے "درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔" بھوکا اگر یہ دعویٰ کرے کہ میرے پاس دنیا بھر کے افلاس اور محتاجی کا حتمی علاج موجود ہے تو اسے کون ہوشمند صحیح تسلیم کرے گا؟ اس لئے جو قوم عملاً غلام ہو، اس کی بات پر اعتماد کون کرسکتا ہے۔ بقول حکیم الامت ؒ ؎

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی	جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا
بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر	کہ دنیا میں فقط مردانِ حر کی آنکھ ہے بینا

آج کا مُسلمان آئینہ کے سامنے

آج مسلمان حیران ہے کہ اسلام جب ایک حقیقتِ ثابتہ ہے تو اسے دنیا بے غل و غش قبول کیوں نہیں کرلیتی۔ لیکن یہ کہتے وقت وہ کبھی نہیں سوچتا کہ دنیا، اسلام کو اس کے پیش کرنے والوں کی حالت سے جانچتی ہے۔ جن پیش کرنیوالوں کی حالت یہ ہو (جو ہماری آج ہے) تو ان کی بات سُننا کون پسند کرے گا، وہ جہاں بھی جائیں گے یہی جواب پائیں گے کہ اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ کیا ان کی بات پر ایمان لے آئیں جو دنیا میں انسان کہلانے کے بھی مستحق نہیں! اگر اس نسخۂ کیمیا میں ایسا ہی حیات بخش اثر ہے جیسا بتاتے ہیں تو ان کی اپنی حالت ایسی ناگفتہ بہ کیوں ہو رہی ہے؟ یہ ایک ایسا اعتراض ہے جس کا کوئی جواب بن نہیں پڑسکتا۔ اسلام کو پیش کرنے کا حق اس قوم کو حاصل ہے جس کی اپنی حالت اسلام کے درخشندہ نتائج کی زندہ دلیل ہو۔ نہ کہ ان بھکاریوں کا جو اپنی روٹی تک کے لئے بھی دوسروں کے رحم و کرم کے محتاج ہوں۔ انہیں تو اپنے آپ کو اسلام کے ساتھ منسوب کرنے سے بھی شرم آنی چاہیئے کہ ان کی وجہ سے دنیا میں اسلام جیسا مہر عالمتاب، گہن میں آرہا ہے۔ علامہ اقبال ؒ نے سچ کہا ہے کہ

تا نداری از محمد ﷺ رنگ و بو

از درود خود میالا نام او

کس قدر الم انگیز ہے یہ حقیقت جسے زبان و قلم کے بجائے خون کے آنسوؤں ہی سے بیان کیا جاسکتا ہے؟

احسانات کی یاددہانی

پھر لوٹیئے اصل قصّہ کی طرف! سورۂ شعراء میں اس واقعہ کے ضمن میں ایک اور ایسی بات آگئی ہے جو دنیا میں سیاست فرعونی کی اہم حقیقت اپنے آغوش میں لئے ہے۔ جب حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے کی اجازت دے دی جائے تو فرعون نے کہا کہ "موسیٰ! تو، اور اس قسم کی بغاوت کی باتیں! حالانکہ تجھے یاد ہونا چاہیئے کہ ہم نے کس ناز و نعمت سے تیری پرورش کی۔ اور پھر تو یہاں سے کتنا بڑا جرم کر کے بھاگا تھا لیکن ہم نے اس پر بھی تجھ سے کوئی مواخذہ نہیں کیا۔ تو بڑا ہی احسان فراموش واقع ہوا ہے"۔

قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ۝ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (۲۶ / ۱۹–۱۸)

فرعون نے موسیٰؑ سے کہا کہ اے موسیٰؑ! کیا یہ واقعہ نہیں کہ ہم نے بچپن سے اپنے ہاں تمہاری پرورش کی، اور تم نے اپنی عمر کا ایک حصّہ ہمارے ہاں بسر کیا۔ تم ربّ العٰلمین کہتے ہو! تمہاری پرورش تو خود ہم نے کی تھی۔ لیکن تم نے اِن احسانات کا بدلہ یوں دیا کہ خود ہماری ہی قوم کے ایک آدمی کو قتل کر ڈالا —— تم کیسے ناشکرگزار آدمی ہو؟

فرعون کے طعن کا دوسرا حصّہ چونکہ حضرت موسیٰؑ کی طرف ایک جرم کو منسوب کر رہا تھا اس لئے آپ نے پہلے اسی کی طرف توجہ فرمائی اور کہا کہ

قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ[1] ۝ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ (۲۶ / ۲۱–۲۰)

موسیٰؑ نے کہا کہ —— میں نے دانستہ اُسے قتل نہیں کیا تھا۔ میں نے تو اسے محض ایک مکّا مارا تھا مجھے کیا خبر تھی کہ وہ مکّے سے مر ہی جائے گا (۲۸ / ۱۵) —— (۲۶ / ۲۰)

اس کے بعد، میں یہاں سے اس لئے بھاگ گیا تھا کہ (مقتول تمہاری قوم کا آدمی تھا، اس لئے) میں ڈرتا تھا کہ (تم انصاف سے نہیں، بلکہ قومی عصبیت سے کام لوگے، اور میرے خلاف قتلِ عمد کا جُرم عائد کر دو گے)۔

---

[1] ضَآلِّيْن کی تشریح بعد میں آئے گی۔

اِس کے بعد، خدا نے مجھے نبوت سے سرفراز فرمایا۔ مجھے معاملات میں صحیح فیصلے کرنے کی صلاحیت عطا کی۔ اور میرا شمار، خدا کے رسولوںؑ کے زمرہ میں کر دیا۔ (اور اب میں اِسی حیثیت سے تمہارے پاس آیا ہوں۔

"ہاں میں بھاگ گیا تھا! اس لئے نہیں کہ میں واقعی قتلِ عمد کا مرتکب تھا اور اپنے آپ کو اس جرم کا مجرم سمجھتا تھا بلکہ اس لئے کہ تیرے ظلم و ستم اور تیرے اربابِ حکومت کی سازشوں سے ڈرتا تھا کہ ان کے اثر کی وجہ سے، فیصلہ حق و انصاف کی رو سے نہیں بلکہ دیگر رجحانات و مقتضیات کے مطابق ہونا تھا۔ لیکن اس کے بعد جو کچھ مجھے اللہ کی طرف سے عطا ہوا اس سے وہ تمام خوف دور ہو گیا۔ باقی رہا تمہارا یہ کہنا کہ تم لوگوں نے میری پرورش کی تو اس کے جواب میں، میں اس سے زیادہ اور کیا کہوں کہ

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدتَّ بَنِي إِسْرَائِيلَ ۝ ($\frac{26}{22}$)

(باقی رہا تمہارا یہ کہنا کہ تم نے بچپن میں میری پرورش کی اور محلات میں ناز و نعمت سے پالا۔ تو) تم اپنے اِن احسانات کا بدلہ یہ چاہتے ہو کہ پوری کی پوری قوم بنی اسرائیل کو اپنی محکومی کے شکنجے میں جکڑے رکھو! (تم نے ایک فرد پر جو احسانات کئے ہیں، اُنہیں تو جتاتے ہو، لیکن اُس کی پوری قوم پر جو مظالم کر رہے ہو، ان کا ذکر کیوں نہیں کرتے؟)

غور فرمائیے: حضرت موسیٰؑ نے کیسی حقیقت کشا بات کہی ہے؟ مستبد حکومت کا سب سے بڑا حربہ یہ ہوتا ہے کہ محکوم قوم کے چند ایک ممتاز افراد کو نوازتی رہتی ہے تاکہ وہ اس کے خلاف لب کشائی نہ کر سکیں اور پھر ان کی ساری قوم کو محکومی کے شکنجے میں کسے رکھتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ جس احسان کی طرف تم اشارہ کر رہے ہو اس کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ تم نے قوم بنی اسرائیل کے ایک فرد کی پرورش کی اور اس کی قیمت اتنی وصول کر رہے ہو کہ ساری کی ساری قوم کو اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے؟ کیا اسی کا نام احسان ہے؟

فرعون نے جب تمام باتیں سنیں تو بھانپ گیا کہ حضرت موسیٰؑ انقلابات کی کتنی دنیائیں اپنے ساتھ لائے ہیں۔ کہا کہ میں نے یہ سب کچھ سن لیا! یاد رکھو۔

قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ إِلَٰهًا غَيْرِي لَأَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُونِينَ ۝ ($\frac{26}{29}$)

ل؎ اس سے لفظ اِلٰہ کے معانی کس قدر واضح ہیں۔ یعنی صاحبِ اقتدار۔ حاکم۔ نہ کہ وہ جس کی پرستش کی جائے۔ (اس کی وضاحت سابقہ جلدوں میں کی جا چکی ہے)۔

(اب فرعون سے نہ رہا گیا۔ اس نے طیش میں آکر موسیٰؑ سے کہا کہ اپنی زبان بند کرو اور کان کھول کر سُن لو کہ) اگر تم نے (میری مملکت میں رہتے ہوئے) میرے سوا کسی اور کو صاحب اقتدار تسلیم کیا (خواہ وہ تمہارا خدا ہی کیوں نہ ہو، تو یہ کھلی ہوئی بغاوت ہوگی، جس کی پاداش میں) تمہیں جیل بھجوا دونگا۔

حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ اگر میرے پاس، میرے دعوے کے ثبوت میں واضح دلائل موجود ہوں تو کیا تو پھر بھی اسی طرح اپنی ضد پر قائم رہے گا؟

قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ ۝ (۲۶/۳۰)

موسیٰؑ نے کہا کہ اگر میں اپنے دعوے کی تائید میں کوئی کھلی ہوئی دلیل لے آؤں (تو کیا تم پھر بھی مجھے قید کر دو گے؟ کیا تم معاملہ کو دلائل و براہین کی رُو سے، طے کرنے کے بجائے، دھاندلی سے کام لینا چاہتے ہو؟ کیا تمہارے ہاں استبدادِ فرعونی کے علاوہ اور کوئی قانون نہیں؟)

فرعون نے کہا

قَالَ فَاْتِ بِهٖٓ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (۲۶/۳۱)

(اس جواب سے فرعون کچھ جھینپا اور موسیٰؑ سے) کہا کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو، تو لاؤ میں بھی دیکھوں، وہ کون سی نئی بات ہے جسے تم پیش کرنا چاہتے ہو؟

عصا اور ید بیضا کے الفاظ پہلے بھی آچکے ہیں جہاں کہا گیا تھا کہ ان الفاظ کے مجازی معانی کی تشریح اس مقام پر کی جائے گی جہاں حضرت موسیٰؑ کے، ساحرین دربار فرعون کے ساتھ مقابلہ کا منظر سامنے آئے گا۔ وہ مقام اب آرہا ہے اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ ان الفاظ کی تشریح کر دی جائے۔

عصا کا مفہوم مطالب الفرقان جلد دوم (صـ۲۴۵) میں بیان کیا جا چکا ہے جہاں بتایا گیا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معانی جمعیت اور ائتلاف کے ہیں یعنی قوت اور محکمیت کے ذرائع اور اسباب۔ اسی جہت سے یہ لفظ جماعت کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور لاٹھی کو بھی اسی لئے عصا کہا جاتا ہے کہ وہ تقویت اور سہارے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ طبعی طور پر تو لاٹھی سہارے کا موجب بنتی ہے لیکن جب یہ لفظ معنوی اعتبار سے مستعمل ہوگا تو اس سے مراد محکم دلائل ہوں گے جو مدعی کے لئے سہارے کا موجب ہونگے۔

الیَد (ہاتھ) کا لفظ متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے، جسطرح ہمارے ہاں "ہاتھ" لفظ۔ یا فارسی میں دست

اور انگریزی میں (HAND) طبیعی طور پر اس کا مطلب پانچ انگلیوں والا پنجہ (ہاتھ) ہوتے ہیں، لیکن مجازی طور پر اس سے مراد ہر قسم کی قوت اور گرفت ہوتی ہے۔

البیاض (بیضاء) کے بنیادی معنی سفیدی کے ہیں لیکن چونکہ عربوں کے ہاں بَیَاضٌ (سفید) افضل ترین رنگ تھا اس لئے وہ جملہ خصائل حمیدہ اور صفات کریمانہ کو بیاض سے تعبیر کرتے تھے۔ چنانچہ جو شخص کسی عیب کے ساتھ آلودہ نہ ہوا سے ابیض الوجہ کہتے تھے۔ اسی لئے اس کے معنی بے داغ کردار اور روشن سیرت لئے جاتے تھے۔ جب یہ لفظ دلائل اور براہین کے لئے آئے گا تو اس سے مراد نہایت محکم، روشن اور درخشندہ دلائل ہونگے جن میں کوئی سقم نہ ہو۔ عربوں کے ہاں اَلْیَدُ الْبَیْضَاءُ روشن اور واضح دلیل کو کہتے تھے (دیکھئے لغات القرآن۔ عنوان (ب۔ی۔ض)۔ یہی اس کے مجازی معانی ہونگے۔

سحر (ساحرین) کے متعلق، مطالب الفرقان جلد دوم۔ میں تفصیلی بحث آچکی ہے۔ اس کے عام معانی تو جادو کے ہیں لیکن اس کا استعمال ہر باطل عقیدہ یا فریب کارانہ مسلک کے لئے ہوتا ہے۔ قدیم مذاہب میں مذہبی پیشوا اپنے تقدس اور مقام الوہیت کو ساحرانہ شعبدہ کاریوں کے بل بوتے پر قائم رکھتے تھے اس لئے ساحرین کا لفظ مذہبی پیشواؤں کے لئے بھی بولا جاتا تھا۔ پھر ان مذہبی پیشواؤں کا، نظم و نسق حکومت میں بھی بڑا عمل دخل ہوتا تھا اس لئے بلند مرتبہ ارباب مذہب اور اعیان حکومت بھی ساحرین کہلاتے تھے۔ فرعون کے ہامان کو دیکھئے۔ وہ صرف مذہبی پیشوا ہی نہیں۔ ان کے جنود (لشکر) بھی ہیں۔ نیز وہ شعبۂ عمارات مملکت کا بھی مقتدر اعلیٰ تھا۔ لہذا جب فرعون نے فیصلہ کیا کہ (حضرت) موسیٰؑ کا مقابلہ ساحرین سے کروایا جائے تو اس سے مراد جادوگروں کے ساتھ مقابلہ نہیں تھا۔ ان بلند پایہ مذہبی پیشواؤں کے ساتھ مقابلہ مقصود تھا جو حیطۂ حکومت میں بھی اعلیٰ مناصب رکھتے تھے۔

اسی سلسلہ میں اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ حضرات انبیا کرامؑ (معاذ اللہ) جادوگر نہیں ہوتے تھے۔ قرآن کریم نے جادو اور جادوگروں کی شدید مذمت کی ہے۔ اسی لئے یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ حضرت موسیٰ اور ساحرین دربار فرعون کے مابین مقابلہ "جادوگری" کا تھا۔ حضرات انبیاء کرامؑ پیغام حق کے داعی ہوتے تھے اور باطل پرستوں سے ان کا مقابلہ ہوتا تھا۔ اس مقابلہ کی بنیاد دلائل و براہین (بینات اور آیات خداوندی) پر ہوتی تھی، اور انہی کی رو سے وہ باطل پرستوں پر غالب آتے تھے۔ یہ حضرات اپنے مخالفین کو چیلنج ہی یہ دیتے تھے هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲۷/۶۴) اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو اس کی تائید میں دلائل پیش کرو۔ بنا بریں حضرت موسیٰؑ اور فرعونی مذہبی پیشواؤں میں مقابلہ حق و باطل کے دعاوی کا تھا جس کی تائید اور تردید

دلائل کی رو سے ہوتی تھی۔ قرآنِ کریم نے اس کے لئے جو الفاظ استعمال کئے ہیں انہیں ان کے مجازی مفہوم میں لیا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ یہ بات تو ایک پیغمبر کے شایانِ شان ہی نہیں کہ وہ اپنی دعوت حقہ کو جادو کے زور سے منوائے وہ تو بلکہ جادو، اور اسی نوعیت کی دیگر توہم پرستیوں کو مٹانے کے لئے آتا تھا۔ دین کی عمارت علم و بصیرت اور دلائل و براہین کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے، نہ کہ طلسمانہ جہالت اور شعبدہ کارانہ فریب کاریوں پر۔ اس سلسلہ میں، مطالب الفرقان کی سابقہ جلدوں میں (انڈکس کے حوالوں کی رو سے) معجزات کا عنوان دیکھئے ——— بالخصوص جلد چہارم میں حضرت عیسیٰؑ کے مبینہ معجزات کا عنوان۔

ان حقائق کی روشنی میں، یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ہم نے ان الفاظ کے مجازی معانی کیوں لئے ہیں۔ بایں ہمہ جو حضرات ان الفاظ کے حقیقی معانی سے مطمئن ہیں، وہ بخوشی وہی معانی اختیار کریں۔ میری ان سے کوئی بحث نہیں۔

سلسلۂ کلام یوں چلا آ رہا تھا کہ فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ تم اپنے دعوے کی تائید میں کوئی دلائل رکھتے ہو تو انہیں پیش کرو۔

فَأَلْقَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِينٌ ۝ وَنَزَعَ يَدَهُ فَإِذَا هِيَ بَيْضَاءُ لِلنَّاظِرِينَ ۝

(۲۶/۳۲-۳۳)

اس پر موسیٰؑ نے وہ قوانین و ضوابط پیش کئے جو اسے خدا سے ملے تھے اور جنہیں وہ نہایت مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا۔ یہ قوانین و ضوابط کیا تھے، گویا ایک اژدھا تھا جو باطل معتقدات کو نگلے جا رہا تھا۔ (ان کی رُو سے بتایا گیا تھا کہ اہلِ فرعون کی غلط روش کا نتیجہ کس قدر تباہ کن ہوگا۔ ۷/۱۰۸-۱۰۷ ؛ ۲۰/۲۵-۱۷ ؛ ۲۸/۳۲-۳۱)

اس کے بعد موسیٰؑ ان براہینِ نیرہ کو سامنے لایا جن کی رُو سے واضح کیا گیا تھا کہ قوانینِ الٰہیہ کی اطاعت سے ان کا مستقبل کس قدر روشن ہو جائے گا۔ ان دلائل کی درخشندگی اور تابناکی ہر دیدۂ بینا کو صاف نظر آ رہی تھی۔

اس پر فرعون نے اراکینِ سلطنت سے کہا

قَالَ لِلْمَلَإِ حَوْلَهُ إِنَّ هَٰذَا لَسَاحِرٌ عَلِيمٌ ۝ يُرِيدُ أَن يُخْرِجَكُم مِّنْ أَرْضِكُم بِسِحْرِهِ فَمَاذَا تَأْمُرُونَ ۝ (۲۶/۳۵-۳۴)

اس پر فرعون نے اپنے اہلِ دربار (سردارانِ قوم) سے کہا، کہ یہ شخص یقیناً ایک ماہر سحر کار ہے جو

جھوٹ کو سچ بنا کر دکھاتا چلا جا رہا ہے۔

اس کا ارادہ یہ نظر آتا ہے کہ یہ اپنی فریب کاریوں سے لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر، یہاں اپنی حکومت قائم کرے اور تمہیں اِس ملک سے نکال باہر کرے۔ سو بتاؤ کہ تمہارا اس باب میں کیا مشورہ ہے؟ (۷/۱۱۰)

یہ تمہارا دین بدل دے گا (یعنی نظامِ حکومت)۔ (۴۰/۲۶)

میں ان کے ابناء کو قتل کر دوں گا ——— (۷/۱۲۷)؛ (۴۰/۲۵)

اُنہوں نے کہا۔

قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ۝ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ۝ (۲۶/۳۶-۳۷)

اُنہوں نے کہا کہ (ہمارا خیال یہ ہے کہ) سردست موسیٰؑ اور اس کے بھائی کے معاملہ کو معرضِ التوا میں رکھو، اور مملکت کے بڑے بڑے شہروں میں ہرکارے بھیجو کہ وہ، مختلف معبدوں سے، ماہرینِ سحرکار پروہتوں کو تمہارے پاس بُلا لائیں۔

اس سلسلہ میں سورۂ اعراف کی جو آیات پہلے گذر چکی ہیں ان میں کہا گیا تھا کہ اربابِ حکومت نے باہمی مشورہ کیا اور پھر فرعون سے کہا کہ پیشواؤں کو جمع کراؤ۔ یہاں فرمایا ہے کہ ارکینِ سلطنت سے پوچھا تو اُنہوں نے ایسا مشورہ دیا۔ بات ایک ہی ہے۔ فرعون نے ان سے پوچھا۔ انہوں نے باہمی مشورہ کیا۔ اور فرعون کے سامنے اپنی تجویز پیش کر دی۔ سورۂ نمل میں ایک اور حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ فرمایا کہ قومِ فرعون کے لوگ حضرت موسیٰؑ کی صداقت وحقانیت کے دل سے قائل ——— ہو چکے تھے۔ لیکن اپنی ضد اور قوت وحکومت کے نشہ کی بدمستی کی بنا پر انکار کئے جا رہے تھے۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ (۲۷/۱۳-۱۴)

لیکن جب اس قوم کے پاس ہمارے اس قدر بصیرت افروز احکام آئے، تو بجائے اِس کے کہ وہ لوگ ان پر ایمان لے آتے، اُلٹا کہنے لگے کہ یہ تو کھلا ہوا جھوٹ ہے (کہ موسیٰؑ کو خدا نے یہ احکام دے کر ہماری طرف بھیجا ہے، اور اگر ہم نے اُنہیں نہ مانا تو ہم پر تباہی آجائے گی)۔

حالانکہ انہیں دل میں یقین ہو چکا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں، لیکن انہوں نے محض، اپنی سرکشی اور تکبر کی بنا پر ان سے انکار کر دیا۔ سو تم دیکھو کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہوا جنہوں نے انسانی معاشرہ میں اس طرح فساد برپا کر رکھا تھا (انسانی معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرنا، عدالتِ خداوندی میں سب سے بڑا جرم ہے)۔

غور کیجئے۔ قرآن نے کتنی بڑی حقیقت، دو لفظوں میں بیان کر دی ہے۔ باطل اور فریب کی بنیادوں پر بڑا بننے کا جذبہ انسان میں ایسی ذہنیت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ ان حقائق سے جن کی صداقت کا وہ دل سے قائل ہوتا ہے اس لئے انکار کئے جاتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس سے اس کی ہیٹی ہوگی اور اسے دوسروں کی نظروں میں خفیف ہونا پڑے گا۔ ظلم و استبداد کی رو سے حاصل کردہ عزت و شوکت کی حقیقت ملمع کی سی ہوتی ہے جس کا رنگ ایک تاؤ دینے سے فق ہو جاتا ہے۔ عزت و عظمت وہی پائیدار ہوتی ہے جو حق پر مبنی معتقدات اور حسنِ کردار اور پاکیزگی سیرت کی بنا پر حاصل ہو۔ اسے کوئی چھین نہیں سکتا۔ اس لئے ان کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جس بات کو حق سمجھتے ہیں مردانہ وار اس کا اعلان کرتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ وہ ایک بات کو دل سے مانیں لیکن مصلحت بینی کی بنا پر اسے زبان پر نہ لائیں یا زبان سے وہ کچھ کہیں جو ان کے دل میں نہ ہو۔ دل اور زبان کی ہم آہنگی ان کے کردار کی بنیادی خصوصیت ہوتی ہے۔

آئینِ جواں مرداں، حق گوئی و بیباکی   اللہ کے بندوں کو آتی نہیں روباہی

قومِ فرعون کی پستئ کردار دیکھئے۔ طبیعی طور پر دبدبہ اور طنطنہ کا یہ عالم کہ ایک قوم کی قوم کو اپنے پنجۂ آہنی کی گرفت میں لے رکھا ہے۔ اور کیریکٹر کی کمزوری کی یہ کیفیت کہ ایک بات کو صحیح مانتے ہیں لیکن مصلحت بینی کی بنا پر اسے زبان پر لانے کی ہمت نہیں پاتے۔ اس قسم کی روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

افسوس صد ہزار سخن ہائے گفتنی   خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

اس سے بھی آگے بڑھیئے۔ ان لوگوں کی دوں فطرتی اس حد تک آگے بڑھ جاتی ہے کہ جب ان سے فریق مقابل کے دلائل کا جواب نہیں بن پڑتا تو یہ استخفاف اور استہزا پر اتر آتے ہیں۔ (جیسا کہ مطالب الفرقان جلد اول صفحہ ۲۴ پر لکھا جا چکا ہے) یہ دنائت اور کمینگی کی انتہا ہوتی ہے۔ چنانچہ جب فرعون اور اس کے اعیانِ سلطنت کے پاس حضرت موسیٰؑ کے دلائلِ باہرہ کا کوئی جواب نہ رہا تو وہ اس حربہ پر اتر آئے۔ فرمایا:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَقَالَ اِنِّىْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝
فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰيٰتِنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَضْحَكُوْنَ ۝ (۴۳ / ۴۶-۴۷)

(مثلاً) ہم نے موسیٰؑ کو، اپنے قوانینِ خداوندی دے کر، فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا۔

اُس نے اُس سے کہا کہ مجھے خدائے رب العلمین نے تمہاری طرف بھیجا ہے۔

جب اُس نے اُن کے سامنے قوانینِ خداوندی کو پیش کیا تو وہ اُن کا مذاق اڑانے لگے۔

سورۂ قصص میں ہے۔

فَلَمَّا جَآءَهُم مُّوسَىٰ بِآيَاتِنَا بَيِّنَاتٍ قَالُوا مَا هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَمَا سَمِعْنَا بِهَٰذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ ○ (۲۸/۳۶)

چنانچہ جب موسیٰؑ ہمارے قوانین کو لے کر اُن کے پاس گیا تو انہوں نے چھوٹتے ہی کہہ دیا کہ یہ سب جھوٹ پر مبنی من گھڑت باتیں ہیں۔ ہم نے ایسی باتیں اپنے آباء و اجداد سے کبھی نہیں سُنیں۔ (اس لئے ہم انہیں ماننے کے لئے تیار نہیں)۔

اس پر حضرت موسیٰؑ نے فرمایا :-

وَقَالَ مُوسَىٰ رَبِّي أَعْلَمُ بِمَن جَآءَ بِالْهُدَىٰ مِنْ عِندِهِ وَمَن تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ○ (۲۸/۳۷)

موسیٰؑ نے کہا کہ (یہ بھلا کون سی دلیل ہے کہ چونکہ یہ باتیں تم نے اپنے آباء و اجداد سے نہیں سُنیں، اس لئے یہ سب جھوٹ ہیں۔ باقی رہا تمہارا یہ اعتراض کہ میں نے یہ باتیں اپنی طرف سے خود وضع کی ہیں اور انہیں منسوب کر رہا ہوں خدا کی طرف۔ تو تم ان باتوں کو پرکھ کر دیکھو کہ یہ کیسی ہیں۔ جہاں تک اُن کی منجانب اللہ ہونے کا تعلق ہے) میرا نشوونما دینے والا خوب جانتا ہے کہ کون فی الواقعہ اس کی طرف سے قوانین لے کر آتا ہے۔ (اور کون اس کی طرف غلط باتیں منسوب کرتا ہے۔ نیز وہ یہ بھی جانتا ہے کہ) انجام کار کامیابی کس کی ہوگی۔ اس لئے کہ اُس کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ اُس کے قوانین سے سرکشی برتیں، (یا اُس کی طرف غلط باتیں منسوب کریں) وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

اس کے جواب میں فرعون نے ارکینِ سلطنت سے کہا ...

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرِي فَأَوْقِدْ لِي يَا هَامَانُ عَلَى الطِّينِ فَاجْعَل لِّي صَرْحًا لَّعَلِّي أَطَّلِعُ إِلَىٰ إِلَٰهِ مُوسَىٰ وَإِنِّي لَأَظُنُّهُ مِنَ الْكَاذِبِينَ ○ (۲۸/۳۸) (نیز ۴۰/۳۶-۳۷)

فرعون نے اپنے اہلِ دربار سے کہا کہ (موسیٰؑ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ محض "مذہبی" گفتگو نہیں۔ یہ تو گہری

سیاست ہے۔ یہ کہتا ہے کہ اقتدار و اختیار، سروری اور حاکمیت سب خدا کے لئے ہے۔ کسی اور کے لئے نہیں۔ لیکن) میں اپنی مملکت میں، تم لوگوں کے لئے، اپنے اقتدار و اختیار کے سوا کسی کا اقتدار نہیں جانتا۔

اس کے بعد اُس نے ہامان سے استہزاءً کہا کہ یوں کرو کہ پزاوہ میں اینٹیں پکاؤ۔ پھران اینٹوں سے میرے لئے ایک بہت بلند محل تعمیر کراؤ تاکہ میں اُس پر چڑھ کر، موسیٰ کے خدا تک پہنچوں اور دیکھوں کہ وہ کیسا ہے!

بہرحال، میں اسے، اس کے دعویٰ میں جھوٹا سمجھتا ہوں، اس لئے اس کی کوئی بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ ($\frac{۲۸}{۳۸}$) و (نیز $\frac{۴۰}{۳۰}$ اور $\frac{۴۰}{۳۶-۳۷}$)۔

بہرحال فرعون نے سب کچھ دیکھنے سمجھنے کے باوجود، حضرت موسیٰؑ کی تکذیب کی۔ استہزاء پر اُتر آیا اور ان اصولوں سے سرکشی برتی جن کی طرف آپ دعوت دے رہے تھے۔ سورۂ نازعات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے ارشاد فرمایا تھا کہ فرعون کی طرف جاؤ اور

فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۝ وَ اَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ۝ ($\frac{۷۹}{۱۸-۱۹}$)

اُس سے کہو کہ (تم نے دولت اور قوت بہت جمع کر رکھی ہے، لیکن اپنے مقامِ انسانیت کے متعلق تم نے کبھی کچھ سوچا ہی نہیں)۔ کیا تو چاہتا ہے کہ تیرے شرفِ انسانیت کی بھی نشوونما ہو جائے؟ اور میں تجھے وہ راستہ بتاؤں جو تمہیں خدا کی ربوبیتِ عامہ کی طرف لے جائے ——— اس سے یہ کچھ کہو۔ ہوسکتا ہے کہ اس سے اُس کا احساسِ شرفِ انسانیت بیدار ہو جائے، اور وہ اپنی موجودہ روش سے، جو اسے تباہیوں کے جہنم کی طرف لئے جارہی ہے، رُک جائے۔ (اس سے کم از کم اتمامِ حجت ہی ہو جائے گا)۔

چنانچہ حضرت موسیٰؑ اس کی طرف گئے اور فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ۝ ($\frac{۷۹}{۲۰}$) "زندگی کا بلند و بالا اصول اس کے سامنے پیش کیا"۔ لیکن فرعون نے اس کی تکذیب کی اور حضرت موسیٰؑ کی دعوتِ انقلاب سے سرکشی برتی۔ فَكَذَّبَ وَعَصٰى ($\frac{۷۹}{۲۱}$)۔ اور منہ پھیر کر چل دیا۔ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ۝ ($\frac{۷۹}{۲۲}$)۔ اور اپنی رعایا کو جمع کیا اور منادی کرادی۔ فَحَشَرَ فَنَادٰى ۝ ($\frac{۷۹}{۲۳}$)۔ کیا منادی کرائی؟ یہ کہ یاد رکھو! میں تمہارا سب سے بڑا پرورش کرنے والا ہوں۔ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ۝ ($\frac{۷۹}{۲۴}$)۔ میں تمہارا "ان داتا" ہوں۔ سو یاد رکھو، میرے سوا کسی کی بات نہ ماننا۔

سورۂ زخرف میں اس "منادی" کی مزید تفصیل دے دی گئی ہے۔

وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِىْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِىْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ

تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ اَمْ اَنَا خَیْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ مَهِیْنٌ ۙ وَّلَا یَكَادُ یُبِیْنُ ۝ فَلَوْلَاۤ اُلْقِیَ عَلَیْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِیْنَ ۝ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ۝ ($\frac{۴۳}{۵۱-۵۴}$)

(فرعون، اس انقلابی تحریک کے بڑھتے ہوئے اثرات سے اس قدر خائف تھا کہ) وہ ملک میں اس قسم کے اعلانات کرتا رہتا تھا کہ اے میری قوم! کیا میں مملکتِ مصر کا مالک نہیں ہوں؟ کیا یہ نہریں، جو میرے انتظام کے تحت جاری ہیں، اور جن پر تمہاری معیشت کا دار و مدار ہے، میری نہیں ہیں؟ کیا تم ان باتوں پر غور نہیں کرتے؟ ($\frac{۷۹}{۲۴}$)

کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ میں اس شخص کے مقابلہ میں کس قدر بہتر اور برتر ہوں، جو ہماری محکوم قوم کا ایک فرد ہے، اس لئے نہایت پست اور کمزور۔ پھر، یہ ایسا دہقانی اور گنوار ہے کہ اسے کھل کر بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں۔ ($\frac{۲۳}{۴۷}$)۔

اگر اس کے خدا نے اسے اتنے بڑے اقتدار کا مالک بنانا تھا تو اسے، سرداری کے امتیازی نشان کے طور پر، سونے کے کنگن کیوں نہ دیئے گئے۔ یا اس کے جلو میں صف و رصف فرشتے کیوں نہ بھیجے گئے۔

چنانچہ وہ اس قسم کے پراپیگنڈہ سے اپنی قوم کو فریب میں مبتلا رکھنے کی کوشش کرتا رہا تاکہ وہ سمجھ سوچ سے کام نہ لے سکیں بلکہ اندھا دھند اس کی اطاعت کرتے رہیں۔ لیکن حق بات تو یہ ہے کہ وہ قوم خود ہی غلط راستوں پر چلنا چاہتی تھی۔ (ورنہ اگر قوم صحیح راستے پر چلنا چاہے تو مستبد قوتوں کی طرف سے اس قسم کا پراپیگنڈا اسے متاثر نہیں کرسکتا)۔

ان آیات پر غور کیجئے اور پھر تصور میں لائیے ان جذبات کو جن سے متاثر ہو کر اس نے یہ اعلان کیا ہوگا۔ اَلَیْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ؟ کیا یہ مملکتِ مصر (اور اس کی حکومت) میری نہیں؟ کیا اس کے دریا اور نہریں میرے قبضہ میں نہیں؟ کیا تم یہ کچھ نہیں دیکھ رہے؟ قوت و شوکت کے سب سامان ایک طرف اور دوسری طرف (نقل کفر، کفر نباشد) یہ ذلیل و کمزور سا انسان، جو اچھی طرح (مہذب انسانوں کی طرح) بات بھی نہیں کرسکتا! جس کے پاس ایک پیسہ تک نہیں۔ اور دعویٰ یہ ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ اگر یہ سچا ہے تو اس کے جلو میں آسمان کے فرشتوں کے پرے کیوں نہیں؟ یہ سب جھوٹ ہے۔ کوئی اس کی بات نہ سنے! قوم کی کیا مجال تھی جو اس فرعونی حکم سے سرتابی برتتی (حالانکہ جیسا اوپر لکھا جا چکا ہے۔ وہ دل سے حضرت موسیٰؑ کی صداقت کے معترف تھے) اس قوم نے اپنے بادشاہ

ہی کی اطاعت کی ۔ اس لئے کہ قوم بھی تو ویسی ہی تھی جیسا خود فرعون ۔ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝

پھر یہ چیز بھی قابلِ غور ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے کس قدر گہرا خطرہ پیدا کر دیا تھا جس کے پیشِ نظر فرعون کو ایسے اعلانات کی ضرورت پڑی ۔ غور فرمایا آپ نے کہ ایک داعیٔ انقلاب ، رسول برحق ، کی آواز میں کس قدر زلزلہ انگیز کڑک ہوتی ہے کہ وہ دلوں کی بستیوں کو ہلا دیتی ہے ۔ دنیا میں علمبرداران حق و صداقت کا مسلک ہی یہ ہے کہ وہ غیر خدائی نظامہائے زندگی میں ایسا تزلزل پیدا کر دیں کہ ہر طاغوتی قوت بلبلا اٹھے !

پھر اس نکتہ کی طرف بھی آپ نے توجہ کی کہ فرعون نے کہا کہ اگر یہ شخص صاحبِ حشمت و دولت ہوتا تو بھی اس کی بات سن لی جاتی ! لیکن یہ "غیر مہذب" سا مفلس و نادار انسان اور دعویٰ اس قدر بلند آہنگ ! یعنی اسی سازِ کہن کی صدائے بازگشت جسے ہم قومِ نوح کے زمانہ سے سنتے چلے آرہے ہیں !

جیسا کہ ہم شروع سے بتاتے چلے آرہے ہیں اپنے ہی جیسے انسانوں کو اپنا مطیع و محکوم بنانے کا طریق یہ ہے انہیں روٹی کا محتاج کر دیا جائے ۔ مستبد قوتوں کی حکمرانی کا راز ہی اسی میں ہوتا ہے کہ وہ رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضہ میں رکھتی ہیں اور پھر بھوکے لوگوں سے جو چاہے منوائی اور کرائی ہیں ۔ فرعون نے اپنے اعلان میں یہی دھمکی دی تھی کہ اگر تم نے میرا حکم نہ مانا تو تم پر رزق کے سب دروازے بند کر دیئے جائیں گے ، اور یہ شخص (حضرت موسیٰؑ) تمہیں ایک وقت کی روٹی بھی نہیں دے سکے گا کیونکہ اس کے پاس تو کچھ بھی نہیں ! سرکس کے شیر کو بھوکا ماریئے اور پھر اس سے جو چاہے کرائیے !

قوتِ کلیمی

فرعون نے اپنی بوکھلاہٹ میں یہ سب کچھ کہا لیکن ، بایں ہمہ ، اسے خطرہ تھا کہ حضرت موسیٰؑ کی دلکش تعلیم اور اس کی تائید میں ایسے واضح دلائل کہیں عوام کو متاثر نہ کر دیں ۔ اس لئے اس نے اس کا علاج بھی سوچا کہ اپنی قوم کے پیشوایانِ مذہب کے ساتھ اس کا مناظرہ کرایا جائے ۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ باوجود اپنی (بظاہر) بے سروسامانی کے حضرت موسیٰؑ اپنے اندر کتنی بڑی قوت رکھتے تھے کہ فرعون کو یہ جرأت نہیں پڑی کہ انہیں پکڑ کر قتل کرا دے یا قید کر دے ۔ سیرتِ بلند کی قوت بے پناہ ہوتی ہے ۔ محکوم قوم ہی کیوں نہ ہو ، اسے ایک کلیم کی ضرورت ہوتی ہے ۔ پھر سرکشی و استبداد کی سب قوتیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں ۔ وہ کلیم جس کے متعلق کہا ہے کہ

مردِ حُر محکم ز وردِ لاتخف   ما بمیداں سر بجیب او سر بکف
پادشاہاں در قبا ہائے حریر   زرد رُو از سہمِ آں عُریاں فقیر
(اقبالؒ)

بہرحال، فرعون نے حکم دیا کہ ملک کے مذہبی پیشواؤں کو اکٹھا کیا جائے۔ اب حق و باطل کی کشمکش کا ایک نیا میدان سامنے آیا۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے۔

۷/۱۱۳ وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ○

چنانچہ ان کے مذہبی پیشوا (ہامان اور اس کے ساتھی پروہت) فرعون کے پاس جمع ہو گئے[1]۔ انہوں نے اُس سے کہا کہ اگر ہم موسیٰؑ پر غالب آ گئے تو ہمیں اُمید ہے کہ ہمیں اس کا بہت بڑا صلہ ملے گا۔ (مذہبی پیشواؤں کے پیشِ نظر "اُجرت" ہوتی ہے، حق کا بول بالا کرنا نہیں ہوتا۔ یہ اس لئے کہ مذہب پرستی اُن کا پیشہ ہوتا ہے، لہذا ذریعۂ معاش)۔ (۴۲/۲۶)

فرعون نے کہا۔

۷/۱۱۴ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ○

فرعون نے کہا "ضرور ملے گا، اور تم سب میرے مقربوں کی صف میں داخل ہو جاؤ گے"۔ اس سے بڑا انعام اور کیا حاصل ہو سکتا تھا کہ بادشاہ کا تقرب حاصل ہو جائے۔

قبل اس کے کہ ہم اس رزمگاہِ حق و باطل کا منظر سامنے لائیں، ایک اہم وضاحت ضروری ہے۔ آیت (۳۸/۲۸) میں لکھا جا چکا ہے کہ فرعون نے ہامان سے کہا کہ "ایک پختہ محل بناؤ تا کہ میں اس پر چڑھ کر موسیٰؑ کے خدا کو آسمان پر جھانک لوں"۔ اس کے علاوہ ہامان کا ذکر ان آیات میں بھی آیا ہے (۸ : ۶ ؛ ۲۸) ؛ (۳۹ : ۲۹) ؛ (۳۶ ؛ ۲۴ ؛ ۲۴ : ۴۰)۔ ان کے متعلق میں نے اپنی کتاب "برقِ طور" میں بھی لکھا ہے لیکن اس کا یہاں دہرانا ضروری ہے۔

تورات (عہد عتیق) کی کتاب آستر میں ایک ہامان کا ذکر آیا ہے جو ایران کے شاہنشاہ 'اخسویرس' کے دربار میں ایک اعلیٰ منصب پر فائز تھا۔ وہ یہودیوں کی نسل کشی کے درپے تھا لیکن شہنشاہ کی محبوبہ 'آستر' نے بادشاہ کو اس طرح اپنے دامِ فریب میں پھنسایا کہ اس نے خود ہامان کو حوالۂ دار و رسن کر دیا۔ یورپ کے بعض متعصب مستشرقین نے یہ بیہودہ اعتراض کیا ہے کہ حضور نبی اکرمؐ نے (معاذ اللہ) ایران کے ہامان کا قصہ سن کر اسے فرعون مصر کی داستان کے ساتھ چپکا دیا ہے لیکن حق کی قوت ملاحظہ ہو کہ وہیں کے تاریخ کے محققین نے یہ ثابت کیا ہے کہ (۱) تورات میں شامل کتاب آستر اور اس میں مذکور ہامان کی کہانی سب جعلی ہے۔ اور (۲) جس ہامان کا ذکر قرآن میں آیا ہے وہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اس تحقیق کا ملخص یہ ہے کہ آمن رع (سورج کا دیوتا) مصر میں سب سے بڑا دیوتا سمجھا جاتا تھا، اور اس کے مندر کا اعلیٰ پجاری، شان و شوکت کے بلند ترین مقام پر فائز تھا۔ یہی آمن رع قرآن کا ہامان ہے — جیسے تورات کا آرون

[1] لفظی معنی جادوگر ہیں۔

(AORON) بتغیر لفظی سے قرآن کریم میں ہارون ہو گیا۔ ڈاکٹر سٹینڈورف (STEINDORFF) اپنی کتاب (THE RELIGION OF THE ANCIENT EGYPTIANS) میں ہامان کے متعلق لکھتا ہے۔

آمن دیوتا کے سردار کاہن کو نبی اوّل (یعنی سب سے بلند مرتبہ کاہن) کہتے تھے۔ وہ محکمہ تعمیرات کا افسر بھی تھا۔ مندر کی عالی شان عمارات اور ان کی زیبائش و آرائش کا نظم و نسق اسی کی تفویض میں تھا۔ یہی دیوتاؤں کی فوج، یعنی مندر کی سپاہ کا جرنیل بھی تھا۔ خزانہ کی نگرانی اور انتظام کا بھی یہی ذمہ دار تھا۔ نہ صرف آمن کا مندر اور اسکے پجاری اس کے دائرۂ اقتدار میں تھے بلکہ تھیبس اور شمالی اور مغربی مصر کے تمام منادر کے پجاریوں کا افسر اعلیٰ بھی یہی تھا۔ اگر حساب لگایا جائے تو صرف شہر تھیبس کے آمن کے مندر کے قبضہ میں مصر کی زمین کا دسواں حصہ تھا اور کم از کم سویں آبادی پر اس کی حکومت تھی۔

اسی محقق نے اپنی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ جرمنی میں مصر کا ایک قدیم مجسمہ ہے جس پر منقوش ہے کہ وہ آمن کے سردار کاہن بکن خونس کا ہے جو فرعون، رعمسیس ثانی کے زمانے میں تھا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں (تحت لفظ مصر) مذکور ہے کہ

فراعنۂ مصر کے اٹھارھویں خاندان کے وقت سے مندر کے پجاریوں نے خاص اثر اور اہمیت اختیار کر لی تھی اس خاندان کے زمانے میں آمن رع (واقعہ تھیبس) کے نام پر ایشیا کے مفتوح علاقے وقف ہو چکے تھے جن کی وجہ سے وہ بے حساب دولت کا مالک سمجھا جاتا تھا۔

ڈاکٹر (BREASTED) نے بھی اپنی کتاب (A HISTORY OF EGYPT) میں لکھا ہے کہ آمن کے سب سے بڑے پجاری کے ماتحت بہت بڑا مقامی لشکر ہوتا تھا۔ (حوالوں کے لئے دیکھئے برق طور۔ عنوان ہامان)۔

ان حقائق کی روشنی میں ان قرآنی آیات کا مفہوم بآسانی سمجھ میں آجاتا ہے جن میں ہامان کا ذکر ہے۔ (واضح رہے کہ جیسطرح مصر کے شہنشاہوں کا نام نہیں بلکہ لقب فرعون تھا اسی طرح آمن رع کے سب سے بڑے پجاری کا لقب ہامان تھا)۔

ان تصریحات کے بعد، ہامان (آمن رع) کے جنود (یعنی پجاریوں کی فوج کے دستے) اور صاحب ضرب کلیم کے مقابلہ کی طرف آئیے۔

سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ اس معرکہ کے لئے جشن کا دن مقرر کیا گیا تھا اور ذرا دن چڑھے کا وقت۔ تاکہ لوگ ضروریات سے فارغ ہوں اور مجمع زیادہ رہے۔ اہل فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے کہا۔

فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَآ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ○ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ○

(۲۰/۵۸-۵۹)

اگر یہی بات ہے تو ہم تیری سحر طرازیوں کا جواب، سحر طرازیوں سے دیں گے (اس کا جواب ہمارے مذہبی پیشوا دیں گے)۔ سو تو، ہمارے اور اپنے درمیان مقابلہ کے لئے ایک دن مقرر کر لے۔ اس کی خلاف ورزی نہ ہم کریں، نہ تم کرو۔ ہمارے اور تمہارے درمیان یہ مقابلہ برابر کی سطح پر ہوگا۔

موسیٰؑ نے کہا، بہت اچھا۔ تمہارے سے مقابلہ کے لئے جشن کا دن مقرر ہوا۔ دن چڑھے لوگوں کو اکٹھے ہو جانا چاہیئے۔

چنانچہ معاملہ طے کر کے، فرعون ان سے الگ ہوا اور اب اپنی تدابیر کی تکمیل کی فکر کرنے لگا۔

فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ○ (۲۰/۶۰)

اس فیصلہ کے بعد فرعون نے اُن کی طرف سے توجہ ہٹالی۔ اپنی تمام تدابیر کو یک جا جمع کیا، اور مقررہ وقت پر مقابلہ کے لیے آ گیا۔

جب مقابلہ کا دن آیا تو حضرت موسیٰؑ نے مجمع کو (یا ان کے مذہبی پیشواؤں کو) مخاطب کر کے کہا۔

قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ○ (۲۰/۶۱)

(جو مذہبی پیشوا، موسیٰؑ کے مقابلہ کے لیے بلائے گئے تھے) موسیٰؑ نے انہیں مخاطب کر کے کہا کہ یاد رکھو! تم تباہ ہو جاؤ گے۔ تم خدا کے خلاف افترا پردازی مت کرو۔ اپنی طرف سے مذہب تراش کر، اسے اُس کی طرف منسوب مت کرو۔ یاد رکھو! خدا کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ ایسا کرتے ہیں، وہ خاسر و نامراد رہتے ہیں۔ وہ انہیں جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیا کرتا ہے۔

اس خطاب کا یہ اثر ہوا کہ وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔

فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ○ (۲۰/۶۲)

(اس تقریر کا اثر یہ ہوا کہ) ان مذہبی پیشواؤں نے آپس میں رد و کد شروع کر دی اور باہم سرگوشیاں کرنے لگ گئے۔ (عوام پر بھی اس کا بڑا اثر پڑا)۔

ارباب حل وعقد نے جب دیکھا کہ حضرت موسیٰؑ تو مقابلہ سے پہلے ہی میدان مارے جا رہے ہیں تو مجمع (یا مذہبی پیشواؤں) سے کہا کہ تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ یہ دونوں بھائی کیا کیا منصوبے باندھ رہے ہیں؟ گوش ہوش سے سنو۔

قَالُوٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ○ فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ○ (۲۰/۶۴-۶۳)

(فرعون کے درباریوں نے جب مجمع کی یہ حالت دیکھی تو انہیں خطرہ لاحق ہو گیا) انہوں نے لوگوں سے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ یہ دونوں بھائی (موسیٰؑ اور ہارونؑ) کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟ یہ باطل مذہب کے پیشوا ہیں[1] اور ان کا ارادہ یہ ہے کہ اپنی فریب کاریوں سے اپنا تسلط جما لیں اور تمہیں تمہاری مملکت سے نکال باہر کریں اور تمہارے مذہب و مسلک کو، جو اس قدر اعلیٰ درجہ کا ہے تباہ کر کے رکھ دیں۔ اور اس طرح تمہارے ارباب حکومت اور پیشوایانِ طریقت کا تمام شرف و اقتدار چھین کر لے جائیں۔

(پھر انہوں نے اپنے مذہبی مناظروں کو خصوصیت سے مخاطب ہو کر کہا کہ) اپنے باہمی اختلافات کو چھوڑ کر، اس مشترکہ دشمن کو مغلوب کرنے کے لئے، اپنی تمام ہنرمندیوں اور تدابیر کو یکجا کر لو اور پھر پرا باندھ کر ان کے مقابلے کے لئے ڈٹ جاؤ۔ یاد رکھو! یہ معرکہ بڑا فیصلہ کن ہے۔ جو آج بازی لے جائے گا، وہی کامیاب ہوگا۔ (۷/۱۱۳-۱۱۱) ; (۱۰/۷۹)۔

دیکھئے! کس طرح ان کے جذبات کو مشتعل کیا جا رہا ہے تاکہ حضرت موسیٰؑ کی موعظت اور تنذیر نے جو اثر کیا تھا اسے زائل کر دیا جائے اور یہ انہیں اپنے ملک اور تہذیب و تمدن کا دشمن خیال کرنے لگ جائیں کہ یہ نہ صرف تمہارا ملک ہی چھیننے کی فکر میں ہیں بلکہ اس بلند و بالا تہذیب و تمدن کے مٹا ڈالنے کی بھی تدبیریں سوچ رہے ہیں جس کے تم وارث ہو۔ آنکھیں کھولو! کس سوچ میں ہو!! دیکھو کہ یہ دونوں بھائی کس انقلاب کی ٹھانے بیٹھے ہیں!!!

سورۃ شعراء میں ہے۔

---

[1] یہ ان الفاظ کا مجازی مفہوم ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، جو قارئین حقیقی معانی کو ترجیح دینا چاہیں وہ ان الفاظ کے معانی کسی با ترجمہ قرآن کریم کے نسخے سے دیکھ لیں۔

فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ (۲۶ / ۳۸)

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، اور ملک کے بڑے بڑے سحر کار پروہت، تاریخ اور وقت مقررہ پر، موسیٰؑ کے مقابلہ کے لئے جمع ہو گئے۔

مذہبی پیشواؤں کے علاوہ عوام کو بھی دعوت شمولیت دی گئی تھی۔

وَّقِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ۝ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ۝

(۲۶ / ۳۹ - ۴۰)

علاوہ ازیں، عام لوگوں سے بھی کہا گیا کہ وہ بھی جمع ہو جائیں۔

تاکہ جب یہ پروہت کامیاب ہوں تو ان کا شاندار جلوس نکالا جائے۔

اس کے بعد ان کے مذہبی پیشواؤں کی صلہ جوئی اور معاوضہ طلبی کی درخواست کا ذکر ہے جسے سورۂ اعراف کی آیات (۷ / ۱۱۳ - ۱۱۴) میں بیان کیا جا چکا ہے (دیکھئے ۲۶ / ۴۱ - ۴۲)۔ اس کے بعد مقابلہ شروع ہوا۔ اور سوال یہ پیدا ہوا کہ پہل کون کرے۔

مقابلہ ۷ / ۱۱۶ قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ۝

موسیٰؑ نے کہا کہ تم پہل کرو۔ سو جب انہوں نے اپنے مسلک کو پیش کیا، تو ان کی سحر بیانی کی چمک نے لوگوں کی نگاہوں میں خیرگی پیدا کر دی، اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے لوگوں کو اس سے بھی ڈرایا کہ تم نے فرعون کی مخالفت کی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟) اور اس طرح انہوں نے بہت بڑے مکر و فریب کا جال بچھا کر رکھ دیا۔

اس کے بعد۔

۷ / ۱۱۷ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ۝ ۚ

اور ہم نے، موسیٰؑ سے، وحی کے ذریعہ کہہ دیا کہ تم اپنی تدبیرات کو پوری قوت اور شدت کے ساتھ پیش کرو[1]۔ جب اس نے انہیں بیان کیا تو مخالفین کا فریب باطل ملیامیٹ ہو کر رہ گیا۔

---

[1] یہاں یہ لفظ "عصا" آیا ہے۔

"عصائے موسوی" باطل کی نظر فریب "رسیوں" کو نگل گیا۔ اور اس طرح۔

۷ / ۱۱۸-۱۱۹	فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ فَغُلِبُوا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوا صَاغِرِينَ ۝

سو اس طرح حق ثابت ہوگیا۔ اور اُن کا کیا کرایا سب اکارت گیا۔ (۱۰ / ۸۲-۷۶)؛ (۲۰ / ۶۵-۷۲)

یہ سب کچھ قوانینِ خداوندی کی رُو سے ہوا تھا۔ (۱۰ / ۸۲)

اور فرعون اور اُس کی قوم کو، وہیں دیکھتے دیکھتے، مغلوب اور ذلیل ہو کر پسپا ہونا پڑا۔

قرآن کریم کے دیگر مقامات میں بھی اس مناظرہ کا ذکر (قریب قریب) انہی الفاظ میں آیا ہے (دیکھئے ۱۰ / ۸۲-۷۵؛ ۲۰ / ۶۵-۶۹ و ۲۶ / ۴۳-۵۴) آیت (۲۰ / ۶۶) میں ہے کہ فرعون کے مذہبی پیشواؤں کا انداز بیان اس قدر سحر آفریں تھا کہ حضرت موسیٰؑ کو خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں ان کے دلائل (محض لفاظی کے زور پر) اثر انداز نہ ہو جائیں اور اس طرح وہ کامیاب ہو جائیں۔ لیکن خدا نے انہیں اطمینان دلایا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ تمہارے دلائل ان اثرات کو زائل کر دیں گے۔

ساحرین کا کیریکٹر

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں (جو قرآن کریم نے کہا ہے کہ فرعون اور اس کے اہل دربار، دل میں تو حضرت موسیٰؑ کی دعوت کی صداقت کے مائل ہو چکے تھے لیکن ان کی انانیت اس اعترافِ حقیقت کے برملا اظہار کے راستے میں حائل ہو رہی تھی اس لئے وہ اس کی مخالفت کئے جا رہے تھے۔ لیکن یہاں معاملہ اس کے برعکس سامنے آتا ہے۔ قوم فرعون کے ان مذہبی پیشواؤں کا جو مقام تھا اس کی بابت ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ ان کا منصب اور ان کے مقام کی عظمت اربابِ اقتدار سے بھی کہیں بڑھ کر تھی۔ پھر اس مقابلہ کی اہمیت اور نزاکت بھی ان پر واضح تھی۔ اس میں کامیابی کا جو صلہ انہوں نے طلب کیا، اور فرعون نے جس کا اقرار کیا تھا، اسے بھی ہم دیکھ چکے ہیں۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ اگر انہوں نے حضرت موسیٰؑ کی دعوت کی صداقت کو تسلیم کر لیا تو فرعون کی طرف سے اس کا کیا ردِ عمل ہوگا!

ان تمام ترغیبات اور ترہیبات کے علی الرغم ان کی پختگی سیرت اور بلندئ کردار کا یہ عالم تھا کہ جب حضرت موسیٰؑ کے دلائل کی رو سے ان پر یہ حقیقت بے نقاب ہو گئی کہ الٰہ حقیقی فرعون (یا آمن) نہیں بلکہ خدائے ارض و سموات ہے، تو انہوں نے تمام عواقب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، اس کا کھلے بندوں اعلان کر دیا۔ اور خدائے حقیقی

کے حضور والہانہ انداز سے سجدہ ریز ہو گئے۔ وَ اُلْقِیَ السَّحَرَۃُ سٰجِدِیْنَ (۱۲۰)

یہ وہ سجدہ تھا جس سے زمین و آسمان رقص میں آجائے جس سے باطل کے "ہر خدا" کی اصلیت بے نقاب ہو جائے۔ اس سجدے کی عظمت کے متعلق مطالب الفرقان۔ جلد دوم۔ صفحہ ۱۰۳ ملاحظہ فرمائیے۔

سجدے سے اٹھے اور کہا:

۱۲۱-۱۲۲ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ رَبِّ مُوْسٰی وَ هٰرُوْنَ ○ (۱۲۱-۱۲۲)؛ (۲۰؛ ۴۸-۴۷/۲۶)

انہوں نے کہا کہ "ہم اس خدا پر ایمان لاتے ہیں جو جملہ کائنات کا پروردگار ہے۔ جو موسیٰؑ اور ہارونؑ کا رب ہے۔

کیسا درخشندہ تھا طالع ان بیدار بخت مذہبی پیشواؤں کا جس پر ساری کائنات کی عظمتیں اور ثروتیں نچھاور کر دی جائیں وہ سجدہ نصیب ہوا جس سے ان کی خاک آلود پیشانیوں میں رفعتوں کے ہزار عرش جگمگا اٹھے۔ یہی وہ سجدہ تھا جس نے انہیں وہ جرأت عطا کر دی کہ وہ دنیا کی بڑی سے بڑی چوکھٹ سے سرفرازانہ آگے بڑھ جائیں۔ ہم غلامانہ ذہنیت کے خوگر اس سجدہ کی لذت کو کیا جائیں ؎

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

فرعون کی شعلہ بازی

ہم ساحرین کے تحیر انگیز جذبہ ایمان کے کیف بار و نشاط آور منظر میں کچھ اس طرح جذب ہو گئے کہ یہ بھول ہی گئے کہ فرعون کی قلبی کیفیت کا بھی جائزہ لے لیں کہ اس پر اس غیر متوقع انقلاب سے کیا گزری؟ اس میدان مبارزت میں ساحرین کی ناکامی ہی کچھ کم الم انگیز نہ تھی۔ اس پر جب دیکھا کہ وہ "موسیٰؑ کے خدا" پر ایمان لے آئے ہیں (یعنی بزعم فرعون، دشمن سے جا ملے ہیں) تو آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اس کے دل و دماغ کی حالت کیا ہو گئی ہوگی! ذلت اور ایسی کھلی ہوئی ذلت! شکست اور ایسی رسوا کن شکست!! وہ ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح گرجا اور کف بر دہاں سیلاب کی طرح امڈا۔ کہ ہیں! میری آنکھوں کے سامنے ایسی کھلی ہوئی بغاوت:

۱۲۳ قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِی الْمَدِیْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ○

(اس پر فرعون کے غصے کی آگ بھڑک اٹھی)۔ اس نے کہا کہ کیا تم میری اجازت کے بغیر ہی موسےٰؑ کے خدا پر ایمان لے آئے ہو؟ میں اب سمجھا کہ یہ تم سب کی ملی بھگت ہے۔ یہ تو ایک گہری سیاسی سازش معلوم ہوتی ہے جس سے مقصود یہ ہے کہ تم میرے دارالخلافہ سے اربابِ اقتدار کو نکال باہر کرو (اور خود مملکت پر قبضہ کر لو۔ تم سب اندر سے ملے ہوئے نظر آتے ہو) تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا کہ اس سازش کا نتیجہ کیا ہے۔

کسی مسلک کو صحیح جان کر اس پر ایمان لے آنا انسان کے اپنے دل کے فیصلہ پر موقوف ہونا چاہیئے لیکن استبداد اس کی کب اجازت دے سکتا ہے؟ وہاں تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ آپ کی عقل و بصیرت اور قلب و دماغ کا فیصلہ کچھ ہو۔ کیا وہ ہوگا جس کا حکم دیا جائے۔ اسی لئے فرعون نے کہا کہ "میری اجازت کے بغیر ایمان لے آئے؟" پھر جیسا کہ استبد حکومتوں کا دستور ہے۔ فرعون نے ساحرین کے اس فیصلہ کو ایک سازش قرار دیدیا تاکہ انہیں بغاوت کے الزام میں ماخوذ کیا جائے۔ ساحرین کا ایمان علیٰ وجہ البصیرت تھا۔ لیکن چونکہ اس سے قصرِ حکومت میں تزلزل واقع ہوتا تھا اس لئے اسے سازش قرار دے دیا گیا جس کی سزا فرعون کی "عدالت" میں اس کے سوا کیا ہو سکتی تھی کہ:

۷/۱۲۴ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ○

میں تمہارے ہاتھ پاؤں اُلٹے کٹواؤں گا (یا ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈلواؤں گا) اور تم سب کو سُولی پر چڑھا دونگا۔

سورۂ طٰہٰ میں فرعون کے قول کا ایک اور ٹکڑہ بھی نقل کیا گیا ہے۔ اس نے جب دیکھا کہ ساحرین کے اس اعتراف سے عوام پر بے حد بُرا اثر پڑا ہے تو معاملہ کو مشتبہ بنانے کے لئے مشہور کر دیا کہ یہ مذہبی پیشوا (درپردہ) حضرت موسیٰؑ کے شاگرد ہیں اور ان کی آپس میں ملی بھگت ہے۔ دوسری جگہ ہے۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۭ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۡ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى ○ (۲۰/۷۱) (نیز ۲۶/۴۹)

(اس پر فرعون، مارے غصے کے لال پیلا ہو گیا اور اُن سے گرج کر کہا کہ یہیں!) ـــــ تم میرے حکم کے بغیر ربِ موسیٰؑ و ہارونؑ پر ایمان لائے ہو؟ (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ موسیٰؑ) تمہارا پیر و مرشد ہے جس سے تم نے یہ سب فریب انگیزیاں سیکھی ہیں (اور یہ جو کچھ ہو رہا تھا، سب تمہاری ملی بھگت تھی۔ تم دیکھو میں تمہیں کیسی عبرت انگیز سزا دیتا ہوں) میں تمہارے ہاتھ پاؤں اُلٹے سیدھے کٹواؤں گا (یا تمہیں اُلٹی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈلواؤنگا)

اور تمہیں کھجوروں کے تنوں کے ساتھ لٹکا کر سولی دی جائے گی۔ اور اس طرح تم دیکھ لوگے کہ ہم دونوں (فرعون اور موسیٰؑ) میں سے کون زیادہ سخت اور دیرپا عذاب دے سکتا ہے۔

ساحرین کا ایمان

جورو استبداد کی ان قہرمانی تجلیوں کو آپ نے دیکھ لیا! اب ساحرین کے کوہ تمثال عزم و ایمان کی تجلیات کا تابناک منظر بھی دیکھئے۔ اب ساحرین بھی وہ نہیں تھے جن کا اندازہ فرعون نے کیا تھا۔ وہ اب خدائے حیّ قیوم پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان لا چکے تھے اور یہ وہ ایمان ہے جسے دنیا کی کوئی طاقت اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتی۔

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

دنیا میں حقیقی قوتوں کا راز، ایمان میں مضمر ہے۔ جس قدر آپ کا یقین محکم ہے، اسی قدر ناقابلِ تسخیر قوتوں کے آپ مالک ہیں شکست و کامرانی کا بنیادی مدار قاطبۃً ساز و سامان پر نہیں، یقین و عدم یقین پر ہے۔ جن لوگوں کو اپنے مقاصد کی صداقت پر غیر متزلزل یقین ہوگا وہی دنیا میں کامیاب و شادکام ہوں گے۔ یہی شکست و فتح کا اٹل پیمانہ ہے۔ اسی سے قوموں کا مستقبل ماپا جاتا ہے۔ جب یقین، ایمان کے درجہ تک پہنچ جائے۔ اور ایمان ہو، اَللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَهَّار پر۔ تو پھر دنیا کی کوئی طاقت آپ کو اپنے مقام سے نہیں ہلا سکتی۔ لہٰذا فرعون کی دھمکی، ایمان و ایقان کے ان آہنی پیکروں پر کیا اثر کر سکتی تھی۔

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا

فرعون نے اپنے انتہائی غضب و جلال میں کہا کہ میں "تمہیں سولی پر لٹکا دوں گا۔ تمہاری تکا بوٹی کر دوں گا۔ ڈرو میرے غضب سے! خوف کھاؤ میرے انتقام سے!!" لیکن اس سے ان استقلال و استقامت کے مجسموں پر کیا اثر ہوا؟ انہوں نے ایک خفیف سی ہنسی سے فرعون کی طرف نگۂ حقارت سے دیکھا اور کہا کہ کیا کہہ رہے ہو؟ جن حقائق کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں، کیا تمہارے ڈر سے ان کی تکذیب کر دیں؟

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِىْ فَطَرَنَا ...... (۲۰/۷۲)

انہوں نے (اس گرج کو نہایت اطمینان کے ساتھ سنا اور دل کو پورے سکون سے) کہا کہ جو حقیقت دلائل و براہین کی رو سے ہم پر منکشف ہو چکی ہے، نہ ہم اس پر اپنی باطل پرستی کو ترجیح دے سکتے ہیں اور نہ ہی ہم اس خدا

سے منہ موڑ کر جس نے ہمیں پیدا کیا ہے، تمہارا حکم مان سکتے ہیں۔

"فرعون! تو کیا جانے کہ ہماری آنکھوں نے کیا دیکھا ہے؟ تجھے کیا معلوم کہ خدا پر ایمان کی لذت کیسی ہوتی ہے؟ یہ تیری دھمکیاں اور تخویف و ترہیب کی شعلہ باریاں، ہم پر کچھ اثر نہیں کر سکتیں۔ فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ (۲۰/۷۲) جو فیصلہ تو کرنا چاہتا ہے، کر ڈال۔ جو تیرے جی میں آئے کر گزر۔ تیرے آہنی ہاتھ زیادہ سے زیادہ ہماری طبیعی زندگی تک گلوگیر ہو سکتے ہیں۔ اس سے آگے تو کر ہی کیا سکتا ہے؟ اِنَّمَا تَقْضِىْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا (۲۰/۷۲)۔ تو صرف اسی دنیاوی زندگی تک ہی حکم دے سکتا ہے۔ ہم اپنے اللہ پر ایمان لا چکے ہیں۔ اس ایمان سے ہمیں کوئی نہیں پھیر سکتا۔"

اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ۗ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ○ (۲۰/۷۳)

ہم اپنے نشو و نما دینے والے پر ایمان لا چکے۔ اس سے ہماری دعا یہ ہے کہ وہ ہماری سابقہ غلطیوں کے مہلک اثرات سے ہماری حفاظت کرے۔ یہ ——— بالخصوص باطل پرستی کی اس خطاکارانہ روش کے اثرات سے جس پر چلنے کے لئے تم نے ہمیں مجبور کر رکھا تھا۔ (ہم اب دیکھ چکے ہیں کہ) خدا کا قانون ہی بہترین اور باقی رہنے والے نتائج کا حامل ہے۔

ساحرین، فرعون کو یہ جواب دے رہے تھے اور آسمان کے فرشتے محوِ تحیّر، بارگاہِ ایزدی میں عرض کر رہے تھے کہ الٰہ العالمین! تیرا ارشاد بجا تھا کہ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۔ اسی آدم کی ذریت میں، جسے ابلیس نے بہکانے اور پھسلانے کا یوں دعویٰ کیا تھا، ایمان اور ایقان کے ایسے فولادی پیکر بھی ہوں گے، جن کی کیفیت یہ ہوگی کہ

بچو مرگ آید تبسم بر لب اوست

۷/۱۲۶-۱۲۵

سورۂ اعراف کی آیات (۷/۱۲۶-۱۲۵) اور سورۂ شعراء کی آیات (۲۶/۵۱-۵۰)۔ میں بھی اسی واقعہ کو دہرایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان مذہبی پیشواؤں نے فرعون کی دھمکیوں کا جواب کس قدر حقارت آمیز ہنسی سے دیا۔

ایک ایمان یہ تھا اور ایک ایمان اس انداز کا ہوتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۗ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ○ (۲۲/۱۱)۔

(ایک طبقہ تو اُن لوگوں کا تھا جو قانونِ خداوندی سے اس طرح روگردانی کرتے ہیں۔ دوسرا طبقہ اُن کا ہے جن کی حالت یہ ہے کہ) وہ قانونِ خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں، لیکن اس طرح گویا وہ کنارے پر کھڑے ہیں۔ اگر دیکھتے ہیں کہ اس قانون کی اطاعت میں فائدہ ہے، تو اس پر مطمئن رہتے ہیں۔ لیکن اگر اس سے اُنہیں کسی قسم کا نقصان ہوتا ہو۔ تو وہ اس سے بلا تامل منہ پھیر لیتے ہیں (۲۲:۱۱)۔ اس روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کی حال کی زندگی بھی تباہ ہو جاتی ہے اور مستقبل کی بھی ——— دُنیا میں بھی خسارہ اور آخرت میں بھی ——— اور یہ خسارہ ایسا کھلا ہوا ہے (جس کے لئے کسی دلیل و بُرہان کی ضرورت نہیں۔

علیٰ وجہ البصیرت ایمان اور "پیدائشی مسلمان" کے ایمان میں یہی فرق ہوتا ہے۔

ما ہمیداں سر بجیب۔ او سر بکف

دارد اندر سینۂ تکبیرِ اُمم　　در جبین او ست تقدیرِ اُمم
قبلۂ ما گہ کلیسا، گاہ دیر　　او نخواہد رزقِ خویش از دستِ غیر
صبح و شام ما بفکرِ ساز و برگ　　آخرِ ما چیست؟ تلخیہائے مرگ
در جہانِ بے ثبات او را ثبات　　مرگ او را از مقاماتِ حیات
اہلِ دل از صحبتِ ما مضمحل　　گلِ زفیضِ صحبتش دارائے دل
کارِ ما وابستۂ تخمین و ظن　　او ہمہ کردار، و کم گوید سخن
ما گدایاں کوچہ گرد و فاقہ مست　　فقرِ او از لا الٰہ تیغے بدست
ما پرِ کاہے اسیرِ گرد باد　　ضربش از کوہِ گراں جوئے کشاد

محرمِ او شو، ز ما بیگانہ شو
خانہ ویراں باش و صاحب خانہ شو

(اس ضمن میں مطالب الفرقان - جلد دوم - صفحہ ۲۵ بھی ملاحظہ فرمایئے)۔

یہاں تک داستانِ حضرت موسیٰؑ کا وہ حصّہ سامنے آیا ہے جس کا تعلق فرعون کے ساتھ ٹکراؤ سے ہے۔ اس میں بنی اسرائیل کا ذکر نہیں آیا۔ اس کے بعد (آیت ۷:۱۲۷ اور اس سے آگے) فرعون اور بنی اسرائیل دونوں کا تذکرہ آئیگا۔ بنی اسرائیل کی رکم و بیش) پوری داستان مطالب الفرقان جلد دوم میں، اور بعض کوائف جلد چہارم میں آچکے ہیں لہٰذا، اب ہم ایسا انداز اختیار کرینگے (کہ سورۃ الاعراف کی جن آیات میں بنی اسرائیل کے ان واقعات کا ذکر آئے گا جو سابقہ جلدوں میں بیان ہو چکے ہیں، وہاں صرف سابقہ جلدوں کا حوالہ دیدیا جائے گا اور جو واقعہ ایسا ہو گا جو پہلے نہیں آچکا، اس کی عند الضرورت تشریح کر دی جائے گی۔

پانچواں باب

سورۃ الاعراف۔آیات ۱۲۷ تا ۱۵۸

کوائفِ بنی اسرائیل

۱ ——— وراثتِ ارض کا ابدی قانون۔

۲ ——— فرعونی نظام کے ابتدائی تباہ کن نتائج

۳ ——— قوم فرعون کی غرقابی۔

۴ ——— بنی اسرائیل کا عبورِ دریا۔

۵ ——— نفسیاتِ غلامی کے مظاہرے۔

۶ ——— گوسالہ پرستی۔

۷ ——— تفرقہ، شرک سے بھی بدتر۔

۸ ——— حضرت موسیٰؑ کی دیدارِ خداوندی کی استدعا۔

اس کا جواب۔

۹ ——— قوم کی طرف سے خدا کو بے نقاب دیکھنے کا مطالبہ۔

دونوں میں فرق۔

۱۰ ——— الواحِ حضرت موسیٰؑ۔

۱۱ ——— حضرت موسیٰؑ کی درخواست کہ ان کی قوم کو دنیا اور آخرت کی حسنات سے نوازا جائے۔

۱۲ ——— اس کا جواب کہ ایسا اتباعِ محمدیؐ سے ہوگا۔

۱۳ ——— بعثتِ نبی اکرمؐ کا مقصود و منتہیٰ۔

نوعِ انسانی کی آزادی۔

۱۴ ——— خدا کا آخری رسولؐ۔

پانچواں باب

کوائفِ بنی اسرائیل

سابقہ باب میں (آیت ۷/۱۲۶ تک) حضرت موسیٰؑ کے کوائفِ حیات بیان ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد کی آیات میں (منجملہ دیگر امور) داستانِ بنی اسرائیل کے متعدد گوشے سامنے لائے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ داستانِ بنی اسرائیل کے ضمن میں حضرت موسیٰؑ کا ذکر بھی آئے گا۔ لیکن یہ ذکر ضمنی ہوگا۔ تقدماً داستانِ بنی اسرائیل ہی کی بیان ہوگی۔ یہ داستان مطالب الفرقان جلد دوم میں شرح و بسط سے بیان ہو چکی ہے۔ اُن واقعات میں سے، سورۃ الاعراف کی آئندہ آیات میں جن کا ذکر آئے گا، اُن کی تشریح کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اُن کے متعلق صرف مطالب الفرقان جلد دوم کا حوالہ دیا جائے گا۔ البتہ جن آیات میں کسی سابقہ واقعہ میں کوئی اضافہ ہوگا، ان کی تشریح کر دی جائے گی۔ اس التزام کے مطابق، آئندہ آیات ملاحظہ فرمائیے۔ آیت (۷/۱۲۷) میں ہے

۷/۱۲۷ وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْىٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ○

فرعون کے درباریوں نے اس سے کہا کہ (تم نے ان مذہبی پیشواؤں کے خلاف تو اپنا فیصلہ دے دیا لیکن) کیا تیرا ارادہ یہ ہے کہ موسیٰؑ اور اس کی قوم کو اس طرح آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ ملک میں فتنہ و فساد برپا کرتے پھریں اور ایسا پراپیگنڈا کریں جس سے خود تیری قوم، تجھے اور تیرے معبودوں کو چھوڑ دے۔

فرعون نے کہا کہ (نہیں! میں ان کی طرف سے غافل نہیں ہوں۔ لیکن ان کے لئے میرے ذہن میں دوسری تدبیر ہے۔ یہ ہماری محکوم قوم ہے، اسے ہم سیاسی حربوں سے کچل دیں گے)۔ ہم اس قوم کے معززافراد کو

جن میں جوہر مردانگی کی جھلک دکھائی دیتی ہو اور جن سے خطرہ کا امکان ہو، ذلیل و خوار کر کے غیر مؤثر بنا دیں گے، اور جو طبقہ ان جوہروں سے عاری ہوگا، اسے معزز اور مقرّب بنا کر آگے بڑھاتے جائیں گے[1]۔ اس طرح مجموعی حیثیت سے یہ قوم تباہ ہو جائے گی (۴۹/۲ ؛ ۲۵/۴۰)۔

فرعون کی طرف سے تشدّد

اس کا ذکر آیت (۱۴۱/۷) میں بھی آیا ہے۔ مفہوم مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۳۴۷ پر آچکا ہے۔ فرعون کی حکومت، اپنی محکوم قوم (بنی اسرائیل) کو جس جس طریق سے اذیتیں دیتی تھی، اس کا ذکر (مطالب جلد دوم میں) آچکا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی آمد سے پہلے یہ اذیتیں اور انداز کی تھیں۔ صاحب ضربؑ کلیم نے جو انقلابی آواز بلند کی تو اس سے بنی اسرائیل کی حیثیت ایک باغی قوم کی ہو گئی۔ لہٰذا قوم فرعون کی طرف سے اذیتیں بھی شدّت اختیار کر گئیں۔ بنی اسرائیل نے ان تکالیف سے گھبرا کر حضرت موسیٰؑ سے شکایت کی، تو آپ نے انہیں یہ کہکر تسلّی دی کہ تکالیف کا یہ دور جلدی گزر جائیگا اور اس کے بعد تم محکوم قوم سے حاکم قوم بن جاؤ گے۔ اگلی دو آیات میں اسی انقلاب کا ذکر ہے:

۱۲۹-۱۲۸/۷ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۗ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۗ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝ ع

موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ فرعون کی ان دھمکیوں سے مت ڈرو۔ تم قانون خداوندی کے مطابق اپنی صلاحیتوں کو نشوونما دیتے جاؤ اور خدا سے اس کی توفیق مانگو (۴۵/۲) اور اپنے پروگرام پر ثابت قدم رہو۔ (حکومت و مملکت ان کے باپ کی جاگیر نہیں کہ وہ ابدی طور پر ان ہی کے پاس رہے خواہ یہ کچھ ہی کیوں نہ کرتے رہیں) یہ تو خدا کے قانون کے مطابق ملتی اور اس کے مطابق چھنتی ہے۔ اور اس کا قانون یہ ہے کہ یہ ملتی اس قوم کو ہے جس میں اس کی صلاحیت ہو (۱۰۵/۲۱)۔ جو قوم اس کے قانون کی نگہداشت کرے گی، یہ آخر الامر اس کے پاس جائے گی۔

اس پر موسیٰؑ کی قوم نے اس سے کہا کہ جب تم یہاں نہیں تھے تو اس وقت بھی ہمیں مصیبتوں کا سامنا رہا تمہارے آنے سے یہ امید بندھ گئی تھی کہ اب ہمارا پاپ کٹ جائے گا، اور آرام سے زندگی بسر ہوگی۔ لیکن فرعون سے

[1] لفظی معنی "ان کے بیٹوں کو قتل کر دیں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھیں گے"۔

لڑائی مول لے کر) تم نے ہمیں پھر مصیبت میں ڈال دیا۔

استقامت کی تلقین موسیٰؑ نے کہا کہ گھبرانے کیوں ہو۔ (پہلے تمہاری مصیبتیں، محکومی اور غلامی کی وجہ سے تھیں، لیکن اب جن تکالیف کا سامنا کرنا پڑے گا، وہ حصول آزادی کے لئے ہوں گی۔ اگر تم نے ثبات و استقامت سے کام لیا تو تم دیکھو گے کہ) تمہارا نشو و نما دینے والا کس طرح تمہارے دشمن کو تباہ کر دیتا ہے، اور اُس کی مملکت تمہارے حصے میں آجاتی ہے۔

اس کے بعد وہ خدا یہ دیکھے گا کہ، مملکت حاصل ہونے کے بعد تم کس قسم کے کام کرتے ہو؟ اس کا ذکر آیت (۷/۱۳۷) میں ان الفاظ میں آیا ہے:

۷/۱۳۷ وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَ دَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَ قَوْمُهٗ وَ مَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ۝

اور جس قوم کو وہ اس قدر کمزور و ناتواں (اور ذلیل و حقیر) سمجھا کرتے تھے، اُسے (مختلف مراحل سے گزر کر) اُس ملک کے مشرقی اور مغربی حصوں کا وارث بنا دیا جو ہمارے قدرتی خزائن اور پیداوار سے مالا مال تھا۔ یوں تیرے نشو و نما دینے والے کا پروگرام، بنی اسرائیل کے حق میں، اس حسن و خوبی سے تکمیل تک پہنچا۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے اس تمام جدوجہد میں بڑی استقامت کا ثبوت دیا تھا۔ اُن کے برعکس، قوم فرعون کے ساختہ پرداختہ کو برباد، اور اُن کی عالیشان عمارات کو تہس نہس کر دیا۔

(لیکن یہ اس داستان کا آخری حصہ ہے جسے ہم نے اس مقام پر بیان کیا ہے)۔

اس تمکن فی الارض کی تفسیر مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۷۶ تا ۴۲۹ پر آچکی ہے۔

قوموں پر اُن کے غلط نظام کے نتیجے میں، تباہیاں کس طرح آتی ہیں، ان کی تفصیلات سابقہ جلدوں میں آچکی ہیں۔ (ملاحظہ ہو انڈکس)۔ اس کا اصولی تذکرہ آیت (۷/۹۴) میں بھی سامنے لایا گیا ہے۔ اس اصول کے مطابق، قوم فرعون پر بھی تباہیاں آئیں، جن کا ذکر آیات (۷/۱۳۰) و (۷/۱۳۳) میں ان الفاظ میں آیا ہے:

۷/۱۳۰ وَ لَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَ نَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝

قوم فرعون پر تباہیاں

(اُس اُصول کے مطابق جس کا ذکر (۷/۹۴) میں کیا جا چکا ہے) قوم فرعون کے غلط نظام کے نتائج رفتہ رفتہ سامنے آنے شروع ہو گئے۔ چنانچہ وہاں خشک سالی کی وجہ سے، فصلوں میں کمی ہو گئی تو سارے ملک میں قحط پھیل گیا۔ اُنہیں اس سے سمجھ لینا چاہیئے تھا کہ (غلط نظام معاشرہ میں قدرتی حادثات کے مقابلہ کی سکت نہیں ہوتی۔ اس قسم کے حوادث کے مضر اثرات کی روک تھام کا انتظام نظام ربوبیت ہی کی رُو سے ہو سکتا ہے)۔

۷/۱۳۳ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ
مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝

اُن پر سیلاب آئے۔ ٹڈی دل نے تباہی مچائی۔ فصلوں کو برباد کرنے والے کیڑے پیدا ہوئے مینڈکوں کی کثرت ہو گئی۔ فساد خون کی بیماریاں رُونما ہو گئیں۔ یہ سب کھلی کھلی علامات تھیں (اس بات کی کہ جب ملک کا نظام صحیح خطوط پر متشکل نہ ہو، تو وہاں اس قسم کے حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور ارباب نظم و نسق اپنی عیش پرستیوں میں اس قدر منہمک ہوتے ہیں کہ اُنہیں اس طرف توجہ دینے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی)۔
قوم پر اس قسم کی مصیبتوں کے باوجود، اس کا حکمران طبقہ اپنی سرکشی سے باز نہ آیا۔ وہ درحقیقت تھا ہی مجرموں کا گروہ! (جو کچھ ملک میں ہو رہا تھا، وہ انہی کے جرائم کا نتیجہ تھا)۔

لیکن، بجائے اس کے کہ وہ اِن جھٹکوں سے عبرت پکڑتے اور سبق حاصل کر کے اپنے نظام کی اصلاح کرتے، وہ حضرت موسیٰؑ کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے۔ فرمایا:

۷/۱۳۱-۱۳۲ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا
بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ؕ اَلَاۤ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ
لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ
لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝

لیکن ان کی کیفیت یہ تھی کہ جب اُن پر خوش حالی کا زمانہ آتا تو کہتے کہ یہ ہمارے حسن انتظام کا نتیجہ ہے۔ اور جب سختی آتی تو کہتے کہ یہ موسیٰؑ اور اس کے ساتھیوں کی نحوست کی وجہ سے ہے۔

اُن کی اس مصیبت کا سبب، موسیٰؑ اور اُس کی جماعت کی نحوست نہ تھی (نحوست کسی میں بھی نہیں ہوتی) یہ اُن کی اپنی غلط روش کا نتیجہ تھا جو قانونِ خداوندی کے مطابق مرتب ہو رہا تھا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اکثر لوگ

اس حقیقت کو نہیں جانتے (اور اپنے اعمال کا جائزہ لینے کے بجائے دوسروں کو ان کا ذمہ دار قرار دے کر اپنے آپ کو فریب میں مبتلا رکھنا چاہتے ہیں۔) (۲/۴۲) ؛ (۴/۶۹) ؛ (۴۲/۳۰) ؛ (۳/۱۶۴)

قوم فرعون (موسیٰؑ سے کہتی کہ تو ہم سے اپنا باطل مذہب منوانے کے لئے جتنا جی چاہے زور لگا لے، اور جس قسم کی مصیبت ہم پر لاسکتا ہے، لے آ۔ ہم تجھ پر کبھی ایمان نہیں لانے کے۔

اس کے بعد ہے:

۷/۱۳۴-۱۳۵
وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوا يَا مُوسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ
عِنْدَكَ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ
بَنِي إِسْرَائِيلَ ۝ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ إِلَى أَجَلٍ هُمْ بَالِغُوهُ إِذَا
هُمْ يَنْكُثُونَ ۝

جب ان پر تباہی آتی تو وہ کہتے کہ اے موسیٰؑ! تو اپنے رب سے دعا کر۔ اگر وہ ہم سے اس عذاب کو ٹال دے، تو ہم تیری بات مان لیں گے اور بنی اسرائیل کو تیرے ساتھ بھیج دیں گے، چونکہ (تو کہتا ہے کہ) خدا نے تجھ سے عہد کر رکھا ہے، اس لئے وہ تیری دعا ضرور قبول کرے گا۔

سو جب ہم، کچھ وقت کے لئے، ان سے اس سختی کو دور کر دیتے، جس تک انہوں نے بالآخر اپنی غلط روش کی وجہ سے پہنچکر رہنا تھا[1]، تو وہ اپنے عہد کو توڑ ڈالتے۔

اس کے بعد ان کی آخری تباہی کا ذکر ہے، جس میں وہ غرق و رسوا ہو گئے تھے:

۷/۱۳۶
فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا
عَنْهَا غَافِلِينَ ۝

جب وہ اس طرح (مسلسل اور پیہم) ہمارے قانون کو جھٹلاتے رہے اور اس کے نتیجہ خیز ہونے کی طرف سے لاپرواہ رہے، تو ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں پکڑ لیا۔ صورت یوں ہوئی کہ وہ اپنی قوت کے نشے میں بدمست، موسیٰؑ اور اس کی قوم کا تعاقب کرتے ہوئے، سمندر (یا دریا) میں کود پڑے، اور غرق ہو گئے۔ یوں ہم نے

---

[1] قرآن کریم نے اس جگہ کتنی بلند حقیقت کو بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ مصیبت انسان کی طرف نہیں آتی۔ انسان خود مصیبت کی طرف جاتا ہے۔

اُنہیں تباہ کر دیا۔

غرق ہوتے وقت فرعون کے ایمان لانے کا واقعہ اور اُس کی لاش کے محفوظ رکھے جانے کا ذکر مطالب الفرقان جلد دوم صفحات ۲۴۹ تا ۲۵۲ پر آچکا ہے۔

بنی اسرائیل کے سمندر پار کرنے کا ضمنی سا اشارہ آیت (۷/۱۳۸) میں آیا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۲۵۴ میں ملے گی۔

اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ صحرائے سینا پہنچنے کے بعد بنی اسرائیل نے کس طرح بُت سازی کی فرمائش کی۔

(۷/۱۳۴-۱۳۸) وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْکُفُوْنَ عَلٰٓی اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا کَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ قَالَ اِنَّکُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ۞ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِیْهِ وَبٰطِلٌ مَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۞ قَالَ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْکُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ۞

قومِ فرعون ڈوب گئی اور بنی اسرائیل کے لئے ہم نے ایسا انتظام کر دیا کہ وہ سمندر (یا دریا۔ ۲/۵۰) کے پار اُتر گئے۔ اُس کے بعد اُن کا گزر ایک ایسی قوم پر سے ہوا جو اپنے بتوں کی پرستش پر جمی بیٹھی تھی (اور یہی چیز ان میں وجۂ جامعیت تھی)۔ موسیٰؑ کی قوم نے موسیٰؑ سے کہا کہ جس قسم کے ان کے دیوتا ہیں، ہمیں بھی اس قسم کا دیوتا بنا دو!

موسیٰؑ نے کہا کہ (میں، اس کے سوا تم سے کیا کہوں کہ) تم بڑے ہی جاہل ہو۔ (۱۳۸)

جس مسلک پر یہ (بُت پرست) چل رہے ہیں، وہ مسلک تباہ ہو کر رہنے والا ہے، اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں، وہ یکسر باطل ہے۔ اِس کا نتیجہ تخریب کے سوا کچھ نہیں۔ (۱۳۹)

اُس نے کہا کہ کیا میں تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی اور اِلٰہ تجویز کر دوں، حالانکہ وہ خدا ایسا ہے جس نے تمہیں اپنی ہم عصر اقوام پر فضیلت عطا کی ہے۔ (۱۴۰)

اس کی تفصیل مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۲۵۳ میں آچکی ہے۔

اِن آیات میں صرف بُت سازی کی فرمائش کا ذکر ہے۔ اِس کے بعد ان کی گوسالہ پرستی کا ذکر اس طرح آیا ہے:

۷ / ۱۴۸
وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ۭ
اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا
ظٰلِمِيْنَ ۝

گوسالہ پرستی

بہرحال، موسیٰؑ کی عدم موجودگی میں، اُس کی قوم نے اپنے زیورات وغیرہ گلا کر بچھڑے کا ایک دھڑ سا بنایا۔ (یعنی اس قسم کی طلائی مورتی بنا لی جس کی پرستش اہلِ مصر کیا کرتے تھے۔ سامری نے اُس میں ایسی کاریگری رکھ دی (۲۰/۸۵) کہ اس میں سے، ہوا سے، گائے جیسی آواز نکلتی تھی۔ توہم پرست، جاہل قوم کے لئے یہی چیز، اس جسدِ بے جان کو معبود تسلیم کرنے کے لئے کافی تھی حالانکہ اگر وہ ذرا بھی عقل و خرد سے کام لیتے تو یہ حقیقت اُن پر واضح ہو جاتی کہ وہ "معبود" اُن سے باتیں نہیں کرتا (اُس میں سے صرف ایک بے معنی سی آواز نکلتی ہے۔ اور وہ آواز ہمیشہ ایک ہی جیسی ہوتی ہے) نہ ہی وہ کسی معاملہ میں اُن کی راہنمائی کرتا ہے۔ لیکن، اس کے باوجود، اُنہوں نے، اس بچھڑے کو اپنا دیوتا بنا لیا۔ وہ کس قدر راہِ حق سے ہٹی ہوئی قوم تھی۔

(ایک مدت کی غلامی نے، اُن سے غور و فکر کی صلاحیتیں اس حد تک چھین لی تھیں، اور اُن میں اس قدر احساسِ کمتری پیدا ہو چکا تھا کہ وہ اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے حیوان کے بُت کو، اپنے سے افضل سمجھتے تھے اور اُس کے سامنے جھکتے تھے۔ شرک اسی لئے جرمِ عظیم ہے کہ وہ انسان کو اُس کے مقام بلند سے بہت نیچے گرا دیتا ہے۔)

یہ واقعہ حضرت موسیٰؑ کی عدم موجودگی میں ہوا تھا۔ وہ جب واپس آئے تو:

۷ / ۱۵۰-۱۵۱
وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ
مِنْ بَعْدِيْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ
اَخِيْهِ يَجُرُّهٗٓ اِلَيْهِ ۭ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ڮ
فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَاۗءَ وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ قَالَ رَبِّ
اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَاَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ ڮ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝

جب موسیٰؑ اپنی قوم کی طرف واپس آیا تو (اُسے ان کی حماقت پر، غصہ بھی آیا، اور افسوس بھی ہوا۔ اُس نے اُن سے کہا کہ تم نے میری عدم موجودگی میں جو کچھ کیا ہے، بہت بُرا کیا ہے۔ مجھے یہاں سے

گئے ہوئے کچھ ایسا لمبا عرصہ تو نہیں ہو گیا تھا کہ تم مایوس ہو گئے اور خدا کے غضب کو آوازیں دے دیکر بُلا لیا۔ (۲۰/۸۶)۔

پھر اُس نے الواحِ تورات کو ایک طرف رکھ دیا، اور (غصے میں) اپنے بھائی کے بال پکڑ کر کھینچے (۲۰/۹۴)۔ بھائی نے کہا کہ (مجھ پر اس طرح ناراض نہ ہو۔ میری بات سُن لو۔ میں نے انہیں اِس بات سے

شرک اور تفرقہ

اس لئے زبردستی نہیں روکا کہ تو آکر کہے گا کہ تم نے قوم میں تفرقہ پیدا کر دیا، اور میری واپسی کا انتظار تک نہ کیا (۲۰/۹۴)۔ میں نے اُنہیں سمجھانے کی کوشش کی تو انہوں نے میری نرمی کو) میری کمزوری پر محمول کر لیا۔ قریب تھا کہ یہ مجھے قتل ہی کر ڈالتے۔ سو تم اب یہ تو نہ کرو کہ مجھے بھی اِن سرکش مجرموں کے زمرے میں شامل کر لو، اور میرے ساتھ ایسا ذلت آمیز سلوک کرو جس سے ہمارے دُشمن ہم پر ہنسیں (۱۵۰)۔

(جب موسیٰؑ اِس طرح حقیقتِ حال سے باخبر ہوا تو اُس نے) کہا کہ اے میرے پروردگار! مجھ سے اور میرے بھائی سے جو خطا ہو گئی ہو، اُس سے ہماری حفاظت کا سامان بہم پہنچا۔ اور اپنی نظرِ عنایت کو بدستور، ہمارے شاملِ حال رکھ۔ اس لئے کہ تجھ سے بڑھ کر سامانِ رحمت و عاطفت بہم پہنچانے والا اور کون ہے؟ (۱۵۱)

اِن آیات کے درمیان بنی اسرائیل کی توبہ کا ذکر ہے:

۷/۱۴۹ وَلَمَّا سُقِطَ فِيٓ اَيۡدِيۡهِمۡ وَ رَاَوۡا اَنَّهُمۡ قَدۡ ضَلُّوۡا ۙ قَالُوۡا لَئِنۡ لَّمۡ يَرۡحَمۡنَا رَبُّنَا وَ يَغۡفِرۡ لَنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ۝

جب (موسیٰؑ کے سمجھانے سے اُنہوں نے اپنے کئے پر غور کیا تو) اُس پر سخت نادم ہوئے اور اُنہوں نے محسوس کر لیا کہ وہ سخت غلطی کر بیٹھے ہیں۔ چنانچہ وہ کہنے لگے کہ اگر ہمارے نشوونما دینے والے نے ہم پر مہربانی نہ کی، اور ہماری اِس حماقت کے تباہ کن نتائج سے ہمیں محفوظ نہ رکھا، تو ہم یقیناً سخت نقصان میں رہیں گے۔

مطالب الفرقان جلد دوم میں یہ واقعات صفحات ۲۵۷ تا ۲۵۹ میں بیان ہوئے ہیں۔ اس کے بعد ہے:

۷/۱۵۴ وَلَمَّا سَكَتَ عَنۡ مُّوۡسَى الۡغَضَبُ اَخَذَ الۡاَلۡوَاحَ ۖۚ وَفِيۡ نُسۡخَتِهَا هُدًى وَّرَحۡمَةٌ

لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ۝

اور جب موسیٰؑ کا غصہ فرو ہوا تو اس نے تختیوں کو اُٹھایا جن پر وحی منقوش تھی۔ جو کچھ اُن پر لکھا تھا، اس میں، اُن لوگوں کے لئے جو قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے خائف ہوں صحیح راستے کی طرف راہنمائی اور سامانِ رحمت تھا۔

آیات (۱۵۳-۱۵۲/۷) میں ان کی سزا کا ذکر ہے:

۱۵۳-۱۵۲/۷ إِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا ۡ اِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

اس پر خدا نے کہا کہ (تم دونوں سے ہم نے درگزر کیا)۔ لیکن جن لوگوں نے بچھڑے کی پرستش کی تھی، اُنہیں، ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق سزا ملے گی۔ اُنہوں نے اپنے آپ کو بے جان حیوان سے بھی زیادہ حقیر سمجھا، اس لئے وہ دُنیا میں ذلیل و رسوا ہوں گے (۲/۹۷)۔ ہم افترا پردازوں کو اُن کی بدعملی کی اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں (۲/۵۴)۔

لیکن جن لوگوں سے (سہواً) کوئی لغزش ہو جائے، اور اس کے بعد، وہ پھر اپنے مقام کی طرف لوٹ آئیں (اپنے کئے پر نادم ہوں اور آئندہ کے لئے اپنی اصلاح کر لیں)۔ اور خدا کے ضابطۂ حیات کو اپنا نصب العین بنالیں۔ تو تیرے نشو و نما دینے والے کے قانونِ ربوبیت میں، اُن کی حفاظت اور رحمت کی گنجائش ہے۔

اس سزا کی تفصیل واقعۂ سبت کے ضمن میں سامنے آئے گی جس کا ذکر چند آیات بعد کیا گیا ہے۔

سورۃ بقرہ (آیت ۲/۵۵) میں ہے کہ ان لوگوں نے حضرت موسیٰؑ سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ خدا کو بے نقاب دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس پر کیا ہوا، اس کی تفصیل مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۲۷ پر گزر چکی ہے۔ اسی واقعہ کو آیہ درجِ ذیل میں دہرایا گیا ہے۔ فرمایا:

۱۵۵/۷ وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ

قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ۭ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاۗءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِىَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ۭ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَاۗءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَاۗءُ ۭ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ۝

خدا کو بے نقاب دیکھنے کا مطالبہ

اور موسیٰؑ نے اپنی قوم میں سے ستر آدمی ہمارے مقرر کردہ وقت کے لئے چُنے (۲/۵۵) جب اُنہیں سخت زلزلہ نے آ پکڑا تو

——— موسیٰؑ نے عرض کیا کہ اے میرے نشوونما دینے والے! اگر تو چاہتا تو مجھے اور ان لوگوں کو اس سے پیشتر ہی (جب ان لوگوں نے یہ سوال کیا تھا۔ ۲/۵۵) ہلاک کر دیتا۔ (لیکن جب تو نے ایسا نہ کیا تو اس سے ظاہر ہے کہ تیری مشیّت یہی تھی کہ ہم اس طرح ہلاک نہ ہوں۔ تو اب) کیا تو اُس بات کی وجہ سے جو ہم میں سے کچھ بیوقوف لوگ کر بیٹھے ہیں، ہمیں ہلاک کر دے گا؟ معلوم ہوتا ہے کہ یہ زلزلہ انگیزی، ہماری ہلاکت کے لئے نہیں، بلکہ یہ دیکھنے کے لئے ہے کہ ہم میں حوادث برداشت کرنے کی کس قدر صلاحیت آ چکی ہے۔ (تاکہ ہم اپنے متعلق کسی غلط اندازے میں نہ رہیں)۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس قسم کے مقامات بڑے نازک ہوتے ہیں۔ ایسے نازک کہ عقل و فکر سے کام نہ لینے والے لوگ، انہی سے غلط راستوں پر پڑ جاتے ہیں، اور دوسرے لوگوں کا قدم صحیح راستے کی طرف اُٹھ جاتا ہے۔

بہرحال، تو ہمارا کارساز اور سرپرست ہے جو غلطی ہوگئی ہے اُس کے مُضر نتائج سے ہماری حفاظت اور رحمت کا سامان کر دے۔ اِس لئے کہ سب سے بہتر سامانِ حفاظت عطا کرنے والا تیرا ہی قانونِ ربوبیت ہے۔

حضرت موسیٰؑ کی اس درخواست کا باقی حصہ اگلی آیت میں ہے، اور اس کے ساتھ، خدا کی طرف سے جواب جو آیت (۷/۱۵۷) تک چلا گیا ہے اور اپنے موضوع کے اعتبار سے بڑا اہم ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے گزارش کیا کہ:

۷/۱۵۶ وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ۭ قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَاۗءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

حضرت موسیٰؑ کی درخواست

اور ہمارے لئے اس دنیا کی زندگی میں بھی خوشگواریاں پیدا کر دے اور مستقبل کی زندگی میں بھی۔ اس لئے کہ ہم تیری طرف رجوع کر رہے ہیں۔

اس پر خدا نے کہا کہ میری طرف سے تباہی میرے قانونِ مشیت کے مطابق صرف اُس پر آتی ہے (جو میرے قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ ورنہ) میرا عام پروگرام یہی ہے کہ کائنات کی ہر شے، نشوونما حاصل کرکے، اپنی تکمیل تک پہنچ جائے۔ (تم دیکھتے ہو کہ خارجی کائنات میں میرا یہ نظام ربوبیت و رحمت کس طرح کارفرما ہے۔ اسی طرح انسانوں کی دنیا میں) یہ ربوبیت انہیں مل سکتی ہے جو زندگی کی تباہیوں سے بچنا چاہیں اور دوسروں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچائیں، یعنی وہ لوگ جو ہمارے قوانین کی صداقت پر پورا پورا یقین رکھیں۔

یہ تھا جو ہم نے موسیٰؑ سے کہا۔

اس میں چار اہم نکات سامنے آتے ہیں:

۱۔ دنیا اور آخرت کی حسنات (خوش گواریاں)

۲۔ رحمتِ خداوندی کی وسعت اور عالمگیریت۔

۳۔ انسان اپنے اوپر مصائب آپ لاتا ہے۔

۴۔ رحمتِ خداوندی کے مستحق کون لوگ ہیں۔

دنیا اور آخرت میں حسنات کے موضوع پر، مطالب الفرقان جلد اوّل (صفحات ۱۵۰-۱۴۹) اور جلد سوم صفحہ ۴۵۲ دیکھئے۔ دین (نظامِ خداوندی) کا ماحصل ہی یہ ہے۔ دنیاوی خوش گواریوں سے وہ رہبانیت کی جڑ کاٹ دیتا ہے، اور اُخروی خوش گواریوں سے سیکولرازم کی۔

رحمتِ خداوندی کے قرآنی مفہوم کے لئے مطالب الفرقان جلد اوّل (صفحہ ۲۰) دیکھئے۔ اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آجائے گی کہ یہ رحمت کسطرح پوری کائنات کو محیط ہے۔

انسان اپنے آپ کو اس رحمت سے محروم کرکے، کسطرح مصائب کا شکار اور تباہیوں سے دوچار ہوتا ہے۔ اس کے لئے سابقہ جلدوں میں تقدیر اور مکافاتِ عمل کے عنوانات دیکھئے۔ بالخصوص مطالب الفرقان جلد چہارم (صفحہ ۲۲۰) جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ مصیبتیں انسان کی اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہیں۔

چوتھے نکتہ کے متعلق مختصر سا اشارہ زیرِ نظر آیت میں دیا گیا ہے۔ لیکن تفصیل اگلی آیت میں آئی ہوئی ہے ہم دونوں آیات کا مفہوم یکجا بیان کریں گے۔ واضح رہے کہ آیت نمبر (۱۵۷/۷) میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس کے مخاطب حضرت موسیٰؑ معلوم نہیں ہوتے کیونکہ اس میں توراۃ کے ساتھ انجیل کا بھی ذکر ہے۔ اس کے مخاطب

نبی اکرمؐ کی مخاطب قوم، یا اقوام ہیں جن میں بنی اسرائیل (یہودی) بھی شامل ہیں[1] اس کی تائید آیت (۷/۱۵۸) سے بھی ہوتی ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے کہ اس رحمت کے سزاوار وہ لوگ ہوتے ہیں:

۷/۱۵۷ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

اتباعِ رسولِ اکرمؐ

(ہمارا یہ قانون، سابقہ انبیاءؑ کی وساطت سے بھی ملتا رہا، اور اب یہی قانون اس رسولؐ کی معرفت آیا ہے۔ اس لئے اب ہماری ربوبیت اور رحمت ان لوگوں کے حصّے میں آئے گی، جو نظامِ ربوبیت قائم کرنے کے لئے) اس رسول کے پیچھے پیچھے چلیں گے جو (قرآن سے پہلے) اُمّی تھا (۲۹/۴۸)۔ جس کی علامات (یہود و نصاریٰ) اپنے ہاں، تورات اور انجیل میں لکھی پاتے ہیں۔ وہ اُن باتوں کا حکم دیتا ہے جسے وحیٔ خداوندی صحیح تسلیم کرتی ہے، اور اُن امور سے روکتا ہے جو اس وحی کی رُو سے ناپسندیدہ ہیں۔ اسی وحی کی رُو سے وہ زندگی کی تمام پاکیزہ، خوشگوار چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے، اور اُن خبائث کو حرام ٹھہراتا ہے۔ (جن کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے ۶/۱۴۶)۔ اور (مذہبی پیشواؤں کے جن خود ساختہ آئین و شرائع اور مستبد حکام کے جور و ستم کے) جس بوجھ کے نیچے انسانیت دبی چلی آ رہی تھی، اس بوجھ کو اُس کے سر سے اتارتا

نوعِ انسان کو آزادی عطا کرنا

ہے۔ اور (تقلید و اوہام کی جن زنجیروں میں، انسانی قلب و دماغ جکڑا ہوا تھا) ان زنجیروں کو توڑتا ہے (۴۷/۴)۔ —— اور اس طرح انسان کو صحیح آزادی عطا کرتا ہے کہ وہ (حدود اللہ کا پاس رکھتے ہوئے) اپنی سعی و کاوش سے جن بلندیوں تک جانا چاہے، چلا جائے۔ اس کے راستے میں کوئی روک نہ ہو۔ قرآن کا نظام، ہر نوع غلامی کے لئے موت کا پیغام ہے۔ یہ کسی انسان کو اس کا حق نہیں دیتا کہ وہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنائے۔ (۳/۷۸)۔ وہ

---

[1] ہو سکتا ہے کہ یہ امور حضرت موسیٰؑ ہی سے بطور پیشگوئی کہے گئے ہوں جس طرح اُن سے حضورؐ کی آمد اور بعثت کا ذکر بطورِ پیشگوئی کیا گیا تھا۔ مخاطب کوئی بھی ہو، ان امور کا اطلاق عام ہے۔

رزق کے سرچشموں کو اربابِ اقتدار کے ہاتھوں سے چھین لیتا ہے تاکہ وہ دوسروں کی محتاجی سے فائدہ اٹھا کر اُن کے آقا نہ بن بیٹھیں۔ (۲۴/۷۹) و (۵۱/۴۳) ۔ وہ تقلیدِ آباء کے قلادوں کو توڑ پھینکتا ہے۔ (۲/۱۷۰) و (۴۳/۲۳-۲۲) ۔ وہ احبار و رہبان کی فریب کاریوں کو بے نقاب کر کے، اُن کے معتقدین کو خود فیصلے کرنے کے قابل بنا دیتا ہے (۹/۳۱) و (۹/۳۴) ۔ وہ نظامِ سرمایہ داری کی جڑیں کاٹ دیتا ہے (۹/۳۴-۳۵)

لہٰذا جو لوگ اس کی نبوّت پر ایمان لے آئیں، اور اس کے پیش کردہ پیغام کے مخالفین کے لئے روک بن کر اُس کی مدافعت کریں۔ اس نظام کے قیام میں اُس کی مدد کریں۔ اور اس مقصد کے لئے اُس روشنی کو اپنے لئے چراغِ راہ بنائیں جسے اِس رسولؐ کی طرف نازل کیا گیا ہے۔ تو یہی لوگ ہوں گے جن کی کھیتیاں پروان چڑھیں گی، اور جو کامیاب و کامران زندگی بسر کریں گے۔ (۷/۱۵۷)

آیت کا مطلب تو مفہوم سے واضح ہے، کیونکہ وہ بڑا مشرح ہے۔ اس بنا پر چند ایک اشارات کافی ہوں گے:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے جو الدّین نبی اکرمؐ کی وساطت سے (قرآن مجید میں) عطا فرمایا، وہ آخری دین مکمل اور غیر متبدل تھا، تمام نوعِ انسانی کے لئے اور آخری زمانے (قیامت) تک۔ اِس لئے اِس کے بعد تمام سابقہ ادیان (جو مختلف اوقات میں خدا کی طرف سے ملے تھے) منسوخ ہوگئے، اور تمام نوعِ انسان کے لئے (خواہ وہ اہلِ کتاب ہوں یا غیر اہلِ کتاب)، ضابطۂ حیات صرف قرآن مجید رہ گیا۔ سابقہ جلدوں میں اس حقیقت پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے کہ اصل کے اعتبار سے دین ایک ہی تھا جو مختلف انبیائے کرام کو دیا گیا۔ لیکن ان انبیاء کی اُمتوں نے یا تو اس میں تحریف کر دی، اور یا وہ ضائع ہوگیا۔ وہی الدّین اپنی مکمل اور غیر متبدل شکل میں آخری بار قرآن میں محفوظ کر دیا گیا ہے ـــــ یہ آخری دین اس لئے ہے کہ حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس پر سلسلۂ وحی ختم کر دیا گیا ـــــ حضورؐ آخری نبیؐ۔ قرآن آخری کتاب اور الاسلام آخری دین ہے (اہلِ کتاب کو بالخصوص ایمان لانے کی دعوت کے لئے، دیکھئے مطالب الفرقان جلد اوّل صفحہ ۸۳۔ اور جلد دوم صفحہ ۱۸۲)

۲۔ لفظ اُمّی کے مفہوم کے لئے دیکھئے مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۳۴۷

۳۔ نبی اکرمؐ کی بعثت (یا نزولِ قرآن) کا مقصد یہ ہے کہ نوعِ انسان کو آزادی دلائی جائے ہم سمجھتے ہیں کہ

اسلام کا مقصد ـــــ نوعِ انسان کی آزادی

اسلام کی غرض و غایت کے لئے اس ایک لفظ (آزادی) سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

سابقہ جلدوں میں تفصیل سے بتایا جا چکا ہے کہ انسانی غلامی کو تین شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: ۱۔ ملوکیت۔ یعنی

قوت کے بل بوتے پر کمزور انسانوں سے اپنے احکام کی اطاعت کرانا۔ ملوکیت خواہ سابقہ زمانوں کی شہنشاہیت ہو، خواہ عہد حاضر کی ڈکٹیٹر شپ اور خواہ مغربی جمہوریت، سب انسانوں کی حاکمیت کی مختلف شکلیں ہیں اسلام ان سب کے خلاف نعرۂ انقلاب ہے۔ ۲۔ نظام سرمایہ داری۔ یعنی انسانوں کو روٹی کا محتاج بنا کر، اُن سے اپنی مرضی کے مطابق کام کرانا۔ قرآن اس نظام کی جڑ کاٹنے کے لئے آیا تھا۔ اور ۳۔ مذہبی پیشوائیت۔ یعنی انسانوں کی عقل و فکر کو ماؤف کر کے اُن سے خدا کے نقاب میں اپنی اطاعت کرانا۔

قرآن کریم غلامی کی ہر نوع کے لئے موت کا پیغام تھا۔ وہ ہر قسم کے اغلال و اصر کو توڑنے کے لئے آیا تھا۔ اسکے نظام میں، انسان، خدا کے احکام کے سوا کسی کا محکوم نہیں رہتا۔ یہی بعثتِ محمدیہؐ کا مقصود و مطلوب تھا۔

۴۔ زکوٰۃ کے مفہوم کے لئے انڈکس دیکھئے۔ نیز "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" کے لئے۔

۵۔ حلال و حرام کی پوری تفصیل سابقہ جلدوں میں ملے گی (انڈکس دیکھئے)

۶۔ رسول اللہؐ اور قرآن پر ایمان لانے والوں کا فریضہ الدّین (نظامِ خداوندی) کا قیام اور استحکام قرار پاتا ہے۔ یعنی ایمان اس پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے لایا جاتا ہے۔ اس کے لئے قرآن کا اتباع ضروری ہے۔

۷۔ کہا یہ گیا ہے کہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) رسول اللہؐ کی بعثت کی پیشین گوئیاں اپنی کتابوں (تورات اور انجیل) میں موجود پاتے ہیں۔ ان کتابوں میں، زمانۂ نزولِ قرآن تک میں بھی تحریف و تنسیخ ہو چکی تھی۔ (تفصیل اس کی میری کتاب "مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں" یا مطالب الفرقان کی سابقہ جلدوں میں دیکھئے)۔ لیکن اس کے باوجود، ایسا نظر آتا ہے کہ ان کے بچے کھچے آثار میں بھی یہ پیش گوئیاں کسی نہ کسی رنگ میں موجود تھیں۔

کتب سابقہ میں پیش گوئیاں

قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ لوگ رسول اللہؐ کا تذکرہ اپنی کتابوں میں مذکور پاتے ہیں۔ یہ لوگ (یہود و نصاریٰ۔ بالخصوص یہودی) اس تلاش میں رہتے تھے کہ قرآن کے خلاف اعتراض کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ آئے۔ اگر وہ اپنی کتابوں میں حضورؐ کی آمد کا تذکرہ موجود نہ پاتے، تو وہ حضورؐ کے دعویٰ نبوّت کے خلاف طوفان برپا کر دیتے۔ لیکن انہوں نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جس سے واضح ہے کہ اُس زمانے میں ان کتابوں میں یہ تذکرہ موجود تھا۔ اس چودہ سو سال میں، ان کتابوں میں جس قدر تحریف ہوئی ہے اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان میں بھی اشارات اور تلمیحات کے انداز میں بعض نشانات ملتے ہیں، (مثلاً) تورات کی کتاب استثنا میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے کہا:

میں اُن کے لئے (یعنی بنی اسرائیل کے لئے) ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کرونگا،

اور اپنا کلام اُس کے منہ میں ڈالوں گا۔ (باب ۱۸ آیت ۱۸ ۔ ۹)

بنی اسرائیل کے بھائی، بنی اسمٰعیل تھے۔ اور بنی اسمٰعیل میں سوائے نبی اکرمؐ کے کوئی نبی نہیں آیا اس لئے اس میں اشارہ حضورؐ ہی کی طرف ہے۔ اس کتاب میں ذرا آگے چل کر ہے:

خداوند سینا سے آیا۔ اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران کے پہاڑ سے وہ ان پر جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا۔ (باب ۳۳ آیت ۲)

فاران مکہ کی پہاڑی کا نام ہے۔ اور دس ہزار قدسی وہی ہیں جن کی معیت میں حضورؐ مکہ میں داخل ہوئے تھے۔

انجیل۔ کتاب متی (باب ۲۱۔ آیات ۴۲۔ ۴۳) میں ہے۔

جس پتھر کو معماروں نے رد کیا، وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا .... اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے گی، دیدی جائے گی۔ اور جو اس پتھر پر گرے گا ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔

حضرت عیسیٰؑ کے بعد خدا کی بادشاہت کا دعویٰ نبی اکرمؐ کے سوا کسی نے نہیں کیا تھا (نیز مرقس ۱۲/۱۔۱۱) یوحنا کی انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے حواریوں سے کہا:

میں باپ سے درخواست کروں گا کہ وہ تمہیں دوسرا مددگار بھیجے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے۔ (۱۴/۱۶)۔ نیز (۱۴/۲۶)

اصل لفظ فارقلیط تھا جس کا ترجمہ انجیلوں کے مختلف نسخوں میں، مختلف کیا گیا۔ میرے پیش نظر بائیبل کا وہ اردو ترجمہ ہے جسے برٹش اینڈ بائیبل سوسائٹی (لاہور) نے ۱۹۲۲ء میں شائع کیا تھا۔ اس میں اس کا ترجمہ "مددگار" کیا گیا ہے اور حاشیہ میں "وکیل یا شفیع" لکھا ہے۔ اور اسی باب کی آیت ۲۶ میں "مددگار یعنی روح القدس" لکھا ہے۔ اس کے سولھویں باب میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے حواریوں سے کہا:

لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے۔ کیونکہ اگر میں نہ جاؤں گا تو وہ مددگار تمہارے پاس نہیں آئے گا (یہاں بھی حاشیہ میں وکیل یا شفیع لکھا ہے)

عیسائیوں کی چار مروجہ انجیلوں کے علاوہ ایک اور انجیل بھی ہے جسے "انجیل برنباس" کہتے ہیں۔ (برنباس

انجیل برنباس کی شہادت

بھی حضرت عیسیٰؑ کے ایک معزز حواری تھے)۔ یہ انجیل قدرے غیر محرف معلوم ہوتی ہے (اس لئے عیسائی اسے مستند تسلیم نہیں کرتے

کی چوتھی جلد میں اس کی تفصیل دیکھی ہو گی) ۔ اس انجیل میں متعدد مقامات پر حضورؐ کا نام (محمّد الرّسول اللہ) لے کر ذکر کیا گیا ہے ۔ اس کی فصل ۱۶۳ میں ہے :

اس وقت یسوعؑ نے کہا : بھائیو ! اس میں شک نہیں کہ برگزیدگی کا سابق میں ہو جانا ایک بڑا بھاری راز ہے ۔ تاآنکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اسے صاف طور پر نہیں جانتا مگر فقط ایک ہی انسان ۔ اور وہی انسان ہے کہ اس کی طرف قومیں گردن اٹھا کر دیکھ رہی ہیں ۔ وہ ایسا انسان ہے کہ اللہ کے راز اس پر پوری طرح واضح اور جلی ہوں گے ۔ پس زہے نصیب ان لوگوں کے جو اس کے کلام پر کان لگائیں گے ۔ جب کہ وہ دنیا میں آئے گا ۔

شاگردوں نے جواب میں کہا ! اے معلم ! وہ آدمی کون سا ہو گا جس کی نسبت تو یہ باتیں کہہ رہا ہے ، اور جو کہ دنیا میں عنقریب آئے گا ۔

یسوعؑ نے دلی خوشی کے ساتھ جواب دیا ! بیشک وہ محمّد الرّسول اللہؐ ہے (۲۴۲)

میرے سامنے انجیل برنباس کا وہ اردو ترجمہ ہے جسے مولوی انشاء اللہ (مرحوم) نے اپنے اخبار وطن سے ۱۹۱۵ء میں شائع کیا تھا ۔ اس کے دیگر صفحات (صفحہ ۷۰ ؛ صفحہ ۶۴ ؛ صفحہ ۱۶۷ ؛ صفحہ ۳۰۶) پر بھی اسی طور حضورؐ کا اسم گرامی (محمد الرسول اللہؐ) مذکور ہے ۔

یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک اب یہ سوال محض نظری بن کر رہ گیا ہے ، کیونکہ انہیں خود اس امر کا اعتراف ہے کہ ان کے پاس ان کی کتابیں غیر محرف (اصلی شکل میں) کہیں نہیں ۔ ہمارے لئے یہی امر موجب اطمینان ہے کہ حضورؐ کے زمانے میں جب یہ دعویٰ کیا گیا تو یہود اور نصاریٰ میں سے کسی نے اسے چیلنج نہیں کیا ، جس کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے اسے صحیح تسلیم کر لیا ۔ ویسے بھی اس سے قبل (خود راقم الحروف کی زندگی کے ابتدائی ایام میں) ، عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں کے اکثر مناظرے ہوتے تھے ، اور ان میں اس قسم کے مسائل زیر بحث آتے تھے ۔ لیکن اب زمانے کے تقاضوں نے ہوا کا رخ بدل دیا ہے ۔ اب مذاہب کے بجائے ، نظامہائے زندگی کے متعلق بحث ہوتی ہے اور مذہب کا مدار بھی دلائل و براہان پر ہوتا ہے ۔ جوں جوں علم و بصیرت کی روشنی بڑھے گی ، مذاہب ختم ہوتے جائیں گے اور بات ادیان (نظامہائے حیات) کی رہ جائے گی ۔ ان میں اسلام (الدّین) کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکے گا ۔

متذکرہ بالا آیت میں کہا گیا تھا کہ بعثت نبی اکرمؐ کے بعد فلاح و بہبود انسانیت مشروط ہو چکی ہے رسالت محمدیہؐ

(قرآنِ مجید) کے اتباع سے۔ اگلی آیت میں اِسے نکھار کر بیان کر دیا کہ رسالت محمدیہ، تمام نوعِ انسان کے لئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہے۔ اِس لئے اب انسانیت کے منزلِ مقصود تک پہنچنے کا صرف یہی ایک راستہ ہے۔ فرمایا:

۷/۱۵۸ قُلْ يَآيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَاِ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۖ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝

خدا کے آخری رسولؐ

(اے رسولؐ!) تم تمام نوعِ انسان سے پکار کر کہہ دو کہ میں (قبائل و اقوام کی قیود، اور نسلی، وطنی اور مذہبی گروہ بندیوں کی حدود سے بلند ہو کر) پوری کی پوری انسانیت کی طرف خدا کا پیغامبر بن کر آیا ہوں ——— اُس خدا کا پیغامبر جس کی حکومت کا تختِ اجلال تمام کائنات میں بچھا ہوا ہے، جس کا قانون ہر جگہ کارفرما ہے۔ اُس کے سوا کائنات میں کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ افراد اور اقوام کی زندگی اور موت کے فیصلے اُسی کے قانون کے مطابق ہوتے ہیں۔ لہٰذا تم (اپنے اپنے غلط معتقدات وتصورات کو چھوڑ کر) اُس خدا پر ایمان لاؤ۔ اور اس کے رسولؐ پر جو {(قرآن ملنے سے پہلے ۲۹/۴۸)} اُمّی تھا۔ وہ خود بھی، سب سے پہلے، خدا پر، اور اُس کی طرف سے نازل کردہ قوانین پر ایمان لایا ہے۔ تم، ان قوانین کو عملاً متشکل کرنے کے لئے اس رسولؐ کے پیچھے پیچھے چلو۔ بس یہی ایک راستہ ہے جو تمہیں کامیابی کی منزل تک لے جائے گا۔

ہمارے ہاں، مسئلۂ ختمِ نبوت پر بھی لمبی چوڑی بحثیں ہوتی رہتی ہیں۔ (لِلّٰہ الحمد کہ ——— مرزا غلام احمد کے متبعین کو قانوناً دائرۂ اسلام سے خارج قرار دینے کے بعد بحثوں کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا)۔ میں سمجھتا ہوں کہ (دیگر آیات کے علاوہ) صرف یہ ایک آیت اس موضوع پر قولِ فیصل کا حکم رکھتی ہے۔ جس رسولؐ کی رسالت "جمیع نوعِ انسان" کے لئے ہو، اس کے بعد انسانوں کی طرف کسی اور رسول کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

آیت (۷/۱۵۵) تک حضرت موسیٰؑ کا تذکارِ جلیلہ، اور اسی ضمن میں داستانِ بنی اسرائیل مسلسل آ رہی تھی۔ درمیان میں تین آیات (۷/۱۵۶-۱۵۸) میں نبی اکرمؐ کا ذکرِ مبارک آگیا جیسے اُوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ اس کے بعد پھر وہی داستان شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن ہم نے درمیان میں سے آیات (۷/۱۴۲-۱۴۷) کو چھوڑ دیا تھا کہ ان میں ایک الگ حقیقت بیان ہوئی تھی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب ان آیات پر بھی غور کر لیا جائے۔ اور اسکے بعد

آگے بڑھا جائے۔ پہلے آیات ۱۴۳، ۱۴۲ کو یکجا لیجئے، کیونکہ ان میں ایک ہی مضمون آیا ہے۔

۷/۱۴۲-۱۴۳ وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ
رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ
قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا
وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ۗ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ
اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ
جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ
وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

حضرت موسیٰؑ کی دیدارِ خداوندی کی آرزو

پھر ایسا ہوا کہ موسیٰؑ، ہمارے حکم کے مطابق، ایک ماہ دس دن کے لئے اپنی قوم سے الگ ہوا (۲/۵۱)۔ اُس نے اپنے بھائی ہارونؑ سے کہا کہ تم میری عدم موجودگی میں، میری جانشینی کرنا اور قوم کی اصلاح کی کوشش کرتے رہنا۔ اور دیکھنا! ان میں ایسا شرارتی عنصر بھی ہے جو انتشار پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اُن کی راہ نہ چلنا۔ اُن سے محتاط رہنا۔ (۱۴۲)

اور جب موسیٰؑ ہمارے مقرر کردہ وقت پر پہنچا، اور اُس کے رب نے اُس سے باتیں کیں، تو وہ (شدتِ اشتیاق سے بے اختیار پکار اُٹھا کہ) کہ اے میرے پروردگار! تو میرے سامنے بے حجاب آجا، تاکہ تیرے دیدار سے میری نگاہ کامیاب ہو۔ اس نے کہا۔ اے موسیٰؑ! تو مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن تو اُس پہاڑ کی طرف دیکھ۔ اگر یہ اپنی جگہ پر ٹکا رہا تو تُو مجھے دیکھ سکے گا۔ سو جب جلالِ خداوندی نے اس پہاڑ پر اپنی نمود کی۔ تو اُس نے اُسے ریزہ ریزہ کر دیا (۲۱/۵۹)۔ اور موسیٰؑ بے ہوش ہو کر گر پڑا[1]۔ پھر جب وہ ہوش میں آیا تو کہا کہ بار الٰہا! تو واقعی اس سے بہت بلند ہے کہ انسان تجھے دیکھ سکے میں تیری طرف (ویسے) ہی متوجہ رہوں گا (جیسے تو نے کہا ہے)۔ میں اس حقیقت پر سب سے پہلے ایمان لاتا ہوں (کہ انسان کے لئے خدا کا دیکھنا محال ہے)۔

---

[1] یہ نبوت کے مقامات ہیں جن کی حقیقت و ماہیت سے غیر از نبی آشنا نہیں ہو سکتا۔ ان حقائق کو بیان تو ہمارے ہی الفاظ میں کیا جاتا ہے لیکن ان کی اصل و غایت کچھ اور ہوتی ہے۔ جس طرح ہم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ جبرئیل، نبیؐ پر وحی کس طرح لاتا تھا، اسی طرح ہم یہ بھی نہیں جان سکتے کہ نبیؐ اور خدا کا تعلق کیا ہوتا تھا۔ ہم نبیؐ کی طرف نازل شدہ وحی کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کے ہم مکلف بھی نہیں۔

حضرت موسیٰؑ سے متعلق ایک خصوصیت خدا سے ہم کلامی کی بتائی گئی ہے۔ اس کے متعلق تفصیلی بحث مطالب الفرقان جلد سوم ۔ صفحہ ۲۲ ۔ ۲۱ ؛ صفحہ ۴۲۸ پر گزر چکی ہے ۔ وہاں بتایا گیا ہے کہ الفاظ کوئی بھی ہوں، مقصد اُن سے وحیٔ خداوندی ہوتا ہے ۔ اور چونکہ یہ خاصۂ نبوت ہے، اس لئے کوئی غیر از نبی سمجھ نہیں سکتا کہ اس کی کُنہ و حقیقت کیا ہوتی ہے ۔ وحی کسطرح نبی پر نازل ہوتی تھی ۔ اُس وقت نبی کی قلبی کیفیت کیا ہوتی تھی ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ ہمارا تعلق وحی کے متن سے ہے جسے رسول، دوسرے انسانوں تک، بعینہٖ انہی الفاظ میں پہنچا دیتا تھا ۔ اور غور و فکر سے اسے سمجھا جا سکتا تھا ۔ اور سمجھا جا سکتا ہے ۔

لیکن یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے خدا کو بے حجاب دیکھنے کی آرزو کا اظہار کیا ہے ۔ خدا کیا ہے؟ اس کے متعلق ہم بسیط سے بسیط لفظ بھی استعمال نہیں کر سکتے ۔ وہ ذات برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم ہے ۔ اس لئے اس کے لئے الفاظ کون سے استعمال کئے جا سکتے ہیں، اس کی جو صفات قرآن میں بیان ہوئی ہیں، ہم انہی کی نسبت سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایسا ہے، اور ایسا ہے ۔ لیکن اُس وہ کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے ۔ چہ جائیکہ اسے آنکھوں سے دیکھا جا سکے ۔ اس کے خلاف اُس نے خود کہہ دیا ہے کہ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ..... (۶/۱۰۳) اس کے یہی معنی نہیں کہ اُسے آنکھیں دیکھ نہیں سکتیں ۔ یہاں لفظ ادراک آیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بصارت اور بصیرت ہر دو اعتبار سے حیطۂ ادراک میں نہیں آسکتا ۔ اس لئے اُسے آنکھ سے دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ لیکن اس کے باوجود ______ میں نامرادِ دل کی تسلی کو کیا کروں؟ یہ سوال بڑا نازک ہے، اس لئے گہرے غور و تدبر کا محتاج ہے ۔

زندگی اپنے ابتدائی مراحل طے کرتی، حیوانی سطح تک آئی تو وہ (یوں کہئے کہ خالص) طبیعاتی (PHYSICAL) یا مادیاتی (MATERIAL) تھی، اس لئے اس کی دنیا محسوسات تک محدود تھی ۔ اس کے تقاضے بھی اسی حد تک

انسانی ذات

محدود تھے، اور اس کی خواہشات بھی وہیں تک محصور ۔ لیکن جب یہ پیکرِ انسانی میں پہنچی تو اس میں ایک بنیادی تبدیلی آئی ۔ اس کا جسم اور اس کے تقاضے تو طبیعاتی سطح پر تھے ۔ لیکن اسے ایک اور شے بھی عطا ہوئی تھی، جسے اس کی ذات، نفس یا خودی سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ یہ غیر مادی ہے، اس لئے محسوسات کے دائرے میں آ نہیں سکتی[1] اسے نہ ہم دیکھ سکتے ہیں، نہ چھو سکتے ہیں ۔ یعنی اس کا

---

[1] نفسِ انسان کے متعلق تفصیلی بحث سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے ۔ دیکھئے انڈکس ۔

وجود ہے، لیکن محسوسات سے ماوراء۔ اس حد تک دیکھئے تو یہ صفتِ خداوندی کی حامل ہے۔ اس کا بھی وجود ہے، لیکن محسوسات سے ماوراء۔

مادیت سے اس قدر ماوراء ہونے کے باوجود، نفسِ انسان کا فردِ متعلقہ کے مادی جسم سے تعلق لاینفک ہے۔ وہ اپنے تمام فیصلوں کو انسانی جسم کی وساطت سے بروئے کار لاتا ہے۔ جسمِ انسانی کے ساتھ ایسا گہرا تعلق ہونے کے باوجود نفسِ انسانی، انسانی جسم کی گرفت میں نہیں آسکتا ——— لیکن انسان کو کچھ اور صلاحیتیں بھی دی گئی ہیں۔ (مثلاً) قیاس۔ تخیل۔ تصور وغیرہ۔ فوق الطبیعاتی حقائق (REALITIES) کو تشبیہات اور تمثیلات کے انداز میں بیان کیا جاتا ہے تو انسان، اپنے تخیل اور تصور کی رُو سے اُنہیں محسوس قالب میں ڈھال لیتا ہے۔ لیکن اس سے بھی اس کی تسکین نہیں ہوتی وہ غیر محسوس حقیقت کو، لباسِ مجاز میں دیکھنے کی آرزو رکھتا ہے ——— اور شدت سے آرزو۔ انسان کی اسی شدتِ آرزو کا نتیجہ تھا کہ اس نے خدا کو اوتاروں کی شکل میں ڈھال لیا۔ اور ان کے بعد ان کے مجسموں کی پرستش شروع کر دی۔ یوں بُت پرستی کی طرح پڑ گئی۔ دنیا کا قریب قریب ہر مذہب (خواہ وہ عام طور پر متعارف ہو یا غیر معروف) اسی توہم پرستی کا شکار ہے۔ وہ خدا کو کسی نہ کسی محسوس شکل میں دیکھتا ہے۔ اسی سے اس کے جذبات کی تسکین ہوتی ہے۔

خدا اور انسان

قرآن کریم نے اس توہم پرستی کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ اس نے خدا کا ایسا فوق الطبیعاتی منزہ تصور پیش کیا، جو کسی محسوس قالب میں ڈھل ہی نہیں سکتا۔ اس نے منسوب بھی ایک محسوس شے اپنی طرف کی۔ یعنی بیت اللہ (کعبہ)، لیکن وہ ایسا ہے جو بُت کی شکل اختیار ہی نہیں کر سکتا۔ جہاں تک کسی انسان کے خدا بنا دینے کا تعلق ہے، اس کے لئے حضور نبی اکرمؐ کی طرف بھی نگۂ عقیدت اُٹھ سکتی تھی۔ قرآن کریم نے حضورؐ کی بشریت کو اس وضاحت و صراحت اور اصرار و تکرار کے ساتھ پیش کیا کہ آپؐ کے (خدا ہونے کا تو ایک طرف) فوق البشر ہونے کا تصور بھی ختم کر دیا۔ (مسلمانوں نے بعد میں کیا کیا، وہ ایک الگ داستان ہے۔ اس کے لئے میری کتاب "تصوف کی حقیقت" دیکھئے، یا سابقہ جلدوں میں "غلو" کا عنوان۔ میں یہاں کتاب اللہ کی بات کر رہا ہوں نہ کہ مسلمانوں کے عام عقائد کی)۔

فوق الفطرت حقیقت کو لباسِ مجاز میں دیکھنے کی یہی شدتِ آرزو تھی جو اس استدعا کی شکل میں حضرت موسیٰؑ کی زبان پر بے ساختہ آگئی کہ رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡکَ (۷/۱۴۳)۔ اِدھر سے یہ استدعا زبان پر آئی اور اُدھر سے کسی توقف اور تامل کے بغیر یہ جواب کہ لَنۡ تَرٰىنِیۡ (۷/۱۴۳) "تو مجھے نہیں دیکھ سکتا"۔[1]

[1] خدا نے تو اپنے متعلق یہ کہا کہ کوئی انسانی آنکھ اُسے دیکھ نہیں سکتی۔ ہم نے اس باب میں کس قدر غلو کیا، اس کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۲۷۸ دیکھئے۔

اِس کے بعد حضرت موسیٰؑ کے ساتھ کیا گزری اور پہاڑ پر کیا بیتی، یہ معاملات ہماری سمجھ سے باہر ہیں۔ اس قسم کے واقعات کا تعلق نہ احکام سے ہوتا ہے، نہ راہنمائی سے۔ اس لئے اگر یہ ہماری سمجھ میں نہ بھی آئیں تو اس سے قرآنی راہنمائی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ (جہاں تک پہاڑ کے متزلزل ہونے کا تعلق ہے، اس کا ذکر سورۃ حشر کی آیت ۲۱ (۵۹/۲۱) میں بھی آیا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ "اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر نازل کرتے تو تُو دیکھتا کہ اس پر کس طرح لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ لیکن وہیں کہہ دیا گیا ہے کہ وہ محض تمثیلی بیان ہے)۔

نبی کی بشری حیثیت

ہمارے لئے اس واقعہ میں ایک ہی نکتہ موجب موعظت ہے۔ اور وہ ہے نبی کی نبوی اور بشری حیثیت میں فرق۔ نبی کو حقائق کا علم وحی کے ذریعے ہوتا تھا۔ جو حقائق اسے بذریعہ وحی نہیں بتائے جاتے تھے، یا جب تک بتائے نہیں جاتے تھے، اُن کا اسے علم نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن عام معمولات میں وہ اپنے معاشرہ ہی کا ایک فرد ہوتا تھا۔ اور اس سے اُسے صرف وحی منفرد کرتی تھی۔ حضرت موسیٰؑ کے دل میں اگر خدا کو بے نقاب دیکھنے کی آرزو اُبھری تو یہ بہ تقاضائے بشریت تھی۔ وحی نے فوراً بتا دیا کہ خدا محسوسات کا پیکر اختیار نہیں کر سکتا۔ وہ اس سے بلند و بالا اور منزہ ہے۔ اس کے بعد ایسی آرزو کبھی اُن کے لب پر نہیں آئی۔

ایک بات اور بھی غور طلب ہے۔ خدا کو بے نقاب دیکھنے کا مطالبہ قومِ موسیٰؑ نے بھی کیا تھا اور اس کی استدعا حضرت موسیٰؑ نے بھی کی لیکن دونوں میں بنیادی فرق تھا۔ قوم بنی اسرائیل نے کہا تھا کہ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً۔ (۲/۵۵)۔ "ہم تم پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک خدا کو بے نقاب نہیں دیکھیں گے"۔ اور یہ ایسی شرط تھی جو کبھی پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ لہذا یہ مطالبہ با استدعا نہیں تھی۔ جاہلانہ ضد تھی۔ اس کے برعکس جب حضرت نے اس کی استدعا کی اور وہ پوری نہ ہوئی تو انہوں نے فوراً کہا کہ انا اول المؤمنین (۷/۱۴۳)۔ "میں سب سے پہلے اس حقیقت پر ایمان لاتا ہوں کہ خدا کی ذات ایسی ہے جسے دیکھا نہیں جا سکتا"۔ یہ ہوتا ہے فرق ضد پر مبنی مطالبات اور حسنِ نیت پر مبنی درخواستوں میں۔

اس کے بعد حضرت موسیٰؑ کو اُن کے مقامِ بلند سے آگاہ کیا اور ضروری احکامات وحی فرمائے:

۷/۱۴۴ قَالَ يٰمُوْسٰۤى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ ۖ فَخُذْ مَاۤ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝

اللہ نے کہا کہ اے موسیٰؑ! میں نے تجھے دوسرے لوگوں سے ممتاز کیا ہے، دو باتوں میں ——— ایک یہ کہ تجھ سے میں نے باتیں کی ہیں (یہ نبوّت ہے)؛ اور دوسرے یہ کہ تجھے اس پر مامور کیا ہے کہ جو کچھ تم سے کہا گیا اُسے دوسروں تک بھی پہنچاؤ۔ (یہ رسالت ہے) لہٰذا جو کچھ میں نے تمہیں دیا ہے ——— یعنی احکامِ خداوندی ——— اُسے مضبوطی سے تھامے رہو اور (ان پر عمل پیرا ہو کر) ان برگزیدہ لوگوں میں سے ہو جاؤ جنکی محنتیں بھرپور نتائج پیدا کیا کرتی ہیں۔

الواحِ حضرت موسیٰ اُس زمانے کے معمول کے مطابق حضرت موسیٰؑ نے ان احکام کو تختیوں پر لکھ لیا تھا۔ محققین آثارِ قدیمہ کو اُس زمانے کے کھنڈرات سے ایسی مٹی کی (یا ریاں) تختیاں ملی ہیں جن پر تحریریں منقوش ہیں۔ واضح رہے کہ یہ نہیں تھا کہ خدا آسمان سے لکھی لکھائی تختیاں نازل کیا کرتا تھا یا کتابیں۔

حضراتِ انبیاء کرام خدا کی وحی کو اس طرح محفوظ کر لیا کرتے تھے۔ فرمایا:

۱۴۵ وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ مِن كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَأْمُرْ قَوْمَكَ يَأْخُذُوا بِأَحْسَنِهَا ۚ سَأُورِيكُمْ دَارَ الْفَاسِقِينَ ○

اور ہم نے ان تختیوں پر (جن پر موسیٰؑ نے وحی لکھی تھی) دین کے ہر گوشے سے متعلق احکام اور اخلاقی قدریں صاف صاف بیان کر دی تھیں۔ (یعنی ہم نے ان امور کو موسیٰؑ پر وحی کیا اور موسیٰؑ نے انہیں، اس زمانے کے قاعدے کے مطابق، تختیوں پر منقش کر لیا) ہم نے موسیٰؑ سے کہہ دیا کہ (وہ بھی انہیں ہر وقت پیشِ نظر رکھے) جو معاملہ سامنے آئے، یہ دیکھے کہ ان احکام میں سے کونسا حکم اُس کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہے۔ اُس کا اتباع کرے ($\frac{۳۹}{۱۸}$)۔ (اگر تمہاری قوم نے ایسا کیا تو) وہ بہت جلد دیکھ لے گی کہ (ان کے مطابق عمل کرنے سے کیسے خوشگوار نتائج مرتب ہوتے ہیں اور) ان کے خلاف چلنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

انہی کے متعلق کہا:

۱۴۶-۱۴۷ سَأَصْرِفُ عَنْ آيَاتِيَ الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَإِن يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوا بِهَا ۚ وَإِن يَرَوْا سَبِيلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا ۚ وَإِن يَرَوْا سَبِيلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا

عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ ع

جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ وہ، نوعِ انسانی کے لئے تعمیری کام کئے بغیر دنیا میں بڑائی حاصل کریں (۲۸/۳ ؛ ۹/۲۸) وہ ہمارے قوانین سے اپنا رُخ پھیر لیتے ہیں[۱] ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ خواہ اپنی غلط روش کے ایک ایک نتیجہ کو بھی اپنے سامنے کیوں نہ دیکھ لیں، وہ پھر بھی صحیح روش اختیار نہیں کرتے۔ (ان کا بے جا غرور انہیں اس طرف آنے ہی نہیں دیتا) ان کے سامنے زندگی کی صحیح روش کیسی ہی نمایاں طور پر کیوں نہ آجائے، وہ اس پر کبھی نہیں چلتے۔ لیکن اگر غلط راستہ سامنے آجائے تو اُس پر فوراً چل پڑیں گے۔ ان کی یہ حالت اس لئے ہو جاتی ہے کہ وہ ہمارے قوانینِ زندگی کو جھٹلاتے ہیں اور اس سے لاپرواہی برتتے ہیں۔ (۱۴۶)

یاد رکھو! جو لوگ بھی ہمارے قوانین کو جھٹلائیں، اور اسے کبھی تسلیم نہ کریں کہ ان کی غلط روش کے نتائج، ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق ضرور سامنے آکر رہیں گے (خواہ اس دنیا میں، یا اس کے بعد کی زندگی میں) اُن کا کیا کرایا سب رائگاں جاتا ہے۔ (اس سے وہ خوشگوار نتائج کبھی مرتب نہیں ہوتے جو اُن لوگوں کے پیشِ نظر ہوتے ہیں جس قسم کا عمل، ویسا ہی اس کا نتیجہ (لہٰذا، جن اعمال میں تعمیرِ انسانیت کا کوئی پہلو نہ ہو ان کا نتیجہ تعمیری کسطرح ہو سکتا ہے؟)

آیات کا مفہوم تو واضح ہے، لیکن ان میں جو آیا ہے: سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ۔ تو ان الفاظ کا ترجمہ عام طور پر یوں کیا جاتا ہے ——— "میں پھیر دوں گا اپنی آیات سے ان کو جو تکبر کرتے ہیں زمین میں ناحق"۔

قانونِ مکافاتِ عمل

"میں پھیر دوں گا" سے ذہن اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ خدا لوگوں کو اپنی آیات (احکام یا قوانین) سے پھیر دیتا ہے، لیکن اس موضوع پر سابقہ جلدوں میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ (مثلاً عنوان "تقدیر" یا "مکافاتِ عمل" وغیرہ) کہ اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ ایسا کچھ قوانینِ خداوندی کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ اور یہاں تو بات ویسے بھی واضح ہے۔ قوانینِ خداوندی

---

[۱] الفاظ یہ ہیں "ہم ان کا رُخ پھیر دیں گے"۔ قرآن کریم کا اسلوب یہ ہے کہ جو نتائج خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق برآمد ہوتے ہیں، اُن کی نسبت خدا خود اپنی طرف کرتا ہے۔ مزید تشریح کے لئے دیکھئے (۹/۱۲۷ ؛ ۵۱/۹ ؛ ۶۱/۵ ؛ ۸۳/۱۴)۔ اس ضمن میں (۷/۴) اور (۴/۱۵۵) بھی قابلِ غور ہیں۔

سے رُخ اُن کا پھرتا ہے ـــــــ اَلَّذِیۡنَ یَتَکَبَّرُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ - یعنی جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں - قوانینِ خداوندی کے بجائے اپنا اقتدار قائم کرتے ہیں - اگلے الفاظ نے اس کی مزید وضاحت کر دی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ہزار نشانیاں دیکھنے کے باوجود ایمان نہیں لائیں گے - صحیح راستہ سامنے آجانے کے بعد بھی اُسے اختیار نہیں کریں گے - غلط راستے کی طرف سبقت کرتے جائیں گے - ان امور سے بھی واضح ہے کہ یہ سب انسانوں کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے - اس کا نام مکافاتِ عمل ہے - ذٰلِکَ بِاَنَّهُمۡ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا... نے بات بالکل واضح کر دی - یعنی یہ سب اس لئے ہوتا ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کی تکذیب کرتے ہیں -

یہاں یَتَکَبَّرُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ - کو جُرم قرار دیا گیا ہے - یعنی وحیٔ خداوندی کو چھوڑ کر اقتدار (کبریائی) حاصل کرنا جرم ہے - بالفاظِ دیگر اقتدار حاصل کرنا جُرم نہیں، اسے وحیٔ خداوندی کے تابع نہ رکھنا جُرم ہے - وحیٔ خداوندی کو دنیا میں نافذ کرنے کے لئے تو اقتدار (استخلاف - تمکن) لاینفک ہے ـــ الدین نام ہی اس کا ہے - اس موضوع پر مطالب الفرقان جلد اوّل صفحہ ۲۴۳ (آیت ۲/۱۱-۱۲) میں تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے - اس کے علاوہ آیات (۱۰/۲۳) و (۲۸/۸۳) و (۴۱/۱۵) و (۴۲/۴۲) و (۴۶/۲۰) میں بھی اس کا اعادہ کیا گیا ہے - (انڈکس میں عنوان علو دیکھئے)

اس کے بعد آیات (۷/۱۵۸) تک پہلے آچکی ہیں، اور آیت (۷/۱۵۹) سے پھر داستانِ بنی اسرائیل شروع ہو جاتی ہے - جو اگلی جلد میں سامنے آئے گی -

---

بنگر کہ جوئے نور چہ مستانہ می رود

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

انڈکس

مطالبُ الفرقان جلد پنجم

مطالب الفرقان کی پہلی تین جلدوں کا انڈکس جلد سوم کے آخر میں شائع کیا گیا تھا اور جلد چہارم کا انڈکس اُسی جلد کے آخر میں۔ پانچویں جلد کا انڈکس درج ذیل ہے۔ حوالہ میں جہاں صرف لفظ "انڈکس" لکھا جائے گا اس سے مراد پہلی تین جلدوں کا مشترکہ انڈکس ہوگا۔ باقی جلدوں کے انڈکس کے ساتھ متعلقہ جلد کی تصریح کر دی جائے گی۔ آپ کو جس موضوع کی بھی تلاش ہو بہتر ہوگا کہ آپ اسے تینوں انڈکسوں میں دیکھ لیں۔ جب یہ تفسیر مکمّل ہو جائے گی تو اس کے تمام انڈکس جامع طور پر یک جا کر دئیے جائیں گے۔ وہ تمام قرآن کریم کا جامع انڈکس ہوگا۔

انڈکس میں بائیں جانب سورۃ کا نمبر ہے اور دائیں جانب آیت کا نمبر۔ مثلاً (۴ : ۳۸) سے مراد ہے چوتھی سورۃ کی اڑتیسویں آیت۔ وقس علیٰ ہٰذا۔

۲۔ انڈکس کے حوالوں میں کہیں غلطی نظر آئے تو اس سے ہمیں مطلع فرمائیں۔

مضمون	صفحہ	آیت
الف		
آرٹ اور اسلام۔	۱۸۳	۷ : ۳۲
آل — درود میں آل کا اضافہ۔	۶۵	۶ : ۹۱
ابراہیمؑ (حضرت) کی داستانِ حیات۔ والد کو تنبیہ۔ حقائقِ کائنات کا مشاہدہ۔ ستارہ پرستی کے خلاف مفسرین کی غلط نگہی	۵۳	۶ : ۷۵ تا ۶ : ۷۹
(ملت) ابراہیمی کا اِتباع۔	۱۴۹	۶ : ۱۰۲
(ذریت) ابراہیمی اور انبیاء کا سبق۔	۶۲	۶:۸۵-۸۹
اِتباع اور اطاعت میں فرق۔	۱۵۷	۷ : ۱و۲
اجرِ رسالت		
رسول اجرِ رسالت نہیں مانگتے تھے — مودۃ فی القربیٰ کا مفہوم	۶۵	۶ : ۹۱

مضمون	صفحہ	آیت
اختیارات سے ذمہ داریوں کی پرکھ ہوتی ہے	۱۵۱	۶:۱۶۶
اخروی زندگی اور قرآن پر ایمان لازم و ملزوم ہیں۔	۲۰	۶:۲۹ تا ۶:۳۴
اِذن کے معنی قانونِ خداوندی۔	۲۱۴	۷:۵۸
اِرتقاء		
نظریۂ ارتقاء کا بُنیادی اصول۔	۲۵	۶:۳۸
مستقر و مستودع۔	۵۴	۶:۹۹
اربابِ اقتدار کے بگڑنے سے ساری قوم بگڑ جاتی ہے	۴۵	۶:۶۵
ارض و سماء میں اللہ۔	۵	۶:۳
اِستہزاء کا انجام۔	۵، ۱۴۸	۶:۱۰،۱۱، ۶:۶۸-۷۰
اسلاف کے مسلک کا اِتباع۔	۱۶۱	۷:۳
اسلام کے لئے شرحِ صدر کی ضرورت	۱۲۲	۶:۱۲۶-۱۲۸
اسلام کسے کہتے ہیں۔	۱۵۰	۶:۱۶۳-۱۶۴
اعراف کا مفہوم۔	۲۰۲	۷:۴۸
اعمال نامہ کی تفصیل۔	۴۲	۶:۶۱-۶۲
اقتدار بغیر الحق جُرم ہے۔	۲۴۰	۷:۱۴۷
اقوام (اور افراد) کی موت و حیات	۴	۶:۲
اقوامِ سابقہ کا انجام۔ (نیز دیکھئے قوم)	۶، ۱۲۶	۶:۴-۶، ۶:۲۴-۲۵
اقوامِ سابقہ کی تباہی۔	۱۶۲	۷:۵
(تباہی سے پہلے دو شرائط کا پورا ہونا)	۱۶۴	۷:۶

مضمون	صفحہ	آیت
اکثریت کی تائید حق کا معیار نہیں ہو سکتی	۱۰۳	۶:۱۱۷-۱۱۸
اِلا ماشاء اللہ کا مفہوم۔	۱۲۳	۶:۱۲۹-۱۳۲
انبیاء		
تمام انبیاء اُمتِ واحدہ کے افراد تھے۔	۶۴	۶:۹۰
انبیاء کی دعوت کے دُشمن۔	۹۹	۶:۱۱۳،۱۱۴
انسان کے اور خدا کے صاحب اختیار ہونے میں فرق	۱۰	۶:۱۲
انسانی اختیار سلب کرکے ایمان لانے پر مجبور کرنا مشیتِ خداوندی نہیں ہے	۲۳	۶:۳۵
اولیاء اللہ		
یہ عقیدہ کہ اولیاء اللہ خدا کی محفل میں شریک ہوتے ہیں — باطل ہے	۹۰	۶:۱۰۳-۱۰۴
الیسعؑ کے متعلق ضمنی اشارہ۔	۷۹	۶:۹۴
ایمان		
ایمان عقل و فکر کی رُو سے لایا جاتا ہے	۲۴	۶:۳۶
ایمان بلا عمل۔	۱۴۵	۶:۱۵۹
انسان کو ایمان لانے پر مجبور کرنا خلافِ مشیّتِ خداوندی ہے	۲۳	۶:۳۵، ۶:۱۰۸
دل مانتا ہے، لیکن جھوٹی عزت کا خیال اعتراف نہیں کرتا	۳۳۱	۷:۱۰۱

ب

مضمون	صفحہ	آیت
برکت کے معنی۔	۷۸	۶:۹۳
بنی اسرائیل کے لیے نبی اکرمؐ پر ایمان لانا ضروری ہے۔	۴۰۸	۷:۱۵۷
بہائیوں کی گمراہی۔	۱۹۰	۷:۳۴
بے حیائی کے خلاف۔	۱۳۸	۶:۱۵۲
ت		
تباہی کی دو شرائط: ہدایت پہنچ چکی ہو اور اس کے سمجھنے کی صلاحیت ہو	۱۲۳	۶:۶۸–۷۰ ، ۶:۱۲۹–۱۳۲
تخلیقِ انسانی نفسِ واحدہ سے	۸۶	۶:۹۹
تسبیح کا مفہوم۔	۳۴۱	
تصریفِ آیات سے قرآن فہمی۔	۹۲	۶:۱۰۶
تفرقہ شرک سے بھی بدتر ہے۔	۴۰۹	۷:۱۵۱
تقدیر		
الا ماشاء اللہ کا مفہوم۔	۱۲۳	۶:۱۲۹ تا ۱۳۲
اگر خدا کو منظور ہو گا تو..	۱۳۶	۶:۱۴۹ تا ۱۵۱
تقدیر اور تقلید دونوں خلافِ قرآن۔	۱۷۸	۷:۲۸
توبہ		
تباہی سامنے آجانے کے بعد توبہ بے معنی ہے۔	۱۴۵	۶:۱۵۹
جہالت سے غلط اقدام اور توبہ	۳۵	۶:۵۴
توہم پرستیاں۔	۸۹ ، ۱۲۸	۶:۱۰۱ ، ۶:۱۳۷–۱۴۱
توحید سے خوف مٹ جاتا ہے۔	۵۹	۶:۸۱ تا ۸۲
تھیاکریسی سنگین ترین جرم۔	۷۹	۶:۹۴
ج		
جان		
ہر انسانی جان یکساں واجب الاحترام ہے	۱۳۸	۶:۱۵۲
جائز ذرائع سے فراوانیٔ رزق۔	۲۸	۶:۴۴
جرم کی سزا، جرم کے مطابق۔	۱۴۸	۶:۱۶۱
(فقہ کا ناقابلِ بیان فیصلہ)	۱۴۸	۶:۱۶۱
جمہوریت — (مغربی)		
خلافِ قرآن ہے۔	۱۰۳	۶:۱۱۷–۱۱۸
جمہوریت کی تاریخ۔	//	//
جمہوریت مغرب میں بھی غیر مقبول ہو رہی ہے۔	۱۰۳	//
جنّ و انس کا اجتماع۔	۹۹	۶:۱۱۳–۱۱۴ اور ۶:۱۲۸–۱۳۲
جنّت — اہلِ جنّت کے دلوں سے غِل کا دور ہو جانا	۱۹۷	۷:۴۲–۴۳
جنّت — اہلِ جنّت و جہنّم کا مکالمہ	۱۹۹	۷:۴۴
جنسی خواہش پر ضبط۔	۱۳۸	۶:۱۵۲
جہنّم میں قوموں کا مکالمہ۔	۱۹۲	۷:۳۷

مضمون	صفحہ	آیت
ح		
حاکم اور رب کا باہمی تعلق ۔	۱۵۱	۶:۱۶۵
حبطِ اعمال ۔	۱۶۸	۷:۷-۹
حرام اشیاء ۔	۱۳۵	۶:۱۴۶
حرام وحلال کی فقہی فہرستیں ۔	۸۷	۷:۳۲
حقوق اللہ وحقوق العباد ۔	۱۳۱	۶:۱۴۲-۱۴۵
حکم ۔ کتاب ۔ نبوّت ۔	۶۴	۶:۹۰
حکومت (وراثتِ ارض) کا قانون ۔	۳۹۸	۷:۱۲۸-۲۹
حکومت صرف اللہ کی ہے	۵۹ ۱۰۱	۶:۸۱-۸۲ ۷:۱۱۵
حلال وحرام کی فقہ کی مرتب کردہ فہرستیں ۔	۱۳۱ ۱۳۵	۶:۱۴۲-۱۴۵ ۶:۱۴۷-۱۴۸
حلال میں سے طیب کھاؤ ۔	۱۱۵	۶:۱۲۰
حلال ۔ جس پر اللہ کا نام نہ لیا جائے وہ حلال نہیں ۔	۱۱۵	۶:۱۱۹-۱۲۲
حنیف کا مفہوم ۔	۱۳۴	۶:۱۶۲
خ		
ختم نبوّت کے بعد کشف والہام کے مدعی	۷۹	۶:۹۴
خدا ”ایسا کرتا ہے“ کا مفہوم ۔	۳	۶:۱
〃 ۔ انسان کو مجبوراً صحیح راہ پر نہیں چلاتا	۹۵	۶:۱۰۸
خدا ۔ اور انسان کے اختیار میں فرق ۔	۱۰	۶:۱۲
〃 ۔ خدا وسعت سے زیادہ مکلّف نہیں ٹھہراتا	۹۵ ۱۵۱	۶:۱۰۸ ۶:۱۵۲
〃 ۔ نے اپنے آپ پر پابندیاں عائد کر رکھی ہیں	۱۰	۶:۱۲
〃 ۔ کی اولاد کا عقیدہ ۔ اس کی بیوی ہی نہیں پھر اولاد کیسے ہو سکتی ہے	۸۹	۶:۱۰۲
〃 ۔ کا ادراک کوئی آنکھ نہیں کر سکتی ۔	۹۰	۶:۱۰۳-۱۰۴
〃 ۔ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا ۔	۱۰	۶:۱۲
〃 ۔ کی ہمسر قوتیں ۔	۲۷	۶:۴۱-۴۳
〃 ۔ کی دعوت کے سوا ہر دعوت گمراہی ہے ۔	۵۰	۶:۷۱-۷۲
〃 ۔ کا صحیح تصوّر وہی ہے جسے خود خدا دے ۔	۷۶	۶:۹۲
〃 ۔ خدا مصیبت کے وقت یاد آتا ہے ۔	۴۴	۶:۶۳-۶۹
خلافت فی الارض ۔	۱۵۲	۶:۱۶۶
د		
درجات مطابقِ اعمال ۔	۱۲۵	۶:۱۳۳
درود میں آل کا اضافہ ۔	۶۵	۶:۹۱

مضمون	صفحہ	آیت
درس کے معنی	۹۳	۶:۱۰۶
دعاوی کے سچے اور جھوٹے ہونے کا ثبوت — محسوس نتائج۔	۱۲۶	۶:۱۳۶
دنیاوی زندگی لہو ولعب سے زیادہ کچھ نہیں۔	۲۰	۶:۲۹-۳۴
دنیا میں واپسی — مرنے کے بعد دنیا میں واپسی نہیں ہوگی۔	۲۰۴ ۱۹	۷:۵۲ ۶:۲۵-۲۸
دو قومی نظریہ۔	۱۸۰ ۲۲۲	۷:۳۰ ۷:۵۹
دین شروع سے ایک ہی رہا ہے (شریعت بدلتی ہے)	۶۵	۶:۹۱
دین اور دنیا کا ارتباط۔	۳۲۸	۷:۹۶

ذ

مضمون	صفحہ	آیت
ذبح کے وقت خدا کا نام لینا ضروری ہے۔	۱۱۵	۶:۱۱۹-۱۲۲
ذکر کا مفہوم۔	۳۴۱	

ر

مضمون	صفحہ	آیت
رب صرف خدا ہے۔	۱۵۱	۶:۱۶۵
رب اور حاکم کا باہمی تعلق	؍؍	؍؍
رحمت — خدا نے اپنے اُوپر رحمت فرض قرار دی۔	۱۰ ۳۵	۶:۱۲ ۶:۵۴
رزق — حصولِ رزق کی صلاحیتیں خدا کی عطا کردہ ہیں۔	۳۰	۶:۴۶
رسولؑ بھی اگر معصیت کا مرتکب ہو تو مؤاخذہ سے بچ نہیں سکتا	۱۲	۶:۱۵-۱۸
رسولؐ کا وحی کے مطابق نظام قائم کرتا تھا۔	۷	۶:۷-۹
رسولؑ کا اعلان کہ میرے پاس خزانے نہیں، غیب کا علم نہیں جانتا، فرشتہ نہیں ہوں، میں صرف وحی کا اتباع کرتا ہوں۔	۳۲	۶:۵۰
رسولؐ کا فریضہ راستہ دکھانا ہے، زبردستی راستے پر چلانا نہیں۔	۴۶	۶:۶۶
لوگوں پر قرآن پہنچاتے رہنا۔	۴۸	۶:۶۸-۷۰
رسولؐ کی بشریت۔	۵۳	۶:۷۵-۷۶
رسولؐ کی مجلس میں منافقانہ شرکت۔	۱۹	۶:۲۵-۲۸
رسولؐ کو جھوٹا نہیں کہتے، وحی کی تکذیب کرتے ہیں۔	۲۰	۶:۲۸-۳۴
رسولؐ کو اتباعِ قرآن کا حکم۔	۵۴	۶:۱۰۷
رسولوںؑ کی (آخر الامر) کامیابی۔	۲۰	۶:۲۹-۳۴
رسولوںؑ کی دعوت پر سب سے پہلے غریب لوگ لبیک کہتے تھے۔	۳۳	۶:۵۱

مضمون	صفحہ	آیت
اُنہیں دھتکارو نہیں۔	۳۴	۶:۵۲
رسولؐ، نہ ماننے والوں کے غم میں گھُلے جاتے تھے۔	۲۲	۶:۳۵
رسولؐ کوئی اجرِ رسالت نہیں مانگتا تھا۔	۲۸	۷:۷۹
رسولؐ کی بعثت کا مقصد		
نوعِ انسانی کی غلامی کی زنجیریں توڑنا۔	۴۰۸	۷:۱۵۷
حضورؐ تمام نوعِ انسانی کی طرف رسولؐ ہیں۔	۴۱۳	۷:۱۵۸
رجس۔	۱۲۲	۶:۱۲۶-۱۲۸

ز

مضمون	صفحہ	آیت
زمین میں مرنے جینے کا مفہوم۔	۱۷۶	۷:۲۵
زیب و زینت کی چیزیں حرام نہیں۔	۱۷۶	۷:۲۶-۲۷
	۱۸۱-۸۲	۷:۳۱-۳۲

س

مضمون	صفحہ	آیت
سائنس (دیکھئے علومِ سائنس)	۸۶	
سعد و نحس کا مفہوم۔	۲۶۳	۷:۷۲
سماء ـــ ارض و سماء میں اِلٰہ	۵	۶:۳
سُنت اللہ اور کلمت اللہ۔	۱۰	۶:۱۲
سُنت اللہ اور کلمت اللہ۔ غیر متبدل۔	۲۰	۶:۲۸-۳۴

ش

مضمون	صفحہ	آیت
شرحِ صدر۔ کے معنی۔	۱۵۴	۷:۱-۲
شرک مت کرو۔	۱۳۸	۶:۱۵۲
شرک ظلمِ عظیم ہے۔	۶۱	۶:۸۳
شرک کا لازمی نتیجہ خوف ہے۔	۵۹	۶:۸۱-۸۲
شرک۔ مومن کہلاتے ہوئے بھی مشرک۔	۶۱	۶:۸۳
شعیبؑ (حضرت)۔	۳۰۹	۷:۸۸
شفاعت کے غلط مفہوم	۱۴	۶:۱۵-۱۸
	۲۰۵	۷:۵۲
شیٰطین الاُنسِ والجن۔	۹۸	۶:۱۱۳-۱۱۴

ص

مضمون	صفحہ	آیت
صالحؑ (حضرت)۔	۲۶۵	۷:۷۴
ناقۂ حضرت صالحؑ۔	۲۷۵، ۲۸۷	۷:۷۳
اسے آیت اللہ کہا گیا۔	۲۸۸	۷:۷۵
صحابہؓ ـــ بارگاہِ نبویؐ میں صحابہ کا مقام	۳۴ ۳۵	۶:۵۲ ۶:۵۴
صلوٰۃ ـــ اِقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم کتاب اللہ کی اطاعت ہے	۵۰	۶:۷۱-۷۲
صلوٰۃ کا مفہوم حضرت شعیبؑ کی زبانی۔	۳۱۷	۷:۹۰
صُور کا اجمالی مفہوم۔	۵۲	۶.۰-۳۷۴

ض

مضمون	صفحہ	آیت
ضد۔ ایک دفعہ نہ کردی، پھر اس پر اڑے رہے۔	۹۷	۶:۱۱۰-۱۱۲

ظ

مضمون	صفحہ	آیت
ظالمین کی جڑ کٹ جاتی ہے۔	۱۲۶ / ۲۹	۶:۱۳۶ / ۶:۴۵
ظاہر و باطن ممنوع سے اجتناب۔	۱۱۷	۶:۱۲۱
ظاہرا احکامِ شریعت کی اطاعت ضروری ہے۔	۱۱۷	۶:۱۲۱

ع

مضمون	صفحہ	آیت
عاد (قوم)۔	۲۴۷	۷:۵۹
وہ مستبصرین تھے۔	۲۵۷	۷:۷۰
عدل کی تاکید۔	۱۴۱	۶:۱۵۳
عذاب کی شکلیں۔	۴۵	۶:۶۵
علم و بصیرت سے مدارج بلند ہو جاتے ہیں۔	۷۹	۶:۹۴
علومِ سائنس کی اہمیت۔	۸۴ / ۵۴	۶:۹۶-۹۸ / ۶:۷۷-۷۹
عورت کی دیت مرد سے نصف	۱۳۸	۶:۱۵۲
عہد کا ایفا۔	۱۴۱	۶:۱۵۳

غ

مضمون	صفحہ	آیت
غیب۔ رسولؐ غیب نہیں جانتے تھے۔	۳۲	۶:۵۰
غیب کے امور	۳۸	۶:۵۸-۵۹

ف

مضمون	صفحہ	آیت
فُرادیٰ کا مفہوم۔	۸۱	۶:۹۵
فرقہ بندوں کا رسولؐ سے کچھ واسطہ نہیں۔	۱۴۷	۶:۱۶۰
تمام انبیاء اُمتِ واحدہ کے افراد تھے	۷۴	۶:۹۰
فرعون کی بیوی۔	۳۰۰	
فقہا سند نہیں ہو سکتے۔	۱۳۷	۶:۱۵۱
فنا اور بقا کا مفہوم۔	۵۴	۶:۷۷-۷۹
فواحش کا مفہوم۔	۱۸۸	۷:۳۳

ق

مضمون	صفحہ	آیت
قتلِ نفس۔	۱۳۸	۶:۱۵۲
قرآن (کتاب اللہ و قانون)		
قرآن اور اُخروی زندگی پر ایمان لازم و ملزوم ہیں۔	۲۰	۶:۲۹-۳۴
قرآن کی مثل۔ مثلہ و معہ کا عقیدہ	۷۹	۶:۹۴
قرآن کی وضاحت خود خدا نے کر دی ہے	۹۲	۶:۱۰۶

مضمون	صفحہ	آیت
قرآن ہی صراطِ مستقیم ہے۔	۱۴۳	۶:۱۵۴
قرآن کا اتباع ہی اتباعِ سُنّت ہے۔	۱۴۳	۶:۱۵۴
قرآن کی طرف وحیا آرہی ہے۔	۱۰۳	۶:۱۱۷-۱۱۸
قانون غیر مبہم ہونا چاہیئے۔	۳۶	۶:۵۵
قانون کا مُدعی دوسروں کے جذبات کا اتباع نہیں کرتا۔	۳۷	۶:۵۶
بصائر کا مجموعہ۔	۹۱	۶:۱۰۵
تصریفِ آیات سے قرآن فہمی۔	۹۲	۶:۱۰۶
نکھار کر بات کرنے والی کتاب	۱۰۱	۶:۱۱۵
مکمل اور غیر متبدل۔	۱۰۲	۶:۱۱۶
سند صرف خدا کی کتاب ہے۔	۱۰۱	۶:۱۱۵
(کتابِ موسیٰ کے بعد) آخری کتاب	۱۴۳	۶:۱۵۴
کتاب اللہ مبارک ہے۔	۷۸	۶:۹۳
اہلِ عرب کی طرف کتاب تاکہ اتمامِ حجت ہو جائے۔	۱۴۴	۶:۱۵۷-۱۵۸
ہم قرآن کی عملی تکذیب کرتے ہیں۔	۱۴۴	۶:۱۵۷-۱۵۸
قیامت تک ضابطۂ حیات۔	۱۵	۶:۱۹
یہ اُنہی کے لئے مفید ہوگا جو زندہ ہوں۔	۱۲۰	۶:۱۲۳
قوم — (نیز اقوام)		
اقوامِ سابقہ کے مآل کی مثال۔	۶	۶:۴-۶
قوموں کی تباہی کے اسباب۔	۲۷	۶:۴۰-۴۳

مضمون	صفحہ	آیت
اقوام اور افراد کی موت وحیات (ہلاکت)	۴ ۳۱	۶:۲ ۶:۴۸-۴۹
قانونِ استبدالِ قومی۔	۱۲۶	۶:۱۳۴-۱۳۵
قہر — قہار		
خدا کے قہر اور انسانوں کے قہر میں فرق۔	۱۴	۶:۱۵-۱۸
ک		
کائنات		
خُدا کی محکم اسکیموں کے مطابق	۵۲	۶:۷۳-۷۴
حقائقِ کائنات کا مشاہدہ (ابراہیمؑ)	۵۳	۶:۷۵-۷۶
ہر شئے تغیر پذیر۔	۵۴	۶:۷۷-۷۹
مظاہرِ کائنات۔	۸۴	۶:۹۶-۹۸
آیات للمومنین۔	۸۸	۶:۱۰۰
کتاب و حکم و نبوّت۔	۶۴	۶:۹۰
کفار اپنے اپنے اعمال کا بدلہ اسی دنیا میں لے لیتے ہیں	۱۶۸	۷:۷-۹
کلماتُ اللہ۔	۲۰ ۹	:۲۹-۳۴ ۶:۱۲
ل		
لُوط (حضرت لوطؑ و قومِ لوط)	۲۹۰	۷:۸۰

مضمون	صفحہ	آیت
تورات کی افسانہ طرازیاں۔	۳۰۴	۷:۸۴
ایک طرف حضرت لوطؑ اور حضرت نوحؑ کی بیویاں، دوسری طرف فرعون کی بیوی	۳۰۰	۷:۸۴
م		
مارس بکائیؒ (MAURICE BUCCAELLE) (فرانس کا سائنس دان)		
اُس کی تحقیق۔	۲۰۸	۷:۵۴
مدین کی قوم۔	۳۰۵	۷:۸۵
مسجد کے معنی اطاعت کرنا۔	۱۷۸	۷:۲۹
معاشی نظام		
زمین تمام انسانوں کے لئے ذریعۂ رزق ہے۔	۱۶۹	۷:۱۰
متاع کا مفہوم۔	۱۷۰	۷:۱۱-۲۴
ناقۂ حضرت صالحؑ۔	۲۷۵	۷:۷۳
حضرت شعیبؑ کا معاشی نظام۔	۳۰۹	
انبیاء کی دعوت پر غریب لبیک کہتے تھے	۳۴	۶:۵۲
یہ نظام تمام افراد کی ضروریات پوری کریگا۔ خود کچھ نہیں ہوگا	۱۳	۶:۶۳-۶۴
معاشی تحقیقات قرآن کے خلاف نہیں	۳۴	۶:۵۲
بڑے لوگوں کی فرعونیت۔	۳۴	۶:۳۳

مضمون	صفحہ	آیت
اکابر مجرمین کی طرف سے مخالفت	۱۲۰	۶:۱۲۴-۱۲۵
مفلسی اور افراطِ زر دونوں تباہی کا موجب	۲۷	۶:۴۰-۴۳
ماپ تول پورا رکھو۔	۱۴۱	۶:۱۵۳
جائز اور ناجائز ذرائع رزق۔	۲۸	۶:۴۴
حصولِ رزق کی صلاحیتیں۔	۳۰	۶:۴۶
نظامِ سرمایہ داری کی تردید (قارون)	۲۹	۶:۴۵
سامانِ نشو و نما۔	۸۸	۶:۱۰۰
معبودانِ باطل کو گالی مت دو۔	۹۵	۶:۱۰۹
معجزات طلبی اور انکار۔	۱۵۶ ۹۷ ۲۴ ۷	۷:۱-۲ ۶:۱۱۱-۱۱۲ ۶:۳۷ ۶:۷-۹
معجزات دکھانے پر بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے۔	۲۳	۶:۳۵
مکافاتِ عمل۔ (قانونِ مکافات)	۱۵۰	۶:۱۶۵
تنذیر سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو قانونِ مکافات پر یقین رکھیں۔	۳۳	۶:۵۱
قانونِ مہلت۔	۳۷ ۴۷	۶:۵۷ ۶:۶۷
ظہورِ نتائج کے بعد تأسف و ندامت بے کار ہے۔	۲۰	۶:۲۸-۳۴

مضمون	صفحہ	آیت
ہر عمل اپنے لئے۔	۹۱	۶:۱۰۵
مکافاتِ عمل پر یقین۔	۳۳	۶:۵۱
مستقر و مستودع۔	۸۴	۶:۹۹
مجرم الگ ہو جائیں گے۔	۳۶	۶:۵۵
مذہبی پیشوائیت۔	۷۹	۶:۹۴
حُسنِ عمل کی جزا دس گنا، جُرم کی سزا اتنی ہی۔ (اور فقہ کا افسوسناک فیصلہ)	۱۴۸	۶:۱۶۱
منافقانہ شرکت، مجلسِ نبویؐ میں۔	۱۹	۶:۲۵-۲۸
موت اور نیند میں فرق۔	۴۰	۶:۶۰
موت سے صرف جسم مرتا ہے۔	۴۲	۶:۶۱-۶۲
موت اور حیات کا قرآنی تصوّر۔	۱۱۶	۶:۱۲۳
موت کے بعد دنیا میں واپس نہیں ہو سکے گی۔	۲۰۴	۷:۵۲
موسیٰؑ		
بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی۔	۴۰۳	۷:۱۴۸
تسبیح و ذکر کا مفہوم۔	۳۴۱	
تفرقہ شرک سے بھی بدتر ہے۔	۴۰۳	۷:۱۴۸-۱۵۱
تجلّی کادِ طُور۔	۳۳۴	
خدا کے ساتھ ہونے کا مفہوم۔	۳۴۷	
حضرت موسیٰؑ کی طرف سے دیدارِ خداوندی کی استدعا	۴۱۴	۷:۱۴۲-۱۴۳
اور اُنہیں کا جواب	۴۱۴	

مضمون	صفحہ	آیت
ساحرین کا مفہوم۔	۳۷۷	۷:۱۰۹-۱۱۲
ساحرین کا ایمان۔	۳۹۱	۷:۱۲۱-۱۲۲
طوبیٰ کا مفہوم۔	۳۳۵	
عصا اور یدِ بیضا۔	۳۳۸، ۳۶۷، ۳۷۶	۷:۱۰۹-۱۱۲
ذبحِ ابناء اور پارٹی بازی۔	۳۶۴	۷:۱۰۴-۱۰۵
فرعون اور حضرت موسیٰؑ کا مکالمہ	۳۴۷	
فرعون کی دھمکی۔	۳۷۱	۷:۱۰۹-۱۱۲
موسیٰؑ دربارِ فرعون میں۔	۳۵۶	۷:۱۰۴-۱۰۵
قوم کی طرف سے خدا کو بے نقاب دیکھنے کا مطالبہ	۴۰۵	۷:۱۵۵
قومِ فرعون کی غرقابی۔	۴۰۱	۷:۱۳۴-۱۳۶
محکوم کی کوئی بات قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جاتی۔	۳۷۲	۷:۱۰۹-۱۱۲
مدین کی زندگی۔	۳۴۳	
وہ منازل جن سے حضرت موسیٰؑ گزر رہے تھے۔	۳۴۲	
وراثتِ ارض کا قانون۔	۳۹۸	۳:۱۲۷
ہامان کی حقیقت۔	۳۸۵	۷:۱۱۳-۱۱۴
مؤدت فی القربیٰ۔	۶۵	۶:۹۱
ن		

مضمون	صفحہ	آیت
ناقۂ حضرت صالحؑ :	۲۸۵-۲۸۶	۷:۷۳
نبوّت - کتاب و حکم و نبوت ۔	۶۴	۶:۹۰
نذر و نیاز ___ عُرس ۔	۷۳	
"نزول" ___ لفظ کی اہمیت ۔	۱۵۴	۷:۱-۲
نسل پرستی کے خلاف ۔	۶۵	۶:۹۱
نظامِ اسلامی :		
رسولؐ کا فریضہ اسلامی نظام قائم کرنا تھا ۔	۷	۶:۷-۹
نظامِ اسلامی کی خصوصیت ۔	۱۳	۶:۱۳-۱۴
مُجرم الگ ہو جائیں ۔	۳۶	۶:۵۵
غیر متبدل اصول اور بدلنے والے احکام	۷۰	۶:۹۳
نفسِ انسانی بہ حالتِ نیند اور موت ۔	۴۰	۶:۶۰
نفس کو موت نہیں آتی ۔	۴۲	۶:۶۱-۶۲
نفسِ انسانی تغیّرات سے ماوراء ہو جاتا ہے ۔	۵۴	۶:۷۷-۷۹
نفس کی محکمیت بھی اور نشوونما بھی ۔	۶۸	۶:۹۳
اَلیغو ۔	۸۰	۶:۹۴
فُرادیٰ کا مفہوم ۔	۷۹	۶:۹۴
نور و ظلمت خدا کی تخلیق ۔	۳	۶:۱
نوحؑ		
داستانِ حضرت نوحؑ ۔	۲۲۰	۷:۵۹
طبقاتی تقسیم کے خلاف	۲۲۲	//
کشتی کی تیاری ۔	۲۲۹	//
دو قومی نظریہ ۔	۲۳۲	//
عمر حضرت نوحؑ ۔	۲۳۷	//
کشتی کے متعلق افسانہ طرازیاں ۔	۲۴۳	//
نیند اور موت میں فرق ۔	۴۰	۶:۶۰
و		
والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک ۔	۱۳۹	۶:۱۵۲
وراثتِ ارض کا قانون ۔	۳۹۹	۷:۱۳۷
وزن (اعمال کا) ایک اہم معیار ۔	۱۶۴	۷:۷-۹
وحی کی خصوصیت ۔	۱۵۴	۷:۱-۲
وحی کے طریق اور عقل کے طریق میں فرق ۔	۳۲۵	

مضمون	صفحہ	آیت
وحی۔ مطالبہ یہ کہ ان کی طرف وحی براہِ راست کیوں نہیں آئی	۱۲۰	۶:۱۲۴-۱۲۵
ھ		
ہدایت صرف خدا کی ہدایت ہے۔	۵۰	۶:۷۱-۷۲
ھُودؑ (حضرت)۔	۲۴۷	۷:۵۹

مضمون	صفحہ	آیت
ی		
یتیموں کے مال کی حفاظت	۱۴۱	۶:۱۵۳
یہود و نصاریٰ کی طرف سے مخالفت	۱۵	۶:۱۵-۱۸
یہودیوں پر اُن کے جرائم کی بنا پر بعض چیزیں حرام قرار دے دی گئی تھیں۔	۱۳۵	۶:۱۴۷-۱۴۸

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

چُوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شُد جہاں دیگر شود

(اقبالؒ۔ جاوید نامہ ص۹)